رجسٹرڈ نمبر اے ۷۸۱

دسمبر ۱۹۴۲ء

معارف

مجلس المصنفین کا علمی ماہوار رسالہ
مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

قیمت :- پانچ روپیہ (۵) سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات وغزوات، اخلاق وعادات اور تعلیم وارشاد کا یہ عظیم الشان کتابی ذخیرہ جس کا نام سیرۃ النبیؐ عام طور سے مشہور ہے مسلمانوں کے موجودہ ضروریات کو سامنے رکھکر صحت واہتمام کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے،

اب تک اس کتاب کے چھ حصے شائع ہوچکے ہیں، پہلے میں ولادت سے لے کر فتح مکہ تک کے حالات اور غزوات ہیں، اور ابتدا میں ایک نہایت مفصل مقدمہ لکھا گیا ہے جس میں فن سیرت کی تنقید و تاریخ ہے، دوسرے حصہ میں تکمیل دین، تاسیس حکومت الٰہی، وفات، اخلاق وعادات، اعمال عبادات اور اہلبیت کرام کے سوانح کا مفصل بیان ہے، تیسرے حصہ میں آپ کے معجزات وخصائص نبوت پر بحث ہے، اس میں سب سے پہلے عقلی حیثیت سے معجزات پر متعدد اصولی بحثیں کیگئی ہیں، پھر ان معجزات کی تفصیل ہے جو بروایات صحیحہ ثابت ہیں، اس کے بعد ان معجزات کے متعلق غلط روایات کی تنقید وتفصیل کی گئی ہے، چوتھے حصہ میں ان اسلامی عقائد کی تشریح ہے جو آپ کے ذریعہ مسلمانوں کو تعلیم کیے گئے ہیں، کوشش کی گئی ہے کہ اس میں قرآن پاک اور احادیث صحیحہ سے اسلام کے عقائد لکھے جائیں، پانچویں حصہ میں عبادت کی حقیقت، عبادات کی تفصیل وتشریح اور ان کے مصالح وحکم کا بیان ہے، اور دوسرے مذاہب کے عبادات سے ان کا مقابلہ وموازنہ ہے، چھٹے حصہ میں حقوق فضائل، اور آداب کے عنوانوں اور اس کی ذیلی سرخیوں کے تحت اخلاقی تعلیمات کی تفصیل ہے،

قیمت بڑی تقطیع	حجم	قیمت ملکی	قیمت ولایتی	قیمت چھوٹی تقطیع	حجم	قسم اول	قسم دوم
سیرۃ النبیؐ۔ حصہ اوّل	×	×	×	سیرۃ النبی حصہ اوّل	۵۶۱	×	للعہ
〃 〃 دوم	۳۵۱	ے	للعہ	〃 〃 دوم	۴۳۸	صہ	عہ۸
〃 〃 سوم	۵۹۶	للعہ	عہ۸	〃 〃 سوم	۶۹۴	معہ	صہ
〃 〃 چہارم	۶۸۶	ے	للعہ	〃 〃 چہارم	۸۸۸	معہ۸	صہ۸
〃 〃 پنجم	۳۶۸	للعہ	عہ۸	〃 〃 پنجم	۴۹۳	صہ	عہ۸
〃 〃 ششم	۶۱۲	صہ	للعہ	〃 〃 ششم	۸۷۲	معہ	صہ

دائرۃ المعارف

یعنی

معارف اعظم گڈہ

کی

۵۰ ویں جلد

از جولائی ۱۹۴۲ء تا دسمبر ۱۹۴۲ء

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

مطبوعہ معارف پریس اعظم گڑھ

فہرست مضمون نگاران معارف

جلد ۵۰

جولائی ۱۹۴۲ء تا دسمبر ۱۹۴۲ء

(بہ ترتیب حروفِ تہجی)

شعراء

فہرست مضامین

جلد ۵۰

جولائی ۱۹۴۲ء تا دسمبر ۱۹۴۲ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

جلد ۵۰ ماہ جمادی الاُخری ۱۳۶۱ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۴۲ء عدد ۱

مضامین



بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

مولانا حیدر حسن صاحب محدث ٹونکی کی وفات

مولانا حیدر حسن خاں صاحب محدث ٹونکی جو تقریباً دس پندرہ برس تک دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ میں شیخ الحدیث رہ کر دو سال ہوئے کہ ریاست کی خواہش پر اپنے وطن چلے گئے تھے، افسوس ہو کہ چند روز ہوئے کہ اپنے وطن ہی میں وفات پائی، محدث مرحوم اور ان کے بڑے بھائی مولانا محمود حسن خاں صاحب مصنف معجم المصنفین اس وقت کے علما میں ایسے دو نامور فرد تھے کہ جن کے وجود پر علم و فضل اور ورع و تقویٰ کو ناز تھا، الحمد للہ کہ ابھی مولانا محمود حسن خاں صاحب ہم میں موجود ہیں، مگر افسوس ہو کہ ان کے چھوٹے بھائی مولانا حیدر حسن خاں صاحب نے اس عالم فانی کو الوداع کہا، ایسے زمانہ میں جب نام کے مولویوں کی تعداد گو کثرت حاصل کر رہی ہی، مگر کام کے علما روز بروز کم سے کم ہوتے جا رہے ہیں، مرحوم کی وفات مشرقی علم و فضل کی کائنات میں حادثۂ عظیم سمجھی جائے گی،

مرحوم بڑے جامع العلوم تھے، علوم عقلیہ و نقلیہ و ریاضیہ کے وہ یکساں ماہر تھے، زیادہ تر اپنے بڑے بھائی مولانا محمود حسن خاں صاحب سے پڑھا تھا، حدیث کی سند شیخ حسین صاحب عرب یمنی خزرجی سے حاصل کی تھی، استفادۂ باطنی میں بھی ان کا مرتبہ بلند تھا، انھوں نے مکہ معظمہ جا کر حضرت حاجی شاہ امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے فیض حاصل کیا تھا، اور ماشاء اللہ زہد و عبادت بے تکلفی اور تواضع میں بزرگوں کا نمونہ تھے، علوم عقلیہ و ریاضیہ میں بھی ان کا درجہ بلند تھا، اور علوم نقلیہ میں وہ ماہر کامل تھے، علم حدیث کو بطرز حنفیہ بہت خوبی سے پڑھاتے تھے، رجال پر ان کی نظر وسیع تھی، ان کے درس کا طریقہ یہ تھا کہ حدیث پڑھاتے وقت احادیث کی ساری کتابیں

اور اسماء الرجال اور اصول کی کوئی مستند کتاب اُردگرد رکھ لیتے تھے، ہر نزاعی مسئلہ پر وہ داد تحقیق دیتے وقت اپنے شاگردوں کو ہر حوالہ کی حدیث کو نکال کر دکھاتے، اور رجال پر بحث کرتے وقت راوی کی حالت زبانی بیان کرکے مزید تشفی کیلئے انکو کتاب کھولکر اس راوی پر جرح و توثیق کے اقوال بھی دکھادیتے، اور اصول سے اپنے مدعا کو ثابت کرتے تھے،

ان سے اکثر مسائل میں گفتگو آتی رہتی تھی، مگر وہ ہمیشہ حاضر العلم نظر آئے، اور جب کبھی کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی، صاف اقرار کرلیتے تھے، اور دوسرے وقت وہ اس کو دوبارہ سمجھ کر بحث میں لاتے تھے، اس علم و فضل پر بیحد منکسر، بیحد خاکسار، بیحد متواضع، اتباعِ سنت اور پابندیِ شریعت میں ممتاز تھے، ان کی نماز خضوع و خشوع اور سکون و طمانیت کی تصویر ہوتی تھی، دار العلوم کی مدرسی کے زمانہ میں لکھنؤ کے اکثر اہل علم ان کے معترف و مداح تھے، اور مسائل میں ان کا فیصلہ قول فیصل کا حکم رکھتا تھا، اللہ تعالیٰ اس مجموعۂ خوبی کو اپنے فضل و کرم سے نوازے، اور مراتب اعلیٰ عنایت فرمائے،

ہندوستانی ایکاڈیمی الہ آباد جو کئی سال سے حکومت کی تحقیقاتی قید و بند میں گرفتار تھی، اخبارات سے یہ معلوم کرکے اطمینان ہوا کہ وہ اب گورنر صاحب صوبہ کے حکم سے آزاد کردی گئی ہی، ہز اکسلنسی نے تحقیقاتی کمیٹی کی ایک دو باتوں سے اتفاق اور اس کے اکثر فیصلوں سے بجا اختلاف کیا ہے، ہز اکسلنسی کی یہ ادب نوازی اس وقت جب دنیا خون میں نہا رہی ہی، اور دوبارہ اس کی امداد کا اجرا جب ہر حکومت جو کچھ اس کے خزانہ میں ہی جنگ کی قربانگاہ پر چڑھا رہی ہی، بیحد تعریف کے قابل ہے،

اگر یہ بات جو ہمارے بہت سی ہموطنوں پہ گراں گذریگی صفائی اور ایمانداری کے ساتھ کہدی جائے تو بیجا نہ ہوگا، کہ ہمارے بہت سی ہموطن جو ہندی کو صوبہ کی زبان بنانے کے لئے سالہا سال سے بیقرار ہیں، ہر اس کوشش کو جس سے اردو کی بقا اور قیام کو کوئی مدد ملے، حد درجہ ناپسند کرتے ہیں! اور اسلئے ہندوستانی ایکاڈیمی الہ آباد ہمیشہ انکی نظروں میں اسلئے کھٹکتی رہی کہ یہ ہندی کیساتھ ہندی کے برابر برابر اردو کو کیوں جگہ دیتی اور اسکی بقا و قیام میں کیوں کوشش کرتی ہی،

کانگریس گورنمنٹ کے عہد میں وزیر تعلیم اور اسپیکر جس طرح کھلم کھلا اور بالاعلان ہندی کی اشاعت

اور امداد کا کام انجام دیتے رہے، وہ کچھ چھپی بات نہیں، ان ہی کے اشارہ سے ہندوستانی ایکاڈیمی پر اس نام سے تحقیقات کا پہرہ بٹھایا گیا کہ اس کے ذریعہ سے اردو اور ہندی دو زبانوں کے بجائے، ایک ہندوستانی زبان کا کام کس طرح لیا جا سکتا ہے، حالانکہ اس کے بنانے کی غرض یہ کبھی نہ تھی، بلکہ فریقانہ جھگڑوں سے الگ رہ کر دونوں زبانوں کی برابر کی خدمت تھی،

یہ سب کو معلوم ہے کہ خاکسار نے مخالفتوں کے باوجود ہندوستانی نام اور ہندوستانی زبان کی پرزور حمایت کی تھی، اس سے مقصود یہ تھا کہ دونوں قوموں کے درمیان بول چال کی زبان ایک ہے، اور جبکی صورت یہ تھی کہ ہمارے اردو اور ہندی کے اہل قلم چند اصول پر مل کر ایک ہوتے، اور دونوں کوشش کرتے کہ اپنی زبان کو آسان سے آسان کریں، اور لفظوں کے پرتال کا طریقہ یہ ہوتا کہ وہ لفظ قبول کئے جاتے جو چلن میں ہیں، اس کے لئے نہ قاموس کے ورق کھولے جاتے اور نہ شبد ساگر سے دیکھ دیکھ کر بولے اور لکھے جاتے، مگر افسوس کہ یہ میری تحریک عام طور سے کامیاب نہ ہو سکی، اس کا سبب صرف ایک تھا اور وہ یہ کہ ہمارے سیاسی ہندی کے حامی یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ وہ ہندی کو یعنی سنسکرتی ہندی کو اس صوبہ کی سرکاری اور تعلیمی زبان بنا کر چھوڑیں گے، اس خیال کے حامی اگر صوبہ کی تعلیمی وزارت، مجلس قانون ساز کی صدارت اور ہماری سب سے پرانی تعلیم گاہ (یونیورسٹی) کی وائس چانسلری کی کرسیوں پر ہوں تو نتیجہ کے متعلق فیصلہ مشکل نہیں،

ہندی کے بعض حامیوں کی طرف سے یہ بات کہی گئی ہے کہ اردو مسلمان بادشاہوں کے دربار میں پیدا ہوئی اور صرف ان لوگوں کی زبان رہی جو درباروں سے تعلق رکھتے تھے، باقی سارے ملک کی زبان ہمیشہ ہندی ہی رہی ہے، افسوس ہے کہ یہ نظریہ ایک بڑی یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی طرف سے پیش کیا گیا ہے، اس سے اندازہ ہوگا کہ علمی اور تاریخی مسئلوں میں بھی ذہنی تنگ نظری حقیقت کو کس طرح بدلنے پر مجبور کرتی ہے، اردو کی ہزار سال کی تاریخ اب بالکل سامنے آگئی ہے، اسکو دیکھ کر ہر شخص فیصلہ کر سکتا ہے کہ یہ زبان عوام کے جھونپڑوں، بیوپاریوں کی دوکانوں، لشکریوں کے خیموں اور فقیروں کی خانقاہوں سے نکل کر بادشاہوں کے درباروں تک پہنچی ہے، یہ دربار سے بازار بازار سے دربار تک نہیں پہنچی ہے، اور یہی واقعہ اردو کی ملکی ضرورت کے راز کو فاش کرتا ہے،

مقالات

عہدِ نبویؐ کے عربی ایرانی تعلقات

از

جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب استاذ جامعہ عثمانیہ

قبل اسلام جزیرہ نمائے عرب زیادہ تر صحرا ہے، اس لئے وہان کی آبادی اپنی غذا تک کے لئے قدیم سے بیرونی درآمد کی محتاج رہی ہے، تعدد ازدواج سے آبادی مین تیز اضافہ اور ذرائعِ معیشت مین خانہ جنگیون وغیرہ کے باعث روزافزون انحطاط عربون کو اکثر ترکِ وطن پر قدیم سے مجبور کرتا رہا ہے ایک طرف وہ خطرناک بحری راستہ سے مشرقی افریقہ جاتے رہے، تو دوسری طرف شمال مشرق مین عراق کی طرف اور شمال مغرب مین فلسطین کی طرف بھی خشکی کے راستہ سے ہمیشہ ان کا[1] رُخ رہا، بعد مین ملاحی مہارت بڑھنے پر وہ ہند اور چین تک تجارت کے لئے آنے جانے لگے،

جہان تک ایران کا تعلق ہے، اس کو سب سے پہلے معلوم ہوتا ہے، کہ قبیلۂ طےؔ ہی سے سابقہ پڑا، چنانچہ اب یہ مسلمات سے سمجھا جاتا ہے، کہ فارسی لفظ تازی، اور اسی کا بگڑا ہوا چینی لفظ

---

[1] اسکی قدامت اور وسعت کے لئے دیکھئے میرا مقالہ "عربون کے تعلقات بیزنطینیون سے" مجلۂ تحقیقاتِ علمیہ جامعہ عثمانیہ سالنامہ سوم، مختصر یہ کہ سنٹ پاول کے زمانہ مین دمشق مین ایک عرب بادشاہ حارث حکمران تھا، تو حلب جیسے شمالی علاقون تک مین عرب کی راجدھانیان قائم ہو چکی تھین،

تاشی (جس سے عرب مراد ہوتے ہین) اسی لفظ "طی" کی بگڑی ہوئی صورت ہی۔[1]

ان تارکانِ وطن کی تعداد ایرانی صوبۂ عراق مین اتنی زیادہ ہوگئی تھی، کہ انھون نے عہد نبوی سے صدیون قبل حیرہ (کوفہ) مین ایک طاقتور سلطنت قائم کرلی تھی، اور لخمی قبیلہ کے ان عرب حکمرانون پر ماحول کا کچھ اتنا اثر پڑا کہ شام کی طرف جانے والے غسانیون کے برخلاف انھون نے خانہ بدوشی تک ترک کردی، اور بستیون مین بس کر عربی تہذیب کی عظیم الشان خدمت انجام دینے لگے،

ایرانی شہنشاہون نے مختلف مصلحتون سے انھین ہاتھوں ہاتھ لیا، چنانچہ ایک طرف تو یہ عرب اور ایران (عراق) کے مابین حد فاصل اور حاجز مملکت (Buffer State) بنے، اور خانہ بدوش بدویون کی عراق مین لوٹ مار کی نہین خود یہ لوگ جھیلنے لگے،[2] اور ایرانی امن مین ہوگئے، تو دوسری طرف ایرانی جو روز افزون آرام طلب ہوتے جارہے تھے، مفت کے عرب رضا کارون سے اپنی فوج مین کثیر تعداد مین کام لینے لگے، اس سے عربون مین جنگجوئی اور فوج آرائی کی روح نہ صرف تازہ رہی بلکہ صیقل پاتی اور نطرت مین رچتی گئی، تو ساتھ ہی ایرانی روز بروز جنگ سے ڈرنے لگے، اور بزدل ہوتے گئے، ایرانی بیزنطینی جنگون مین ایک سے زیادہ مرتبہ ان عربی فوجون نے جو فیصلہ کن اور عظیم الشان حصہ لیا، اور ایرانی حکومت کے لئے صرف اپنے بل بوتے پر جو وسیع فتوحات حاصل کین، ان سے ہر کوئی واقف ہے، ان کے دہرانے کی ضرورت نہین، یہ امر البتہ نمایان کئے جانے کے قابل ہے، کہ بیزنطینی قیصرون نے ضجعیون اور پھر غسانیون سے جنگی حلیفی کرلی، اور ایرانی کسراؤن کے لئے بھی ناگزیر تھا کہ اسی کے مماثل طاقتور عربون کو اپنا حلیف بنائے رکھین،

عرب کے جانورون تک کی وفاداری ضرب المثل ہے، پھر حیرہ کے حکمرانون پر کسرایانِ ایران کا اعتماد کیون نہ بے پایان ہوتا، کسی اور ملک مین یہ نظیر نہ ملے گی، جیسی یہان ملتی ہے، کہ کسرائے ایران

---

[1] بریٹ شنائڈر کا انگریزی رسالہ "عربون کے متعلق چینیون کے معلومات" (ص۶) [2] تنبیہ مسعودی ص ۱۸۱

اپنے ولی عہد کو اپنے جونیر حلیف بلکہ ماتحت حکمران حیرہ کے ہان بھیج دے، تاکہ وہین اس کی تعلیم و تربیت ہو، بعد مین بدوی روایات کے حامل اس شہزادے نے حکمران بن کر دنیا پر یہ ثابت کر دیا کہ حیرہ کا عربی ماحول مدائن کے ایرانی ماحول سے کہین زیادہ مفید و کردار ساز تھا،

حیرہ والون کی خدمات خود عرب کے لیے کچھ کم اہم نہ تھین، عربی شعراء اور تاجر ہمیشہ ان کے دربار مین بھرے رہتے تھے، اور غیر محسوس طور سے تاثر و تاثیر کرتے چلے جاتے تھے، اور غالباً صحرانشینون سے اس مسلسل تعلق ہی نے باوجود عیش و ترفہ کے لخمی حکمرانون مین بہت سی اچھی بدوی صفتین مثلاً بات کا پاس اور آن کے لئے جان تک کی پرواہ نہ کرنا، بہت کچھ برقرار رکھین،

عربی رضاکارون کی وفاداری اور اطاعت شعاری نے رفتہ رفتہ دربار مدائن کو یہ بھلا دیا کہ حیرہ کمزور اور جونیر حلیف سہی، لیکن ماتحت اور غلام نہ تھا، مجوسی و مزدکی روایات نے عصمت و ناموس کا تصور ہی ایرانی دربار سے مٹا دیا تھا[1]، اسی لئے انھون نے اس مین کوئی برائی ہی نہین سمجھی کہ انھی اصول کا اطلاق عرب حکمران کی بہو بیٹیون پر کیا جائے، اس کے نتیجہ سے سب واقف ہین کہ حکمرانِ حیرہ کو مدائن طلب کیا گیا، اور اس وفاشعار نے جانتے بوجھتے اسکی تعمیل کی، تو تحفظ عصمت کے جرم مین اس کا سر قلم کیا گیا، اور نشۂ غرور مین چور شہنشاہ نے حاجز مملکت کو بھی فنا کر دینے کا حکم دیا، چنانچہ حیرہ مین ایرانی افسر آدھمکے اور گو برائے نام ایاس بن قبیصہ نامی ایک عرب کو بھی وہان کے عربون کا سردار بنا یا گیا، لیکن سلطنت حیرہ کا ایران سے الحاق کر کے ایک معمولی صوبہ بنا دیا گیا، یہ قصہ یہین ختم نہ ہوا، بلکہ حکمران حیرہ نے اپنے پاس کا بعض امانتی مال اصل مالکون کو پہنچانے کے لئے بعض بدوی قبائل کے سردارون کے سپرد کیا، تو شہنشاہی احکام اسکی فوری حوالگی کے لئے پہنچے، اور انکار پر سزادہی اور

[1] مزدکنے ملکۂ ایران کے متعلق بھرے دربار مین شہنشاہ سے جس بے باکانہ بے حمیتی کا اظہار کیا تھا، اس سے عربی خوان بے خبر نہ ہونگے،

عربوں کی بالکلیہ تباہی کے لئے ایک عظیم الشان ایرانی لشکر روانہ کیا گیا، مگر اب کی دفعہ قدرت نے ایران کو ایک تنبیہ کرنی چاہی، اور ذی قار کی جھیل پر ان کی فوج کو جان پر کھیلے ہوئے بدوؤن نے کاٹ کر رکھدیا، مگر دربار ایران نے بجائے سبق لینے اور اپنی اصلاح کرنے کے عربوں پر مزید ستم آرائی شروع کردی، اور انھین روز افزون اپنا دشمن بنانا شروع کیا، (اب جناب رسالت مآب صلعم کا مدنی دور زندگی شروع ہو چکا تھا) اور خلافت صدیقی کے آغاز پر اسی ایرانی سرحد کے ستم رسیدہ مثنیٰ شیبانی کا ایران پر حملہ کے لئے اپنے رضاکارانہ خدمات کا پیش کرنا زیادہ تر ایران کی اسی عرب کش سیاست کا ردِ عمل تھا،

اس واقعہ سے چند ہی سال قبل یمنیوں کی دعوت اور تعاون سے ایرانیون نے حبشیون کو نکال کر یمن پر قبضہ کر لیا تھا، اور وہرز کی فوجی گورنری کے بعد لائق باذان وہان گورنر بنا، لیکن پائے تخت ایران مین کچھ ایسی تیزی سے شاہ گردی ہو رہی تھی، کہ مٹھی بھر ایرانی فوج کے لئے کسی مزید کمک کی غیر موجودگی مین یمن پر قبضہ رکھنا بڑا دشوار ہو گیا تھا،

حیرہ اور یمن کے علاوہ مشرقی اور جنوب مشرقی عرب کے ساحلی علاقون یعنی عمان اور الحسار مین بھی (جسے اُس زمانہ مین بحرین کہا جاتا تھا) ایرانی اثرات مستحکم ہو گئے تھے، عمان مین جلندی بن المستکبر کا خاندان کسرائے ایران کی طرف سے حکمران نامزد ہوا تھا، جس کے کچھ حالات محمد بن حبیب (المتوفی ۲۴۵ھ) نے اپنی مشہور کتاب المحبر (مخطوطہ دائرۃ المعارف حیدرآباد) مین لکھے ہین، اور بعد مین اسی جلندی کے بیٹون جیفر اور عبد سے جناب رسالت مآب صلعم نے تخاطب فرمایا تھا، عمان وسیع ملک ہے وہان کے ایک اور عرب سردار ہوذہ بن علی کو کسریٰ نے ایک جواہر نگار ٹوپی عطا کی تھی، اسی لئے اس کا لقب ذو التاج یا صاحب التاج مشہور ہو گیا تھا، (دیکھئے اشتقاق ابن دُرید ص ۲۰۹ عقد الفرید ابن عبدربہ جلد ۲، ص ۶۷) الحسار مین کسی عرب ریاست کا بظاہر پتہ نہین چلتا، اور وہان کے صدر مقام ہجر مین ایرانی فوجی گورنر (مرزبان) رہا کرتا تھا، بعض غیر موروثی عرب افسر بھی تھے،

عرب مؤلفون کے ہان اس قسم کے تذکرے کثرت سے ملتے ہین، فلان عربی شیخ نے فلان بادشاہ (کسریٰ، قیصر نجاشی وغیرہ) کے ہان باریابی حاصل کی، ابن عبد ربہ نے اس کا ایک مستقل باب (الوفادات) ہی قائم کیا ہے، ایسے ہی ایک شخص سے خوشنودی کے سلسلہ مین کہتے ہین کہ شیخ کی خواہش پر کسریٰ نے ایک مہندس (انجینیر) بھیجا، جس نے وادی وج مین ایک فصیل دار قلعہ تعمیر کیا، جسے طائف کہنے لگے (کتاب الاغانی جلد ۱۲ صفحہ ۴۸-۴۹) اس کے استحکام کا اندازہ اسی سے لگایا جاسکتا ہے، کہ فتح مکہ و حنین کے بعد طائف کو اسلامی فوجون نے آگھیرا تھا، اور باوجود منجنیق اور دبابون کے استعمال کے محاصرہ ختم ہوتا نہ نظر آیا، اور جناب رسالت مآب صلعم نے مزید جانی نقصان نامناسب سمجھ کر محاصرہ اٹھا لیا تھا،

ابتدائے اسلام

ایران آتش پرست تھا، انتہائی جنسی اباحیت رکھی تھی تو حقیقی بہنون اور صلبی بیٹیون تک کو وہان ازدواجی اغراض کے لئے محرمات مین نہین شامل کیا جاتا تھا، غالباً اسی قسم کے معاملات ہون گے جس نے مشرک عیسائیون کو جناب رسالتمآب صلعم کی نظر مین مجوسیون پر قابل ترجیح بنا دیا تھا، قرآن مجید کی سورۂ روم بھی انھی جذبات کی ترجمان ہے،

ابن ہشام (صفحہ ۲۷۰) وغیرہ نے روایت کی ہے کہ ابتدائے اسلام مین جب آنحضرت صلعم مختلف قبائل کو اسلام کی دعوت اور اسلام کی مدد کی ترغیب دیتے، تو علاوہ اُخروی روحانی ثواب کے وعدے کے یہ پیشینگوئی بھی فرماتے کہ کسریٰ و قیصر کی دولت تمھارے قدمون پر نچھاور ہو گی، جنگ خندق مین سنگ مرمر کی چٹان کو توڑتے وقت چنگاریان اڑنے پر اسی پیشینگوئی کا اعادہ فرمایا گیا تھا، (دیکھو طبری وغیرہ)

مین نے ایک مستقل مضمون مین اس پر تفصیل سی بحث کی ہے[۱] کہ ۶ھ کی صلح حدیبیہ کو قرآن مجید نے "فتح مبین" اور "نصر عزیز" کیون کہا ہے، اور کس لئے اسے اسلام اور مسلمانون کی سیاسی کامیابیون

---

[۱] دیکھئے رسالۂ سیاست حیدرآباد دکن، اپریل ۱۹۴۲ء

بحر خوارزم (ارال)
بخارا
بحر خزر
(قزوین)
بحر اسود
روم
رے
ایران
مدائن
حیرہ
سماوہ
ذی قار
بحر متوسط
غسان
مدینہ
طائف
مکہ
خلیج فارس
بحرین
ہجر
عمان
یمن
بحر عرب

تخمینی نقشہ سلطنت ایران
بوقت آغاز اسلام

کاشہ کار سمجھا جاتا ہے، (مشہور عام خیال تبلیغ کی سہولت کچھ دل کو نہین لگتا) یہان اس کا دہرانا غیر ضروری ہے

بہر حال اس صلح سے جہان مسلمانون کے ہاتھ کھل گئے، اور وہ خیبر کے نوپذیر خطرے کا دو ہی تین ماہ مین استیصال کرنے کے قابل ہو گئے، وہین انھین نینوا مین ایرانیون کی بیزنطینیون (رومیون) کے ہاتھون عہد آفرین شکست کے سلسلہ مین بین الممالک صورت حال سے فائدہ اوٹھانے کا موقع مل گیا، (نینوا کی لڑائی شعبان ۶ھ مین ہوئی تھی، اس کے بعد ہی صلح حدیبیہ ہوئی)

بلاذری (فتوح ص ۷۹) اور ابن الاثیر (کامل ۲/۱۴۵) نے بیان کیا ہے، کہ ایرانی مقبوضۂ بحرین کے ایک عربی النسل افسر منذر بن ساوی کو جناب رسالت مآب صلعم نے سب سے پہلا خط ۶ھ ہی مین روانہ کیا تھا، غالبًا کسرائے ایران کا خط بھی اسی نامہ بر کے ذریعہ سے بھیجا گیا ہوگا، جس نے بحرین کے حاکم سے خواہش کی، کہ اسے کسری کے پاس مدائن بھیج دے،

یہان اسکی غالبًا ضرورت نہین کہ سماوہ، بحرین، عمان، یمن وغیرہ عرب کے جملہ ایرانی مقبوضات سے عہد نبوی مین جو اسلامی تعلقات رہے ان کی پوری تفصیل اور ان کا ارتقا بتایا جائے، ورنہ ان علاقون کے ایرانی افسرون یا عرب شیوخ کے نام لکھے ہوئے کئی درجن نامہ ہاے نبوی تاریخ نے محفوظ رکھے ہین، ایک منذر ہی کے نام کے نو خط ملتے ہین، جن مین بحرین کی سیاسیات کی پوری تاریخ محفوظ ہے، ان کے متن کے لئے میری حقیر تالیف الوَثَائق السِّيَاسِيَة دیکھی جا سکتی ہے، (جس کی طباعت کے بعد اوائل ۱۳۶۱ھ مین کتب خانہ خدا بخش مرحوم پٹنہ مین قبیلۂ عبد القیس سے کیا ہوا ایک اور معاہدہ کتاب وَسِيلَةُ المُتَعَبِّدِين مین دستیاب ہوا ہے) یہان صرف شہنشاہ ایران سے خط و کتابت پر کچھ بحث کیجائیگی، جس مین متعدد گتھیان سلجھانی ہین،

تمام اسلامی مورخون محدثون اور دیگر مولفون نے متفقہ طور سے بیان کیا ہے، کہ صلح حدیبیہ کے بعد ہی جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ہمسایہ ممالک کے حکمرانون کے نام اسلام کے تبلیغی

خطوط بھیجے، تو ان مین سے ایک کسرائے ایران کے نام بھی تھا، اس کا متن جس مین کچھ لفظی اختلافات بھی پائے جاتے ہین، یہ ہے،

(۱)	بسم اللہ الرحمٰن الرحیم	بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
(۲)	من محمد رسول اللہ الی کسریٰ عظیم فارس،	محمد رسول اللہ کی طرف سے سردار ایران کسریٰ کے نام،
(۳)	سلام علی من اتبع الھدیٰ وآمن باللہ ورسولہ،	ہدایت پر چلنے اور خدا و رسول پر ایمان لانے والے کے لئے سلامتی ہو،
(۴)	وادعوک بدعایۃ اللہ فانی انا رسول اللہ الی الناس کافۃ،	مین تجھے خدا کا بلاوا دیتا ہون کیونکہ مجھے خدا نے تمام انسانون کی طرف بھیجا ہے،
(۵)	لانذر من کان حیا ویحق القول علی الکافرین،	تاکہ مین ہر زندہ شخص کو ڈراؤن کافرون کے متعلق خدا کی بات پوری ہو کر رہے گی،
(۶)	فاسلم تسلم،	اسلام لا سلامت رہے گا،
(۷)	فان ابیت فان اثم المجوس علیک،	اگر تو انکار کرے تو تمام مجوسیون کا وبال تجھی پر پڑے گا،

یہ متن تاریخ طبری ص ۱۵۷۱ و ص ۱۵۷۲ (دو روایتین) صبح الاعشیٰ قلقشندی جلد نمبر ۶ صفحہ ۲۹۶، کتاب الصناعتین لابی ہلال العسکری، نیز جلد نمبر ۹ صفحہ ۳۰۷، اعلام السائلین عن کتب سید المرسلین لابن طولون، مکتوب نمبر ۳، المواہب اللدنیہ للقسطلانی جلد نمبر ۱ صفحہ ۲۹۱، تاریخ الیعقوبی جلد نمبر ۲ صفحہ ۸۳، نصب الرایۃ لاحادیث الہدایۃ للزیلعی، مکتوب نمبر ۹، مفید العلوم و مبید الہموم للقزوینی مکتوب نمبر ۲، دلائل النبوۃ لابی نعیم جلد نمبر ۲ صفحہ ۱۲۲، المنتقی لابی نعیم ورق نمبر ۳۵/ب (مخطوطہ حیدرآباد دکن)

نفریدون بک جلد ا ص ۳۱، وسیلۃ المتعبدین لعمر الموصلی جلد ۸ ورق نمبر ۲۷/ب (مخطوطہ بانکی پور) میں مکمل ملتا ہے، اور طبقات ابن سعد، اموال ابی عبید، صحیح البخاری، صحیح مسلم، مسند ابن حنبل وغیرہ میں جستہ جستہ ملتا ہے، اس پر کا تانی نے اپنی اطالوی "تاریخ اسلام" میں اور اسپرنگر نے اپنی جرمن کتاب سوانح و تعلیمات محمدی میں بحث کی ہے، ادارۂ معارف اسلامیہ لاہور کے اجلاس دوم کی روداد میں میرا بھی ایک انگریزی مضمون اس خط کے متعلق ملیگا،

جیسا کہ ابھی بیان ہوا، یہ متن مختلف تاریخوں نے لفظی اختلاف کے ساتھ روایت کیا ہے، اہم ترین یہ ہے بعض روایتوں میں "بسم اللہ الرحمن الرحیم" حذف ہو گیا ہے، اسکی کوئی اہمیت نہیں کیونکہ حذف عبارت کا عام رواج رہا ہے،

قلقشندی نے ابو ہلال عسکری سے جو متن نقل کیا ہے، صرف اسی ایک روایت میں "کسریٰ ابرویز عظیم فارس" کے الفاظ ہیں، اور باقی کسی نے بھی پرویز کا نام نہیں لیا ہے، میرا خیال ہے کہ پرویز کا نام بعد کا قیاسی اضافہ ہے، واللہ اعلم،

نـ۲ میں طبری کی ایک روایت میں وشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ وأن محمداً عبدہٗ ورسولہ کے الفاظ زائد ہیں، جو اصل فقرے کی صرف شرح معلوم ہوتی ہے،

نـ۳ میں دعاء اللہ اور دعایۃ اللہ کی روایتیں عام ہیں، رسالات نبویہ مؤلفہ عبد المنعم خان ٹونکی نے دعاء الاسلام کہیں سے نقل کیا ہے، مطلب سب کا ایک ہی ہے،

نـ۴ میں قرآنی آیت کے لحاظ سے بعض روایتوں میں "لینذر" بھی مروی ہے، جو عربی کے لحاظ سے ذرا تکلف سے ٹھیک ہوگا،

نـ۵ میں "فان" کی جگہ "وان" اور اسی طرح "ابیت" کی جگہ "تولیت" نیز "اثم المجوس علیک" کی جگہ "علیک اثم المجوس" وغیرہ فرق بھی ملتے ہیں، جو روایت بالمعنی کا نتیجہ ہیں، ان سے مطلب پر کوئی

اثر نہین پڑتا،

غرض یہ خط عبد اللہ بن حذافہ السہمی بحرین کے حاکم کے پاس لے گئے تھے، یہ ٹھیک طور سے نہین معلوم ہوتا کہ آیا عبد اللہ بن حذافہ ہی مداین گئے تھے، یا حاکم بحرین نے اپنے کسی آدمی کے ہاتھ اسے پایۂ تخت روانہ کیا تھا، بہر حال تمام اسلامی مؤلف بیان کرتے ہین، کہ کسریٰ (خسرو پرویز) نے طرز تخاطب دیکھتے ہی پورا خط پڑھے بغیر چاک کر دیا، اور نامہ بر کو سامنے سے نکلوا دیا، اس کے علاوہ یہ قصہ بیان کیا جاتا ہے، کہ کسریٰ نے یمن کے گورنر باذان کو حکم بھیجا کہ دو آدمی مدینہ روانہ کرے اور نبی عربی کو برضامندی ورنہ گرفتار کر کے مداین روانہ کرے، جب یہ لوگ مدینہ آئے تو جناب رسالت مآب صلعم نے اُن سے کہا کہ آج رات میرے رب نے تمھارے رب کو قتل کر دیا، اس پر وہ یمن چلے آئے، اور جلدی ہی مداین سے کسریٰ شیرویہ نے سرکاری اطلاع بھیجی کہ اس نے مصلحت عامہ کے تحت اپنے باپ کو قتل کر دیا، اور خود تخت نشین ہو گیا ہے، اور کہتے ہین، کہ شیرویہ کی پدرکشی کی تاریخ وہی تھی، جو حضرت رسول کریم صلعم نے فرمائی تھی، اور اس معجزہ کو دیکھکر باذان اور بہت سے یمنی مسلمان ہو گئے،

یہ واقعہ سیرۃ ابن ہشام (صفحہ ۴۶) پر مذکور ہے اور بظاہر ابن اسحاق کا بیان نہین ہے، بلکہ ابن ہشام نے زہری کی روایت خود اضافہ کی ہے، سیرۃ ابن ہشام صفحہ ۹۷۱ مین جہان بادشاہون کے نام خطوط کا ذکر ہے، وہان کسریٰ کے سلسلہ مین یہ قصہ بیان نہین ہوا ہے، تاریخ طبری (ص ۱۵۷۲ تا ۱۵۷۴) مین جہان اس سفارت کا ذکر ابن اسحاق کے حوالہ سے نقل ہوا ہے، وہین زہری کی روایت صرف اتنی بیان ہوئی ہے کہ کسریٰ کے نامۂ مبارک کو پارہ پارہ کر ڈالنے کی اطلاع ملی، تو آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ خدا اوسکے ملک کو بھی پارہ پارہ کر دے، اور طبری نے شیرویہ کی پدرکشی کا قصہ زہری سے اس قطع کلام کے بعد یزید بن حبیب کی روایت کی بنا پر نقل کیا ہے، اور وہان زہری کا اس

سے تعلق نہیں ہے،

اس اختلاف کو ہم کوئی خاص اہمیت عام حالتوں میں نہیں دیتے، لیکن طبری نے جہاں یہ قصہ ۶ھ کے حالات میں حدیبیہ کے بعد بیان کیا ہے، وہیں ایران قدیم کے حالات میں، (ص ۱۰۰۹) یہ جملہ بھی عکرمہ کے حوالہ سے ایک غیر مربوط قصہ کے آخر میں لکھا ہے:-

فاھلك الله كسرى وجاء الخبر	چنانچہ خدا نے کسریٰ کو ہلاک کر دیا، اور
الى رسول الله صلى الله عليه وسلم	اس کی اطلاع جناب رسالت مآبؐ کو حدیبیہ
يوم الحديبية ففرح و	کے دن پہنچی جس سے آپ کو اور آپ کے ساتھیوں
من معه،	کو خوشی ہوئی،

جب خسرو پرویز کے مرنے کی اطلاع حدیبیہ کے دن آچکی تھی، تو پھر بعد میں پرویز کے نام خط لکھنا، اور پدر کشی کی اطلاع بطور معجزہ دینا سب بے بنیاد قصے بن جاتے ہیں، کثیر نویسی کی وجہ سے طبری کے ہاں بلا تنقید متضاد روایات کا آجانا اور روایات میں بھی بے احتیاطی سے قطع و برید ہو جانا ایک معروف واقعہ ہے جس سے ہر وہ شخص واقف ہے جس نے طبری کا غور سے مطالعہ کیا ہے، اسی بنا پر ابو نعیم کی دلائل النبوۃ (جلد نمبر ۲ ص ۱۲۴) کی یہ روایت خاص توجہ کی مستحق ہے کہ:

"رومیوں کے ہاتھوں ایرانیوں کو اسی دن شکست ہوئی تھی جس دن حدیبیہ کی صلح ہوئی اور جب اسکی اطلاع پہنچی تو جناب رسالت مآب صلعم کو بڑی خوشی ہوئی (کہ قرآن مجید کے سورۂ روم کی کئی سال قبل کی پیشنگوئی پوری ہو گئی)

نینوہ کی لڑائی شعبان ۶ھ (دسمبر ۶۲۷ء) میں ہوئی تھی، جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا، عام طور سے اسلامی مورخ یہ بیان کرتے ہیں، کہ ہم حدیبیہ کے لئے مسلمان مدینہ سے ذی قعدہ ۶ھ میں نکلے لیکن امام ابو یوسف نے کتاب الخراج (ص ۱۲۸) میں یہ روایت بیان کی ہے، کہ جناب رسالت مآب صلعم

حدیبیہ کے لئے رمضان مین نکلے، تاریخ ابن کثیر (البدایہ والنہایہ جلد ۴ ص ۱۶۴) مین حدیبیہ کے ذی قعدہ مین پیش آنے کا ذکر کرکے اس بات پر تعجب ظاہر کیا گیا ہو کہ عروہ کے بیان کے مطابق صلح حدیبیہ ماہ شوال مین منعقد ہوئی،

آنحضرت صلعم کے ہمعصر زمانہ کی تاریخین نہ تو بیزنطینیون کے ہان محفوظ رہین، نہ ایرانیون کے ہان، اور نہ حبشیون کے ہان، ان حالات مین ایک واحد استثنائ خاص توجہ کا محتاج ہے، وہ یہ قیصر ہرقل اور کسریٰ پرویز مین جب آخری فیصلہ کن لڑائی شروع ہوئی، تو قیصر میدان جنگ سے وقتاً فوقتاً اپنے بیٹے کو خط روانہ کرتا رہا، اتفاق سے یہ اب تک محفوظ ہین، اور انہی مین سے ایک مین قیصر نے اپنے بیٹے کو لکھا ہو کہ خبر آئی ہو کہ خسرو پرویز کو اس کے بیٹے شیرویہ نے، ۲۰ فروری ۶۲۸ء کو قتل کر ڈالا ہے[۵] (جو وسط رمضان ۶ھ کے مطابق ہو) قرائنی شہادت قیصر کے اس خط کی صحت کی تائید کرتی ہو، شعبان مین نینوا مین فیصلہ کن شکست کھانے کے بعد وسط رمضان مین اس کا مارا جانا کوئی تعجب کا حامل نہین، اور بظاہر قیصر کو اس واقعہ کے بیان کرنے مین عمداً جھوٹ پر آمادہ کرنے کی بھی کوئی وجہ نظر نہین آتی، اسی وجہ سے واقدی کا یہ بیان کرنا کہ

"شیرویہ نے اپنے باپ کسریٰ کو منگل کی رات ۱۰ جمادی الاولیٰ ۷ھ کو قتل کیا، جب کہ چھے گھڑی رات گذر چکی تھی، (تاریخ طبری ص ۱۵۶۲)

اپنے اندر مقابلۃً کم کشش رکھتا ہو،

---

[۵] قیصر ہرقل کی جنگون کے متعلق بھی بڑی پیچیدگیان ہین، اس موضوع پر سب سے مستند کتاب جرمن زبان مین گیرلانڈ (Gerland) کی ہے جس کا نام "قیصر ہرقل کی ایرانی مہمین" (Die persische Feldzüge des Kaisers Herakleios) ہے، یہ واقعہ اس کتاب مین یونانی مورخ تیوفان کے حوالہ سے نقل ہوا ہو،

غرض اس وقت جو گتھیان نظر آتی ہین ان کا خلاصہ یہ ہی :-

واقعہ	طبری فی روایہ	ابونعیم	ابویوسف	واقدی	ابن کثیر فی روایہ	ہرقل کا خط یونانی تاریخ مین	عام مورخین
نینوہ مین ایرانی شکست	.	.	.	.	یوم الحدیبیہ	.	شعبان سنہ ۶ھ
کسری پرویز کا قتل بیٹے کے ہاتھ	یوم الحدیبیہ	.	.	۱۰ جمادی الاولی سنہ ۷ھ	.	وسط رمضان سنہ ۶ھ	.
اس قتل کی اطلاع کا جناب رسالتمآب کو پہنچنا	.	یوم الحدیبیہ	.	.	.	.	حدیبیہ کے کئی ماہ بعد تقریباً ربیع الثانی یا جمادی الاولی مین
حدیبیہ کیلئے روانگی	.	.	رمضان سنہ ۶ھ	.	.	.	ذی قعدہ سنہ ۶ھ
صلح حدیبیہ					شوال سنہ ۶ھ	.	تقریباً اواخر ذی قعدہ یا اوائل ذی حجہ سنہ ۶ھ

ان مین ممکن ہو تو باہم تطابق دینے ورنہ کسی ایک کے بیان کو ترجیح دینے کی ضرورت ہی لیکن اس طرف توجہ کرنے سے قبل دو اہم امور بطور تمہید ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہی :-

۱- واقدی اور ان کے شاگرد ابن سعد نے سیرۃ نبویہ کے واقعات کو کبھی تو ہجری سنہ سے بیان کیا ہی، اور کبھی ہجرت کے وقت سے، اور سب جانتے ہین کہ ہجرت ۱۲ ربیع الاول کو ہوئی اور سنہ ہجری اس سے کوئی دو ماہ اٹھارہ دن قبل یکم محرم سے شمار کیا جاتا ہی، اسی لئے مثلاً جنگ بدر کا ذکر کرنا ہو تو ماہ نہم (رمضان) سنہ ۲ھ یا ہجرت سے ایک سال چھ ماہ بعد کہنا پڑے گا، واقدی نے کسی ایک طریقہ شمار کا چونکہ شروع سے آخر تک لزوم نہین رکھا ہے، اس لئے من الہجرۃ (ہجرت کے وقت سے) اور للہجرۃ (ہجری سنہ سے) کہنے مین بآسانی خلط ملط ہوسکتا ہے، مزید بران

اگر راوی کی صرف روایت پہنچی ہو، اور اس سے بالمشافہ جرح اور تعین کا موقع نہ ہو، اور راوی نے ہجری سنہ مراد لیا ہو، اور واقدی نے وقت ہجرت سے مدت مراد ہونی سمجھی ہو، تو نادانستہ دو ماہ کا بڑی آسانی سے فرق پیدا ہو جاتا ہے، خاصکر اس لئے کہ واقدی نے مہینے کا نام لینے کے لئے اکثر مہینوں کی گنتی دی ہے، کہ ہجرت کے اٹھارہ یا بیس مہینوں بعد، وغیرہ،

۲-جناب رسالت مآب صلعم نے ذی حجہ سنہ ۱۰ھ میں سال کبیسہ کو عربی مہینوں کے لئے ہمیشہ کے واسطے منسوخ فرما دیا، اور خطبۂ حجۃ الوداع میں اس کی قرآنی ممانعت (انما النسئی زیادۃ فی الکفر الآیہ) کو دہرانے کے بعد ارشاد فرمایا تھا،

وَاِنَّ الزمان قد استدار کھیئۃ	زمانہ چکر کھا کر پھر وہی شکل اختیار کر چکا ہے،
یَوْمَ خلق اللّٰہ السَّمٰوٰتِ والارض	جیسا خلقت آسمان و زمین کے وقت تھا،

(سیرۃ ابن ہشام ص ۹۶۸ و تاریخ طبری ص ۱۷۵۴، وغیرہ)

اور متفقہ طور سے اسکی تشریح یہ کیجاتی ہے کہ اس وقت سنہ ۱۰ھ میں حجۃ الوداع کے موقع پر قمری اور کبیسہ دونوں لحاظ سے ذی حجہ باہم جمع ہو گئے تھے، قمری اور کبیسہ مہینوں کے متعلق عربی مورخوں نے جو بیانات چھوڑے ہیں، ان سے یہ معلوم ہوتا ہے، کہ ہر تیسرے سال قبیلۂ بنی فقیم کا سردار جس کا لقب قلمس ہوا کرتا تھا، حج کے موقع پر منیٰ میں ایک خاص رسم کی انجام دہی کے ذریعہ سے اعلان کرتا تھا، کہ اب جو ذی حجہ چل رہا ہے، اس کے بعد نیا چاند نظر آئے، تو وہ محرم الحرام کا نہ ہوگا، (بلکہ ایک گمنام اور غیر محترم مہینہ ہوگا) اور اس کے بعد کا نیا چاند محرم الحرام کا ہوگا، (جدید علم ہیئت بھی یہی کہتا ہے کہ قمری سال میں شمسی سال سے دس دن کم ہوتے ہیں، اور ہر تیسرے سال ایک مہینہ کا فرق پڑ جاتا ہے) اس بیان کے بموجب اگر سنہ ۱۰ھ میں دونوں قسم کے مہینے یکجا ہو گئے تھے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ

سنہ ۶		سنہ ۷		سنہ ۸		سنہ ۹		سنہ ۱۰	
ہجری مدنی	مکی کبیسہ	ہجری مدنی	کبیسہ مکی	ہجری مدنی	کبیسہ مکی	ہجری مدنی	کبیسہ مکی	ہجری مدنی	کبیسہ مکی
محرم	ربیع ۱	محرم	صفر	محرم	صفر	محرم	صفر	محرم	محرم
صفر	ربیع ۲	صفر	ربیع ۱	صفر	ربیع ۱	صفر	ربیع ۱	صفر	صفر
ربیع ۱	جمادی ۱	ربیع ۱	ربیع ۲	ربیع ۱	ربیع ۲	ربیع ۱	ربیع ۲	ربیع ۱	ربیع ۱
ربیع ۲	جمادی ۲	ربیع ۲	جمادی ۱	ربیع ۲	جمادی ۱	ربیع ۲	جمادی ۱	ربیع ۲	ربیع ۲
جمادی الاول	رجب	جمادی ۱	جمادی ۲	جمادی ۱	جمادی ۲	جمادی ۱	جمادی ۲	جمادی ۱	جمادی ۱
جمادی ۲	شعبان	جمادی ۲	رجب	جمادی ۲	رجب	جمادی ۲	رجب	جمادی ۲	جمادی ۲
رجب	رمضان	رجب	شعبان	رجب	شعبان	رجب	شعبان	رجب	رجب
شعبان	شوال	شعبان	رمضان	شعبان	رمضان	شعبان	رمضان	شعبان	شعبان
رمضان	ذی قعدہ	رمضان	شوال	رمضان	شوال	رمضان	شوال	رمضان	رمضان
شوال	ذی حجہ	شوال	ذی قعدہ	شوال	ذی قعدہ	شوال	ذی قعدہ	شوال	شوال
ذی قعدہ	×	ذی قعدہ	ذی حجہ	ذی قعدہ	ذی حجہ	ذی قعدہ	ذی حجہ	ذی قعدہ	ذی قعدہ
ذی حجہ	محرم	ذی حجہ	محرم	ذی حجہ	محرم	ذی حجہ	×	ذی حجہ	ذی حجہ

اس طرح ہم دیکھ سکتے ہین کہ ذی قعدہ سنہ ۶ مکی مین جب صلح حدیبیہ ہوئی، تو رمضان سنہ ۶ ہجری چل رہا تھا، اور اس طرح عروہ کا یہ کہنا کہ مہم حدیبیہ شوال مین ختم ہوئی یا امام ابو یوسف کا کہنا کہ حدیبیہ کے لئے مسلمان مدینہ سے رمضان مین نکلے تھے، اور عام مورخین کا اس واقعہ کو ذی قعدہ مین قرار دینا، ان مین باہم کوئی تضاد نہین، چونکہ اس وقت تک سال کبیسہ منسوخ نہین ہوا تھا، اور مکہ پر قریش ہی قابض تھے، اس لئے ان کے حج کا موسم ان کے ذی قعدہ سے شروع

ہوا تھا، حالانکہ خالص قمری حساب سے ابھی رمضان ہی کا مہینہ چل رہا تھا،

سنہ ہجری اور وقتِ ہجرت کے فرق کے تین مہینے اور قمری اور کبیسہ سالوں کے ۶ھ میں فرق کے تین مہینے جملہ چھ مہینوں کا فرق، یہ بڑی آسانی سے واقدی کی اس روایت کی توجیہ کر دیتا ہے کہ پرویز کا قتل ذی قعدہ (۶ھ) کی جگہ جمادی الاولیٰ میں کیوں بیان کیا گیا، دوسرے الفاظ میں راوی نے کہا ہوگا، کہ سنہ ہجرت اکترویں مہینہ میں، اور واقدی نے وقت ہجرت (ربیع الاول) سے حساب کیا، اور نہ تو دو کبیسہ سالوں کا خیال رکھا، اور نہ ہجرت اور سنہ ہجری کے فرق کا لحاظ کیا، اور سنہ ہجرت کے اکترویں مہینہ یعنی ذی قعدہ ۶ھ کی جگہ جمادی الاولیٰ ۷ھ بیان کر دیا،

واقدی نے یہ نہیں بیان کیا ہے کہ خسرو پرویز کے اپنے بیٹے کے ہاتھوں مارے جانے کی تاریخ انھیں کس ماخذ سے معلوم ہوئی، اگر اس تاریخ کے متعلق یونانی مورخ کا بیان (خود قیصر ہرقل کے خط کی بنا پر) صحیح مانا جائے تو یہ واقعہ ۲۷ فروری ۶۲۸ء (مطابق وسط رمضان ۶ھ م وسط ذی قعدہ ۶ھ ملی) ہوا ہوگا، اور یہ روایت قطعاً رد کر دینی پڑے گی، کہ کسریٰ کے حکم سے جب یمن سے دو ایرانی افسر مدینہ آئے تو جناب رسالت مآب صلعم نے ان سے فرمایا کہ آج رات میرے رب نے تمھارے رب کو قتل کر دیا" اور یہ کہ اس پیشینگوئی یا غیب گوئی کے صحیح ثابت ہونے پر گورنر یمن مع حوالی موالی مسلمان ہو گئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی اپنی عظمت کی برقراری کے لئے ایسے کسی معجزہ کی محتاج نہیں، خاص کر جب کہ اس معجزہ کا حال کچھ بہت زیادہ مستند ذرائع سے بھی معلوم نہیں ہوتا ہے، اور اس کے متعلق خود عرب مؤلف متضاد باتیں بیان کرتے ہیں حتیٰ کہ اگر واقدی کی روایت کہ یہ قتل ۱۰ جمادی الاولیٰ کو ہوا، صحیح بھی مانی جائے تو متعدد علمی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں، اور پرویز کے قتل کی جو تاریخ ایرانی اور رومی ذرائع سے متعین ہے، اسے نظر انداز کرنا آسان نہیں ہے،

اسی لئے طبری کی روایت کہ کسریٰ کے قتل کی اطلاع حدیبیہ کے دن آئی، اصل مین اس روایت کی بگڑی ہوئی شکل ہی، جو ابو نعیم نے بیان کی ہے، کہ نینوا کی شکست کی خبر حدیبیہ[۱] کے دن آئی، اور اس مین کوئی امر مانع نہین معلوم ہوتا، کیونکہ یہ حدیبیہ سے مہینہ بھر پہلے کا واقعہ تھا، اور اس عرصہ مین ایران کی خبر اس زمانہ مین مکہ تک آسکتی تھی،

مجھے اپنے ان اخذ کردہ نتائج پر اصرار نہین ہی، اور اگر کوئی اہلِ علم ان کی اصلاح کر سکین اور گتھیون کو سلجھا سکین تو سیرۃ نبویہ کی ایک الجھن رفع ہو سکے گی، وَاللہ الہادی إلی الصّواب و ہُو الموفق والیہ المآب،

تتمہ | جیسا کہ عرض کیا گیا جناب رسالتمآب صلعم نے "کسریٰ عظیم الفرس" کے نام خط روانہ فرمایا تھا، ابو ہلال عسکری کی روایت کہ خط مین "کسریٰ ابرویز" لکھا ہوا تھا، ممکن ہی کہ صحیح ہو، اور باوجود پرویز کے قتل ہو چکنے کے اس کی اطلاع اس وقت تک مدینہ منورہ نہ آئی ہو، لیکن پرویز کے قتل کے بعد مداین مین جو شاہ گردی شروع ہوئی، اس کے باعث یہ نہین معلوم کہ وہ نامۂ مبارک دراصل کس نے وصول کیا، بہر حال ایران کی پریشان صورتِ حال کے باعث جناب رسالتمآب صلعم نے براہ راست ایرانی مقبوضاتِ عرب کے افسرون سے مخاطبت شروع فرمائی، چونکہ ان مٹھی بھر ایرانیون کو اب مداین سے کسی کمک اور مدد کی توقع نہ رہی تھی، جیسا کہ طبری نے تاریخ صفحہ ۱۹۹۰ مین بیان کیا ہی کہ کم از کم یمن مین ایک وطنیت پسند تحریک زور و شور سے اٹھ چکی تھی، کہ مداخلت کنندہ ایرانی غیر ملکیون کو نکال باہر کیا جائے، اس لئے علاوہ اور اسباب کے کوئی تعجب نہین کہ اپنی جان و مال کے اس خطرہ کو دیکھکر ان ایرانیون نے اسلام قبول کرنے اور حکمرانِ عرب صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت حاصل کرنے کی جانب ترغیب پائی ہو، اور ہم دیکھتے ہین، کہ یمن، عمان، بحرین وغیرہ کے ایرانی مقبوضات دیکھتے کے دیکھتے

[۱] گو ابو نعیم کے ظاہری الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہی کہ نینوا کی شکست ہی حدیبیہ کے دن ہوئی،

مداین سے ٹوٹ کر مدینہ سے جڑ گئے تھے، اور آنحضرت صلعم کی سیاست خارجہ کچھ اتنی کامیاب ہوئی تھی، کہ مابقی علاقون کے لئے مداین کو فکر ہونے لگی، چنانچہ چند ہی دنون بعد جب قسمت نے پوران دخت کو تخت کیانی پر پہنچایا، تو اس نے جناب رسالت مآب صلعم کے پاس تحفے تحائف بھیج کر دوستی کی طرح ڈالنی چاہی (جیسا کہ تاریخ طبری ص ۳۱۶۳ مین صراحت سے اور ترمذی شریف جلد نمبر ۲ ص ۲۹۶ باب قبول الہدایا مین بلا صراحت نام اس کا ذکر ملتا ہے)

ضمیمہ | نسی کے متعلق عرب مولفون مین سے البیرونی وغیرہ بعض یہ بیان کرتے ہین، کہ یہ سال قمری کو سال کبیسہ بنانے کا نام ہے، تو بعض مولف یہ بیان کرتے ہین کہ یہ اشہر حرم کی طوالت سے گھبرا کر غیر حرام مہینہ بیچ مین شامل کیا جانے کا نام تھا تا کہ اس زمانہ مین لوٹ مار کیجا سکے، غور کرنے پر یہ معلوم ہوتا ہی، کہ "نسی" کی حرمت کے کئی سو سال بعد جب خالص قمری سنہ مین پلے ہوے بعض عرب مؤلف اس کو سمجھ نہ سکے، اور جس طرح قمری و شمسی سال مین سالانہ دس دن کا فرق قدیم زمانہ مین عام بدویون کی سمجھ مین نہ آتا تھا، اور وہ قلمس کی کبیسہ گری کو محض یہ سمجھتے تھے، کہ مسلسل تین حرام مہینون کی دل برداشتہ کرنے والی طوالت کو توڑنے کے لئے ایک غیر حرام مہینہ لایا گیا ہی، بالکل اسی طرح انہی بدویون کی اولاد اور ان کی کہاوتون اور روایتون کے حامل مسلمان علما، بعد کو زیادہ غور کئے بغیر بدویون کی روایتون کو اسلامی ادبیات مین شامل کرنے لگے، نسی کے متعلق سویڈن کے پروفیسر نوبرگ (Nyberg .) نے جرمن زبان مین ۱۹۳۱ء مین جو مقالہ لکھا ہی، وہ چاہے نتائج کے لحاظ سے غیر تشفی بخش ہو، لیکن مواد اور حوالون کے اعتبار سے بہت مفید ہے، اسی کا خلاصہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام مین بھی دیا گیا ہے،

قصص الحق

داستانِ کلیمؑ

از

پروفیسر سید نواب علی صاحب سابق وزیر تعلیم جوناگڈھ

ہنود کی طرح مصریون کے بھی بے شمار دیوتا اور دیویان تھین جن کے بت مندرون مین پوجے جاتے تھے، ان کا بڑا دیوتا امن تھا جس کا چہرہ کبھی بشکل ایک ریشائل انسان کے اور کبھی مینڈھے کی طرح جس کے دو سینگ کانون کی طرف جھکے ہوئے نقش کیا جاتا تھا، اور پیچھے ایک دم لٹکتی ہوتی تھی، سر پر لمبی کلاہ دو گوشہ سرخ سبز اور نیلے رنگ کی پیشانی کے دونون جانب بدر کامل اور آفتاب، اس دیوتا کا عظیم الشان مندر دار السلطنت تھیبس مین تھا، اور ملک بھر مین بڑا متبرک مانا جاتا تھا، اور ہر فرعون وہان نذر و نیاز چڑھایا کرتا تھا، اس مندر کا سردار کاہن نہایت مقتدا اور متمول ہوتا تھا، اور عموماً وزیر سلطنت سیاہ و سفید کا مالک اور محکمۂ تعمیرات کا افسر اعلیٰ ہوتا تھا، اراضی ملک کا ۱/۶ حصہ اس کے قبضہ مین بطور جاگیر رہتا تھا، اور ذاتی مسلح فوج رکھنے کا اختیار رکھتا تھا تخت نشینی کے جھگڑون مین جس فریق کا طرفدار سردار کاہن ہوتا تھا، وہی فرعون بن بیٹھتا تھا،

فراعنہ مین پہلا موحد

پندرھوین صدی قبل مسیح مین امینوتپ سوم بڑے شان و شکوہ کا فرعون گذرا ہے اس کے عہد مین دولتِ مصر دنیا کی سب سے بڑی سلطنت شمار ہوتی تھی، اس کے عہد کے تعمیرات اور صنعتیں اعلیٰ صناعی اور نقاشی کے نمونہ تھے، اس کا میرِ عمارت اپنے زمانے کا مشہور ساحر سمجھا جاتا تھا

اس نے تھیبس کے مغربی میدان مین فرعون کے دو بڑے مجسمے ایسی صنعت سے بنائے تھے، کہ طلوعِ آفتاب کے وقت ان کے جوف سے آوازین نکلتی تھیں، (سامری نے حضرت موسیٰؑ کے زمانہ مین سونے کا بچھڑا اسی صنعت سے بنایا تھا) اس فرعون نے ۴۰ برس حکومت کی تخت نشینی کے بیسوین سال اس کے ایک لڑکا پیدا ہوا، جو باپ کی وفات کے بعد امینوتپ چہارم کے لقب سے جانشین ہوا، اس نے حکیمانہ دماغ پایا تھا، اور مزاج مین بڑی نفاست تھی، ابتدا ہی سے اسکو بت پرستی سے نفرت تھی، اور وزیرِ اعظم سردار کاہن کے مذہبی تشدد اور امورِ مملکت میں دخل اندازی کو پسند نہین کرتا تھا، سردار کاہن نے بادشاہ کا یہ رنگ دیکھکر عوام کے مذہبی جوش کو بھڑکا کر اپنی قوت بڑھانا چاہی، مگر فرعون کی ہیبت دلون مین بیٹھی ہوئی تھی، کچھ نہ ہوسکا تب فرعون نے کھلم کھلا اپنے عقائد کا اظہار شروع کیا، اور امن کے مندر کی معافیان ضبط کرلین، اور بتون کی پوجا کی ممانعت ہونے لگی، پھر اس نے اپنا پایہ تخت تھیبس سے بدل کر تین سو میل جانب جنوب البتان مین قائم کیا، اور ایک نیا عالیشان معبد بنایا، جس مین نہ اصنام تھے، نہ تماثیل، صاف ستھرا مکان جانب مشرق خوشبودار پھولون سے آراستہ، عبادت کے وقت اتون یعنی نور الانوار کا ذکر ہوتا تھا، جس کا مظہر آفتاب اور جس کی شعاعین مبدأ حیات تھین، اسکی تعلیم تھی، کہ اتون جو خدائے واحد ہے حسنِ کامل ہی، اس تک رسائی حسنِ کلام اور حسنِ عمل سے ہوتی ہی روحِ انسانی اسکے نور کی ایک شعاع ہے، اسلئے کشت وخون اور جنگ وجدال سے گریز چاہئے، اور صلح اور آشتی سے زندگی بسر کرنا چاہئے، اس حکیمانہ تعلیم کے ساتھ فرعون نے اپنا لقب امینوتپ بدل کر اخنیتون رکھا، اور حکم دیا کہ ممالک محروسہ مین اس نئے دین کی تبلیغ کیجائے، چنانچہ مصر اور شام مین نئے عبادت خانے تعمیر ہوئے، اخنیتون نہ صرف حکیم موحد تھا، بلکہ شاعر بھی تھا، اس کی ایک مناجات گذشتہ صدی مین دستیاب ہوئی ہے، کہتا ہی:

"تیری صنعتین جو ہماری نظرون سے غائب ہین، شمار نہین ہوسکتین، اے خدائے واحد تیری

قدرتین کسی اور مین کب ہین، تونے عالم کو اپنی مرضی کے مطابق بنایا، ایسی حالت مین جب کہ تو یگانہ تھا، کائنات تیرے ید قدرت مین ہے، تیرے ظہور سے زندگی ہے، اور تیری غیبت سے موت، تجھی سے انسان کی زندگی ہے، اور اس کی آنکھین تیرے ہی حسن کی نگران ہین، تونے ہی صورت حسین کھینچی ہے، اور ہان تو ہی میرے قلب میں جلوہ گر ہے"

آخر کے مضمون کو اردو کے ایک شاعر نے خوب ادا کیا ہے،

دیر و حرم کا جب کہ جہان مین نشان نہ تھا عاشق کے دل سوا کوئی اسکا مکان نہ تھا

اخینتون کا انتقال جوانی مین ہوگیا، اسکی کوئی اولاد نرینہ نہ تھی، جانشین نااہل نکلے، اور ایک ہی قرن کے اندر اس خاندان کا خاتمہ ہوگیا، امن دیوتا کے کاہنون کی پھر بن آئی، انھون نے اپنے ڈھب کے فراعنہ جو انیسوین خاندان رعمیس کے نام سے مشہور ہین، تخت پر بٹھائے، اور ظلم و استبداد کا زور وشور سے عمل شروع ہوا، اخینتون کے متبعین اور ہم نوا پر آفت آگئی، بہت سے مارے گئے، اور اکثرون نے اپنا ایمان چھپایا، نبی اسرائیل بھی جو قوم ہکساس کے اخراج کے بعد سے مورد ظلم وستم تھے، اب بے طرح ستائے جانے لگے، آخر ان مظلومون کی نالہ نیم شبی اور آہ سحر نے عرش الٰہی کو ہلا دیا، اور خدا کے کلیم کا بشکل موسیٰ ظہور ہوا،

توریت کتاب خروج مین لکھا ہے کہ نبی اسرائیل جنھیں حضرت یوسف نے مصر مین آباد کیا تھا، ۴۳۰ برس کے بعد وہان سے حضرت موسیٰ کے ہمراہ غرق فرعون کے بعد نکل گئے، اس وقت حضرت موسیٰ کی عمر اسّی سے متجاوز ہو چکی تھی، اس حساب سے آپ کی پیدایش کا زمانہ چودہ سو برس قبل مسیح تھا، اور وہ دور فرعون ستی اول کا تھا جس نے بیس سال تک حکومت کی، اسکی وفات کے بعد اس کا نابالغ بیٹا رعمیس دوم تھیبس کے دار السلطنت مین تخت نشین ہوا، اور ۶۷ برس تک حکومت

کی اور یہی حضرت موسیٰؑ کا فرعون تھا،

قرآن مجید مین حضرت موسیٰؑ کا قصہ سب سے زیادہ متعدد سورتون مین بار بار مذکور ہے، اور واقعات تقریبًا وہی ہین، جو توریت کتاب خروج، اعداد اور مثنی مین درج ہین، لیکن چند ایسے واقعات بھی سورہ المومن، سورہ الکہف اور سورہ یونس مین مذکور ہین جس کا ذکر کتب یہود و نصاری مین نہین ہے، لیکن ان کی تصدیق گذشتہ صدی مین مصر کے آثار قدیمہ کے انکشاف سے اب ہوتی ہی، ان واقعات کو ہم ذیل مین درج کرتے ہین،

اول، آل فرعون کا ایک مرد مومن،

حق تعالیٰ سورۂ المومن مین ارشاد فرماتا ہے،

وَقَالَ رَجُلٌ مِن آلِ فِرعَونَ یکتم	کہا ایک آدمی نے آل فرعون مین سے جو
ایمَانَہٗ اَتَقتُلُونَ رَجُلًا اَنْ	چھپائے ہوئے تھا اپنے ایمان کو کیا تم
یقول رَبِّیَ اللہ وقَدْ جَاءَکُم	قتل کرتے ہو ایسے آدمی کو جو کہتا ہی کہ
بالبیّنٰتِ مِنْ رَبِّکُم،	میرا رب اللہ ہی اور وہ آیا تمھارے پاس
(المومن)	تمھارے رب کی دلیلون کے ساتھ،

فرعون نے جب حضرت موسیٰؑ سے بنی اسرائیل کی آزادی کا مطالبۂ الٰہی سُنا تو برہم ہو کر حضرت کو قتل کرنا چاہا، لیکن آل فرعون کے ایک مرد مومن نے جو اپنا ایمان چھپائے ہوے تھا، مانع ہوا، اور فرعون کو سمجھانے لگا، کہ وہ اپنے قصد سے باز آئے، اس مرد مومن کا ذکر توراۃ مین نہین ہی، ہمارے مفسرین نے قیاس آرائی کی، مگر کوئی ثبوت نہ تھا، اب جب کہ فرعون اختین آتون کے حالات کا جن کو ہم اوپر لکھ چکے ہین، آثار قدیمہ سے انکشاف ہوا تو دیکھو کہ قرآن کی معجز بیانی کی کیسی تصدیق ہوتی ہی، خاندان عمیس آمن دیوتا کے کاہنون کی حمایت سے تخت نشین ہوا تھا، فرعون اختین

اُون کے متبعین جو موحد تھے، نئی حکومت کے خوف سے اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھے، انہی مین سے آلِ فرعون کا یہ مردِ مومن بھی تھا، جسے حضرت موسیٰؑ کے بے خوف و خطر اعلانِ حق سے اتنی جرأت ہوئی کہ متکبر فرعون کو سمجھانا شروع کیا، اور یون کہنے لگا،

وَيٰقَوْمِ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ يَوْمَ	اور اے میری قوم مین ڈرتا ہون تمھارے لئے
التَّنَادِ يَوْمَ تُوَلُّوْنَ مُدْبِرِيْنَ	پکارنے کے دن سے جب کہ تم پھر جاؤ گے پیٹھ
مَا لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ	پھیر کر اور نہین ہوگا تمھارے لئے اللہ سے کوئی بچانیوالا
مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ	اور جس کو اللہ گمراہ کرے نہین ہے اس کیلئے

کوئی راہ دکھانے والا،

ان آیات مین ایک خاص واقعہ کی طرف اشارہ ہے، آلِ رعمیس کی تخت نشینی کے بعد مغربی ایشیا کے مفتوح ممالک نے بغاوت کی اور متحدہ قوت سے مقابلہ پر آمادہ ہوئے، موسوی فرعون رعمیس دوم ایک تیار فوج لیکر ان پر حملہ آور ہوا، مگر میدانِ جنگ مین اسکی فوج کا ایک بڑا حصہ شکست کھا کر بھاگا، اتحادیون نے مصری کیمپ کو لوٹنا شروع کیا، یہ دیکھکر فرعون اپنی بقیہ فوج کو یکجا کرکے بادل کی طرح گرجتا ہوا بڑی دلیری سے ان پر ٹوٹ پڑا، اور دشمنون کو مارتا کاٹتا ہوا دریائے ارنٹو کی طرف ڈھکیل دیا، جہان ان کی کثیر تعداد دریا مین غرق ہوگئی، اس فتح کی یادگار مین فرعون نے ایک بڑا مندر رعمیم شہر تھیبس مین بنوایا، اور دیوارون پر اس جنگ کا نقشہ کھنچوایا، فرعون ایک قوی ہیکل دیوتا کی طرح کھڑا ہے، ہاتھ مین بھاری کمان ہے جس سے وہ اپنے دشمنون کے جم غفیر پر جنکو بہت ہی پست قد دکھایا ہے، تیرون کی بوچھار کر رہا ہے، وہ بھاگ رہے ہین، اور دریا مین ڈوبتے ہوئے ایک دوسرے کو مدد کے لئے بلا رہے ہین،

اس ہیبتناک منظر کو یاد دلاتے ہوئے آلِ فرعون کا وہ مردِ مومن قوم سے کہتا ہے کہ فرعون

کی زیادتیون کا کہین وہی نتیجہ نہ نکلے جس کی تصویر اوس نے نقش کرائی ہے، یٰقومِ انی اخاف علیکم یوم التناد کے یہ معنی ہین جواب حل ہوے ہین، یہان یہ بلیغ انداز بیان بھی ملحوظ رہے کہ وہ مرد مومن متکبر فرعون کو براہ راست مخاطب نہین کرتا ہی کہ کہین اس کے غصہ اور ضد کی آگ بھڑک نہ اُٹھے، بلکہ ایک مختصر اور موثر تقریر مین قوم سے خطاب کرتا ہی، مردانِ خدا کی نگاہ کتنی تیز ہوتی ہی، وہ مستقبل کی تصویر حال کے آئینہ مین دیکھتے ہین!

دوم، قصۂ مجمع البحرین،

واذ قال موسٰی لفتٰہ لا ابرح	اور جب کہا موسیٰ نے اپنے جوانوں سے کہ
حتی ابلغ مجمع البحرین او	نہین ٹلون گا مین یہانتک کہ پہنچون مین
امضی حقبا (کہف ع ۹)	دو دریاؤن کے ملنے کی جگہ یا اسی طرح برسون

ان آیات مین جس واقعہ کا ذکر ہے، وہ تفاسیر و احادیث مین قصۂ خضر و موسیٰ کے نام سے مشہور ہے، جو غرق فرعون کے بعد جب بنی اسرائیل بیابانِ تیہ مین سرگردان تھے، حضرت موسیٰ کو پیش آیا ہی، کہا جاتا ہی کہ آپ ایک دن وعظ فرماتے ہین جس سے مجمع نہایت متاثر ہوتا ہی اور حیرت سے پوچھتا ہے کہ کیا آپ سے بھی بڑھکر کوئی اور عالم ہے، آپ نفی مین جواب دیتے ہین، وحی آتی ہے کہ میرا ایک بندہ مجمع البحرین پر ہے، جو تجھ سے زیادہ عالم ہے، آپ شوق علم مین نکل پڑتے ہین، اور اس بزرگ سے جو خضر ہین، استفادہ فرماتے ہین، یہان یہ یاد رہے کہ جس زمانہ کا یہ قصہ بیان کیا جاتا ہے، اس وقت آپ کی عمر سو سے زائد متجاوز ہو چکی تھی، آپ رسول اولوالعزم ہو چکے تھے، اور کوہ طور پر احکام مل چکے تھے!

احادیث کے سلسلۂ رواۃ پر اگر غور کیا جائے، تو صاف نظر آتا ہے کہ یہ قصہ از قبیل اسرائیلیات ہے، روایات سے تھوڑی دیر خالی الذہن ہو کر اگر آیات قرآنی کا مطالعہ آثار قدیمہ کے انکشافات

اور جغرافیہ وتاریخ کی روشنی مین کیا جائے، تو معلوم ہوتا ہے، کہ واقعہ کی صورت ہی کچھ اور تھی،
حضرت موسیٰؑ کو فرعون کی ملکہ نے جو مومنہ تھی، اولاد کی طرح پرورش کیا تھا، آپ کی تعلیم و تربیت مدینۃ الشمس (ہیلو پولس) میں ہوئی، جو اسی زمانہ مین جب کہ نہ حکماے یونان تھے، نہ زرتشت نہ گوتم ایک مشہور یونیورسٹی تھی، جہان علوم و فنون کے ماہر جو عموماً کاہن ہوتے تھے، تعلیم دیتے تھے، انجیل اعمال حوارین باب ۷ مین لکھا ہو، کہ حضرت موسیٰؑ نے مصریون کے تمام علوم کی تعلیم پائی تھی، اور کلام اور کام مین قوت والے تھے" جوانی مین آپ کو فرعون نے حبشیون کے ملک ایتھوپیا کی طرف بھیجا تھا جہان آپ نے باغیون کو زیر کیا، اور وہین قرابت بھی کر لی، اس ملک کی سرحد سوڈان سے ملی ہوئی ہے جہان دریاے نیل کی دو شاخین جو بحر ابیض اور بحر اسود کے نام سے مشہور ہین، بمقام خرطوم ملجاتی ہین (جیسے گنگا اور جمنا الہ آباد مین) یہی وہ مقام ہو جس کو قرآن مین مجمع البحرین کہا گیا ہے، اسکی تصدیق اوامضی حقبا سے بھی ہوتی ہے، اگر مجمع البحرین سے جانب جنوب دریاے نیل کے منبع کی طرف بڑھین تو سیکڑون کوس تک برسون انسان چلتا رہے، اور راستہ ختم نہ ہو،

ہم اوپر لکھ چکے ہین، کہ فرعون اخین اتون نے اپنا دار السلطنت تھیبس سے جانب جنوب تین سو میل قائم کیا تھا، اور جا بجا نئے معبد بنوائے تھے، جو عموماً دریا کے کنارے پر فضا مقامات مین ہوتے تھے، ان معبدون مین اس کے عہد کے موحدین مشغول عبادت رہتے تھے، (جیسے آنحضرت صلعم کی بعثت سے پہلے عرب مین ورقہ بن نوفل، زید بن عمرو بن نفیل قس بن ساعدہ وغیرہ وغیرہ تھے) ان موحدین مین وہ بزرگ بھی شامل ہین، جو حضرت موسیٰؑ کو ملے، اور جن کے متعلق قرآن مین و عَلمناہُ مِن لدنا علماً وارد ہوا ہے، اور حضرت موسیٰؑ بعثت سے پیشتر عالم جوانی مین جو تحصیل علم کا زمانہ ہو، ان بزرگ سے ملاقی اور مستفید ہوئے، حضرت موسیٰؑ اس وقت جلد مشتعل ہو جانیوالے قوی پنجہ جوان تھے، مشیتِ الٰہی یہ تھی، کہ قبل اس کے کہ آپ فرعون اور اس کے جنود کے سامنے

جنگِ آزادی کے لئے بغیر ایک قطرۂ خون بہائے ہوئے کھڑے ہوں، دینی مصلحت بینی سیکھیں، اور جلد باز نہ ہوں، ساتھ ہی غور و تامل صبر و تحمل اور کتمانِ راز کا سبق سیکھیں، کشتی کا توڑنا، لڑکے کا قتل، اور دیوار کا بغیر اجرت لئے بنا دینا وہ نظارہ تھا جو مذکورۂ بالا صفات حاصل کرنے کے لئے عملی تعلیم تھی۔

خضر کا اگرچہ احادیث میں نام آیا ہے، اور حضرات صوفیہ کا اُن سے فیض حاصل کرنا بھی مذکور ہے، نظامی سکندرنامہ میں "مرا خضر تعلیم گر بود دوش" فرما گئے ہیں لیکن قرآن میں خضر کا نام نہیں ہے، حضرت موسیٰؑ والے بزرگ کا نام جو بھی ہو وہ عارف موحد تھے، اور علم لدُنی سے فیضیاب تھے، اکثر علماء اور حضرات صوفیہ قائل ہیں کہ خضر اب تک زندہ ہیں لیکن اکثر محدثین خصوصاً بخاریؒ اس کے منکر ہیں، جن کی تائید میں حافظ ابن کثیر نے دو عمدہ دلیلیں پیش کی ہیں، اوّل نص قرآنی وَمَا جعلنٰھُمْ جَسَدًا لَّا یَاْکلُونَ الطعامَ وَمَا کانوا خالدین، دوم حدیثِ نبوی کہ اگر موسیٰ اور عیسیٰ (زمین پر) زندہ ہوتے تو ان کو میری متابعت کے سوا چارہ نہ تھا، اب اگر خضر عہدِ رسالت میں زندہ تھے، تو حاضر ہو کر زمرۂ اصحاب میں شامل ہوتے، حضرات صوفیہ کا کسبِ فیض ہمارے نزدیک یوں ہے، کہ عالم روحانیات میں غیب و شہادت کے مجمع البحرین پر مستفید ہوئے ہوں، اور یہ کچھ بعید نہیں ہے،

اے کہ انکار کنی عالمِ درویشاں را ... تو چہ دانی کہ چہ سوداو سراست ایشاں را

ارض القرآن حصّہ دوم

بنو امیّہ کے عہد مین نثر کا سرمایہ[1]

از

ازجناب مسعود حسن صاحب شمسی متعلم ام اے کلکتہ یونیورسٹی

"یہ مضمون بہت تشنہ ہی، اموی عہد کا نثری سرمایہ اس سے کہین زیادہ ہی، جتنا لائق مضمون نگار نے دکھایا ہی، خصوصاً حدیث کے بہت سے مجموعے اس عہد مین مرتب کئے گئے، تاریخ کے علاوہ فقہ اور نحو پر کتابین لکھی گئین، لیکن انگریزی زبان کے ایک نوجوان طالب علم کی عربی علم ادب سے یہ دلچسپی قابلِ قدر ہے، اسلئے اسکو شائع کیا جاتا ہے، "م"

عربی ادب کی تاریخ سے جن لوگون کو تعلق رہا ہے وہ جانتے ہین کہ قدیم عربون نے نثر نگاری کی طرف کوئی خاص توجہ نہین کی حقیقت یہ ہی کہ عرب جیسے ملک مین جہان کے باشندے باستثنائے چند نہ لکھ سکتے تھے، اور نہ پڑھ سکتے تھے، نثر کے علمی و ادبی اغراض مین استعمال کا موقع ہی نہ تھا، یہ بھی ہو سکتا ہے، کہ ریگستان کے یہ غیور باشندے نظم کے سوا کسی اور صنفِ ادب کو اظہارِ جذبات کے لئے استعمال کرنا اپنی توہین سمجھتے ہون، اسی بنا پر عربی زبان مین نثر کی پہلی کتاب قرآن مجید قرار دیگئی ہی، قرآن مجید سے پہلے نثر نگاری کے کچھ منتشر نمونے ضرور پائے جاتے ہین ، مگر یہ قلیل سرمایہ بھی جو ہم تک پہنچا ہی وہ

[1] اس مقالہ کی تیاری کے لئے مین اپنے استاذ جناب ڈاکٹر زبیر صدیقی ام اے، پی ایچ ڈی، اور جناب ڈاکٹر اختر امام ام اے، پی، ایچ، ڈی، کا مرہون منت ہون جنھون نے نہ صرف مسودہ پر نظر ثانی کرنیکی زحمت گوارا فرمائی، بلکہ بعض قیمتی مشورے بھی عنایت کئے، اصل مضمون انگریزی مین لکھا گیا تھا، مین نے بعد مین اس کا ترجمہ کیا،

تحریری نہین، بلکہ زبانی،

اسلام سے پہلے قصہ گو اور افسانہ خوان عربون کا تذکرہ سننے مین آتا ہے جنھین وہ اپنی زبان مین سامر کہا کرتے تھے، اس سلسلہ مین نضر بن حارث کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، وہ یمن کے قدیم بادشاہون کی کہانیان اور ان کے حالات سنایا کرتا تھا، ان حکایتون اور افسانون کو وہی حیثیت حاصل تھی، جو ہمارے یہان جنون، بھوتون اور پریون کی کہانیون کو حاصل ہے، نثر کا کچھ سرمایہ راویون کے ذریعہ بھی جمع ہوا، جو قصیدہ سناتے وقت اس کی شانِ نزول، اسکی تلمیحات اور اس سے متعلق بے شمار کہانیان سنانا بھی ضروری تصور کرتے تھے، یہ چیزین آج تاریخی، ادبی اور جغرافیائی حیثیت سے ہمارے لئے بڑی اہمیت رکھتی ہین، اس زمانہ مین خطابت کا بھی عام رواج تھا، اور خطیب کو شاعر کے بعد بڑا اقتدار حاصل تھا، زمانۂ جاہلیت کے یہ خطبات اور خصوصاً قس بن ساعدہ اور سحبان بن وائل کے خطبے اگرچہ ان کی تعداد بہت کم ہے، اب تک محفوظ ہین، اس سلسلہ مین ان بیشمار کہاوتون اور ضرب الامثال کا تذکرہ کر دینا بھی ضروری ہے، جو عہد جاہلیت مین رائج تھے، اور جنھین بہت زمانہ کے بعد ابو ہلال عسکری المتوفی ۳۸۲ھ نے جمہرۃ الامثال مین، میدانی المتوفی ۵۱۸ھ نے مجمع الامثال مین اور مفضل ضبی المتوفی ۱۶۸ھ نے کتاب الامثال مین جمع کیا،

جب اسلام نے عربون کی زندگی کے ہر پہلو مین ایک خوشگوار انقلاب پیدا کیا، تو یہ توقع ہوئی کہ نثر کی قسمت بھی جاگے گی، خصوصاً قرآن مجید کے نزول نے جو عربی نثر نگاری، اور ادب و انشاء

---

[1] یہ ایک جاہلی شاعر اور بعض حضرات کے نزدیک حضرت عائشہ صدیقہؓ کا شعر ہے،

كان لم يكن بين الحجون الى الصفا انيس و لم يسمر بمكة سامر

[2] ابن ندیم نے ایک بہت قدیم مجموعے کا تذکرہ کیا ہے، جسے الکلابی نے مرتب کیا تھا، مگر آج اس کا کوئی نسخہ موجود نہین ہے، الکلابی یزید بن معاویہ کے زمانہ مین گذرا ہے،

کا بلند ترین اور فصیح ترین نمونہ ہے، یہ امید کہ بلند پایہ نثر نگارون کی ایک کثیر تعداد پیدا ہو جائیگی اور بھی قوی ہو گئی، مگر بد قسمتی سے خلافت راشدہ کے اختتام سے پہلے کوئی باقاعدہ خدمت انجام نہ پا سکی، اس وقت تک نثر کا سرمایہ چند ہزار حدیثون[1]، کچھ تحریری احکامات اور معاہدات، آنحضرت صلعم اور صحابۂ کرامؓ کی تقریرون، اور آپ کے مختلف خطوط کے سوا کچھ نہ تھا، اسکی وجہ یہ تھی، کہ اس دور مین مسلمانون کی مذہبی سرگرمی نے جو دوسری صدی ہجری مین اپنی پوری طاقت کے ساتھ ظاہر ہوئی عربی نثر کو قومی پیمانہ پر نشو و نما پانے کا موقع نہین دیا، دوسرے ان دنون علما عام طور پر علم کو سفینون مین جمع کرنے کے بجائے سینون مین محفوظ رکھنا پسند کرتے تھے[2]، مذہبی اور جنگی مصروفیتون کے علاوہ عام سیاسی بے چینی بھی بڑی حد تک اس راہ مین حائل رہی، اگر ایک طرف حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کا عہد حکومت فتنۂ ارتداد اور غیر ملکی فتوحات سے پُر شور رہا، تو دوسری طرف حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کا زمانہ خانہ جنگی سے پُر آشوب رہا، اسلئے عربی نثر کی تاریخ صحیح معنون مین بنی امیہ کے دور حکومت سے شروع ہوتی ہے،

بنو امیہ کی سلطنت جیسا کہ دنیا جانتی ہے، اگر غیر اسلامی نہ تھی، تو خالص اسلامی بھی نہ تھی، اس لئے مذہبی علوم و فنون کو جن مین سے بعض کی بنیاد آنحضرت صلعم کی حیات ہی مین پڑ چکی تھی، حکومت کی سرپرستی نصیب نہ ہو سکی، اس مین شک نہین کہ اس دور مین چند جلیل القدر علما، مثلاً تفسیر مین مجاہد اور ابن عباس، حدیث مین امام زہری، عاصم بن سلیمان اور شعبہ بن حجاج، فقہ میں عبد الرحمن اوزاعی

---

[1] تاریخ ادبیات عرب از نکلسن صفحہ ۲۴ [2] قاضی ابن عبد البر نے جامع بیان العلم مین امام زہری کا یہ قول نقل کیا ہے:-

كنا نكره كتاب العلم حتى اكرهنا عليه — ہم لوگ علم کا قلمبند کرنا پسند نہین کرتے تھے

هؤلاء الامراء، — یہان تک کہ امرا نے ہم کو اس پر مجبور کر دیا،

وغیرہ پیدا ہوئے، مگر ان بزرگون نے جو کچھ کیا، انفرادی طور پر، یہی وجہ ہے کہ یہ بزرگ کوئی بڑا تحریری سرمایہ چھوڑ نہ سکے، اموی دربار مین تاریخ کو بڑا عروج نصیب ہوا، اور یہ اخیر زمانہ تک مقبول بنی رہی، مگر تاریخ سے یہ دلچسپی علم وادب کی خدمت کے جذبہ سے نہ تھی، بلکہ اس کا مقصد یہ تھا، کہ صاحب اقتدار جماعت تخت وتاج کی حفاظت کے لئے ہر طرح کی سیاسی اور ملکی تدبیرون سے واقف رہے، اور یہ صلاحیت صرف تاریخ کی کتابون، اور اگلے فرمانرواؤن کی سیرت کے مطالعہ ہی حاصل ہو سکتی تھی، مسعودی کی روایت کے مطابق خاندان بنی امیہ کے بانی حضرت امیر معاویہؓ کا یہ معمول تھا، کہ وہ روزانہ رات کا ایک ثلث مورخین کی صحبت مین گذارتے، یہ مورخین انھین عرب وعجم کے بادشاہون کے حالات، ان کی سلطنت، ان کی لڑائیون، ان کے طریق حکومت، اور ان کی سیاسی چالون کی تفصیل سنایا کرتے، پھر وہ کچھ دیر آرام فرماتے، اور جب ایک ثلث رات باقی رہ جاتی، تو علماء کی ایک دوسری جماعت آتی،[۵۱] لاطینی اور یونانی کتابین ان کے ساتھ ہوتین، اور وہ دنیا کے بڑے لوگون مثلاً جولیس سیزر، ہنیبال اور سکندر کی سوانحعمریان عربی زبان مین ترجمہ کرکے سناتے، امیر معاویہ رضؓ کو عرب کے قدیم بادشاہون کے حالات سے اس قدر دلچسپی تھی، کہ انھون نے یمن کے ایک عرب عبید بن شریہ کو اپنے دربار مین بلایا، اس سے جنوبی عرب کی روایتون اور افسانون کے متعلق سوالات کئے، اور ان کے جوابات کو ایک جگہ جمع کرکے ایک کتاب تیار کرائی،[۵۲] یہ کتاب جس کا نام کتاب الملوک واخبار الماضین تھا، اور آج دنیا سے ناپید ہے، مسعودی کے زمانہ مین بڑی مقبول تھی،[۵۳] عرب کی قدیم تاریخ سے متعلق بہت سی روایتین جنھیں مسلمان مورخین عام طور پر اپنی کتابون کی ابتداء مین درج کرتے ہین، ایک فارسی النسل یمن کے باشندے وہب بن منبہ المتوفی ۱۱۴ھ سے

---

[۵۱] مروج الذہب، مسعودی [۵۲] الفہرست، ابن ندیم، فلوگل ایڈیشن ص ۸۹ [۵۳] مسعودی جلد ۴ ص ۸۹ کئی سال ہوئے وہب بن منبہ کی ایک کتاب التیجان فی ملوک حمیر اور عبید کی اخبار عبید یکجا حیدرآباد سے شائع ہوگئین،

منقول ہیں، ابن ندیم[۱] نے ابو مخنف لوط بن یحییٰ ازدی کے متعلق لکھا ہے کہ انھوں نے مختلف موضوع پر متعدد کتابیں لکھیں، وہ حضرت علیؓ کے طرفدار تھے، ان کی تصنیف "ذکر مقتل سیدنا و مولنا الحسین بن علیؓ" جسے کئی سال ہوئے ولہاسن نے اپنے اہتمام سے شائع کیا، شہادتِ کربلا پر معتبر کتاب سمجھی جاتی ہے، عوانہ بن الحکم الکلبی بھی اسی زمانہ کے مشہور اہلِ قلم ہیں، انھوں نے ابن ندیم کے بیان کے مطابق دو کتابیں تصنیف کیں، ایک کا موضوع عام تاریخ، اور دوسرے کا حضرت امیر معاویہؓ کے حالاتِ زندگی، اور بنی امیہ کی تاریخ تھی، علم الانساب اگرچہ درحقیقت اسی کی شاخ ہے لیکن عربوں نے ہمیشہ اسے ایک علٰحدہ اور مستقل فن تصور کیا، سب سے پہلا شخص جس نے اس فن پر کتاب لکھی وہ زیاد بن ابیہ ہے، جسے امیر معاویہؓ نے اپنا سوتیلا بھائی بنا کر اپنے طرفداروں میں شامل کر لیا تھا، کہا جاتا ہے، کہ اس نے اپنے نسب نامہ پر ایک رسالہ لکھا تھا، کیا عجب ہے کہ اس میں اوس نے اپنی پیدائش کے متعلق جو خبریں مشہور تھیں، ان کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی ہو[۲]، اس دور کے اور دوسرے ماہر انساب دغفل، حجر بن حارث اور رسان الحمرہ ہیں لیکن ان لوگوں کے حالاتِ زندگی اور ان کی تصانیف کا کسی جگہ پتہ نہیں چلتا،

ان کے علوم کے علاوہ دوسرے دینی و دنیوی علوم کی طرف یک قلم عدم توجہی نہیں برتی گئی، امیر معاویہؓ کے بعد عبد الملک بن مروان نے جو ۶۵ھ میں تخت نشین ہوا، مختلف اسلامی موضوع پر علماء سے کتابیں لکھوائیں، سعید بن جبیر نے اسی کی تحریک پر قرآن مجید کی تفسیر لکھی، چنانچہ عطاء بن دینار کے نام سے جو تفسیر عام طور پر مشہور ہے، وہ دراصل ان ہی کی تصنیف ہے[۳]، حضرت عمر بن عبد العزیز کے متعلق ایک عام غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے، کہ ان کا زمانہ علم و ادب کے لئے ناخوشگوار رہا، یہ صحیح ہے، کہ ان کے دربار میں مبتذل شاعری کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی، لیکن اس حقیقت سے کون انکار

[۱] ایضاً ملاحظہ فرمائیے فوات الوفیات از کتبی جلد ۲ صفحہ ۱۴۰ [۲] الفہرست، ابن ندیم، فلوگل ایڈیشن صفحہ ۹۰ [۳] میزان الاعتدال للذہبی ترجمہ عطاء بن دینار،

کر سکتا ہے، کہ انھوں نے تمام ممالک میں حدیث و سنن کے جمع کرنے اور ترتیب دینے کا حکم بھیجا، چنانچہ سعد ابن ابراہیم نے جو بہت بڑے محدث اور مدینہ منورہ کے قاضی تھے، دفتر لکھ کر تمام ممالک میں بھیجے، ابوبکر بن محمد انصاری کو جو بڑے پایہ کے محدث اور امام زہری کے استاد تھے، حدیثوں کے جمع کرنے کا خاص شوق تھا[1] حضرت عائشہؓ کی اکثر روایتیں فقہ اور عقائد کے اہم مسائل سے تعلق رکھتی ہیں، اس لئے حضرت عمر بن عبد العزیز نے ان کو خاص طور پر جمع کرنے کا اہتمام کیا، عمرہ بنت عبد الرحمن ایک بہت بڑی محدثہ اور عالمہ تھیں، اور چونکہ حضرت عائشہؓ کی آغوش تربیت میں پلی تھیں، اس لئے ان کی مرویات کا ان سے بڑھ کر کوئی عالم نہ تھا، انھوں نے ابوبکر بن محمد کو عمرہ کے پاس بھیجا کہ حضرت عائشہؓ کی تمام روایتوں کو ان سے لیکر قلمبند کریں،[2]

امام زہری سے پہلے فن مغازی کی طرف جس نے بعد میں ترقی پاکر آنحضرت صلعم کے سوانح حیات کی شکل اختیار کی، اس قدر توجہ نہیں کی گئی، جس کا وہ محتاج تھا، اب تک اس سلسلہ میں جو کچھ کیا گیا، وہ یہ تھا کہ غزوات نبوی کے خاص حلقے قائم کئے گئے، جن میں اس فن کے علماء طلبہ اور عوام کے سامنے تقریریں کیا کرتے تھے، چنانچہ عمرو بن قتادہ انصاری المتوفی سنہ ۱۲۱ھ کے متعلق یہ تصریح موجود ہے، کہ وہ دمشق کی جامع مسجد میں لوگوں کو مغازی اور مناقب کا درس دیا کرتے تھے،[3]

سب سے پہلے جس نے مغازی کے فن کو ترقی دی، اور اسے عام مقبولیت بخشا وہ عہد بنی امیہ کے مشہور محدث محمد بن مسلم بن شہاب زہری ہیں، وہ امام بخاری کے شیخ الشیوخ تھے، فقہ و حدیث میں ان کا کوئی ہمسر نہ تھا، ان کی تصنیف کتاب المغازی جیسا کہ امام سہیلی نے روض الانف میں لکھا ہے، فن مغازی

---

[1] طبقات ابن سعد جلد ۲ [2] تہذیب التہذیب لابن حجر، حدیث اور مغازی کے سلسلہ میں بعض واقعات اور بعض حوالے میں نے علامہ شبلیؒ کی سیرۃ النبی کے مقدمہ سے لئے ہیں، مجھے افسوس ہے کہ ہر جگہ الگ الگ اس کا حوالہ دینا میرے لئے ممکن نہ تھا [3] تہذیب التہذیب لابن حجر،

کی پہلی کتاب تھی، اور غالبًا حضرت عمر بن عبد العزیز کے ایما سے لکھی گئی تھی، امام زہری اس حیثیت سے بھی ممتاز ہین، کہ اموی دربار مین ان کی بڑی قدر و منزلت ہوئی، اور انھون نے عبد الملک کے زمانہ مین قضا کا منصب قبول کیا، ۱۲۴ھ مین آپ کا انتقال ہوگیا، ان کے شاگردون مین کئی ایسے لوگ پیدا ہوے، جنھون نے مغازی کو درجۂ کمال تک پہنچایا، امام زہری کے معاصر عبد الرحمٰن عامری نے فقہ مین ایک بڑی اچھی کتاب "موطا" تصنیف کی، جس کی شرح امام زرقانی نے شرح الموطا کے نام سے کی، اس سلسلہ مین اسد ابن موسی المتوفی ۲۱۹ھ کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہی، جنھون نے زہد و تصوف پر ایک بڑی مفید کتاب کتاب الزہد لکھی، عہد بنی امیہ کے ممتاز نثر نگارون کی فہرست نامکمل رہجائیگی اگر دو اور اہل قلم کا تذکرہ نہ کیا جائے، یہ ابن سیرین اور ان کے شاگرد حضرت حسن بصری ہین، ابن سیرین نے خوابون کی تعبیر کے متعلق ایک بڑی دلچسپ کتاب لکھی، جس کا نام کتاب الجوامع ہے[۵۱]، حسن بصری تصوف کے علمبردار ہین، ان کے چھوٹے چھوٹے خطبے[۵۲] اور ان کے مذہبی اقوال اس زمانہ کی نثر نگاری کے بہترین نمونے ہین، استاد اور شاگرد دونون نے اسی سال یعنی ۱۱۰ھ مین وفات پائی، جو جریر اور فرزدق کی موت کی وجہ سے عربی ادب کے لئے "عام الحزن" کہے جانے کا مستحق ہی،

بنو امیہ کے زمانہ مین علوم عقلیہ کی تحصیل کے لئے جو کوششین کی گئین ان پر نظر ڈالیے، تو خالد بن یزید المتوفی ۸۵ھ کا نام بہت نمایان نظر آتا ہی[۵۳]، خالد کو جب مروان کے مقابلہ مین حکومت کی طرف سے بالکل مایوسی ہوگئی، تو اوس نے اپنی توجہ علم و ادب کی طرف مبذول کی، اسے ہیئت اور کیمیا سے خاص طور پر دلچسپی تھی، اسکندریہ ان دنون علم کیمیا کے لئے بڑا مشہور تھا، چنانچہ اسنے ایک رومی پادری کو جس کا نام مریانوس

---

[۵۱] ابن خلکان و ابن ندیم [۵۲] ابن الجوزی، سیرۃ صفحہ ۶۔۱۲۱، ابن خلکان جلد اول صفحہ ۲۲۸، [۵۳] پروفیسر جولیس رسکا نے اپنے ایک رسالہ مین یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہی کہ خالد نے کیمیا پر کوئی کتاب یا کوئی رسالہ نہین لکھا جو کتابین اس کے نام سے مشہور ہین، وہ قرون وسطیٰ مین لکھی گئی تھین، اور شاہزادے کی طرف بعد مین منسوب کردیگئی تھین

تھا، اور جو وہان مقیم تھا، بلایا، اور اس سے کیمیا کی تعلیم حاصل کی، چند دنون کے بعد اوس نے ایک اور عالم کو جس کا نام اسٹیفن (اسطفان) بتایا جاتا ہے، کیمیا پر متعدد کتابین عربی مین ترجمہ کرنے کا حکم دیا، اوس نے نہ صرف قبطی اور یونانی کتابون کا عربی مین ترجمہ کرایا، بلکہ خود بھی اس موضوع پر چار رسالے لکھے[1] اسی طرح جیسا کہ مصنف الفہرست نے اپنی کتاب مین درج کیا ہے، علم طب پر بہت سی کتابین خصوصاً شامی یہودیون کے قلم سے عربی مین منتقل ہوئین، مگر افسوس ہے، کہ ان مین سے ایک بھی ہم تک نہین پہونچ سکی، ایک شامی طبیب ماسرجویہ یا ماسرجس نے جو بصرہ مین مقیم تھا، اور مروان بن حکم کا ہمعصر تھا، اہرون بن اعیون کی کتاب قانون (کناش) کا جو طب پر لکھی گئی تھی، شامی سے عربی مین ترجمہ کیا[2]

مین نے اگلے صفحات مین جو مختصر نقشہ آپ کے سامنے پیش کیا ہے، وہ بڑی تفصیل اور اضافہ کا محتاج ہے لیکن اس سے یہ بات ضرور واضح ہو جاتی ہے کہ نثر کی بنیاد گو مختصر پیمانہ پر لیکن مضبوط اموی فرمانروا ؤن کے اوائل حکومت ہی مین پڑ چکی تھی، جب آل عباس برسر اقتدار ہوئے، تو ان کے لئے یہ چیز بڑی مفید ثابت ہوئی، اور اسی پر انھون نے ایک شاندار عمارت تیار کی، ابوالفرج اصفہانی کی کتاب الاغانی بدیع الزمان اور حریری کے مقامات، طبری کی تاریخ الرسل والملوک اور مسعودی کی مروج الذہب بلا شبہہ عربی ادب مین نثر کے بے نظیر شاہکار ہین، لیکن یہ ماننا پڑے گا، کہ بنو امیہ کی کوششون کے بغیر اس قدر مختصر مدت مین ایسے شہ پارے اور اتنی کثیر تعداد میں شاید وجود مین نہ آسکتے،

---

[1] چارون رسالون کے نام یہ ہین، :(۱) کتاب الحرارات، (۲) کتاب الصحیفۃ الکبیر (۳) کتاب الصحیفۃ الصغیر (۴) کتاب وصیتہ الی ابنہ فی الصنعۃ، ملاحظہ فرمائیے، الفہرست فلوگل ایڈیشن صفحہ ۳۵۴،

[2] الفہرست ابن ندیم، فلوگل ایڈیشن صفحہ ۲۹۷،

بیدل اور تذکرۂ خوش گو

از

جناب قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹر

(بسلسلۂ مئی ۴۲ء)

سفینۂ خوشگو کی تیسری جلد میں خوشگو کا ترجمہ نہیں لیکن دوسرے شعرا کے تراجم میں ضمناً خوش گو نے اپنے حالات لکھے ہیں، اُس کا وطن متھرا[۱] تھا، سالِ وفات معلوم نہ ہو سکا لیکن قرائن کہتے ہیں کہ گیارھویں صدی کے اواخر یا بارھویں کے اوائل میں پیدا ہوا ہوگا، سرخوش[۲] اور گلشن[۳] کی شاگردی کا اُس نے اقرار کیا ہے، لیکن باوجود اس غیر معمولی عقیدت کے جو اُسے بیدل سے ہے، اُس نے صریح الفاظ میں کہیں یہ نہیں لکھا کہ میں بیدل[۴] کا شاگرد ہوں، اس سے خیال ہوتا ہے کہ وہ باقاعدہ شاگرد نہ تھا، سفینۂ خوشگو کی تیسری جلد جس میں معاصرین کے حالات ہیں، بہت کمیاب ہے، اور ہندوستان کے

۱؎ سفینہ ترجمۂ بے کس، قدرت اللہ شوق نے بندرابن (ضلع متھرا) وطن لکھا ہے ۲؎ "راقم خوشگو اول در عمر چہاردہ سالگی مشقِ خود را بہ نظرِ اصلاحش می گذرانید از روے کمال عنایت تخلص خوشگو عنایت فرمود" "بر فقیر حقوقِ پدرانہ دارد" ترجمۂ سرخوش ۳؎ گلشن کی "بندگی خاص و شاگردی" کا اعتراف کیا ہے، ان کا ترجمہ اس بیت سے شروع ہوتا ہے، ؎

گلشنِ معنی جناب شیخ سعد اللہِ ما   قبلۂ ما، میرِ ما، استادِ ما و شاہِ ما

۴؎ آرزو نے جن سے اصلاح لینے کا خوشگو کو اقرار ہے، مجمع النفائس میں لکھا ہے:۔

"استفادۂ بسیار از بیدل و سرخوش و گلشن نمود، از مدت بست و پنج سال بہ ایں ہیچ مداں ربط کلی بہم رسانیدہ و ایں عاجز ہم در تربیت او بہ تقصیر از خود راضی نہ شود و نیست"

کسی مشہور کتب خانے میں کتبخانۂ مشرقیہ بانکی پور کو چھوڑ کر اس کا کوئی نسخہ نہیں، نسخۂ بانکی پور کی کتابت ۱۱۶۲ھ میں ہوئی ہے، اور غالباً اس کا منقول عنہ کوئی ایسا نسخہ تھا جو میر عبدالولی عزلت کی نظر سے گذر چکا تھا، کاتب نے ان حواشی کو بھی نقل کر لیا ہے جو عزلت نے لکھے تھے، یہ صحیح نہیں کہ سفینۂ خوشگو عشرۂ ششم میں تمام ہوا ہے، اس میں بعض واقعات اس کے بعد کے بھی درج ہیں[1]،

جلد ثالث میں بیدل کے حالات اور ان کی طرف اشارات دوسرے شاعروں کے تراجم میں بھی ملتے ہیں

"مربیان بیدل، اعظم شاہ، نقاد سخن و قدر دانِ این فن، بے[2] دل، راسخ، سالم، شہرت شعرائے درگاہِ او بیند و بارہا بہ صلہ ہائے گراں مند امتیاز یافتہ اند، میاں سرخوش در جنگ نامہ احوالِ او گفتہ و مرزا بیدل صاحب بریں دو بیت صاد کردہ اند:

زشمشیر وہے نہ می داشتے | کہ ابروے معشوق پنداشتے
نہ بود از سیاہیِ فوجش ہراس | کہ کردے خط و خالِ خوبان قیاس"

خوشگو نے تاریخ ذیل اعظم شاہ کے نام لکھی ہے "مرہٹا ہٹا بھاگیا" لیکن اس سے ۱۰۹۱ نکلتا ہے، "مرہٹا" کو ہائے مختفی سے لکھیں تو ۱۰۹۵ برآمد ہوگا، خوشگو کے قول کے مطابق[3] ۱۰۹۴ نکلنا چاہیئے، یہ دو شعر بھی اعظم شاہ کے ہیں،

غمے بس است برائے اجل فضو | نیست سرائے سینۂ ما خانۂ دزد نیست
رہ او نگاہ راز من از ہمہ باب بستہ | روزنِ نظارہ را شب وِ خواب بستہ

عاقل خاں رازی تخلص، عسکری نام تھا، صاحب مثنویات و دیوان، آخر عمر میں صوبہ دار شاہجہان آباد[4]

---

[1] وفاتِ تحقیق عظیم آبادی [2] کہیں خلاصہ اور کہیں اصل الفاظ نقل ہوئے ہیں، تعظیمی الفاظ اکثر نکال دیئے گئے ہیں،

[3] اعظم شاہ کی ایک فارسی تاریخ اعظم جہاد کن، بھی سفینہ میں ہے، اس سے ۱۰۹۴ نکلتا ہے [4] مآثر الامراء میں ہے دبقیہ حاشیہ صفحہ ۴۱)

"خود را یکے از اغواث و اقطاب زمانہ می دانست، حضرت میرزا بیدل از صحبت وے این ہمہ سامان استادی و تصوف بہم رسانید، و ہرگاہ شعر میرزا را احسنت و تحسین می فرمود میرزا برای خاست و تسلیم، بجا می آورد، این معنی از روے حرمت و بزرگی بود نہ از راہ شان امارتش، و وے مرید شیخ برہان شطاری برہان پوری بود، چنانچہ ملفوظات شیخ بزرگوار خود نوشتہ"

سالِ وفات[1] ۱۱۰۸ھ، بیدل[2] نے ایک غزل لکھی ہے جس کے ہر مصرع سے تاریخ وفات نکلتی ہے،

شکر اللہ خاں، خاکسار تخلص، ساداتِ خواف سے تھے اور عاقل خاں رازی کے داماد، صاحبِ دیوان ہیں اور شرح مثنوی مولوی کے مصنف، عالمگیر کے زمانہ میں "گرد شاہجہاں آباد" کے فوجدار تھے، وفات ۱۱۱۲ھ[3]۔ "شکر اللہ خاں، شاکر خاں، کرم اللہ عرف عاقل خاں پسرانش مدتِ مدید بعد پدر خود بودند و خدمت گاری میرزا بیدل صاحب می نمودند"

عاقل خاں، عاشق تخلص، کرم اللہ، خلف شکر اللہ خاں و دختر زادۂ عاقل خاں رازی، بیدل کے صاحب دیوان شاگرد تھے اور ان کے طرز خاص اور انہی کی زبان میں شعر کہتے تھے، "در جمع

(بقیہ حاشیہ صنۂ) کہ دار الانشاہیانِ عالمگیری سے تھا، دوسرے عہدوں پر مامور رہنے کے بعد ۲۲؁ جلوس میں بخشی گری تن تھا، اور سال ۴۲ میں صوبہ دار شاہ جہاں آباد ملی، شاہ برہان الدین راز الہی سے بڑی عقیدت رکھتا تھا، رازی تخلص کی یہی وجہ ہے۔ [1] مآثر الامراء میں ۱۱۱۳ھ ہے لیکن بیدل کے کلیات سے بھی ۱۱۰۸ھ ثابت ہوتا ہے [2] ایک نہیں دو غزلیں ایسی لکھی ہیں، ایک غزل کے بعض مصرعے خوشگو نے بھی نقل کئے ہیں، یہ ہیں،

وائے پیوند سخن بیخاں نماند	تکیہ گاہِ صاحب عرفاں نماند
رفت از آفاق لطفِ عدل و داد	برکتِ دیں قدوۂ انساں نماند
قطبِ اقطاب حقائق باریست	سالکے در کشورِ امکاں نماند
مجمع استاد بے شیرازہ شد	رابطِ اقلیم ہندستاں نماند
ہادیِ انوار لطف از دیدہ رفت	ہدیٰ جم جاہ عاقل خاں نماند

[3] آزاد نے سرو آزاد میں سالِ وفات ۱۱۰۸ھ لکھا ہے، اسکی تحقیق آیندہ کیجائے گی،

شاگردانِ آں حضرت رتبۂ خلافت داشت"۔ عہد بہادر شاہ میں دیوان صوبۂ لاہور تھے،

"عزتے[1] در شکوۂ دیر نویسی خطوط بہ خدمتِ مرزا فرستادہ بود، آں جناب بعد مطالعہ فرمودند

کہ فکر عاشق ہمہ معشوقانہ افتادہ، و او خود پایۂ فکر از ماہم گذرانیدہ، لیکن چوں خاطرش عزیز است

موافق استدعایش اصلاح لفظے در مطلع او ہم باشد و مطلع این ست،

زمانہ می کند آں آشنائے ما ۔۔۔ از ما دلش پُرست کہ خالی ست جائے ما

مرزا صاحب بجائے لفظ آشنائے ما، بے وفائے ما رسانیدہ"

عین جوانی میں ۱۱۲۴ھ میں انتقال کیا، مرزا وفات کی خبر سے دیر تک اشکبار رہے،

"نواب ذوالفقار خاں کہ مبلغ دو صد اشرفی بہ خدمتِ میرزا نیاز گذرانیدہ بود، ہمہ آں را بہ

عاقل خاں بخشیدہ بودند کہ درآں وقت از طرف خرج معسر بود"

منعم خاں خان خاناں منعم تخلص، بہادر شاہ کے وزیر کل، الہامات منعمی، مکاشفات منعمی وغیرہ کے

مصنف، وفات ۱۱۲۳ھ،

"وقتے ایں سہ بیت کہ تازہ گفتہ بود پیش میاں صادق[2]، القا خواندہ، وایشاں نقل کردند،

بعد ازاں مرزا بیدل و دیگر شعرا بہ جوابِ آں پرداختہ اند،

چہ شد گر مفلسم فرماں روائے ہفت اقلیم ۔۔۔ حروفِ سکۂ ام اما نہ زر و سیم

من از صحرا نوردانِ جنوں قدرد گرد دارم ۔۔۔ بیاباں می کند از گرد پا د اندازِ تعظیم

سپندم، شعلہ ام، سوز دل پروانۂ عشقم ۔۔۔ کہ ایں شمعِ محفل سوختن ہا کرد تعلیم

---

[1] اس کے متعلق میرزا کا کوئی خط رقعات بیدل کے مطبوعہ اور قلمی نسخوں میں نہیں [2] ان کا دماغ خراب تھا، خوشگو لکھتا ہے "فقیر مجمع شعرا، دادہ بود بہ طلب ایشاں رفت، فرمودند شاعر ناصر علی بود، خود گذشت، بیدل قدرے وقوف سخن داشت او ہم مرد، حالا شاعر منم، ایں زر کہ ناحق در ضیافت صرف می کنی، بہ من دہ کہ در شراب و شاہد صرف کنم،

نظام الملک، شاگرد بیدل " ہرگاہ بہ خانہ مرزا تشریف می آورد، میرزا شرائط استقبال بجا آوردہ، ہم دست شدہ، اندرونِ دولت خانہ می برد، وصحبتِ رنگیں می داشت، وازاقسام اطعمہ حلوائے بیضۂ مرغ بہ مذاقش گوارا افتادہ، بہ میرزا اکثر فرمائش آں می نمود، در وقت رخصت چوں مرزائے مرحوم کتابے از قدما مثل کیمیائے سعادت ونفحات ودیگر ازیں عالم می گذرانید می گفت ازیں کتب ذخیرہ ہا در خانہ دارم، از تبرکات تصنیفات خود عنایت کنید وکتب وسفائن دست خط میرزا باخود می برد "

معاصرین وا حباب میرزا، سرخوش، فقیر خوشگو شاہ گلشن را وسیلہ برانگیخت کہ ایشاں را بریں تپہ باید آورد کہ بہ خانۂ میرزا بیدل رفتہ صحبت دارند کہ ملاقات دو صاحب کمال فائدہ ہا دارد، چہ از مدت ممتد بنا بر بعضے اسباب درمیانِ ایں ہر دو بزرگ جدائی[1] بود، شنیدہ فرمود " ہوس تماشائے جنگِ فیلاں دارید، ایں مطلع گفت وپیش ایشاں خواند،

از فضلِ حق ز ہر دو جہاں کم گرفتہ ایم یک در گرفتہ ایم و چہ محکم گرفتہ ایم

فرمود فضل حق ہمہ جامی باید الا دریں بیت "

(خوشگو نے لکھا ہے کہ آرزو اس اعتراض کو غلط سمجھتے ہیں) سال وفات ۱۱۳۶ھ فضل سے ہو نکلتا ہے ایزد بخش[2] رسا، عزت کے شاگرد تھے، شیعہ سے سنی ہوگئے، سنی تخلص رکھا،

---

[1] سرخوش کلمات الشعراء میں لکھتا ہے، فقیر بہ اشارۂ میاں ناصر علی چند بیت ایشاں (یعنی بیدل) را از راہِ شوخی بہ پیش مصرعِ رسانیدہ مطلع برجستہ ساختہ، اگرچہ ایشاں شنیدہ محظوظ نہ شدند، از روئے غیرتے کہ تلامذۂ رحمٰن را باشد بد بردند، اما یاران منصف وعزیزانِ نازک فہم بسیار پسندند " حکایتے در محیط اعظم میرزا بیدل بہ یازدہ بیت تمام کردہ بودند، فقیر در دو بیت رباعی بہ فصاحت تمام درست نمود، سرخوش نے مرزا کی تعریف بھی کی ہے " سرآمدِ سخنورانِ کامل " استادِ فن امروز در شاہجہان آباد کوس رستمی می نوازد و داد سخنوری می دہد، در فقر و توکل باشاہِ وقت خود " [2] ان کے نام کے کئی خط رقعات بیدل میں ہیں، جہاں تک مجھے یاد ہے، ایک صاحب نے بہارستانِ سخن کے حوالہ سے لکھا تھا کہ ناصر علی نے ایک شعر لکھا تھا جس پر انھیں بڑا ناز تھا، میرزا کے اشارے سے انکے شاگرد عبرت نے اس کا جواب لکھا تھا،

"بے دل کہ باایشان بسیار بود می فرمودند کہ روزے در اثنائے صحبت با وے گفتم کہ مارا در آخر تخلص شما لفظ "ی"، نہ می آید، نظر بہ قامت دراز خود رسا مقرر سازید، قبول نمود و برخاست و تسلیم بجا آورد"

وفات ۱۱۱۹ھ،

میر محمد زماں راسخ، " با بے دل خیلے مربوط بودہ میر و مرزا و حاجی اسلم، سالم و حکیم شیخ حسین شہرت در گجرات بہ لشکر شاہی باہم ہم طرح بودہ اند" وفات ۱۱۰۷ھ،

ناصر علی سال وفات بے دل نے" رنگ ناز شکست[ل]" سے نکالا، ۱۱۰۸ھ،

ناظم خاں فارغ قمی، ایران سے سندھ آئے، سندھ سے دہلی، ناظم خاں خطاب فرخ سیر نے دیا، شاہنامہ کے مصنف ہیں، اوائل عہد محمد شاہ میں وفات پائی،

حاجی محمد اسلم، سالم، اعظم شاہ کے گجرات میں نوکر رہے تھے اعظم شاہ کے مقتول ہونے کے بعد وارد دہلی ہوئے، بے دل سے اخلاص قدیم تھا، ملنے کے لئے آئے، شعر و سخن کی صحبت رہی، بیدل نے چند شعر سنائے، سالم نے کہا،

" ایں ہمہ شنیدم، آں چہ دریں روزہا بر حاشیہ نوشتہ شد از آں ہم باید خواند و غرض ازیں داشت کہ ترقی فکر معلوم کند، مذاقش ازیں جا تصور باید کرد کہ باہم چو مرزا بے دل ایں قسم حرف زدہ و مرزائے مرحوم در تمام عمر دیوان کسے بہ تلاش طلب نہ فرمودہ، مگر دیوان حاجی کہ چند شبانہ روز در مطالعہ داشت"

وفات ۱۱۱۹ھ،

نعمت خاں عالی، " مرزا بیدل ہرگاہ نامش بر زبان می آورد، بہ خطاب حاجی ہجوی یاد می فرمود" وفات[ل] ۱۱۲۳ھ

آقا ابراہیم، فیضان، پسر آقا محمد حسین خاں، ناجی، اکثر اوقات در خانۂ او مجمع شعرا می بود، میرزا بیدل

[ل] کلیات میں نہیں [ل] سال وفات میں اختلاف ہو،

صاحب را طلب می داشت، وضیافت ہای نمود، صحبت ہاے رنگیں واقع می شد، فقیر مولف، خوشگو ریزہ چینِ فیوضاتِ آں مجلس ست" وفات سنہ ۱۱۲۴ھ۔

مرزا محسن، ذو القدر تخلص، اوائل در سرکار شجاع در فرقۂ سپاہیاں انتظام داشت، و با بے دل از صغر سن محشور و ہم طرح بود.... فقیر او را در کمالِ پیری کہ از نود متجاوز بود در مجلسِ مرزا مغفور دیدہ ام" وفات عہد فرخ سیر میں ہوئی،

حسین شہرت، با بے دل در سرکار اعظم شاہ یک جا گذرانیدہ" تاریخ وفات سنہ ۱۱۲۹ھ "شہرت مرد"[1] سے نکلتی ہے،

خواجہ عبد اللہ ساقی، اعظم شاہی، از یارانِ بے دل،

عظمت اللہ بے خبر، از صحبت وے بسیار محظوظ شدند" آزاد بلگرامی کے حوالہ سے بے خبر اور بے دل کی ملاقات کا حال لکھا ہے جو ید بیضا اور سرو آزاد میں موجود ہے،

تلامذہ و مستفیدانِ بے دل، معنی یاب خان شاعر، از شاگردانِ رشید، ہمیشہ خدمتِ متعلقانِ بے دل می کرد، و بہ سبب او ہنگامۂ عرس گرم بود، مرزا الیبا رتش می خواستند، از روے عنایت عصا و شمشیرے بہ او بخشیدہ بودند، چنانچہ تا حال بہ دست داشت" وفات سنہ ۱۱۵۰ھ،

محمد احسن سامع، بیدل سے فیض یاب ہوئے، "علی التواتر بہ خدمت ایشاں می رسید و مستفید می شد" لیکن بعد وفات بے دل شاگردی کی شہرت کی وجہ سے بے دل کے حقوقِ شاگردی کو بالکل فراموش کر گئے،

گور بخش حضوری، با بے دل سالہا صحبت داشتہ مشقِ سخن بہ کمال رسانیدہ"

میر محمد احسن، ایجاد[2]، اعظم شاہ کے لشکر میں تھے" در آں جا با بے دل و سالم و گلشن صحبت ہاے

[1] خوشگو کہتا ہے کہ یہ مادہ تاریخ میرا ہی، لیکن یہی سرو آزاد میں بھی ہے[2] ایجاد کے نام کا خط رقعات میں ہے، ان کی سفارش بھی ایک امیر سے کی تھی،

مستوفی داشتہ، شاگرد بے دل، تخلص بے دل کا عطیہ، وفات ۱۱۳۲ھ،

میر عبد الصمد سخن، "سخن تخلص از بے دل یافتہ"[1] اوائل میں شاگرد تھے، وفات ۱۱۶۱ھ

شیخ عصمت اللہ کامل، "از بے دل تخلص یافتہ، روزے جمدھر خردے خوش اسلوب از ساخت برہان پور نذر ایشاں آورد، مرزا فرمود ترکیب ایں جمدھر بہ نشان برہان پور برہان قاطع ست کامل نظر بر رعایت دو ایہام دریں رعایت کردہ، تصدق گردید، وے چوں ہم را منصب داران قلیل البضاعت بسر می برد روزے ... در تشکوہ کم قراری خویش برخواند

فلاطوں گر بیاید می شود عاجز بہ تدبیرم   کہ منصب آتشیں داغے شد وجاگیر جاں گیرم

ہماں دم آں حضرت بجاے آتشیں، لفظ آتشک رسانیدہ اصلاح فرمودند" وفات عہد فرخ سیر

حافظ محمد جمال، تلاش، "از تخلص یافتگان بے دل، در عہد عالم شاہ دیدنش می شد، میرزا بیدل از بیتش محظوظ بودند،

بروز عید ہر شاہ وگدا کم می کند خود را   تو رفتی بر سمند ناز و من از خویشتن رفتم

احمد عبرت، "مرزا بے دل را توجہ خاص با او بود، چنانچہ برکت انفاس متبرکۂ ایشاں بہ پایۂ خوش فکری رسیدہ، تخلص از آں جناب یافت" وفات ۱۱۳۵ھ، "از سانحۂ او تا دیرے اشکبار بودند"

سید مرتضیٰ قانع، "گویند شاگرد بے دل" میر معصوم وجدان، چندے شاگرد بے دل۔

محمد اشرف، حسرت، مہر علی بے کس، سری گوپال تمیز، محمد پناہ قابل، تلامذۂ بے دل،

محمد عطاء اللہ عطا[2] تخلص، "از ساکنان مردہہ مرادآباد بود، طبع رسا داشتہ، در عہد مبارک محمد شاہی بہ توجہ ... راے صاحب اندر رام مخلص بہ خطاب خانی سرفرازی یافتہ، از شاگردان مرزا بے دل بود طبعش بہ لطائف وظرائف بیشتر میل داشت، ہرگاہ در بزم شریفش بار می یافت، مرزاے مرحوم

۱؎ سخن کے نام کے خط بھی رقعات میں ہیں ۲؎ نکات الشعرا میں بھی عطا کا ترجمہ ہے،

برائے خاطر او اشعار موحدانہ موقوف نمودہ، ہزلیات در میان می آورد، و اکثر می فرمود، استحقاقِ تتبع و تلمذ دیوانِ ہزلیات عطا دارد، وقتے مرزائے مغفور، قلم دانے و بیاضے کہ از اشعار منتخب خود نوشتہ بود به او عنایت فرمود، ایں رباعی در شکر آں گذرانید:

بے دل شہِ اقلیم کمالِ ہر فن از گوشۂ چشم تا نظر داشت بہ من
از روے عنایتِ قلم دان و بیاض فرمود مرا وزارتِ ملکِ سخن

بہ ہمہ حال مرد عزیزے بود، حرکاتِ نمکیں از و سر می زد و زینتِ مجلس ہا بود، روزے تاریخ وفات میرزا بے دل در مجمع شعرا می خواند و می گفت صفت، آں ست کہ در وزن خالق باری گفتہ ام:

عبدالقادر بے دل رفت، در سال ہزار و صد و سی و ششم در دار الخلافہ بہ رحمتِ حق پیوست، و از وفاتش رونقِ مجمع عرس میرزا برہم خورد و اشعارش کم بدست آمدہ ایں قدر بہ یاد ماندہ۔"

برخوردار بیگ فروی، شاگرد بے دل وفات ۱۱۱۹ھ "در احمد آباد بہ سبب نوکری... بادشاہی بسیار ماندہ۔"

شاہ گلشن، "اکثر بہ زبان می راند کہ در زمانے کہ... بے دل صاحب سی ہزار بیت شدہ، در فکر سخن ترقی کرد، میاں ناصر علی از ترقی باز آمدہ بہ ہر قدر کہ نصیب گردد، در ساخت من تازہ بہ فکر آمدہ بودم، ایں ہر سہ دورِ یکے بود، میرزا بے دل تخلص من گلشن [۱] بہ ایشاں، و تخلص سخن بہ میر عبدالصمد بہ یک روز عنایت کردہ۔" وفات جمادی الاولیٰ ۱۱۴۰ھ۔ "جاے گلشن بہشت ابدی" سے تاریخ نکلتی ہے،

سکھراج سبقت، وطن اصلی نواح لکھنؤ، آبا و اجداد اسد خاں وزیر کے نوکر تھے، سبقت بہت

---

[۱] یہاں پر کوئی لفظ معلوم ہوتا ہے کہ چھوٹ گیا ہے آرزو نے مجمع النفائس میں گلشن کی زبانی لکھا ہے کہ میرزا تخلص بہ من داد، چوں نسبت گل و گلشن (شاہ گل ان کے پیر تھے) ملاحظہ کردم اختیار نمودم ہو شاید دوسرے جا تغیر و تبدیلی در اشعار من کردہ باشند"

علوم میں دستگاہ رکھتا تھا، اور "فنون سیاق" میں یگانۂ آفاق تھا" از شاگردانِ بے دل بود و میرزا اکثرمی فرمودند کہ سبقت بر جمیع ہند و بچگاں فائق ست"

کچھ دنوں سید اسد اللہ خاں معروف بہ نواب اویا، عمہ زادہ سید قطب الملک کا میر سامان اور دیوان رہا، دکن کی لڑائیوں میں امیر الامرا حسین علی خاں کے ساتھ شریک تھا، امیر الامرا کو داؤد خاں پر جو فتح ہوئی تھی، اس کے حال میں سات سو شعروں کا جنگ نامہ لکھکر پیش کیا تھا، اور یانصدی منصب پر سرفراز ہوا تھا، ہنگامۂ سادات کے رفع ہونے کے بعد مالوہ میں تین سو سواروں کا جماعدار تھا، راجا گردھر بہادر سے جن کا ملازم تھا جھگڑا ہوگیا، اسی میں قتل ہوا" کرد کھراج زسبقت" سے تاریخ وفات (۱۱۳۸ھ) نکلتی ہے، دیوان میں دس ہزار کے قریب شعر تھے، ضائع ہوگیا،

"فقیر خوشگو از عنفوانِ شعور بہ خدمتش بندگی داشتہ، در مسائل عروض و قافیہ و معما و اکثر دواوین تازہ گویان پیش او گذرانید، چوں نسبت ہم عمری داشتیم، بے تکلفانہ توجہ نمود"

مغل خاں صفت و قابل[۱]، شاگرد، وفات بے دل کی تاریخ ختم کلام سے نکالی ہی لیکن اسمیں ۲ کا اضافہ کرنا ہوگا" از سر بینائی دل گفتہ شد ختم کلام" وفات ۱۱۴۲ھ،

میر محمد علی، رائج، شنیدہ شد کہ او شاگرد غائبانہ میرزا بے دل ست، و برخے گویند شاگردی میر محمد زماں راسخ کردہ"

اندرام مخلص[۲]، اوائل میں بے دل کے شاگرد، شیورام داس حیا، شاگرد، وفات ۱۱۴۴ھ

حکیم چند ندرت،" بارہا صحبت بے دل، و دیگر شعرائے نام دار یافتہ"

---

[۱] اردو کے بھی شاعر تھے، ملاحظہ ہو تذکرۂ فتح علی خاں گردیزی [۲] توقع تھی کہ مخلص کی مرآۃ الاصطلاح یا مرأۃ المصطلحات (اس وقت نام ٹھیک یاد نہیں) جس میں بہت سے شاعروں کا ذکر آگیا ہے، بے دل کے ذکر سے خالی نہ ہوگی، لیکن اس میں بے دل کے متعلق کوئی بات نہیں ملی،

نصرت، کشمیری الاصل، متوطن لاہور، بے دل کی یہ بیت خود دیوان میں ہے، لاہور میں نصرت[1] کے نام سے مشہور ہے،

چشم پوشیدہ تواں کرد سفر

چہ[2] قدر راہِ فنا ہموار ست

جلد ثالث کا قلمی نسخہ اغلاط سے خالی نہیں، لیکن اغلاط اتنے زیادہ نہیں جتنا ترجمۂ بے دل کی نقل کو دیکھکر میں سمجھا تھا، یہ نقل ایک عربی کے فارغ التحصیل طالب العلم نے کی تھی، اور کتابت کے بعد ایک بار میری ہدایت کے مطابق اصل سے اس کا مقابلہ بھی کر لیا تھا، یہ اطمینان ہو جانے کے بعد کہ نقل میں جو اغلاط ہیں وہ اصل سے مطابق ہونے کی وجہ سے ہیں، میں نے اسے معارف کو بھیجا تھا، اسکی اشاعت کے بعد جب میں نے خود اصل سے مقابلہ کیا تو معلوم ہوا کہ گو چند اغلاط کی ذمہ داری کاتب سفینہ اور کاتب معارف کے سر ہے لیکن بیشتر اغلاط نقل کرنے والے صاحب کی بے پروائی کا نتیجہ ہیں، تصحیح میں گل رعنا مصنفہ شفیق اور سفینہ عشرت مصنفہ درگا داس سے بھی مدد لی ہے، ان دونوں تذکروں میں بے دل کا حال بڑی حد تک سفینۂ خوشگو سے لیا گیا ہے، اور جابجا سفینۂ خوشگو کی عبارتیں آگئی ہیں، بعض امور کے متعلق میں نے جناب ریاض حسن خاں صاحب خیال کے مشوروں سے فائدہ اٹھایا ہے، اور اُن کا بہ غایت ممنون ہوں،

ان اغلاط کی تصحیح حسب ذیل ہے:

صفحہ ۳۵۸ ترجمۂ بیدل کی ابتدا اس عبارت سے ہوتی ہے (جو حذف ہوگئی ہے)

---

[1] عزلت نے حاشیہ سفینہ میں لکھا ہے، کہ میں نے مکرر یہ شعر خود نصرت کی زبان سے سنا، اور وہ اپنے کو بے دل کا شاگرد کہتے تھے [2] دیوان مطبوعہ میں ایک غزل اس زمین میں ہے لیکن یہ شعر نہیں، کلیات میں اس زمین میں کوئی غزل غائب نہیں، سرو آزاد میں بھی یہ شعر نصرت کے نام مندرج ہے،

بداں کہ خامہ سنبلستان نگارچین سائے آستان پاکے ست و دل غنچہ مثال پردہ کشائے حقیقت ایجاد بوے گل نفسے کہ نشگفتگی از جبین بہار آئینش گلشن گلشن بہ خود بالیدن داشت، و بزرگی از ذات عرش کمالاتش عالم عالم سامان دکان چیدن می اپناشت،

بایدم شستن لب از مشک و گلاب — تا بگویم نام آں قدسی جناب

سامعہ را وقتِ گل چینی رسید — ناطقہ را صبح حق بینی دمید

درویش پادشاہ دماغ پوست تخت سرفرازی، پادشاہ (غالباً یہاں پر کوئی لفظ چھوٹ گیا ہے،) فراغ تخت روان بے نیازی، ابر دُربار شکوہ آسمان کمال، (؟) خورشید آسماں وقار جہان قال و حال، آئینۂ مظہر قدرتِ الٰہی جامے لبالبِ مو قدرتِ لامتناہی، قبلۂ لفظ و کعبۂ معانی، کدخدائے سخن و خداوند سخندانی،

مرزا بے دل کہ رہ نمائے سخن ست — پیغمبر و غوث و پیشوائے سخن ست

یکتاست در آفریدنِ طرز کلام — باللہ کہ بے سخن خدائے سخن ست

نکہت گلستان و بوستاں نذر شامۂ سامعہ باد بہ استشمام از احوالش سعادت کمالش (کذا) سطر ۸ رباعی سبقت کی بیت اوّل سفینہ اور سفینۂ عشرت میں یوں ہی ہے، مصرع ثانی کے بعض الفاظ کی صحت میں اب بھی شک ہے،

آں ذاتِ ابد قدرت تنزیہ مقام — عبد القادر نمود تشبیہش نام

سطر ۱۶ سکھراج راے، سکھ راج،

صفحہ ۲۵۹ سطر ۱ و ۲ بہ قوت ریاضی بر ماضی و مستقبل روزگار اطلاع داشت، سطر ۱۱و۱۲ انتخاب جز و زماں، سطر ۴ جنبش مژگاں بے نم خامہ تحریر بود، سفینۂ چہار عنصر مطبوعہ اور چہار عنصر کے تین قلمی نسخوں میں وبے نم، لیکن جناب خیال کی رائے ہیں، بانم یا پرنم ہونا چاہئے، بے نم سے

لکھتے وقت قلم میں روشنائی نہیں رہتی جیسا کہ اکثر ہوتا ہے، نم ناکشیدہ یعنی کسی پچھلی جدت کا اظہار کرتے ہیں اپنے خامہ تحریر کے لیے بانم یا پرنم مناسب ہے (از جناب خیال)

ان کے نزدیک "بہیم" بھی مرجح ہے، سطر ۱۱ میرزا قلندر برادر اعیانی مرزا عبدالخالق سطر ۱۴ بادشاہ داشت سطر ۱۹ عارضۂ تب،

صفحہ ۳۶۰ سطر ۱ سرمۂ ولا، جناب خیال نے اس کی جگہ سرمہ سا تجویز کیا ہے، سطر ۱ بصحت نہ گردید سطر ۵ گردن رعونت تارک از تافت، سفینہ میں اسی طرح ہے، لیکن یہ صریحاً غلط ہے، سفینۂ عشرت میں اس مقام پر "گردن رعونت بر فلک تافت" خوشگو نے غالباً اسی طرح لکھا ہوگا، سطر ۱۱ گذاشتے سطر ۱۱ انفاس خوشش سطر ۱۴ بوسے محبتش،

ص ۳۶۱ اہتزاز و قتش سطر ۸ ضروریات راہ در کار

صفحہ ۳۶۲ سطر ۸ بے تعینی بسر سطر ۱۰ امیر کامگار سطر ۷ ابہ سبب فرمایش، سفینہ میں "نسبت فرزندش" جناب خیال کی رائے میں "بہ سبب فرزندش"، سطر ۱۹ بہ مزاج،

صفحہ ۳۶۳ سطر ابنگاہ سطر ۳ شادم الخ، یہ شعر ایک غزل کا ہے جو کلیات میں موجود ہے، قافیہ گاہ گاہی ہونا چاہیے، سطر ۴ وہ زلزلۂ آشفتگی بنیاد سطر ۸ از بدر شعور سطر ۹ واسپ خود سطر ۹ پشتہ سطر ۱ این بادہ زبس زور نہ گنجد در ظرف، سطر ۸ اگر خامہ،

صفحہ ۳۶۴ سطر ۱ درتنگ ودو، سطر ۲ دو ہزار، سطر ۵ عصا خرے از آہن، سطر ۶ داشتے، سطر ۶ بولاس، سفینہ میں ابولاسی، یہ لفظ تذکروں میں کئی طرح آیا ہے، گل رعنا میں انولاسی ہے اور منوہر سہائے صاحب انور ایم اے دہلوی سے معلوم ہوا کہ یہ صحیح ہے، انولاسی بہ واو مجہول ہے، سطر ۱۱ بسیار داشت، سطر ۱۲ چشم ہائے خجستہ، سطر ۱۲ وسعتے سطر ۱۳ ششش گرہ، سطر ۱۴ آہستہ و جدا جدا،

صفحہ ۳۶۵ سطر ۲ باز شدے سطر ۶ زیادہ گذشتے، سطر ۵ داشتے، سطر ۵ و میرزائی از سراپایش می بارید، سطر ۱۱ کہ بہ اصلاح عزریش نیاز افتادست، یہ مصرع سفینہ، سفینۂ عشرت اور گل رعنا میں یوں ہے کہ بہ اصلاح عزیزانش نیاز الخ، اس طرح بھی صحیح نہیں معلوم ہوتا، جناب خیال نے اس مصرع کی

تین شکلیں پیش کی ہیں، (۱) کہ باصلاح غلط ریش بہ نازالخ (۲) کہ بہ اصلاح خط و ریش بہ نازالخ (۳) کہ بہ اصلاح خط و ریش درازالخ سطر ۱۳، تہِ سررشتۂ،

صفحہ ۳۶۶ سطر اور ۲۔ قافیے میں یاے معروف چاہئے، مزید تصحیح آیندہ ہوگی، سطر ۴ نیرنگ سطر ۷ چہ عرفی چہ فیضی، سطر ۹ استاداں می باشد سطر ۱۹، در، کلیات میں وگر،

صفحہ ۳۶۷، سطر ۲ ہرگہہ سطر ۳ چہ علم بہ حشت، سفینۂ و سفینہ عشرت میں اسیطرح لیکن کلیات میں علم چہ وحشت" سطر ۳ چہ گوتہ سطر ۴ چناں، سفینۂ و کلیات دونوں میں اس طرح ہی چساں، سطر ۷ کتابت، سفینہ میں اسی طرح لیکن جناب خیال کی رائے میں کنایت ہو تو تعجب نہیں لیکن گل رعنا کے مصنف نے جو کچھ لکھا ہے، وہ "کتابت" کا موید ہے صفحہ ۳۶ سطر ۷، تحمل، کمل، سطر ۹ ورنگے بے اندازہ سطر ۱۸ یا ہزار، صفحہ ۳۶۹، سطر ۱۰ لفظ مسلّم کے بعد کاتب نے عبارت ذیل حذف کردی ہے، میدارید، ناظم خاں گفت از قدما ہر کہ باشد بس، آں حضرت ہفدہ شعر، صفحہ ۳۷۰ سطر ۵ ہمیں قسم، سطر ۶ گہہ صفحہ ۳۷۱ سطر ۴ نہایت رونسے پانصد بیت سطر ۷ لنگ لنگان بہ سر منزل سطر ۱۰ البیدنہ، چہ بد عقیق سطر ۱۲ خفت ہر گل سطر ۱۲ از چہ، سطر ۱۳ اجزا، سطر ۱۳ ابر کہ بدل سطر ۱۳، مصرع ۲ کلیات میں یوں ہی اور یہی صحیح ہے کافتادہ چہ بار از کہ سر کہ بہ دل سطر ۱۸ چناں، سفینہ میں صاف پڑھا نہیں جاتا، گل رعنا میں چہ ساں اس میں جوں کی جگہ خوں بھی ہے، اس مصرع کی صحت میں شک ہے، سطر ۱۶ مصرع ۲ گل رعنا میں یوں ہی ہے گل بدنہ چہ بود نامہ از کہ زیارِ بیت ثانی کی صحت میں بھی شک ہے سطر ۱۹، ایزادنہ کردہ، سطر ۱۹، ہزار بیت صفحہ ۳۷۲ سطر ۸ ماہمہ صفحہ ۳۷۳، سطر ۱۱ فشاند کلیات میں نشاند سطر ۱۰، خلقت سفینہ میں خلعت، کلیات میں "خلقت" سطر ۱۸، نہ بیش، کلیات بہ بیش صفحہ ۳۷۴ سطر ۲ بگسل سطر ۱۸، مصراعی، صفحہ ۳۷۵ سطر ۵ جان وجید سطر ۱۱ ہرات، سفینہ میں برات کو کاٹ کر ہرات بنادیا ہے، دراصل برات ہے، سطر ۱۱ بر زبان ہاست سطر ۱۸ بیت از قصائد صفحہ ۳۷۶ سطر ۴ بحر بستم سطر ۸ گردش سطر ۹ نفاق وحسد سطر ۹ دز آمہ تغافل، سطر ۱۰ کے آخر میں یہ الفاظ کاتب نے حذف کر دئے ہیں، ایں اشعار از آں جاست، اسکے بعد اشعار ہیں، جن کی تعداد کم و بیش ۲۰۰ ہے،

تلخیص و تبصرہ

رومانیہ کے مسلمان

براعظم یورپ کے قریب قریب کل حصوں میں مسلمان آباد ہیں، خصوصًا اس حصہ میں جو فنلینڈ سے بہ خط مستقیم وسط یورپ ہوتا ہوا اٹریٹا تک چلا گیا ہے، ان کی تعداد اور اقتصادی و سیاسی حالت اتنی ترقی پذیر کہ یہاں کی اکثریت رکھنے والی قومیں ان کو خوف و خطرہ کی نظر سے دیکھتی ہیں، یہ سارے مسلمان اپنے ملک و قوم کے مخلص اور اس کے لئے ہر قربانی کے لئے تیار رہتے ہیں،

یورپ کے متوطن تمام مسلمان اپنے مذہب اور اپنی روایات و رسوم کی حفاظت کے ساتھ یورپی تہذیب میں یوروپین اقوام کے دوش بدوش ہیں، ان میں رومانیہ کے مسلمان سب سے زیادہ اپنے دینی روایات کے محافظ ہیں، ان میں بھی ڈوبروڈجا کے مسلمانوں کو خاص امتیاز حاصل ہے،

آبادی کا بڑا حصہ ترکی النسل ہے،

ڈوبروڈجا کا علاقہ رومانیہ کے اہم ترین حصوں میں ہے، اسی لئے وہ زمانہ قدیم سے حکومتوں میں متنازعہ فیہ چلا آتا ہے، مشرقی یورپ میں کوئی حصہ اتنا حسین نہیں ہے، تین سمتوں سے پانی سے گھرا ہے، چوتھی سمت میں کوہستان کوادڑی لاٹر کا سلسلہ پھیلا ہوا ہے، اس کے دامن میں نہایت شاداب اور خوبصورت جھاڑیاں ہیں اور ہر طرف چھوٹی چھوٹی نہریں رواں ہیں، ان میں بعض معدنی جھیلیں بھی ہیں، جن میں غسل کے لیے ہر سال ہزاروں مریض آتے ہیں، یہ حصہ جنگی نقطۂ نظر سے رومانیہ کے لئے اتنا ہی اہم ہے،

جتنا روس کے لئے جزیرۂ قرم،

ڈوبروڈجا کا لفظ ڈوبرٹیچ سے مشتق ہی، جو چودہوین صدی کے نصف مین ڈارنہ کا بڑا جابر ظالم حکمران تھا، اس حصہ مین دیسیز کے قبائل آباد تھے، ان کے بعد یونانی آباد ہوئے، پھر گاتھ پھر بلغاری، ان کے بعد قرمان پھر بیز نطینی آخر مین مسلمان ترک آباد ہوئے، ان کی آبادی کی تاریخ یہ ہے، کہ ترکی حکومت نے ایک زمانہ مین اس علاقہ کو ترکون کی آبادی کے لئے مخصوص کردیا تھا، چنانچہ ایک ترکی افسر باباصالتوق دہ دہ میں ہزار ترکون کے ساتھ آکر یہان آباد ہوا، اور ۱۲۶۳ء مین اوس نے یہان ایک شہر بسایا، جو داغ باباکے نام سے موسوم ہوا اور سرزمین یورپ مین ترکون کی فتوحات کے ساتھ ڈوبروڈجا اور دوسرے یورپین علاقون مین برابر اسلام پھیلتا گیا، اور ترکی مسلمان ڈوبروڈجا سے لیکر انتہائی شمالی حصہ سافیہ تک پہنچ گئے، اور ان علاقون کی حفاظت کے لئے انھون نے بڑے بڑے جنگی استحکامات اور قلعے تعمیر کرائے، ان مین باباداغ کا قلعہ سب سے زیادہ مستحکم تھا، اسے سلطان محمد اوّل نے تعمیر کرایا تھا،

اٹھارہوین صدی کے وسط مین کریمیا کے فوجی مسلمانون کی بڑی تعداد ڈوبروڈجا مین بس گئی، ان کے علاوہ عرب اور چرکسی فوجین بھی آکر آباد ہوئین، لیکن یہ دونون سین اسٹفانو کے معاہدہ مارچ ۱۸۷۸ء کے مطابق لوٹ گئے، اور ڈوبروڈجا پورے ۶۰۰ برس تک عثمانیون کے قبضہ مین رہنے کے بعد چند دنون کے لئے روسیون کے قبضہ مین چلا گیا، لیکن پھر ۱۸۷۸ء مین معاہدۂ برلن کی رو سے رومانیہ کو مل گیا، اس وقت سے پھر یہان مسلمانون کی آبادی بڑھنی شروع ہو گئی، اور ان کی تعداد ڈھائی لاکھ تک پہنچ گئی، اور انھون نے اپنی زندگی کا مادی نظام یورپین تہذیب اور روحانی نظام اسلامی شریعت کی بنیادون پر قائم کیا، لیکن پھر ان کے رومانیہ سے ترکی مین نقل مکان کی وجہ سے رومانیہ مین ان کی تعداد گھٹ کر ڈیڑھ لاکھ رہ گئی، ان کی آبادیان نہایت مرتب و منظم ہین، مکانات اور عمارتین عموماً سنگی اور

سڑکین اور گلیان بہت کشادہ اور مرتب ہین، آبادیان نہایت وسیع کشادہ اور بڑے بڑے میدانون اور باغون سے بھری ہوئی ہین، سڑکون کے دورویہ شاداب اور سایہ دار درختون کی نہایت مرتب اور خوشنما قطارین ہین، ان کی آڑ مین بجلی اور ٹیلیفون کے تار مکڑی کے جالے کی طرح تنے ہوئے ہین، ہر دس قدم پر بجلی کے بڑے بڑے بلب شہرون اور دیہاتون کو بقعۂ نور بنائے رہتے ہین،

رومانیہ کے مسلمانون نے ترکون اور دنیا کے دوسرے مسلمانون سے بھی تعلق قائم رکھا ہی، ان کی بہت سی مجالس اور انجمنین ہین، جو عالم اسلام سے اس کا تعلق قائم رکھتی ہین، ڈوبروڈجا کا کوئی قریہ اسلامی مجالس سے خالی نہین، جو مسلمانون کے معاملات کی نگرانی اور سوسائٹی مین ان کی سطح بلند کرنے کے فرائض انجام دیتی ہین، ان مجالس کا وہان کے مسلمانون پر بڑا اثر ہے، اور ہر مسلمان ان سے تعلق رکھنا اور ان کی امداد و اعانت کرنا اپنا فرض سمجھتا ہی،

ان اسلامی انجمنون کے علاوہ "ڈوبروڈجا تجاری حرت تشکیلاتی" کے نام سے بہت سی غیر مذہبی انجمنین بھی ہین، گو یہ انجمنین اسلامی انجمنون کے رسمی قیود سے آزاد ہین، لیکن ان اسلامی امور مین جن کا مسلمانون کی فلاح اور ان کی ترقی سے تعلق ہے، اسلامی انجمنون کی پوری معاون و مددگار ہین،

ڈوبروڈجا کا علاقہ چار سنجقون یا چار ضلعون مین تقسیم ہی، ہر سنجق مین ممتاز علما مین سے مسلمانون کا قاضی اور مفتی ہوتا ہی، پھر اکابر علما مین سے ان سنجقون اور قضاۃ کا ایک افسر اعلیٰ ہوتا ہے، تمام اضلاع کے قضاۃ مسلمانون کے جملہ امور خصوصًا ان کے شخصی معاملات اور مذہبی اجتماعی اور ثقافتی مسائل مین اس کے احکام کی پابندی کرتے ہین،

ڈوبروڈجا مین ساڑھے چار سو نہایت خوبصورت مسجدین ہین، ان مین بعض بہت بڑی ہین، اکثر مسجدین استنبول کی مسجدون کی طرز کی ہین، ان کی نگرانی اور آبادی کا خاص انتظام ہی، بعض مسجدین دولتمند مسلمانون نے بنوائی ہین، اور بعض اسلامی انجمنون نے مسجدون کی ضرورت کے لئے رومانیہ کی حکومت اور

میونسپلٹی زمین مفت دیتی ہے، کچھ امداد بھی ملتی ہے، سب سے بڑی اور خوبصورت مسجد کوستنجہ کی "جامع کارول"
اور بخارسٹ کی "جامع پارک کارون" ہے، یہ دونوں مسجدیں شاہ کیرول نے مسلمانوں سے اخلاص و محبت
کے ثبوت میں اپنی جیب خاص سے بنوائی تھیں، مرحوم شاہ فواد مصر نے جامع پارک کارون کے لئے سالانہ
امداد بھی مقرر کی تھی، ارومانیہ کی حکومت نے ائمہ و موذنوں کی تنخواہوں اور مسجد کے دوسرے مصارف
کے لئے انگور کے بڑے بڑے باغات وقف کئے ہیں، جن کی آمدنی اسلامی انجمنوں کی نگرانی میں مساجد پر
صرف ہوتی ہے، "ڈوبرد جا کنجلری حرت تشکیلاتی" کی مجالس زیادہ تر مسلمانوں کے ثقافتی اور سیاسی
امور کی نگرانی اور ان سے متعلق کام کرتی ہیں،

ہر شہر میں چھوٹے بچوں کے مدارس ہیں، جن کی مدت تعلیم دو سال ہے، مدرسہ ابتدائی کی پانچ
سال بعض شہروں میں ثانوی مدارس بھی قائم ہو گئے ہیں، ان مدرسوں میں جمہوریہ ترکیہ کے اصول
پر ترکی زبان میں تعلیم ہوتی ہے، مسلمان بچوں کے لئے بھی ابتدائی تعلیم جبری ہے، سب سے بڑا مدرسہ "مجیدیہ" ہے
جو رومانیہ کے ٹریننگ کالج کے برابر ہے، اس میں ترکی اور عربی دونوں زبانوں کی تعلیم ہوتی ہے،
حکومت اور اسلامی انجمنوں کے درمیان پورا تعاون و اتفاق ہے،

اندلس کا دماغی ترکہ کتب خانہ اسکوریال میں

قرون وسطیٰ میں جب کہ یورپ پر وحشت و جہالت کی گھٹا چھائی ہوئی تھی، عربوں کا تمدن
اسپین میں دنیا کو مطلع انوار بنا رہا تھا، اور اندلس میں دماغی سلطنت قائم تھی، اور قرطبہ کے علمی مراکز شمال
و مغرب کے دور دراز مقامات پر اپنی روشنی ڈال رہے تھے، اور وہاں اسلامی خیالات انتہائی
درجۂ کمال تک پہونچ گئے تھے لیکن سیاسی آندھیوں جنگی مصروفیتوں اور زمانہ کی گردشوں نے
خود اسلامی سلطنت کے قیام ہی کے زمانہ میں اس بلند منارہ کو بار بار گرایا، اور اس کے خزانوں کو

منتشر کیا، اس کے بعد اسپین مین اسلام کے اقبال کا ورق اولٹ گیا، اندلس مین جدید اسپین کی حکومت قائم ہوئی، لیکن اس جدید حکومت کو اسپین کا یہ قدیم دماغی ترکہ نہین ملا، اور تعصب اور جہالت نے عربی کتابون کے ایک بہت ہی چھوٹے حصہ کو باقی رکھا، جو اسکوریال کے تاریک کمرون اور بعض پبلک کتبخانون مین دفن کر دیا گیا، لیکن اس کے باوجود بھی سترہوین صدی عیسوی تک کے وسط مین عربی کی قلمی کتابون کی تعداد کئی ہزار تھی، جو اپنی نوعیت مین بہترین حیثیت رکھتی تھین، لیکن ۱۶۷۱ء مین اسکوریال مین ایک ایسی آتشزدگی ہوئی، جس نے اس خزانہ کے تین حصہ کو جلا کر خاک سیاہ کر دیا، اس وقت تک اسپین کی حکومت عربی کتابون کو ہر مطالعہ کرنے والے کی نگاہ سے چھپانا چاہتی تھی، اور اسپینی مصنف بھی دینی اور قومی اثر سے متاثر تھے، اس لئے ان ماخذون پر جن سے اسلامی سلطنت کے زمانہ کی تاریخ اور تہذیب وتمدن پر روشنی پڑتی تھی، بحث کرنے سے اجتناب کرتے تھے، اور اپنے ملک کے اس تاریخی حصہ کے متعلق صرف قومی ماخذون سے کام لیتے تھے، اس لئے ان کی تحریرین تعصب اور فرقہ پرستی کے جذبات سے لبریز ہوتی تھین، لیکن ۱۶۷۱ء کے حادثہ آتشزدگی کے بعد اسپینی حکومت کی آنکھیں کھلین اور مستشرق کازیری نے عربی کی قلمی کتابون کے بچے کھچے حصہ کی جن کی تعداد ایک ہزار آٹھ سو پچاس تھی، ایک فہرست مرتب کرنی چاہی اور کئی سال کی محنت کے بعد اوس نے ایک فہرست مرتب کی جس کا نام "اسپینی عربی کتب خانہ اسکوریال مین" ہے، اوس نے اس فہرست مین عربی مجموعہ کے مضامین کو تفصیل کیساتھ پیش کیا ہے، اور ہر کتاب کے مباحث کا خلاصہ لکھا ہے، اس پر حواشی چڑھائے ہین، اور مشکل مقامات کی شرح کی ہے، یہ فہرست ۱۷۶۰ء اور ۱۷۷۰ء کے درمیانی زمانہ مین شائع ہوئی، اور متاخرین مستشرقین مین بعض نے اوس پر یہ تنقید کی، کہ اوس مین دقت نظری اور عمق نہین پایا جاتا، لیکن عام رائے یہ ہے کہ اسکوریال مین عربی مجموعۂ کتب کا وہ بہترین ذخیرہ اور عربی خیالات کے نتائج کی بہترین نمایندگاہ کازیری کی فہرست کے شائع ہونے کے بعد سب سے اہم مسئلہ جس کی طرف لوگ متوجہ ہوئے یہ تھا کہ

اسکوریال کے اس ذخیرہ سے ان عربی روایتوں پر بحث کی جائے، جو اسپین میں عربوں کی تاریخ، اسلامی حکومت کی سیاست اور اسلامی سوسائٹی کی خصوصیات سے تعلق رکھتی ہیں چنانچہ ایک جماعت نے جس میں ایڈیس اور ماسدی شامل ہیں عربی علوم و آداب کی تاریخ پر بحث کی اور ماسدی نے ایک بڑی کتاب شائع کی جس کا نام "اسپین اور اسپین کے تمدن کی تنقیدی تاریخ" ہے، یہ کتاب ۱۸۳۰ء اور ۱۸۵۰ء کے درمیانی زمانہ میں شائع ہوئی، اور وہ اندلس کے تمدن کی تاریخ کا بہت بڑا ماخذ ہے، اور اس میں اسپین میں مسلمانوں کی سوسائٹی کی خصوصیات اور اسلامی خیالات کے مختلف گوشوں کے متعلق عمدہ روایتیں جمع کی گئی ہیں، لیکن عربی ماخذوں کے مطابق عربوں کی سیاسی تاریخ اب بھی ایک خواب فراموش رہی، لیکن اس کے بعد مستشرق یوسف کوندی امین کتب خانۂ اکادمی میڈرڈ نے سیاسی حیثیت سے عربی ماخذوں کا وسیع مطالعہ کیا، اور کئی سال اسکوریال کی قلمی کتابوں کی تحقیقات میں صرف کئے، اور اس کے بعد اپنی مشہور کتاب "اسپین میں عربوں کی سلطنت کی تاریخ" شائع کی، اس تاریخ کا پہلا حصہ ۱۸۲۰ء میں شائع ہوا، لیکن اسی سال کوندی نے وفات پائی، اس لئے اس کے مسودوں کے دو بقیہ حصے دوسرے سال شائع ہوئے، لیکن ان میں وہ خصوصیات نہ تھیں، جو اس کی تاریخ کے پہلے حصہ میں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں، بہرحال پہلے حصہ میں فتح کے زمانہ سے لیکر حکم مستنصر کے زمانہ یعنی ۳۶۶ھ (۹۷۶م) تک کی تاریخ درج کی گئی ہے، دوسرا حصہ حکومت عامریہ، ملوک طوائف کی تاریخ پر سلطنت غرناطہ کے پیدا ہونے تک شامل ہے، تیسرے حصہ میں سلطنت غرناطہ کی تاریخ ۱۴۹۲ء میں اس کے زوال تک مذکور ہے، لیکن ان دونوں حصوں میں بعض ایسی غلطیاں موجود ہیں، جو مؤلف کی نظر ثانی نہ کرنے سے پیدا ہوئی ہیں، تاہم ان میں بھی کوندی کی تنقید و نظریات کا کافی حصہ موجود ہے، کوندی نے خاص طور پر اپنے خیالات کو نہایت صراحت کیساتھ ظاہر کیا ہے، یہانتک کہ اپنی قوم اور اپنے ہم وطنوں پر بالخصوص اُن واقعات کے متعلق جو زوال غرناطہ، عربوں پر اسپینیوں کے مظالم، ان کے عیسائی بنانے، پھر ان کے آبائی وطن سے خون کے سیلاب میں نکالنے سے تعلق رکھتے ہیں، نہایت سخت الزامات

لگائی ہین، اسکی وجہ یہ ہی کہ وہ عربی ماخذون اوران کی روح سی متاثر ہوا ہے یہانتک کہ ڈ خود اپنی کتاب کے مقدمہ مین لکھتا ہی کہ اوس نے عربی ماخذون اور عربی روایتون کی اسقدر تقلید کی ہی کہ ایک یورپین جب اسکی کتاب کو پڑھے گا، تو یہ سمجھے گا کہ وہ ایک عربی مورخ کی کتاب پڑھ رہا ہی یہی اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت ہے لیکن ہالینڈ کا مستشرق رینہارٹ ڈوزی جس نے اندلس کی تاریخ کے مطالعہ مین اپنی زندگی کا بڑا حصہ صرف کیا ہی اس کتاب پر سخت حملہ کیا ہی اور لکھا ہی کہ کونڈی عربی زبان سی بہت کم واقف ہی اوس نے ہزارون واقعات غلط نقل کئے ہین لیکن اسکی یہ راے صحیح نہین ہی، کونڈی عربی روایتون کو نہایت خوبی سی نقل کرتا ہی، اسکی کتاب مین جو غلطیان ہین ان کا سبب یہ ہی کہ وہ نظر ثانی کرنے سے پہلے مرچکا تھا، اوراس نے عربی کے ان ماخذون سی جو باہم مخالف تھے، بغیر بحث و ترجیح کے بہت سی روایتین نقل کی ہین، لیکن ان غلطیون کے باوجود اسکی کتاب اندلس کی تاریخ کا بہترین ماخذ ہے،

کارڈون نے بھی اپنی کتاب "تاریخ افریقہ اوراسپین" مین کونڈی کی طرح اون عربی کتابوں سی روایتین نقل کی ہین، جو پیرس کے کتب خانہ مین موجود تھین، لیکن اوس نے اپنے مصنفون سی بھی روایتین نقل کی ہین اور صرف اخیر فصلون مین جو زوال غرناطہ سے تعلق رکھتی ہین، عربی روایتین نقل کی ہین، لیکن ان سب باتون کی باوجود کازیری کی فہرست اپنی نوعیت مین بے مثل ہی، صرف یہی نہین کہ وہ اندلس کی دماغی سرمایہ کا مکمل خلاصہ ہی بلکہ اس سی اندلس کی تمدن کی برتری و تفوق پر بھی بہت سی دلائل قائم ہوسکتے ہین، مثلاً اس ذریعہ کی بہت سی قلمی کتابون کا پتہ چلایا ہے جو ۱۰۰۹ء مین روئی کے کاغذ پر اور چند کتابین ۱۱۰۶ء مین کتان کے کاغذ پر لکھی گئی ہین، جن سی ثابت ہوتا ہی کہ اندلس کی عربون نے کاغذ سازی مین بڑا کمال حاصل کیا تھا، اس کے علاوہ بہت سی تاریخی کتابون سے ثابت ہوتا ہی کہ سب سے پہلے اہل عرب ہی نے جنگ مین ڈائنامیٹ کو استعمال کیا، اس فہرست سے اور بھی بہت سے حقائق کا انکشاف ہوتا ہی جو اسکوریال کے ظلمت کدہ مین گم ہوگئے تھے،

(ع)

اخبارِ علمیہ

سوویٹ روس مین مسلمانون کی تنظیم

موجودہ عالمگیر جنگ سے پہلے سوویٹ روس کے صحیح حالات پردۂ خفا مین تھے، برطانوی روسی اتحادنے اس پردہ کو اوٹھایا، اور برطانوی ذرائع ہی سے روس کے حالات کی دلکش تصویرین منظر عام پر آنے لگین، خصوصاً عربی زبان کے ذریعہ جو حالات چھپتے رہتے ہین، ان سے روس مین مسلمانون کی عام زندگی کا ایک اندازہ ہوتا ہے،

سوویٹ روس کے زیر علم تقریباً ۴ کرور ۵۰ لاکھ مسلمان آباد ہین، جو پوری روسی آبادی کی تقریباً ایک چوتھائی ہے، ان مین سے ایک کرور ۹۰ لاکھ ترکستان مین ہین، ایک کرور قفقاز مین، ۲۰ لاکھ سائبریا مین، ۳ لاکھ لینن گراڈ کے اطراف مین، اور بقیہ اسی طرح روس کے مختلف شہرون مین پھیلے ہوئے ہین، ان مین سے دس لاکھ سے اوپر، روس کی سرخ فوج مین بھی داخل ہو چکے ہین، اور قفقاز کے محاذ پر وہ اس وقت دشمنون کا مقابلہ کر رہے ہین،

روسی مسلمان سوویٹ اتحاد مین مساوی حیثیت سے شریک ہین، اس کے ساتھ ان کی جداگانہ داخلی تنظیم بھی قائم ہے،، روسی علماے دین کی ایک مجلس مشورت قائم ہو، اور مسلمانانِ روس کے عام انتخاب سے ان علماے دین مین سے ایک "مفتی" کا انتخاب کیا جاتا ہے، جس کو "شیخ الاسلام" کا مرتبہ حاصل ہے، آج کل اس جلیل القدر منصب پر رسولیف عبدالرحمن فائز ہین، ۱۹۳۶ء مین

انھیں مسلمانانِ روس کی نمایندہ انجمنوں نے اس عہدہ کے لئے منتخب کیا تھا، اس عہدہ پر ان کا انتخاب سابق مفتی روس فخر الدینوف رضاء الدین کی وفات کے بعد عمل میں آیا تھا، مفتی رسولیف عبد الرحمن جمعیۃ علماے اسلام روس کی صدارت عظمیٰ کے منصب پر بھی فائز ہیں، جمعیۃ علماے مسلمانان روس نے ۱۸ر جولائی ۱۹۴۱ء کے ایک منشور میں مسلمانان روس کو موجودہ جنگ میں شریک ہوکر دشمنوں سے ملک کو بچانے کی دعوت دی تھی،

مفتی رسولیف عبد الرحمن روس کے ممتاز اہل علم میں شمار کئے جاتے ہیں، دینی و علمی موضوعوں پر ان کی قابل قدر تصنیفات ہیں اس وقت ۷۰ سال کی عمر ہے، قد درمیانی، آنکھوں سے ذکاوت و فراست ٹپکتی ہے، چہرہ پر خوبصورت حنائی داڑھی ہے، جسم پر ڈھیلے ڈھالے مشرقی کپڑے، اور سر پر ترکی ٹوپی، ان کے کمرے میں عربی، فارسی، ترکی اور تاتاری زبان کی کتابوں کا قیمتی ذخیرہ موجود ہے، جن میں تقریباً ۱۰۰ نادر قلمی کتابیں ہیں، روس میں اسلامیات پر کتابوں کا یہ نادر ذخیرہ تصور کیا جاتا ہے، سوویٹ روس کے مختلف خطوں میں اسوقت ہزاروں اسلامی مدرسے، مسجدیں اور کتب خانے قائم ہیں، جن سے مسلمانان روس کی ہیئت اسلامی کی تنظیم قائم ہے، اس طرح مسلمانانِ روس ایک طرف سیاسی حیثیت سے سوویٹ روس میں مساوی طور پر شریک ہیں، اور دوسری طرف اپنی دینی جمعیتوں کے ذریعہ آزادی کے ساتھ اپنی مذہبی تنظیم بھی قائم کئے ہوے ہیں،

ہرات کے چند آثار

افغانستان کے تاریخی شہروں میں ہرات کو نمایاں امتیاز حاصل رہا ہے، خصوصاً سلطان حسین مرزا کے زمانہ میں، اس شہر نے مرکزی حیثیت سے بڑی ترقی کی، علماء، ادباء، شعراء و دیگر ارباب علم اس دور میں یہاں جمع تھے،

تیمور کی وفات کے بعد شاہ رخ نے ۸۰۷ھ/۱۴۰۵ء میں ہرات کو اپنا دارالسلطنت بنایا، کہا جاتا ہے کہ اس دور میں پورے وسط ایشیا میں سیاسی، اقتصادی و عمرانی حیثیتوں سے تنہا اسی شہر کو مرکزیت حاصل تھی، ۸۷۳ھ/۱۴۶۸ء میں امیر حسین بائی قرہ یہاں کا فرماں روا ہوا، اس نے اپنے ۴۰ سالہ دور حکومت میں ہرات کو علمی، تمدنی، اقتصادی اور عمرانی حیثیتوں سے غیر معمولی ترقی دی، مہر خود کی تاریخی تصنیف، جامی کی لطیف غزلیات اور بہزاد کے موے قلم کے شاہکار اسی تاریخی شہر کی یادگاریں ہیں،

لیکن افسوس ہے کہ ہرات کے آثار قدیمہ میں سے بہت کم توادث زمانہ کے دستبرد سے محفوظ رہ گئے ہیں، بڑا حصہ تو زلزلوں کے ہاتھوں تباہ ہوا، اور کچھ چیزیں وحشی حملہ آور سپاہیوں نے تباہ کیں، ان میں جوہر شاہ بیگم ملکہ شاہ رخ کی ایک تاریخی مسجد بھی تھی، اب اس مسجد کا تھوڑا سا حصہ محفوظ رہ گیا ہے، ان باقیماندہ آثار میں ملکہ جوہر شاہ بیگم کا مقبرہ بھی قابل ذکر ہے، یہ مقبرہ ایشیا کی خوبصورت بڑی ضریحوں میں شمار کئے جانے کے قابل ہے، ایک دوسری قابل ذکر عمارت "قلعہ شاہ رخ" بھی ہے، اسکی تعمیر ۸۱۸ھ/۱۴۱۵ء میں عمل میں آئی تھی، یہ قلعہ ان دنوں سپہ سالار عام کی قیامگاہ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے، افغانستان میں تشریف لانے والے صحابۂ کرام میں سے حضرت عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ کا مزار مبارک بھی اسی شہر میں ہے، اور زمانہ قدیم سے مرجع خلائق ہے، سلطان غیاث الدین غوری نے جب اس شہر کو پایہ تخت بنایا تو ۵۹۶ھ/۱۲۰۰ء میں یہاں ایک جامع مسجد تعمیر کرائی تھی، وہ بھی ابتک محفوظ کھڑی ہے، پھر ہرات کی شہری آبادی میں بہت سی ایسی قدیم عالیشان عمارتیں ابتک محفوظ ہیں، جن کی دیواروں پر سنہری پچی کاری کے نادر نقش و نگار بنے ہوئے ہیں، جا بجا کوفی خط میں آیات پاک منقوش ہیں، سنگ موسیٰ، سنگ مرمر، سنگ سرخ اور مرصع لاجوردی نقش و نگار سے آراستہ دیواریں کھڑی ہیں، اگرچہ ان محلات کے لئے تاریخی یادداشتیں محفوظ ہیں، مگر ان کی عالیشان عمارتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ہرات کی عمرانی ترقیوں کے دور میں شاہی خانوادوں اور امراے دولت کی قیامگاہیں ہونگی،

ترکی کی صنعتی ترقی

ترکی کو نئے انقلاب کے بعد جب سر اٹھانے کا موقع ملا، تو اس کی سب سے زیادہ توجہ ملک کی صنعتی ترقی کی طرف مبذول ہوئی، اس دور کا آغاز ۱۹۲۶ء سے شروع ہوا، حکومت ترکی نے مختلف غیر ملکی حکومتوں سے ایسے معاہدے کئے جس سے راس المال فراہم کرنے کا موقع ملا، پھر صنعتی ترقی کے لئے ملک میں مختلف قسم کے ادارے قائم کئے گئے جن میں سے ۱۹۳۲ء میں "سومار بینک" کا افتتاح خاص طور پر قابل ذکر ہے، یہ بینک مختلف صنعتوں کی ترقی میں امداد پہنچانے کے لئے قائم کیا گیا ہے، ترکی کے اس صنعتی دور میں کان کنی کو بڑی اہمیت حاصل ہوئی، اور روز بروز اس میں غیر معمولی ترقی ہوتی گئی، مثلاً ۱۹۳۱ء میں پتھر کے کوئلہ کی نکاسی صرف .... ۲۳۲ ٹن ہوئی تھی، ۱۹۳۵ء میں ترقی کر کے .... ۲۴۲ ٹن تک پہنچی، اس سے پہلے محدود ترکی میں پتھر کے کوئلہ کی نکاسی ہوتی تھی، لیکن اس مقدار میں نکلنے کے بعد نہ صرف درآمد رک گئی، بلکہ وافر حصہ برآمد ہونے لگا، اسی طرح ۱۹۳۶ء میں ترکی میں تانبا اس قدر مقدار میں نکالا گیا کہ اس سال ساری دنیا کی نصف مقدار صرف ترکی سے حاصل ہوئی، اور اسی طرح اور دوسرے معادن سے تقریباً اسی مقدار میں مختلف چیزیں نکالی گئیں، ترکی میں ایک ادارہ مستقل طور پر قائم ہے، جو جا بجا تحقیقات کر کے معادن کا اکتشاف کرتا ہے، اور ان چند برسوں میں اتنے معادن دریافت ہو چکے ہیں، جس کی مثال ترکی کی تاریخ میں کبھی نہیں گذری، ترکی کی ان صنعتی ترقیوں سے ایسی بہت سی آبادیاں آج عالیشان شہر ہیں جنھیں پچھلی بڑی لڑائی سے پہلے کوئی اہمیت حاصل نہ تھی، مگر آج وہ اپنی صنعتی ترقیوں کے باعث ترکی کے اہم شہر قرار پا گئے ہیں،

"ر"

ادبیات

مردانِ حق کی تلاش

از

جناب یحییٰ اعظمی

دے مجھکو کسی مسلمِ خالص کا پتہ بھی — یا رب ہین جہان مین علما بھی حکما بھی
سُونے نہین اب بھی ہین یہان منبر و محراب — گلبانگِ مناجات بھی ہے شورِ دعا بھی
ہے نغمۂ توحید بھی مسلم کی زبان پر — تسبیح بھی ہے زمزمۂ حمد و ثنا بھی
اللہ کا گھر اب بھی نمازون سے ہے معمور — پُرشور اذانون سے ہے عالم کی فضا بھی
ہے مسندِ ارشاد بھی تذکیر سے آباد — اصحابِ مواعظ بھی ہین اربابِ ہُدیٰ بھی
دستارِ فضیلت بھی سرون پر ہے مزین — سرتا بہ قدم زہد و تقدس کی قبا بھی
دیکھو جسے ہے دلقِ مرقع مین بھی ملبوس — اوڑھے ہوئے ہے فقر کی پارینہ ردا بھی
ہین مدرسہ مین حکمت و دانش کے بھی جلوے — پھیلی ہوئی ہے علم و معارف کی ضیا بھی
مکتب مین ادادانِ تفقہ بھی ہین موجود — قرآن و احادیث کے ہین نکتہ سرا بھی
اربابِ معارف کا بھی کچھ قحط نہین ہے — اسرار و غوامض کے ہین یان عقدہ کشا بھی
جاری ہین شریعت کے بھی احکام و اوامر — ہر سو ہے بچھی مسندِ افتا و قضا بھی

ملت کی مجالس بھی اسی طرح ہین سرگرم
اخبار پیمبر بھی ہین اذکارِ خدا بھی

ہے محفلِ عرفان بھی بپا خانقہون مین
آراستہ ہے دائرۂ صدق و صفا بھی

ہر گوشۂ خلوت کدۂ زاہدِ مرتاض
گویا کہ وہ ہے جلوہ گہ شمعِ حرا بھی

کیا کیا نہین اس عہد مین موجود ہی لیکن
مطلوب ہے اب دین کو کچھ اسکے سوا بھی

ہنگامے یہ سب کچھ ہین مگر یہ تو بتاؤ
ہین آج کہین دہر مین "مردانِ خدا" بھی

منکرِ خدا سے

از

ازجناب حسرت ترمذی بی اے ایل ایل بی

ذرے کو کس نے مہرِ منور بنا دیا
قطرے کو کس کے فیض نے گوہر بنا دیا

آئین کہان سے شمس و قمر مین تجلیان
کس نے زمین کو حسن کا پیکر بنا دیا

کس نے زمین کو اک نگہ حسن ساز سے
عرشِ برین و خلد کا ہمسر بنا دیا

کس کی لطافتین ہین چمن کی بہار مین
جلوے نے کس کے لالۂ احمر بنا دیا

سبزہ کو جوئبار کو، ابر بہار کو
کس نے نشاطِ روح کا مظہر بنا دیا

نگہت سے کس کی دامنِ گل عطر بیز ہے
صحنِ چمن کو کس نے معطر بنا دیا

اس زندگی کی رہگذر خارزار مین
کس نے شعور و عقل کو رہبر بنا دیا

اے منکرِ وجودِ خدا یہ تو غور کر
کس نے تجھے بنا دیا کیونکر بنا دیا

جوہر پہ انحصارِ حیاتِ جہان سہی
کوئی تو ہے کہ جس نے یہ جوہر بنا دیا

تو اور انحراف خدائے قدیر سے — یہ کس غرور نے تجھے خودسر بنادیا

کیا ایک سانس کا بھی تجھے اعتبار ہے!

بے اختیار! کوئی تجھے اختیار ہے؟

یادگارِ اخگر

ازجناب اخگر مرادآبادی مرحوم

سید امداد حسین صاحب اخگر مرادآبادی ایک دیرینہ سال بزرگوں کے صحبت یافتہ بزرگ تھے، اکثر شملہ میں قیام رہا، شعروسخن کا بھی ذوق تھا، رباعیاتِ اخگر کا مجموعہ بھی چھپ چکا ہے، افسوس کہ انھوں نے اپنے وطن مالوف مرادآباد سے دسمبر ۱۹۴۲ء میں اپنے وطن اصلی کی طرف مراجعت فرمائی، ع

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔ ذیل کی نظم ان کی زندگی کا آخری تبرک ہے،

تری محفل سے اٹھ کر خانہ ویرانی نہیں جاتی — نکل کر گل سے نکہت کی پریشانی نہیں جاتی
نہیں مٹتا ہے توبہ سے بھی احساسِ سیہ کاری — خطا کیا تھی خطا یہ تھی پشیمانی نہیں جاتی
سموئے انکی مرضی میں ڈبوئے راہ میں انکی — کہ تیری بات یوں بھی تو وہاں مانی نہیں جاتی
ملا کر رکھ دیا ہے خاک میں افلاک والوں کو — مگر اس پر بھی شاعر کی غزل خوانی نہیں جاتی
میں جھجکا آئینہ سے جب تو ہنس کر جھریاں بولیں — خود اپنی شکل بھی اب تجھ سے پہچانی نہیں جاتی
مذاہب نے بھی زور اپنا لگایا فلسفہ نے بھی — تری وحشت مگر اے نوعِ انسانی نہیں جاتی
حیات و موت اک چلتی ہوئی گاڑی کے پہیے ہیں — روانی تیری اے بہتے ہوئے پانی نہیں جاتی
ہنسی آتی ہے فطرت مجھ کو تیرے مسخرے پن پر — کہ پیری میں جوانی کی ہوس رانی نہیں جاتی
تحیر میں ہیں چکر میں ہیں حیراں ہیں پریشاں ہیں — وہ دنیا میں کہ جن کی انتہا مانی نہیں جاتی

مرا ہونا تو سورج کی طرح روشن ہی ہے اخگر
مگر ہوں کیا یہ لاعلمی یہ نادانی نہیں جاتی

جذباتِ اثر

از جناب اثر رحمانی رامپوری

وہ رکھیں گے محرومِ حسرت کہانتک
نہ چھیڑیں گے سازِ محبت کہان تک

سمیٹوں ترے غم کی دولت کہانتک
بجالاؤں شکرِ محبت کہان تک

اُن آنکھوں سے جو دعوتِ دید پائے
نہ کھائے فریبِ محبت کہان تک

وہ دل، جو کبھی شاد وآباد دل تھا
کہاں تک خرابِ محبت کہان تک

جو ہو کارگر، جذبۂ شوق دل مین
دبے خواہشِ عرضِ حسرت کہان تک

کبھی فتح میدانِ الفت بھی ہوگا
ہزیمت پہ ہوگی ہزیمت کہان تک

طریقِ محبت مین یہ دیکھنا ہے،
مرا ساتھ دیتی ہے قسمت کہان تک

سرِ بزم، وہ اُن کی دزدیدہ نظرین
کوئی دل کی کرتا حفاظت کہان تک

محبت کا آغاز آغازِ حسرت
محبت کا انجام حسرت کہان تک

تم ان تلخ نغمون کو شیرین بنا دو
شکستہ رہے سازِ الفت کہان تک

کبھی تو کرو احترامِ محبت
لگاتار، توہینِ الفت کہان تک

کبھی تو بنو قدردانِ محبت
کہان تک یہ کفرانِ نعمت کہانتک

کہان تک اثر ایک ہوتے نہ دو دل
نہ اٹھتا حجابِ محبت کہان تک،

باب التقریظ والانتقاد

محمد علی کی خود نوشتہ سوانحمری کا کچھ حصہ

My life: A Fragment by Maulana Mohammadali

ناشر: شیخ محمد اشرف، کشمیری بازار، لاہور ضخامت:- ۲۷۳ صفحے، قیمت:- ؎ے

جناب شیخ محمد اشرف ادھر کئی سال سے نہایت مفید اور اہم انگریزی کتابون کی طباعت و اشاعت مین خاص شہرت حاصل کر رہے ہین، ان کی مطبوعات کی عمدہ لکھائی چھپائی کا اعتراف امریکہ اور یورپ کے مختلف رسالون مین بھی کیا گیا ہے، حال ہی مین ان کی مطبوعات مین مولانا محمد علی مرحوم کی ایک تصنیف کا قابلِ قدر اضافہ ہوا ہے جس کی لکھائی چھپائی، جلد بندی اور ٹائٹل بیج محمد علی مرحوم کی اعلیٰ تحریر اور شخصیت کی شان کے مطابق ہے،

محمد علی مرحوم ہندوستان کی اُن عظیم المرتبت ہستیون مین سے تھے جنھون نے اپنی زبان، تحریر اور عمل سے ہندوستان مین ایک انقلاب عظیم پیدا کرنے کی کوشش کی، وہ نہ صرف ایک سیاسی رہنما تھے بلکہ ایک بلند پایہ صحافت نگار، انشا پرداز، فصیح البیان مقرر، شیرین کلام شاعر اور مذہب کے شیدائی تھے، ان کے جذبات واحساسات کی شدت فہم وادراک کی تیزی عمل کی بے پناہ قوت وسرگرمی اور کردار کی بلندی نے ایسے شرارے پیدا کئے کہ دیکھنے والون کی آنکھین خیرہ ہو کر رہ گئین،

محمد علی مرحوم نے اپنی قوم کے تن بے جان مین پہلے اپنی تحریرون کے ذریعہ سے روح پھونکنے

کی کوشش کی، اور انگریزی اور اردو مین ہزارون صفحات لکھکر اپنے قلب و جگر کے ٹکڑے بکھیرے، لیکن یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ باوجود ہزارون صفحے لکھنے کے وہ اپنے زندگی مین نہ مصنف ہوئے اور نہ مؤلف مختلف اوقات مین اونھون نے مختلف کتابون کے لکھنے کا ارادہ کیا، لیکن ان کی متلاطم زندگی کے مدوجزر نے کبھی ان کے ارادون کو پایۂ تکمیل تک پہونچنے نہین دیا، ان کو فرصت ملی تو جیل کی کالی کوٹھریون مین یہان وہ کتابین لکھکر اپنے حوصلون کی تکمیل کرنا چاہتے تھے، مگر ان کا قلم ان کے خیالات کے طوفان کا ساتھ نہ دیسکتا تھا، اس لئے قبل اس کے کہ اپنے دل کی حسرتین نکالین اسیری کی مدت ختم ہوجاتی تھی، اور پھر ان کے پاؤن مین چکر پڑجاتا تھا،

مذکورۂ بالا کتاب محمد علی مرحوم کے خیالات کے طوفان کا ایک ہلکا سا عکس ہی، جو انھون نے کراچی جیل مین قلمبند کرنے کی کوشش کی تھی، اس قید فرنگ مین وہ مولانا شبلی مرحوم کی سیرۃ النبی کے طرز پر انگریزی مین رسول اللہ صلعم کی ایک سیرت لکھنی چاہتے تھے، مگر ایک سال کی مدت صرف اسکے ابتدائی مراحل طے کرنے مین گذر گئی، اور انھون نے یہ خیال ترک کردیا، اور "اسلام خدا کی سلطنت" کے نام سے ایک کتاب شروع کی، جس مین انھون نے اسلام کی سچائی اور حقانیت کو اپنے نقطۂ نظر سے واضح اور روشن کرنے کی کوشش کی، لیکن ابھی وہ کتاب کی تمہید ہی ختم کرنے پائے تھے، کہ جیل سے رہا کردیئے گئے، اس کے بعد تقریباً سات سال تک اور زندہ رہے، لیکن اس اثنار مین ان کو اتنی فرصت بھی نہین ملی، کہ اس تمہید ہی پر نظر ثانی کرلیتے، ان کی وفات کے بعد اس کا مسودہ ارباب جامعہ ملیہ کو دیدیا گیا، اصلی مسودہ اس قدر ناصاف اور کٹا پٹا تھا، کہ بعض جگہ اس کا پڑھنا بھی سخت مشکل تھا، اسی لئے اب تک طبع نہ ہوسکا، پنجاب کے ایک نوجوان اہل علم جناب افضل اقبال صاحب ایم اے نے جن کو مولانا محمد علی مرحوم کی ذات اور ان کی تحریرون کیساتھ عشق ہے اوسکو بڑی محنت سے اڈٹ کرکے کتاب کی تالیف کے ۱۹ سال کے بعد شائع کیا ہے، جس کے لئے وہ بیحد شکریہ کے مستحق ہین،

زیر نظر کتاب مولانا محمد علی کی مجوزہ تصنیف، اسلام خدا کی سلطنت کی تمہید ہے، اس تمہید مین وہ صرف یہ دکھانا چاہتے تھے، کہ ان کو کلام پاک کے مطالعہ اور اسکے سمجھنے کا کب کب موقع ملا، اور اس کو سمجھ لینے کے بعد ان پر اسلام کی حقانیت کس طرح آشکارا ہوئی، اس کو بیان کرنے کے لئے انھون نے اپنی زندگی کے حالات قلمبند کئے ہین، مگر ان کی زندگی کی حکایتین خود ان کو بھی کچھ ایسی لذیذ معلوم ہوئین کہ خود بخود دراز تر ہوتی چلی گئین، محمد علی مرحوم کی زندگی مین ان کی تحریرون پر طول نگاری کا اعتراض کیا جاتا تھا، جس کا وہ یہ جواب دیا کرتے تھے کہ وہ طویل اس لئے لکھتے ہین کہ ان کو فرصت کم رہتی ہے، اور غور و فکر سے لکھنے کا موقع نہین ملتا، لیکن ان کی وفات کے بعد جب ان کی کوئی تحریر کہین ملجاتی ہے تو پڑھتے وقت جی چاہتا ہے کہ کاش تحریر کا سلسلہ ختم نہ ہونے پائے، بعض اوقات وہ اپنی تحریرون مین موضوع سے خارج باتون کا ایک طویل سلسلہ چھیڑ دیتے ہین، جو امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ قابلِ قدر قیمتی معلومات کا خزانہ بنتا جاتا ہے،

کتاب کا اصل موضوع جہان سے شروع ہوتا ہے، وہین پہنچکر یہ کتاب ختم ہو جاتی ہے، لیکن یہ تمہید بجائے خود ایک دلچسپ کتاب ہو گئی ہے، اس مین محمد علی مرحوم کی آپ بیتی ہے، مرحوم کی کہانی خود ان کی زبانی سننے مین اور بھی موثر اور پُر کیف ہو جاتی ہے، بظاہر انھون نے اپنی زندگی کے حالات قلمبند کئے ہین، لیکن اس سلسلہ مین انھون نے اپنے زمانہ کی معاشرت، تعلیم، سیاست اور مذہب کے بہت سے اہم مسائل اور نکات پر روشنی ڈالی ہے جس سے ان کی یہ سوانحمری اس عہد کے معاشرتی، تعلیمی، سیاسی اور مذہبی حالات کی آئینہ دار بن گئی ہے، اور اس کے مطالعہ مین ایسی لذت ملتی ہے، کہ اس کے سامنے ساری ذہنی لذتین ہیچ معلوم ہوتی ہین،

پہلے باب کی سرخی "گھر اور اسکول کی تعلیم" ہے، اس باب کے ۳۱ صفحے ہین، اس مین مولانا مرحوم نے اپنی ابتدائی تعلیم سے آکسفورڈ کے زمانہ قیام تک کے حالات درج کئے ہین، ان کوائف مین محمد علی

کے گھر کی فضا خاندان مین انگریزی تعلیم سے عصبیت کے باوجود ان کی بیوہ مان کے بلند تعلیمی حوصلون اور برادرانہ شفقت کے ساتھ مولانا شوکت علی کی مخلصانہ نگرانی کا ذکر ہے، مگر محمد علی کی طبیعت کی بےچینی اور بے قراری ان کے قلم مین بھی منتقل ہو جاتی ہے، وہ اپنی ابتدائی تعلیم کے حالات قلمبند کرنا چاہتے ہین، لیکن اس سلسلہ مین ان کا قلم بچون کی ابتدائی خصوصاً مذہبی تعلیم کے نقائص اور معائب پر چل پڑتا ہے، وہ اپنی والدہ کی شفقت و محبت کی لذت کو یاد کرنا چاہتے ہین، اس مین ان کا قلم ہندوستان کی عورتون کی تعلیمی محرومی اور معاشرتی بیچارگی پر رواں ہو جاتا ہے، وہ علی گڑھ مین اپنی تعلیم کا ذکر کرنا چاہتے ہین لیکن ان کا دل اس عظیم الشان اسلامی درسگاہ مین مذہبی تعلیم کی کمی، اور اسکی جانب سے بے توجہی پر خونچکان ہو جاتا ہے، چنانچہ ان اسی صفحون مین محمد علی مرحوم کے نہ صرف گھر، اسکول، کالج اور یونیورسٹی کے تعلیمی حالات ہین، بلکہ اس عہد کی تعلیم اور معاشرت پر ایک بہت ہی ناقدانہ تبصرہ ہے،

دوسرے باب کا عنوان "بیداری" ہے، اس مین مرحوم نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ ریاستون کی ملازمت کے بعد ان مین کس طرح ملکی اور قومی خدمت کا جذبہ پیدا ہوا، کامریڈ کے اجراء کے ساتھ انکے جذبات کا نشو و نما دلچسپ داستان ہے، بلقان کی جنگ اور ترکون کے خلاف برطانیہ کی پالیسی نے انکے پرجوش قلب و دماغ کو کوہ آتش فشان بنا دیا تھا، جس کے شرارون سے وہ تمام مخالف فضا کو خاکستر کر دینا چاہتے تھے، ان ہی جذبات کے ماتحت انھون نے اسلام کا گہرا مطالعہ شروع کیا، اور اسکے نور سے ان کا قلب جتنا زیادہ منور ہوتا گیا، اتنا ہی وہ اسلام کے فدائی اور شیدائی ہوتے گئے، اور ان تمام چیزون کے لئے جن کا تعلق اسلام سے تھا، مرمٹنا اپنی زندگی کا نصب العین بنایا،

تیسرے باب کا عنوان "میری مشکلات اور ان کا علاج" ہے، محمد علی مرحوم کی قومی زندگی کا آغاز صحافت نگاری سے ہوتا ہے لیکن ان کی بلاخیز صحافت نگاری نے ان کو بلاؤن مین گرفتار کر دیا، جنگِ بلقان مین ترکون پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے جا رہے تھے، محمد علی مرحوم اپنی تحریرون کے ذریعہ

مسلمانون کی سیاست مین ایک طوفان بپا کرنے چاہتے تھے، لیکن پریس ایکٹ کی پابندیان ان کے حوصلون کو کچلنا چاہتی تھین، حکومت کی بندشون اور ان کے جذبات کی آزادی مین تصادم ہوا، اور وہ پہلے مہرولی پھر لینڈسون اور پھر چھندواڑہ مین نظربند کر دیئے گئے، یہ تمام واقعات کل اٹھائیس صفحون مین ختم ہوگئے ہین، محمد علی مرحوم جیل کی کوٹھری مین بیٹھکر جیلر کی نگرانی مین یہ حالات قلمبند کر رہے تھے، اس لئے ظاہر ہے کہ وہ دل کھول کر اپنے جذبات کو کاغذ پر منتقل نہین کر سکتے تھے، لیکن جملون اور سطرون کے درمیان وہ تمام چنگاریان موجود ہین، جن سے ان کی آتشین طبیعت کی تشکیل ہوئی تھی،

چوتھے باب کی سرخی "انکشاف" ہے، مولانا محمد علی چھندواڑہ مین ساڑھے تین سال نظربند رہے یہان کی "فرصت" اور "اطمینان کلی" مین وہ حقائیت کے ایسے "سرچشمے" مین غرق ہوگئے جو تیرہ سو سال کے گرد و غبار سے نہ اٹ سکا ہے، اور نہ خشک ہو سکا ہے (صـ۸) یہ پورا باب کلام پاک کے محاسن پر ہے کہین ذاتی تاثرات بیان کئے گئے ہین، کہین یورپین اہل قلم کے اعتراضات کے دندان شکن جوابات دیئے گئے ہین، کہین کلام پاک کے رموز و نکات آشکارا کئے گئے ہین، کہین عیسائی مذہب کے مقابلہ مین اسلام کی خوبیان دکھائی گئی ہین، تحریر کا انداز بہت ہی والہانہ ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جام الست کا سرشار بے خودی مین لکھ رہا ہے، کلام اللہ کے مطالعہ سے جو اثرات محمد علی کے قلب پر مترتب ہوئے، اس کے لطف و اثر کا اندازہ تو اصل انگریزی ہی سے ہو سکتا ہے، ہم صرف اس کا مطلب پیش کرنے کی کوشش کرتے ہین:

"مین نے خدا کو پالیا، اوس نے بنی نوع انسان کو جو پیام دیا تھا، اسکو پالینے کے بعد مین نے اپنے کو پالیا، میری زندگی مین نئے معنی پیدا ہوگئے، زندگی کا اصلی مقصد مجھکو معلوم ہوگیا جس کا احساس اب تک نہ ہوا تھا، اس کے بعد میری گذشتہ زندگی جو میرے نزدیک مشرق کے ایک نیند سے متوالے چھوٹے بر اعظم (یعنی ہندوستان مین) بہت ہی مشغول گذری تھی، بالکل

خالی اور بے کیف معلوم ہوئی "

پانچوان باب "یورپ کا دنیا دارانہ رنگ" کے عنوان سے شروع ہوتا ہے، اس مین رینن اور ایچ جی، ویلز کی بعض تصانیف پر ناقدانہ نگاہ ڈالی گئی ہے، اور یہ بتایا گیا ہو کہ عیسائیت مذہبیت اور روحانیت سے دور ہو کر کس طرح دنیاوی آلائیشون سے آلودہ ہو گئی ہو، حالانکہ شروع مین عیسائی مذہب کی تعلیم وہی تھی جو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے از سر نو پیش کی ہیکن عیسائی مذہب یونانی خیالات سے ملوث ہو کر اپنے اصلی سرچشمہ سے دور ہو گیا، اسلام پر بھی یہ دور آیا، لیکن سوائے فلسفیون کی ایک خاص جماعت پیدا ہو جانے کے خدا کے آخری نبی کا پیغام اس کے اثرات و تمام خطرات سے محفوظ رہا،

چوتھا اور پانچوان باب خالص علمی ہے، لیکن چھٹے باب مین جس کی سرخی "نئی سرگرمی" ہے، پھر کچھ ذاتی حالات آگئے ہین، مگر اس مین زیادہ تر اسلام کے محاسن کی جلوہ آرائیان ہین، اس باب کے شروع مین ڈاکٹر اقبال کی شاعری کا بھی ذکر ہے، محمد علی مرحوم نے اقبال کی شاعری کی دل کھول کر داد دی ہے، اسکی تعریف مین رطب اللسان ہین، اور یہان تک اس کا اعتراف کرتے ہین کہ اسلام کے سمجھنے مین ان کو اقبال کی شاعری سے بھی مدد ملی، محمد علی پر اسلام کے حقائق کا انکشاف جتنا زیادہ ہوتا جاتا تھا، اتنا ہی وہ یورپ کی ذہنی کجروی اور مذہبی گمراہی سے بیزار ہوتے جاتے تھے، ایچ جی ویلز کی بعض تصانیف کو پڑھکر ان کا بے اختیار جی چاہا، کہ وہ یورپ جاکر اہلِ یورپ کو اسلام کا صحیح پیام پہنچائین، کیونکہ ان کو یقین تھا کہ یورپ کی نجات اسلام ہی کے ذریعہ سے ہو سکتی ہے، اس سلسلہ مین یورپ کی قومیت کے تخیل پر ایک عالمانہ تنقید بھی ہے، محمد علی مرحوم ڈاکٹر اقبال کی طرح قومیت کے گورکھ دھندون کے قائل نہ تھے، وہ اس کو بنی نوعِ انسان کی یگانگت اور یکجہتی کے لئے سنگِ راہ سمجھتے تھے،

اس باب مین چھندواڑہ کی نظر بندی کے زمانہ کی زندگی، وہان سے رہائی، یورپ کو وفد خلافت کی روانگی، وہان اس کی کارگذاری، وہان سے واپسی، اور پھر ہندوستان کی سیاست مین مجاہدانہ

سرفروشی، وائیٹر کی گرفتاری، مقدمۂ کراچی اور آخر مین زمانۂ اسیری کے بہت ہی دلچسپ کوائف ہین کہین کہین تو یہ داستان اتنی پر لطف ہو جاتی ہے کہ جی چاہتا ہے کہ اس کا لطف ختم نہ ہونے پائے، اور کہین یہ اتنی دردناک ہو جاتی ہے، کہ بے اختیار آنکھون سے آنسو رواں ہو جاتے ہین، اس پورے باب مین محمد علی مرحوم خدا کے ایک عاجز بندہ، ایک عاشقِ رسول، ایک مجاہدِ اسلام، ایک جانبازِ ملت، اور ایک شیدائی قوم کے مختلف جلوون مین نظر آتے ہین، اور پڑھنے والا نہ صرف ان کی تحریر، بلکہ ان کی شخصیت سے خواہ مخواہ مسحور ہو جاتا ہے،

ساتوان باب "اسلام کہان سے شروع ہوتا ہے، اور کس طرف جاتا ہے" کے عنوان سے شروع ہوتا ہے، یہ باب جو نسبتہً زیادہ طویل اور دلچسپ مضمون پر مشتمل ہے، اس مین اسلام کے مختلف عقائد کے تاریخی ارتقاء پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور جا بجا مختلف قسم کی مفید بحثین کی گئی ہین، ان مباحث کی گتھیون مین مرحوم نے اسلام کی اصلی اسپرٹ، اسکی لازوال قوتِ حیات اور قوتِ تجدید کو دکھانے کی کوشش کی ہے، جس کے مطالعہ کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے، کہ ذہن مین ایک جلا ہو گئی ہے،

اس باب کے بعد ایک ضمیمہ ہے، حالانکہ اصل کتاب کا آغاز یہین سے ہونے کو تھا، لیکن آغاز خاتمہ بنکر رہ گیا ہے، اس لئے لائق مرتب نے ناظرین کی سہولت کے خیال سے اس کو بطور ضمیمہ منسلک کر دیا ہے، اس ضمیمہ کا عنوان "غلط فہمی اور اس کے اسباب" ہے، اس مین محمد علی مرحوم کے مخاطب یورپ کے باشندے اور عیسائی مذہب کے پیرو ہین، اور انھون نے ان کو انہی کے انداز مین اسلام کے محاسن کو سمجھانے کی کوشش کی ہے، افسوس ہے کہ یہ کتاب ناتمام رہ گئی، اگر کتاب مکمل ہو جاتی تو اسلام کا پیام اہلِ مغرب تک ایک بہترین طرز، بہترین انشاء اور بہترین اسلوبِ بیان کے ذریعہ سے پہونچ جاتا، لیکن آہ! کہ اس "جامِ کوثر" کا سرشار اپنی تمام سرشاریون کے ساتھ قبل از وقت حوضِ کوثر پر پہنچ گیا،

کتاب کی قیمت ۶ہے، لیکن کاغذ اور طباعت کی موجودہ گرانی کے لحاظ سے یہ قیمت کچھ زیادہ نہین، ترقی یافتہ قومون مین ان کے رہنماؤن کی جو محبوبیت ہوتی ہے، اس کا ثبوت یہ بھی ہے

جاتا ہے کہ ان کی تصانیف مطبع سے نکلتے ہی گھر گھر اور گوشے گوشے مین پہونچ جاتی ہین، مسلمانون کا محمد علی مرحوم سے زیادہ محبوب اور ہر دلعزیز رہنما کون تھا، ایسی حالت مین کیا یہ ہندوستان کے مسلمانون سے توقع نہین کی جاسکتی ہے، کہ وہ اس کتاب کو ہاتھون ہاتھ لے کر صحیح معنون میں محمد علی مرحوم کی ذات سے اپنی شیفتگی کا ثبوت دین گے، "ص ع"

مقدمۂ رقعات عالمگیر

اس میں رقعات پر مختلف حیثیتوں سے تبصرہ کیا گیا ہے، جس سے اسلامی فن انشاء اور شاہانہ مراسلات کی تاریخ، ہندوستان کے صیغۂ انشا کے اصول نہایت تفصیل سے معلوم ہوتے ہیں، بالخصوص خود عالمگیر انشا اور اسکی تاریخ کے مآخذ اور عالمگیر کی ولادت سے برادرانہ جنگ تک کے تمام واقعات و سوانح پر خود ان خطوطات و رقعات کی روشنی میں تنقیدی بحث کی گئی ہے

قیمت:- للعہ ر، ۳۹۷ صفحے،

رقعات عالمگیر

اورنگ زیب عالمگیر کے خطوط و رقعات جو زمانہ شہزادگی سے برادرانہ جنگ تک اعزہ کے نام لکھے گئے ہیں، اس جلد میں جمع کئے گئے ہیں، اور ان سے علم ادب، سیاست اور تاریخ کے بیسیوں حقائق کا انکشاف ہوتا ہے،

قیمت:- سے ر، ۴۸۷ صفحے،

"منیجر"

مطبوعات جدیدۃ

سیرت سید احمد شہید مولفہ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی تقطیع چھوٹی ضخامت ۵۵۴ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت عہ پتہ معین الدہر صاحب نمبر ۳ گوئن روڈ لکھنو۔

ہندوستان مین جن قومون کے ذریعہ اسلام پہنچا وہ خود اسکی صحیح نمایندہ نہ تھین، اسلئے وہ اپنی اصلی شکل مین نہین پہونچا، اور اس مین لانے والون کے بہت سے عقائد ورسوم شامل ہوگئے تھے، پھر ہندوستان کے عقائد وخیالات نے ان مین مل کر اسکی شکل اور بدل دی، لیکن جب تک یہان اسلامی حکومت قائم رہی، کم از کم سیاسی حیثیت سے اسلام سربلند رہا، پھر حکومت کے زوال کے ساتھ ساتھ مسلمانون کی سیاسی قوت بھی زوال پذیر ہوتی گئی، اور آخر مین یہ نوبت پہنچ گئی تھی، کہ حکومت برائے نام رہ گئی تھی، اس پر دوسری قومون کا غلبہ واقتدار تھا، ملک بھر مین طوائف الملوکی بپا تھی، مذہب اوہام وخرافات اور مشرکانہ رسوم کا مجموعہ بن گیا تھا، اس نازک دور مین حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلویؒ اور ان کے خاندان نے دین وسیاست دونون مین تجدید واصلاح کی کوشش کی لیکن یہ کوشش علمی تھی، اس لئے اس کا اثر عقائد وخیالات کی اصلاح تک محدود رہا، سیاسی تجدید واصلاح کیلئے مسلمانون مین خونِ زندگی دوڑانے کی ضرورت تھی، اس کام کے لئے خدا نے حضرت مولانا سید احمد بریلویؒ اور مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کو پیدا کیا جنھون نے ایک طرف دین کی اصلاح وتجدید کا صور پھونکا، دوسری طرف مسلمانون مین جہاد کی روح بیدار کرکے ہندوستان مین خالص اسلامی حکومت کے قیام کی مجاہدانہ کوشش کی، یہ مسلمانون کے جہاد آزادی کی سب سے بڑی انقلابی کوشش تھی، جو اگر کامیاب ہوگئی

ہوتی، تو آج ہندوستان کی تاریخ دوسری ہوتی لیکن مسلمانون کی بدقسمتی اُن کے نفاق اور دوسری تو تون کی دراندازی سے اس کا خاتمہ ناکامی پر ہوا، اس جہاد حریت مین سارے ہندوستان کے مسلمان شریک تھے، اُدھر اور آسام سے لیکر پشاور تک اس کا نہایت مرتب اور مکمل نظام قائم تھا، اگرچہ یہ کوشش ناکام رہی، لیکن بے نتیجہ نہین رہی، اس کے اثر سے مسلمانون مین ایک ایسی جماعت پیدا ہو گئی، جو اسلام کی صحیح حامل، اُور جوشِ جہاد سے معمور تھی، اوس نے اپنا کام برابر جاری رکھا، اور اس کے ذریعہ دین و سیاست کی بڑی گران قدر خدمات انجام پذیر ہوئین، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اسی جماعت کی یادگار تھے، آج بھی خدا کے فضل سے اسکے باقیات صالحات موجود ہین، سید صاحبؒ کے حالات مین یون تو پرانے طرز کی بعض کتابین موجود ہین لیکن ضرورت ایسی کتاب کی تھی جس مین موجودہ ذوق کے مطابق سید صاحب کے کارنامون کو پیش کیا جائے، اس ضرورت کو اسی دودمانِ سیادت کے ایک صالح نوجوان مولانا سید ابوالحسن ندوی استاد ندوۃ العلما نے پورا کیا، اور سید صاحب کے حالات مین یہ جامع کتاب لکھی، اس مین سید صاحب کے خاندانی حالات، سیرت و سوانح اور ان کے دینی اصلاحی اور سیاسی مجاہدات اور کارنامون کو تفصیل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، کتاب کے شروع مین پس منظر کے طور پر اس عہد کی دنیاے اسلام خصوصًا ہندوستان کے مسلمانون کی دینی و سیاسی حالت کا مختصر خاکہ دیدیا گیا ہے، اور مولٰنا سید سلیمان ندوی کے قلم سے "مسافر اسلام ہندوستان کے غربتکدہ میں" کے عنوان سے ہندوستان میں اسلام کے انحطاط و تجدید کی بڑی موثر سرگذشت ہے، آخر میں سید صاحب کے خلفاء اور متوسلین کے حالات اور انکے کارناموں کا ذکر ہے، اس کتاب کا پہلا اڈیشن ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا تھا، اب مزید ترمیم و اضافوں کے بعد یہ دوسرا اڈیشن نکلا ہے، جو پہلے سے زیادہ مکمل ہے، یہ کتاب درحقیقت ہندوستان کے مسلمانوں کی دینی تجدید و اصلاح اور اُس دور کے جہاد آزادی کی تاریخ ہے، جب ہندوستان مین انگریزون کا قدم بھی پورے طور سے نہ جما تھا، اور آزادی کا تصور کسی دوسری قوم کے خواب و خیال مین بھی نہ آیا تھا،

حکومتِ الٰہی از مولینا ابو المحاسن محمد سجاد مرحوم تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۲۰ صفحے کاغذ کتابت

وطباعت بہتر قیمت معلوم نہین، پتہ:۔ مکتبہ سیفیہ مونگیر و کتب خانہ فخریہ مراد آباد،

مولانا ابو المحاسن محمد سجاد مرحوم نائب امیر شریعت بہار ان صاحب فکر و نظر علما رمین تھے جنھون نے حکومت الٰہیہ یعنی اسلامی نظامِ حکومت کے تمام گوشون پر برسون غور و فکر کیا تھا، اوران کے دماغ مین اس کا پورا خاکہ موجود تھا، اسکو وہ قلمبند بھی کرنا چاہتے تھے لیکن سیاسی مصروفیتون نے اس کا موقع نہ دیا، اور ابھی اسکی تمہید لکھنے پائے تھے، کہ پیام اجل آگیا، مولٰنا منت اللہ صاحب رحمانی نے اسی کو تبرکاً شائع کر دیا ہے، مولانا مرحوم کا نقطۂ نظریہ تھا، کہ ایک ایسے عالمگیر عادلانہ قانون و نظام سازی کے لئے جو ساری دنیا مین نظم و سکون قائم کر سکے، اور انسان کے فلاح و سعادت کا ضامن ہو، جن کمالات اور جس بصیرت کی ضرورت ہی اس سے انسان محروم ہے، اس لئے اس کے بنائے ہوئے سارے قوانین اور نظام بھی ناقص ہین، چنانچہ آج تک دنیا کی کوئی قوم اور کوئی سلطنت ایسا عالمگیر عادلانہ قانون نہ بنا سکی، اور وہ صرف خدا کی ہدایت اور انبیا علیہم السلام کی تعلیمات کی روشنی ہی مین بن سکتا ہی، چنانچہ اس کتاب مین اسی نقطۂ نظر سے قوانین اور دستورون کے مقاصد و مصالح، انسانون کے بنائے ہوئے قوانین اور دستورون کے نقائص اور خرابیون کو دکھا کر خدا کی کتاب اور انبیا علیہم السلام کی تعلیمات کی روشنی مین قانون اور دستور سازی پر اصولی بحث کی ہی، افسوس ہے کہ یہ رسالہ اصل کتاب کی صرف تمہید ہے، تاہم اس سے اسلامی نظامِ حکومت کے بارہ مین مولانا کے نقطۂ نظر اوران کی قانونی فکر و نظر کا کسی حد تک اندازہ ہوجاتا ہے،

شانِ خدا مؤلفہ جناب مولانا عبید الرحمٰن صاحب تقطیع چھوٹی ضخامت ۵۰ صفحے، کاغذ

کتابت وطباعت بہتر، قیمت ۸؍ پتہ کتابستان پوسٹ بکس نمبر ۲۱۴ ۱۶ نمبر ۳ بمبئی،

لائق مؤلف نے یہ کتاب وجود باری اور توحید باری کے اثبات مین لکھی ہے، اس مین یہ

دکھایا ہو کہ وجود باری کا اعتقاد انسان مین فطری ہو اور اس بارہ مین یونان کے قدیم حکما اور یورپ کے جدید فلاسفہ کے اقوال اور ان کے دلائل نقل کئے ہین، اور ملحدون اور مادہ پرستون کے شبہات نقل کرکے اُن کی تردید کی ہو، اور وجود باری پر کلام اللہ کے دلائل بیان کرکے دکھایا ہو کہ وہ تمام دلائل جو فلاسفہ نے وجود باری اور توحید باری پر دئیے ہین وہ سب کلام اللہ مین موجود ہین، صرف فرق یہ ہو کہ اوس نے منطقی طریقہ اختیار نہین کیا ہو، پھر توحید باری پر کلام اللہ کے دلائل نقل کرکے دلائل کی مختلف قسمون پر تبصرہ کیا ہو، اور اسلام اور دوسرے مذاہب کے تصور توحید کا موازنہ کرکے دکھایا ہو کہ کوئی مذہب شرک سے خالی نہین ہو، اور خالص توحید صرف اسلام نے پیش کی ہو، آخر مین صفاتِ الٰہی کا ذکر اور ان پر تبصرہ ہو، کتاب مفید ہو، بعض بحثین مختصا سیرۃ النبی سے ماخوذ ہین، کہین کہین انکا تمام حوالہ بھی دیدیا گیا ہی

علم الاقوام حصہ اول و دوم، تقطیع بڑی، ضخامت ۲۶۵ و ۱۶۴ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت ۴؎ و ۳؎، پتہ انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی،

نئے علوم مین علم الاقوام نہایت مفید اور دلچسپ علم ہو، اس مین تاریخ تمدن کے نقطۂ نظر سے ان قدیم اور موجودہ انسانون اور اقوام و قبائل کی جو تہذیب کے دور طفولیت مین ہین اور جن کی کوئی تاریخ موجود نہین ہو، ذہنی تاریخ یعنی ان کی تنظیم خاندان و قبائل کی تقسیم، رسم و رواج، معاشرتی خصوصیات مذہب، صنعت و حرفت وغیرہ جملہ تہذیبی پہلوؤن پر بحث کیجاتی ہو، اردو مین اس موضوع پر کوئی قابل ذکر کتاب نہ تھی، ڈاکٹر بیرن عمر رالف ایہرن فلس نے جو علم الاقوام کے بڑے عالم ہین اس موضوع پر انگریزی میں دو جلدون مین یہ کتاب لکھی تھی، ڈاکٹر عابد حسین خانصاحب نے اردو مین اس مفید کتاب کا ترجمہ کیا ہو، اس کے پہلے حصہ مین علم الاقوام کے موضوع و مقصد، اسکی تاریخ، اسکے طریق تحقیق پر بحث، اور دنیا کے اولین تہذیبی حلقون اور تنظیمی حیثیت سے مختلف تہذیبون کا ذکر ہو، دوسرے حصہ مین مختلف ملکون افریقہ، شمالی و جنوبی امریکہ، جزائر بحرالکاہل، آسٹریلیا، ہندوستان اور دوسرے مشرقی ملکون کی اقوام کی ذہنی تاریخ اور ان کے تمدنی و معاشرتی حالات ہین، کتاب مفید اور پراز معلومات ہے، ترجمہ کی خوبی کیلئے جناب مترجم کا نام کافی ہو،

فردوس تخیل ز، خ، ش مرحومہ تقطیع بڑی ضخامت ۳۰۲ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر،
قیمت مجلد ۶؎ پتہ دارالاشاعت پنجاب لاہور،

آج سے پندرہ بیس سال پہلے کی ادبی دنیا میں ز، خ، ش یعنی زاہدہ خاتون شروانیہ مرحومہ بنت نواب مزمل اللہ خان مرحوم کو بڑی شہرت حاصل تھی، آج بھی یہ نام نامانوس نہیں ہے، مرحومہ تعلیم یافتہ مسلمان خاتون کا قابلِ فخر نمونہ تھیں، ان کی ذات اعلیٰ تعلیم کے ساتھ تمام لوازمِ شرافت سے آراستہ تھی، ان کا شعری وادبی ذوق اچھے سے اچھے مرد ادیبوں اور شاعروں سے کم نہ تھا، ایک زمانہ میں دنیائے شاعری ان کے ترانوں سے گونج رہی تھی، مرحومہ نے اپنی زندگی ہی میں اپنے کلام کا ایک حصہ جو منظومات پر مشتمل ہے، مرتب کر لیا تھا، جسکی اشاعت کی نوبت ان کی وفات کے بیس سال بعد اب آئی ہے، اس مجموعہ میں تاریخی، مذہبی، قومی، سیاسی، اصلاحی مختلف موضوعوں پر ۱۱۲ نظمیں ہیں، یہ نظمیں جذبات وخیالات اور زبان وادب دونوں حیثیتوں سے اردو کے کسی بلند پایہ کلام سے کم نہیں، ان سے مرحومہ کے ادبی ذوق کے ساتھ ان کی علمی استعداد، وسعتِ معلومات، حالاتِ زمانہ سے واقفیت، اور مذہبی و قومی جذبات کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے، افسوس یہ ہے کہ مرحومہ کا انتقال عین عالم شباب یعنی کل ۲۰ سال کی عمر میں ہو گیا، ورنہ عمر اور مشق و ممارست کی پختگی کے ساتھ ساتھ ان کا کلام بہت اونچا جاتا، آج کل تعلیم یافتہ مسلمان خواتین کی کمی نہیں، بلکہ ان کی ترقی چشم بددور روز افزوں ہے، ان میں شاعرہ بھی ہیں، اور ادیبہ بھی، اور ایسی رنگین نوا کہ ان کی رنگینی پر داغ کی شوخی بھی شرما جائے، لیکن کاش ان میں سے ایک مثال بھی ایسی نکل سکتی، جو علمی کمالات اور نسوانی اوصاف میں نہ سہی، کم از کم ادبی ذوق ہی میں ز، خ، ش کا ناتمام نمونہ پیش کر سکتی،

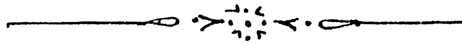
"م"

"جلد ۵۰" ماہ رجب المرجب ۱۳۶۱ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۴۲ء "عدد ۲"

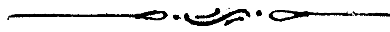
مضامین

شذرات

الحمدللہ کہ اب دارالمصنفین کی آبادی شروع ہوگئی ہے، رفقا، اور مولانا مسعود علی صاحب واپس آچکے ہیں، اوسط اگست تک خاکسار کی بھی وطن سے واپسی ہو جائے گی، حیاتِ شبلی کی ملتوی شدہ چھپائی کا کام اجرا پائے گا، اور تالیف و تصنیف کے دوسرے سلسلے بھی جاری ہوں گے،



اس دوران مین احباب کے بہت سے خطوط کے جواب مین خاکسار سے تعویق و تاخیر ہوئی جس کا افسوس ہے لیکن اس ہیچدان کی تنہائی اور بعض ذاتی افکار و مشاغل کو خیال میں رکھکر امید ہے کہ احباب میری فروگذاشت کو معاف فرمائیں گے،



جولائی کے اواخر مین پٹنہ میں بہار اردو کانفرنس کا اجلاس ہوا، خطبے ہوے، تقریرین ہوئین، پیغام پڑھے گئے، تجویزین منظور ہوئین، اور ہندوستانی زبان کی تحریک کے حسن و قبح پر معرکہ آرائیاں بھی رہین، خوشی اس کی ہے کہ اس صوبہ کے حامیانِ اردو اور شائقینِ ادب نے "نشستند و گفتند" کے فریضہ کا احساس تو کیا، عمل کا قدم تو اس کے بعد اٹھیگا،

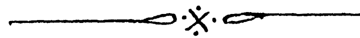


اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ بیس پچیس برس کے اندر اس صوبہ کے تعلیم یافتون مین اپنی زبان کی اشاعت،

اصلاح اور صحت کے خیال نے بڑی ترقی پائی ہے، اور ذوق ادب کا وہ ہنر جس کا دعویٰ پہلے صرف خواص کو تھا اب وہ عام ہے، لیکن یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ کسی صوبہ میں اس کی زبان کی ترقی کا اندازہ اس صوبہ کے منشورات اور مطبوعات ہی سے کیا جا سکتا ہے، اب غور کرنا چاہئے کہ اس صوبہ میں اخبار اور رسالے اور کتابیں سال میں کتنی چھپتی ہیں اور کتنی بکتی ہیں، اس دوڑ میں اگر اردو کے حامی یہاں پیچھے ہیں، تو صرف زبانی دعوےٰ زبان کی ترقی کو کسی صوبہ میں آگے نہیں بڑھا سکتا ہے،



اس جنگ نے ریڈیو کی شکل میں دنیا کی زبانوں میں برق کی سی رفتار پیدا کر دی ہے، برلن، لندن، اٹلی، جاپان، ٹرکی، مصر اور خدا جانے کن کن ملکوں سے اردو یا ہندوستانی زبان میں خبروں اور تقریروں کی اشاعت ہر روز ہوتی رہتی ہے، اور اس کی موجِ آواز فضائے عالم میں پھیل کر خدا جانے کہاں کہاں پہنچتی ہے، جاپان کو چھوڑ کر باقی ملکوں سے سلیس زبان میں خبریں اور تقریریں پھیلائی جاتی ہیں، اور اپنی اپنی زبان کے باوجود اسی زبان میں ہوتی ہیں، جس کے اندر اشاعت کی قدرتی صلاحیت موجود ہے، اور یہ طبعی دلیل اس زبان کے مستقبل کے دعوی کے لئے ناقابلِ تردید ہے،

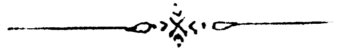


اس عالمگیر انتشار و پریشانی خاطر کے دور میں بعض ایسے خادمانِ علم ہیں جو اطمینان کے ساتھ زمانہ کے حالات سے بے پروا ہو کر علمی خدمات میں مصروف ہیں، چنانچہ ایک دوست کی اطلاع ہے کہ مصر سے مشرقی علوم کے بعض شائق حکیم ابوریحان بیرونی کی کتاب الصیدلہ کی اشاعت کی کوشش میں مصروف ہیں، اس کا عربی متن جو بروصہ واقع ٹرکی سے ملا ہے، اس میں جا بجا بیاض پائے جاتے ہیں، مقابلہ اور تصحیح کے لئے اس کے دوسرے نسخوں کی تلاش ہے، اصل عربی نہ ہو تو اس کے فارسی ہی نسخہ ملیں، اسی سلسلہ میں ہندوستان کے اہل علم سے بھی اس کے متعلق استفسار ہے، اگر ہمارے

ناظرین میں سے کسی کو اس کا پتہ معلوم ہو تو دریغ نہ فرمائیں،



صوبۂ متحدہ کے تعلیمی محکمہ نے اپنی ہندوستانی ایکاڈیمی کی رکنیت کے لئے دارالمصنفین سے ایک رکن کی نامزدگی کی خواہش کی ہے، یہ سرکاری مراسلہ صدرنشین کے نام ہے، امید ہے کہ دارالمصنفین کے صدرنشین نواب صدریار جنگ مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی دارالمصنفین کی طرف سے کسی رکن کو نامزد فرمائیں،



جنگی ضرورتوں نے ریلوے پارسلوں پر جو پابندیاں عائد کی ہیں اس سے تجارتی اشیاء کی آمد و رفت کی راہ میں جو دقتیں پیدا ہو گئی ہیں اس سے کتابوں کے خرید و فروخت پر بہت بُرا اثر پڑ رہا ہے، اس حالت سے دارالمصنفین کے شعبۂ اشاعت کا متأثر ہونا بھی ناگزیر ہے، اور نہیں کہا جا سکتا ہے کہ دارالمصنفین کی مالی حالت پر اس کے جو اثرات پڑیں گے وہ کہاں تک اس کے لئے قابلِ برداشت ہو سکیں گے، ضرورت ہے کہ ہمارے احباب ڈاک کے ذریعہ سے کتابوں کے طلب کرنے کے سلسلہ کو وسعت دیں، تاکہ ان کا یہ ادارہ اپنی زندگی کے ان مشکل دنوں کو کسی طرح کاٹ سکے،



مقالات

اوصافِ نبوّت

اور

قرآنِ مجید

(وصف شہید یا شاہد)

از مولانا عبد السّلام ندوی

قرآن مجید میں پیغمبروں کے جو پیغمبرانہ اوصاف مذکور ہیں، ان میں ایک وصف شہید یا شاہد ہے، جس کے معنی قرآن مجید کے ترجموں اور عام تفسیروں میں گواہ کے لئے گئے ہیں، اور پیغمبروں کی اس گواہی کی مختلف توجیہیں کی گئی ہیں، اس مضمون میں پیغمبروں کے تمام پیغمبرانہ اعمال و فرائض کو پیش نظر رکھکر اس پر غور کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس لفظ کے کوئی دوسرے معنی بھی ہو سکتے ہیں یا نہیں؟

یہ ایک ایسا وصف ہے، جو پیغمبروں ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ تمام روحانی ہستیوں کو شامل ہے، چنانچہ خداوند تعالیٰ کا یہ خاص وصف ہے، اور قرآن مجید کی متعدد آیتوں میں آیا ہے، مثلاً اَنْتَ عَلٰی کُلِّ شَیْئٍ شَھِیْد۔ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْئٍ شَھِیْد، قرآن مجید کے ایک پرانے مستند ترجمہ میں پہلی آیت کا یہ ترجمہ کیا گیا ہے، "اور تو اوپر ہر چیز کے گواہ ہے"۔ اور دوسری آیت کا اس سے مختلف یہ ترجمہ ہے، "وہ اوپر ہر چیز کے حاضر ہے"۔

خداوند تعالیٰ کے بعد یہ وصف ان فرشتوں کا ہے جن کو خداوند تعالیٰ نے اعمالِ انسانی کی نگرانی کے لئے مقرر فرمایا ہے،

وَجَاءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَعَهَا سَائِقٌ وَّشَهِيدٌ (ق - ۲) اور ہر شخص (اعمال کی جواب دہی کے لئے) حاضر ہوگا، (ایک فرشتہ تو) اس کے ساتھ ہانکنے والا ہوگا، اور ایک فرشتہ اس کا اعمال نامہ لئے ہوئے اُسکے عملوں کا گواہ"

اس آیت میں شہید کا ترجمہ گواہ کے لفظ سے قرآن مجید کے ایک جدید اور مقبول ترجمہ میں کیا گیا ہے،

خدا اور فرشتوں کے بعد تیسری روحانی ہستی پیغمبروں کی ہے، اور یہ وصف ان کے لئے قرآن مجید کی متعدد آیتوں میں آیا ہے، چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خود فرماتے ہیں، وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّادُمْتُ فِيهِمْ (مائدہ - ۱۶) اور قرآن مجید کے ایک پرانے مستند ترجمہ میں اس کا یہ ترجمہ کیا گیا ہے "اور تھا میں اوپر ان کے شاہد جب تک رہا میں بیچ ان کے" شاہد عربی لفظ ہے اور تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ شہید ہی کا ہم معنی ہے، اس لئے ٹھیٹھ ترجمہ نہیں،

حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے بعد سب سے زیادہ قرآن مجید میں یہ وصف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آیا ہے،

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا، (بقرہ - ۱۷) اور (مسلمانو! جیسے ہم نے تم کو اب ٹھیک قبلہ بتا دیا ہے) اسی طرح ہم نے تم کو بیچ کی راس کی امت (بھی) بنایا ہے، تاکہ اور لوگوں کے مقابلہ میں تم گواہ رہو اور تمہارے مقابلہ میں (تمھارے) رسول (محمد) گواہ رہیں،

لفظ شہید کے علاوہ آپ کا یہ وصف متعدد آیتوں میں لفظ شاہد کے ساتھ آیا ہے، جو لفظ شہید کے ہم معنی ہے، صرف فرق یہ ہے کہ لفظ شہید مبالغہ کا صیغہ ہے، اور شاھد مبالغہ کا صیغہ نہیں، جس طرح عالم سے مبالغہ کا صیغہ علیم ہے، اسی طرح شاہد سے مبالغہ کا صیغہ شہید ہے، اس لئے جو شخص شہید یا علیم ہوگا

وہ لازمی طور پر شاہد یا عالم ہے، بہر حال قرآن مجید میں آپ کا یہ وصف شاہد کے لفظ کے ساتھ متعدد آیتوں میں آیا ہے،

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيرًا ، (الاحزاب - ۶)	اے پیغمبر! ہم نے تم کو گواہی دینے والا اور خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے،

یہی آیت سورۂ فتح میں بھی ہے، اور امام رازی نے اس کی تفسیر میں لکھا ہے کہ

قال المفسرون شاهداً على امتك بما يفعلون كما قال تعالىٰ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ،	مفسرین کا بیان ہو کہ آیت کے معنی یہ ہیں کہ تمھاری امت جو کچھ کرتی ہے تم اس کے گواہ ہو، جیسا کہ خدائے تعالیٰ نے اس آیت "وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا" میں اسی مضمون کو بیان فرمایا ہے،

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شاہد اور شہید دونوں ایک ہی معنی پر دلالت کرتے ہیں،

سورۂ مزمل میں آپ کے تمام اوصاف میں صرف شاہد کا وصف جیسا کہ آگے آئیگا بیان کیا گیا ہے، یعنی آپ کی صرف ایک پیغمبرانہ حیثیت کو نمایاں کیا گیا ہے،

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ یہ تمام پیغمبروں کا مشترک وصف ہے، چنانچہ خود قرآن مجید میں ہے،

فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هٰؤُلَاءِ شَهِيدًا ، (نساء - ۶)	بھلا تو (اس دن ان لوگوں کا) کیا حال ہوتا ہو جب (سب لوگ جمع ہوں اور) ہم ہر امت کے گواہ (یعنی رسول) کو طلب کریں (جو ان کی نسبت گواہی دے) اور (اے پیغمبر ہم تم کو بھی طلب کریں کہ (اپنی امت کے) لوگوں کی نسبت گواہی دیں،

لسان العرب میں جہاں مادہ "شہد" پر بحث کی ہے، لکھا ہے کہ کل نبی شہید امتہ "یعنی ہر پیغمبر اپنی امت کا شہید ہوتا ہے"،

پیغمبروں کے بعد خدا کے نیک بندوں کا بھی یہ وصف قرآن مجید کی متعدد آیتوں میں مذکور ہے، ایک تو سورۂ بقرہ کی اس آیت میں جو اوپر گذر چکی ہے، اور وہ امت محمدیہ کے ساتھ مخصوص ہے، دوسرے اہل کتاب کا ذکر بھی اسی وصف کے ساتھ سورۂ آل عمران کی اس آیت میں آیا ہے،

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَصُدُّونَ عَنْ	(اے پیغمبران سے) کہو کہ اے اہل کتاب دیدہ و
سَبِيلِ اللَّهِ مَنْ آمَنَ تَبْغُونَهَا عِوَجًا	دانستہ اللہ کے رستے میں (ناحق کی) کجی نکال نکال
وَّأَنْتُمْ شُهَدَاءُ،	کر ایمان لانے والوں کو اس سے کیوں روکتے ہو،

اور قرآن مجید کے اس جدید و مقبول ترجمہ میں "أَنْتُمْ شُهَدَاءُ" کا ترجمہ بجائے گواہ کے "دیدہ و دانستہ" کے لفظ سے کیا گیا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے، کہ خود مترجمین قرآن کے نزدیک اس لفظ کے اور معنی بھی ہوسکتے ہیں

اب جو وصف خدا، خدا کے فرشتوں، خدا کے برگزیدہ پیغمبروں اور خدا کے نیک بندوں میں مشترک طور پر پایا جاتا ہے، وہ جس قدر اہم اور جس قدر ذمہ دارانہ ہے اس کا اندازہ صحیح بخاری کی اس روایت سے ہوسکتا ہے کہ جب ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے یہ آیت "فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَى هَؤُلَاءِ شَهِيدًا" پڑھوا کر سنی تو آپ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہوگئے، اس لئے ایسے اہم اور ذمہ دارانہ وصف کی تفسیر بھی اسی اہمیت اور ذمہ داری کے ساتھ ہونی چاہئے، جس کا بہت کم مترجمین نے خیال رکھا ہے، تفسیروں سے اس کے معنی پر کچھ روشنی پڑتی ہے، لیکن اس سے بھی اس کی پوری وضاحت نہیں ہوتی، امام رازی "وَأَنْتَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ" کی تفسیر میں لکھتے ہیں:۔

فالشهيد الشاهد ويجوز حمله على	شہید کے معنی شاہد کے ہیں اور اس کے معنی دیکھنے

الرویۃ ویجوز حملہ علی العلم ویجوز　　　　کے بھی ہو سکتے ہیں، جاننے کے بھی ہو سکتے ہیں،
حملہ علی الکلام وبمعنی الشہادۃ،　　　　گواہی دینے کے معنی میں کلام کے بھی ہو سکتے ہیں'
لیکن ان احتمالات میں اصل حقیقت گم ہو کر رہ گئی،

دوسری جگہ "اذا جئنا من کل امۃ بشہید الخ" کی تفسیر میں پہلے تو یہ روایت نقل کی ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے فرمایا کہ مجھ کو قرآن پڑھ کر سناؤ، انھوں نے سورۂ نساء کی تلاوت شروع کی، اور اس آیت پر پہنچے تو آپ رو پڑے، اس کے بعد سدی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت اور پیغمبروں کے تبلیغ کی شہادت دے گی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کی تصدیق کی شہادت دیں گے، اسی لئے خداوند تعالیٰ نے فرمایا ہے، "وجعلنا کم امۃ وسطا لتکونوا شہداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شہیدا" لیکن یہ صرف سدی ہی کا قول نہیں ہے، بلکہ خود صحیح بخاری میں یہ روایت مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن حضرت نوح علیہ السلام طلب کئے جائیں گے اور وہ حاضر ہوں گے تو خداوند تعالیٰ ان سے پوچھے گا کہ کیا تم نے تبلیغ رسالت کی، وہ کہیں گے "ہاں" اب ان کی امت سے سوال کیا جائے گا، کہ کیا انھوں نے تبلیغ کی؟ وہ کہیگی کہ ہمارے یہاں کوئی ڈرانے والا نہیں آیا، اب خداوند تعالیٰ حضرت نوح علیہ السلام سے کہیگا کہ تمھارے حق میں شہادت کون دیگا؟ وہ کہیں گے کہ "محمد اور ان کی امت" اب امت محمدیہ شہادت دیگی کہ انھوں نے تبلیغ رسالت کی، اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی "وکذالک جعلناکم امۃ وسطا لتکونوا شہداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شہیدا" اور وسط کے معنی عدل کے بتائے،

اسی روایت کی بنیاد پر مفسرین نے شہید کے معنی ہر جگہ گواہ کے لئے ہیں، لیکن اگر ہر جگہ

شہید یا شاہد کے معنی گواہ کے لئے جائیں تو حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے اس قول کے "وکُنْتُ عَلَیْھِم شَھِیْدًا مَّا دُمْتُ فِیْھِمْ" کیا معنی ہوں گے ؟ ان کی نسبت تو کسی روایت میں نہیں آیا ہے کہ وہ قیامت کے دن اپنی امت کے متعلق کوئی شہادت دیں گے، بلکہ اس آیت سے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شہادت ان کی دنیوی زندگی ہی تک محدود تھی، قرآن مجید کی اس آیت "وَجاءت کلّ نفس معھا سائق وّشھید" میں شہید کے معنی ان فرشتوں کے ہیں جو لوگوں کے اعمال کی نگرانی کرتے ہیں، حالانکہ یہ کسی روایت سے ثابت نہیں ہے، کہ یہ فرشتے قیامت کے دن خدا کے سامنے لوگوں کے اعمال کی گواہی دیں گے،

اصل یہ ہے کہ لغت میں شہادت کے معنی حاضر ہونے کے ہیں، چنانچہ راغب اصفہانی کی مفردات القرآن میں ہے کہ شہود اور شہادت کے معنی حاضر ہونے کے ہیں، خواہ یہ حاضری ظاہری آنکھ کے مشاہدہ سے ہو یا دل کی آنکھ یعنی بصیرت کے مشاہدہ سے ہو، کبھی کبھی یہ لفظ صرف حاضر ہونے کے معنی میں آتا ہے، یعنی مشاہدہ عینی اور مشاہدہ قلبی اس میں داخل نہیں ہوتا مثلاً "عالم الغیب والشھادۃ" میں شہادت کے معنی صرف حضور کے ہیں، البتہ اگر اس معنی میں شہود کا لفظ اور مشاہدہ عینی اور مشاہدۂ قلبی کے معنی میں شہادت کا لفظ لایا جائے تو بہتر ہو

قرآن مجید کی متعدد آیتوں میں یہ لفظ اسی معنی میں آیا ہے، مثلاً

وَھُمْ عَلٰی مَا یَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ شُھُوْدٌ (بروج-۱) اور وہ اوپر اس چیز کے کہ کرتے تھے، ساتھ مسلمانوں کے حاضر تھے،

یہ ایک قدیم مستند ترجمہ ہے، ایک جدید ترجمہ قرآن میں اس کا ترجمہ یہ کیا ہے،" اور جو (ظلم وستم) مسلمانوں پر کر رہے تھے وہ (اس کا تماشہ) دیکھ رہے تھے"، اور تفسیر کبیر میں اس ظالمانہ موقع پر ان کے حاضر رہنے یا تماشہ دیکھنے کی متعدد وجہیں بتائی ہیں، جن میں ایک وجہ یہ ہے کہ وہ

اس قدر سنگدل تھے کہ ان کو اس بے رحمانہ تماشے کے دیکھنے میں لطف آتا تھا، لیکن اس کے ایک معنی گواہی دینے کے بھی ہو سکتے ہیں، یعنی جب بادشاہ نے ان کو مسلمانوں کے جلانے پر متعین کیا تھا، یہ لوگ اس کے سامنے گواہی دینے کے لئے اس موقع پر حاضر ہوئے تھے کہ تعمیل حکم میں کوئی کوتاہی نہیں کی گئی، لیکن یہ ظاہر ہے کہ ان دونوں معنی میں کوئی تضاد نہیں، ایک شخص کسی مجلس میں تماشائی کی حیثیت سے شریک بھی ہو سکتا ہے اور ایک عدالت میں اس کے متعلق شہادت بھی دے سکتا ہے۔

ایک دوسری آیت جس میں یہ لفظ حاضری کے معنی میں آیا ہے، یہ ہے،

ذَرْنِي وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيدًا وَجَعَلْتُ لَهُ مَالًا مَمْدُودًا وَبَنِينَ شُهُودًا، (مدثر-۱)

(اے پیغمبر) ہم کو اور اس نابکار کو (اپنے اپنے حال پر) رہنے دو (کہ ہم اس سے نپٹ لیں گے) جسے ہم نے اکیلا (یعنی بے سامان محض) پیدا کیا اور (پھر) اس کو بہت سامال عنایت کیا اور (مال کے علاوہ) بیٹے دیئے جو اس کے ساتھ حاضر رہتے ہیں،

تفسیر کبیر میں بیٹوں کے موجود اور حاضر رہنے کی دو وجہیں بتائی ہیں، ایک تو یہ کہ اس کے بیٹے دولت مند تھے، اس لیے طلب معاش کے لئے اس سے جدا نہیں ہوتے تھے، اور وہ ان کو اپنے ساتھ دیکھ کر خوش ہوتا تھا، یا یہ کہ وہ اس کے ساتھ مجلسوں اور محفلوں میں شریک ہوتے تھے،

یہ تو اس لفظ کے حقیقی معنی ہیں، اس کے علاوہ یہ لفظ اور بھی بہت سے مجازی معنوں میں استعمال ہوتا ہے، جن میں ہر جگہ حضوری کے معنی پائے جاتے ہیں، شاہد یا شہید یا شہود گواہ کو اس لیے کہتے ہیں کہ وہ واقعہ کے جائے وقوع پر حاضر اور موجود رہتا ہے، جو لوگ خدا کی راہ میں جان دیتے ہیں، ان کو شہید اس لیے کہتے ہیں کہ وہ درحقیقت زندہ ہیں، اس لئے ہم سے غائب نہیں بلکہ ہمیں میں حاضر اور موجود ہیں یا یہ کہ ملائکۂ رحمت ان کے پاس حاضر ہوتے ہیں، حامی اور مددگار کو بھی اس لئے شہید کہتے ہیں، کہ وہ مدد

کے وقت اور موقع پر جان و مال سے حاضر رہتے ہیں۔

وان کنتم فی ریب مما نزلنا علیٰ عبدنا فاتوا بسورۃ من مثلہ وادعوا شہدائکم من دون اللہ ان کنتم صٰدقین۔

(البقرہ - ۳)

اور وہ جو ہم نے اپنے بندے (محمد) پر (قرآن) اتارا ہے اگر تم کو اس میں شک ہو (اور یہ سمجھتے ہو کہ یہ کتاب خدا کی نہیں بلکہ آدمی کی بنائی ہوئی ہے) اور (اپنے اس دعویٰ میں) سچے ہو تو اسی جیسی ایک سورت (تم بھی بنا) لاؤ اور اللہ کے سوا اپنے حمایتیوں کو (بھی) بلا لو،

اسی اصول کے مطابق نگراں کار کو بھی شہید یا شاہد کہتے ہیں، کیونکہ وہ جن لوگوں کی نگرانی کرتا ہے ان کے درمیان حاضر اور موجود رہتا ہے، اسی بنا پر خداوند تعالیٰ کو شہید یا شہود کہتے ہیں، کیونکہ اس سے بڑھ کر انسانی اعمال کا واقف کار اور نگراں کار کون ہو سکتا ہے؟

وَمَا تَتْلُوْ مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ۔

(یونس - ۷)

اور (اے پیغمبر) تم کسی حال میں ہو اور قرآن کی کوئی سی آیت بھی (لوگوں کو) پڑھ کر سناتے اور (لوگو) تم کوئی سا عمل بھی کرتے ہو، ہم (ہر وقت) جب تم اس کام میں مشغول ہوتے ہو تم کو دیکھتے رہتے ہیں اور (اے پیغمبر) تمہارے پروردگار (کے علم) سے ذرہ بھر چیز بھی غائب نہیں رہ سکتی، (نہ) زمین میں اور نہ آسمان میں اور ذرے سے چھوٹی چیز ہو یا بڑی (سب) کتاب روشن (یعنی لوح محفوظ) میں لکھی ہوئی (موجود) ہے،

انسانی اعمال کی نگرانی کے لئے خداوند تعالیٰ نے جن فرشتوں کو مقرر فرمایا ہے، ان کو بھی اسی معنی میں شہید کہتے ہیں، قرآن مجید کی ایک آیت یہ ہے،

واشرقت الارض بنور ربھا ووضع الکتب وجایٔ بالنبیین والشھدآء وقضی بینھم بالحق وھم لا یظلمون (زمر - ۷)

اور زمین اپنے پروردگار کے نور سے چمک اٹھیگی اور (لوگوں کے نامۂ اعمال) کی کتاب (لاکر سامنے) رکھ دی جائے گی، اور پیغمبر اور گواہ لا حاضر کئے جائیں گے، اور (لوگوں) میں انصاف کے ساتھ (ان کے اختلافات کا) فیصلہ کردیا جائیگا، اوران پر (کسی طرح کا) ظلم نہ ہوگا،

لیکن اس آیت میں شہداء کا ترجمہ گواہ کے لفظ سے کرنے کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ یہاں شہداء سے مراد وہ فرشتے ہیں جن کو خداوند تعالیٰ نے اعمال انسانی کی نگرانی کے لئے متعین فرمایا ہے، چنانچہ امام رازی تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں کہ مقاتل کے نزدیک اس سے حفظہ یعنی اعمال انسانی کی نگرانی کرنے والے فرشتے مراد ہیں، اوراس آیت سے جیسا کہ اوپر گذر چکا،

وَجَاءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَائِقٌ وَّشَهِيْدٌ (ق - ۲)

اور ہر شخص (اعمال کی جواب دہی کے لئے) حاضر ہوگا (ایک فرشتہ تو) اس کے ساتھ ہانکنے والا ہوگا، اور (ایک فرشتہ اس کا اعمال نامہ لئے ہوئے اس کے عملوں کا) گواہ

اس کی تائید ہوتی ہے، اس لحاظ سے ان آیتوں میں شہداء اور شہید کا ترجمہ بجائے گواہ کے نگراں کار کے لفظ سے ہونا چاہئے،

فرشتوں کے بعد اعمال انسانی کی نگرانی پیغمبر کرتے ہیں، اس لئے ہر پیغمبر کو بھی شہید کہتے ہیں اور یہ کوئی قیاسی بات نہیں، بلکہ جب آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے شہید کا لفظ آیا ہے، اس کی تفسیر تفسیر فتح البیان میں اس طرح کی گئی ہے،

ای حفیظا ورقیبا ارعی احوالھم وامنعھم عن مخالفۃ امرک،

یعنی میں انکا نگراں کار تھا، اورانکے حالات کی دیکھ بھال کیا کرتا تھا اور تیرے حکم کی مخالفت سے انکو روکتا تھا،

یہ تفسیر درحقیقت زمخشری کی تفسیر کشاف سے ماخوذ ہے، جو مشہور ادیب تھے، اور ان کی تفسیر نے ادبی حیثیت سے خاص طور پر شہرت حاصل کی ہے، وہ اس آیت کی تفسیر ان الفاظ میں کرتے ہیں،

رقیبا امنعھم من ان یقولوا ذالک و یتدینوا بہ، — یعنی میں اُن کا نگہبان تھا اور ان کو یہ کہنے سے اس کو مذہب بنانے سے روکتا تھا،

اور اسی معنی میں قرآن مجید کی متعدد آیتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق شاہد کا لفظ آیا ہے، پیغمبر کے ساتھ ساتھ مومنین صادقین کا ایک گروہ بھی لوگوں کے اعمال کی نگرانی کرتا ہے، اس لیے اس کو بھی اسی معنی میں شہید کا لقب ملا ہے، وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ میں یہی معنی مراد ہے،

اب نظام نبوت یا ایک پیغمبر کے پیغمبرانہ اعمال کی تکمیل چار قسم کے لوگوں کے اجتماع اور اشتراک عمل سے ہوتی ہے، جن کا ذکر قرآن مجید کی اس آیت میں ایک خاص ترتیب سے کیا گیا ہے،

وَمَن يُطِعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ وَحَسُنَ أُولَٰئِكَ رَفِيقًا، (نساء - ۹)

اور جو اللہ اور رسول کا کہا مانے تو ایسے لوگ (جنت میں) ان مقبول بندوں کے ساتھ رہیں گے، جن پر اللہ نے (بڑے بڑے) احسانات کئے ہیں، یعنی نبی اور صدیق اور شہید اور (دوسرے) نیک بندے اور یہ لوگ (کیا ہی) اچھے ساتھی ہیں،

اور امام رازی نے تفسیر کبیر میں ان کے معنی اور فرائض نہایت صحیح طور پر بتائے ہیں، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"خداوند تعالیٰ نے پیغمبروں کا ذکر کیا، پھر تین اوصاف بیان کئے یعنی صدیقین، شہداء، اور صالحین، اس پر تو اتفاق عام ہے کہ انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین سے مختلف ہیں؛ لیکن ان تینوں اوصاف کے متعلق باہم اختلاف ہے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ تینوں

اوصاف ایک ہی موصوف کے ہیں، کیونکہ ایک ہی شخص صدیق، شہید اور صالح ہوسکتا ہے، لیکن دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ ہر وصف سے انسانوں کی ایک مستقل قسم مراد ہے، اور یہی صحت سے قریب تر ہے، کیونکہ معطوف کا معطوف علیہ سے مختلف ہونا ضروری ہے، جس طرح انبیا ان لوگوں سے مختلف ہیں جن کا ذکر ان کے بعد کیا گیا ہے، اسی طرح صدیقین کو ان لوگوں سے مختلف ہونا چاہئے، جن کا اثر ان کے بعد کیا گیا ہے یہی بات اور اوصاف پر بھی صادق آتی ہے، اب ہم تینوں اوصاف کے متعلق بحث کرتے ہیں، ان میں

(۱) پہلا وصف تو صدیق کا ہے، اور صدیق اس شخص کو کہتے ہیں جو سچ بولنے کا عادی ہوتا ہے، کیونکہ جس شخص پر عادۃً کسی فعل کا غلبہ ہو جاتا ہے، جب وہ اس فعل سے متصف کیا جاتا ہے تو اس کے لئے فعیل کا صیغہ استعمال کیا جاتا ہے، جیسا کہ شراب کے سخت عادی کو سکیر، شریب اور خمیر کہتے ہیں ایمانداروں کے اوصاف میں سچائی ایک شریفانہ وصف ہے اور اس کی فضیلت کے لئے صرف اس قدر کہنا کافی ہے کہ ایمان صرف تصدیق کا نام ہے اور جھوٹ کی برائی کے لئے صرف اس قدر کہنا کافی ہے، کہ کفر صرف تکذیب کا نام ہے، جب تم کو یہ بات معلوم ہو چکی تو ہم کہتے ہیں کہ مفسرین نے صدیق کے متعدد معنی بیان کئے ہیں،

ایک یہ کہ جو شخص بغیر کسی قسم کے شک و شبہہ کے پورے دین کی تصدیق کرے وہی صدیق ہے، اور اس کی دلیل خداوند تعالیٰ کا یہ قول ہے،

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ، — اور جو لوگ خدا اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لائے وہی صدیق ہیں،

دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ صدیقین سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بزرگ ترین صحابہ مراد ہیں، تیسرا قول یہ ہے کہ صدیق اس شخص کا نام ہے جس نے سب سے پہلے رسول اللہ علیہ وسلم کی تصدیق

کی اور اس میں تمام لوگوں کا پیشوا ہوا، غرض نبوت کے بعد علم و فضل میں اس وصفِ صدیقیت سے بڑا کوئی درجہ نہیں ہے، قرآن مجید بھی اسی پر دلالت کرتا ہے، کیونکہ قرآن مجید نے صدیق اور نبی کا ذکر اس طریقہ سے کیا ہے، کہ ان کے درمیان میں کوئی واسطہ نہیں ہے، مثلاً وہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے ذکر میں کہتا ہے، کہ وہ صادق الوعد تھے، اور حضرت ادریس علیہ السلام کا وصف قرآن مجید نے اس طرح بیان کیا ہے کہ وہ صدیق نبی تھے، اور اس آیت میں کہا ہے مع النّبیین والصدیقین یعنی اگر کوئی شخص صدیقیت کے درجہ سے ترقی کرے گا تو نبوت کے درجہ کو پہنچے گا، اور نبوت کے درجہ سے تنزل کرے گا تو صدیقیت کے درجہ کو پہنچے گا، کیونکہ ان کے درمیان میں کوئی واسطہ نہیں ہے،

(۲) دوسرا وصف شہادت کا ہے لیکن شہید سے وہ شخص مراد نہیں ہے جس کو کسی کافر نے قتل کیا ہو، کیونکہ ایک تو اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ شہادت ایک بہت بڑا دینی درجہ ہے، اور کافر کے ہاتھ سے قتل ہونا کوئی بہت بڑا شرف نہیں ہے، کیونکہ ایک بدکار شخص بھی کافر کے ہاتھ سے قتل ہو سکتا ہے،

اس بنا پر شہید وہ شخص ہے، جو خدا کے دین کی صحت کی شہادت کبھی دلیل سے، کبھی بیان سے اور کبھی تیغ و سنان سے دے، اس لئے شہدا وہ لوگ ہیں جنھوں نے معیارِ عدل کو قائم کر رکھا ہے، اور یہ وہ لوگ ہیں جن کا ذکر خداوند تعالیٰ نے اس آیت میں کیا ہے،

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ،

اللہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اور فرشتے اور علم والے بھی (گواہی دیتے ہیں اور نیز یہ کہ اللہ عدل و انصاف کیساتھ (کارخانہ عالم کو) سنبھالے ہوئے (ہے)

جو شخص خدا کی راہ میں قتل کیا جاتا ہو اسکو بھی شہید اسی لئے کہتے ہیں کہ خدا کے دین کی حمایت میں اس نے اپنی جان کو ایک متاعِ حقیر سمجھا اور یہ شہادت دی کہ خدا ہی حق ہے اور اس کے سوا جو کچھ ہے باطل ہے، اور جو شخص اس معنی میں خدا کے شہدا میں سے ہوگا، وہ آخرت میں بھی خدا کے شہداء کے زمرے میں شامل ہوگا، جیسا کہ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے، "کذٰلک جعلنا کم امۃ وسطا لتکونوا شھدآء علی الناس!

شاہ ولی اللہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں:۔

صدیقیت اور محدثیت کی حقیقت یہ ہے کہ امت کے بعض افراد اصل فطرت کے رو سے پیغمبروں کے مشابہ ہوتے ہیں، جیسا کہ ایک ذہین شاگرد اپنے استاد کے مشابہ ہوتا ہے، اب اگر یہ مشابہت قوائے عقلیہ میں ہوتی ہے، تو اس کو صدیق یا محدث کہتے ہیں، لیکن جب یہ مشابہت قوت عملیہ میں ہوتی ہے، تو اس کو شہید یا حواری کہتے ہیں، اور خداوند تعالیٰ کے اس قول" والذین اٰمنوا باللہ ورسلہ اولٰٓئک ھم الصدیقون والشھدآء الخ میں ان ہی دونوں مقامات کی طرف اشارہ ہے،

دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

مقاماتِ قلب میں دو مقام ایسے ہیں جو ان نفوس کے ساتھ مخصوص ہیں، جو انبیاء علیہم السلام کے ساتھ مشابہت رکھتے ہیں، اور وہ دونوں بمنزلہ صدیقیت اور محدثیت کے ہیں، البتہ صدیقیت اور محدثیت کا مرکز قوت عقلیہ ہے، اور ان دونوں کا مستقر اس عملی قوت میں ہے، جس کی لہریں قلب سے اٹھتی ہیں، اور یہ دونوں شہید اور حواری کے مقامات ہیں'

اب ان محققانہ تفسیروں کے رو سے شہادت کے معنی امر بالمعروف والنہی عن المنکر کے ہیں اور شہید اس شخص کو کہتے ہیں، جو نیکی کا حکم دے، اور برائی سے روکے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک

موقع پر فرمایا کہ "یہ کیا بات ہے کہ تم لوگ ایک شخص کو دیکھتے ہو کہ وہ لوگوں کی آبروریزی کرتا ہے، اور اسکو روکتے نہیں" سب نے کہا کہ "اس کی بدزبانی سے ڈرتے ہیں" فرمایا "تو ایسی حالت میں تم شہدا کے زمرے میں شامل نہیں ہو سکتے"؛ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے، کہ جس شخص نے برائی سے روکا اور خدا کے معاملہ میں لعنت و ملامت سے نڈر رہا، وہ شہداء کے زمرے میں شامل ہے، (لسان العرب جلد ۴ ص ۲۲۹) بہر حال امر بالمعروف والنہی عن المنکر پیغمبروں کا اصلی فرض ہے، بالخصوص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا امتیازی وصف یہی ہے، اور اسی امتیازی شان کے ساتھ قرآن مجید میں اس کا ذکر کیا گیا ہے،

اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ، (الاعراف - ۱۹)	(ان سے ہماری مراد اس زمانہ کے وہ اہل کتاب تھے) جو ہمارے ان) رسول نبی امی (محمد) کی پیروی کرتے ہیں، جن (کی بشارت) کو اپنے ہاں توراۃ اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں، وہ ان کو اچھے کام (کرنے) کو کہتے اور برے کام سے ان کو روکتے ہیں

اسی معنی میں قرآن مجید میں آپ کا ذکر کہیں شہید اور کہیں شاہد کے لقب سے کیا گیا ہے، اور جہاد جو آپ کی زندگی کا سب سے زیادہ مقدس فرض تھا، اسی امر بالمعروف والنہی عن المنکر کی ایک اعلیٰ ترین قسم تھا، چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ تم میں سے اگر کوئی شخص کسی برائی کو دیکھے تو اس کو ہاتھ سے مٹا دے، لیکن اگر اس کی قدرت نہیں رکھتا، تو اپنی زبان سے مٹائے، اگر اتنی بھی طاقت نہیں رکھتا تو دل سے اس کو برا سمجھے اور صرف دل سے برا سمجھنا ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے، لیکن آپ نے اپنی قوت ایمانی کے بل پر جہاد کے ذریعہ سے نہ صرف ایک یا دو شخص کی بلکہ دنیا کی عالمگیر برائیوں کو مٹایا، اسی بنا پر آپ کی نسبت ارشاد خداوندی ہے،

اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَیْكُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَیْكُمْ	(لوگو) جس طرح ہم نے فرعون کی طرف (موسیٰ کو)

كَمَا أَرْسَلْنَا إِلَى فِرْعَوْنَ رَسُولًا، (مزمل - ۱)

پیغمبر (بناکر) بھیجا تھا، تمھاری طرف بھی (محمد کو) رسول (بناکر) بھیجا ہے جو (قیامت کے دن) تمھارے مقابلہ میں گواہی دیں گے،

اس آیت کے ترجمہ میں بریکٹ میں قیامت کے دن کا جو اضافہ کیا گیا ہے، وہ ایک غیر ضروری اضافہ ہے، کیونکہ آیت میں قیامت کے دن کا کوئی ذکر نہیں ہے، اس لئے لازمی طور پر شاہد کا ترجمہ گواہ سے کرنا بھی صحیح نہ ہوگا، کیونکہ یہ گواہی قیامت میں نہ ہوگی، بلکہ شاہد کا صحیح ترجمہ نگران کار یا دوسرے الفاظ میں امر بالمعروف والنہی عن المنکر کرنے والا ہوگا، اور ہم ابھی لکھ آئے ہیں کہ جہاد بھی امر بالمعروف والنہی عن المنکر ہی کی ایک قسم ہے، اس لئے شاہد مجاہد کو بھی کہہ سکتے ہیں، اور پیغمبروں میں صرف دو ہی پیغمبروں کی مجاہدانہ فوز و فلاح مذہبی تاریخ کا یادگار واقعہ ہے، ایک حضرت موسیٰ علیہ السلام جن کی وجہ سے فرعون جیسا مغرور اور متمرد بادشاہ اپنے کیفر کردار کو پہنچا، دوسرے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن کے ذریعہ سے خداوند تعالیٰ نے روسائے قریش کو جو کبر و غرور اور تمرد و عصیان میں فرعون ہی کے مشابہ تھے، برباد کیا، اور اس حیثیت سے آپ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کامل مشابہت پیدا ہوگئی، اس لئے خداوند تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صراحۃً حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اور کنایۃً آپ کی قوم بالخصوص روسائے قریش کو فرعون کے ساتھ تشبیہ دی اور فرعون کے تمرد و عصیان کا جو نتیجہ ہوا اس کو نہایت تہدید آمیز الفاظ میں اس طرح بیان فرمایا،

فَعَصَىٰ فِرْعَوْنُ الرَّسُولَ فَأَخَذْنَاهُ أَخْذًا وَبِيلًا، (مزمل - ۱)

سو فرعون نے (ان) پیغمبر کی نافرمانی کی تو ہم نے اس کو بڑے وبال میں دھر پکڑا،

اور اس طریقہ سے کفار مکہ اور روسائے قریش کو در پردہ اسی سخت گرفت کی دھمکی دی، خود ہمارے مفسرین تسلیم کرتے ہیں کہ یہ ایک تہدید آمیز آیت ہے، چنانچہ تفسیر کبیر میں ہے،

واعلم ان الخطاب لاھل مکۃ و — جاننا چاہئے کہ اس آیت کے مخاطب اہل مکہ ہیں،

المقصود تھدیدھم بالاخذ الوبیل — اور خطاب کا مقصد ان کو سخت گرفت کی دھمکی دینا ہے

بہرحال شہادت اور امر بالمعروف والنہی عن المنکر دونوں ہم معنی ہیں، اور سب سے پہلے شہادت کا یہ درجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہوا، اور آپ کی تعلیم و تربیت اور آپ کے فیض صحبت سے آپ کی امت بالخصوص صحابۂ کرام کو یہ شرف حاصل ہوا جیسا کہ خداوند تعالیٰ خود اس شرف کو بیان فرماتا ہے،

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ، (آل عمران - ۱۲) — لوگوں (کی رہنمائی) کے لئے جس قدر امتیں پیدا ہوئیں، ان میں تم (مسلمان) سب سے بہتر ہو کہ اچھے (کام کرنے) کو کہتے اور برے کاموں سے منع کرتے ہو،

خداوند تعالیٰ نے اسی مفہوم کو دوسری آیت میں خود لفظ شہادت سے بھی بیان فرمایا ہے،

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ○

لیکن ہمارے مفسرین نے عموماً اس آیت میں اُمَّةً وَّسَطًا کے معنی امت عادلہ کے لئے ہیں اور صحیح بخاری کی روایت میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی "وسطاً" کی تفسیر عادل کے لفظ سے فرمائی ہے، لیکن یہ اس کے مجازی معنی ہیں، ورنہ لغت میں وسط کے معنی کسی چیز کے درمیانی حصہ کے ہیں، اور چونکہ ہر چیز کا درمیانی حصہ اس کے دونوں کناروں سے بہتر ہوتا ہے، اس لئے مجازاً وہ افضل اور بہتر کے معنی میں بھی استعمال کیا جاتا ہے، اور اس حالت میں یہ لفظ اسم نہیں ہوتا، بلکہ صفت ہوتا ہے، چنانچہ لسان العرب میں ہے، (جلد ۹ ص ۳۰۶)

واعلم ان الوسط قد یاتی صفۃ — جاننا چاہئے کہ لفظ وسط اصولاً اگرچہ اسم ہے

وان کان اصلہ ان یکون اسما من — لیکن وہ اس حیثیت سے صفت کے معنی میں

جعلہ ان اوسط الشی افضلہ وخیارہ کوسط المرعی خیر من طرفیہ وکوسط الدابۃ للرکوب خیر من طرفیہا لتمکن الراکب ومنہ الحدیث خیار الامور اوساطہا فلما کان وسط الشی افضلہ واعدلہ جاز ان یقع صفۃ وذلک فی مثل قولہ تعالیٰ وتقدس وَکَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّۃً وَّسَطًا ای عدلا،

بھی آتا ہے کہ ہر چیز کا وسط یعنی درمیانی حصہ اس کا بہترین حصہ ہوتا ہے، جیسے چراگاہ کا درمیانی حصہ اس کے دونوں کناروں سے اچھا ہوتا ہے، اور سواری کا درمیانی حصہ سوار کے لئے اس کے دونوں کناروں سے بہتر ہوتا ہے، کیونکہ درمیانی حصہ میں سوار جم کر بیٹھ سکتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ تمام چیزوں کے بہترین حصے اس کے بیچ کے حصے ہوتے ہیں، پس جبکہ کسی چیز کا درمیانی حصہ اس کا بہترین اور موزوں حصہ ہوتا ہے، تو وہ صفت بھی ہو سکتا ہے، جیسا کہ خداوند تعالیٰ کے اس قول "کَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّۃً وَّسَطًا" میں یہ صفت بمعنی عدل آئی ہے،

اب جبکہ وسط کے معنی افضل اور بہتر کے، اور شہادت کے معنی امر بالمعروف والنہی عن المنکر کے قرار پائے، تو یہ آیت پہلی آیت یعنی کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ الخ" کے ہم معنی و مرادف ہو گئی، اور اب اس کا ترجمہ یہ ہوگا،

وَکَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّۃً وَّسَطًا لِّتَکُوْنُوْا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْکُمْ شَھِیْدًا،

اور اسی طرح ہم نے تم کو بہترین امت بنایا تاکہ تم لوگ اور تمام آدمیوں کو امر بالمعروف والنہی عن المنکر کرو اور تمھارا پیغمبر (محمد) تم کو امر بالمعروف والنہی عن المنکر کرے،

چنانچہ امام رازی نے اس آیت کی تفسیر میں پہلے تو وسط کے معنی وہی عادل کے لئے ہیں، پھر اس کے دوسرے معنی افضل اور بہتر کے بتائے ہیں، اور لکھا ہے کہ

القول الثانی ان الوسط من کل شیی خیارہ قالوا وھذا التفسیر اولی من الاول لوجوہ،

دوسرا قول یہ ہے کہ ہر چیز کا وسط اس کا بہترین حصہ ہوتا ہے، اور مفسرین کہتے ہیں کہ یہ تفسیر پہلی تفسیر (یعنی وسط بمعنی عادل) سے متعدد وجوہ کی بنا پر بہتر ہے،

جن میں ایک وجہ یہ ہے کہ

انہ مطابق لقولہ تعالیٰ "کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ،

وہ خداوند تعالیٰ کے اس قول "کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ" کے مطابق ہے،

اور یہ اس بات کی صاف دلیل ہے، کہ وہ دونوں آیتوں کو ہم معنی سمجھتے ہیں،

اس تفسیر کی روشنی میں شہید اور شاہد کے معنی کی جو تعیین و تشریح کی گئی ہے، وہ پیغمبرانہ فرائض سے بہت زیادہ مناسبت رکھتی ہے، اور جو شخص یا جو لوگ دنیا میں ان فرائض کو ادا کریں گے وہی قیامت کے دن اور لوگوں کے اعمال کے گواہ بھی ہوں گے، اس لئے حدیث و قرآن میں کوئی تعارض نہیں بلکہ تطابق ہے،

تفسیر ابو مسلم اصفہانی

عربی معتزلہ کی مفقود و الخبر نادر الوجود عقلی تفسیر قرآن کے اجزاء، جو نہایت دیدہ ریزی سے امام رازی کی تفسیر کبیر سے جمع کئے گئے ہیں، عمدہ ٹائپ میں چھپی ہے، قیمت :- ۱۲؍ ضخامت ۱۰۳ صفحے،

"منیجر"

ابن جریر طبری

از

مولوی محمد اویس صاحب ندوی نگرامی رفیق دار المصنفین

تیسری صدی ہجری کے اوائل میں طبرستان کے مشہور شہر آمل کے ایک دولت مند گھرانے میں ایک بچہ پیدا ہوا، رنگ گندمی، بدن نحیف و نزار، لیکن کسے خبر تھی کہ یہی جسم ناتوان ایک دن ایسے علوم و کمالات کا حامل ہوگا، جس کی نظیر ملنا مشکل ہو جائے گی، تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، تاریخ، نحو، ادب جس فن پر لب کشائی کریگا، معلوم ہوگا کہ یہ اسی کا فن ہے!

اس سے ہماری مراد، ابو جعفر محمد بن جریر الطبری کی ذات ہے،

ابن جریر طبری کو لوگ عموماً صرف ایک مورخ اور اس کے بعد ناقل روایت مفسر کی حیثیت سے جانتے ہیں، ان کے کمالات اور اُن کی خصوصیات ابھی عموماً پردۂ خفا میں ہیں، اس مضمون میں اجمالی طور سے انھی امور پر نظر مقصود ہے وباللہ التوفیق و علیہ التکلان،

نام و نسب اور ابتدائی زندگی، محمد نام اور ابو جعفر کنیت ہے، خطیب (ج ۲ ص ۱۶۲) اور سبکی (طبقات شافعیہ ج ۲ ص ۱۳۵) کی روایت کے مطابق پورا نسب نامہ یہ ہے:

محمد بن جریر بن یزید بن کثیر بن غالب الطبری،

ابن خلکان (ج ۲ ص ۳۳) کی روایت میں نسب نامہ یوں ہے:

ابو جعفر محمد بن جریر بن یزید بن خالد الطبری،

کسی نے خود ابن جریر سے ان کا نسب دریافت کیا، انھوں نے جواب میں کہا، محمد بن جریر اسائل نے مزید تفصیل چاہی تو یہ شعر پڑھ دیا،

قد رفع العجاج ذکری فادعنی باسمی اذا الانساب طالت یکفنی[1]

سات سال کی عمر میں قرآن حفظ کیا، ابھی بچپن کا زمانہ تھا کہ باپ نے خواب میں اپنے نور نظر کو بارگاہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر پایا، معبّر نے پورا خواب سنکر تعبیر دی کہ اگر یہ بچہ زندہ رہا، تو دین کا خادم اور شریعت کا زبردست حامی ہوگا[2]،

ابتدائی تعلیم اپنے وطن آمل ہی میں پائی، جب کچھ سن تمیز کو پہنچے تو والد بزرگوار نے حصول علم کے لئے سفر کی اجازت دی، چنانچہ آمل سے رے آئے، یہاں رے اور جوار رے کے مشائخ سے استفادہ کیا، اس کے بعد بصرہ، کوفہ مصر، فسطاط اور شام کے سفر کئے اور ہر جگہ علماء و مشائخ سے نفع اٹھایا،

ابن جریر کے زیادہ قابل ذکر اساتذہ کے نام یہ ہیں:

محمد بن حمید الرازی، مثنی بن ابراہیم الأبلی، احمد بن حماد الدولابی، محمد بن بشار، ہناد بن السری ۲۴۳ھ ابوکریب محمد بن العلاء الہمدانی ۲۴۸ھ،

حصول علم میں محنت و جفاکشی کا یہ عالم تھا کہ رے کے زمانۂ قیام میں رے اور جوار رے دونوں جگہ کے مشائخ سے بہ یک وقت استفادہ کرتے، احمد بن حماد دولابی جوار رے میں رہتے تھے، ابن جریر ان کی مجلس میں شرکت کے لئے جاتے اور ختم درس کے بعد وہاں سے دوڑتے ہوئے رے آتے تاکہ یہاں کے مشائخ کے حلقۂ درس میں شریک ہو سکیں[3]،

ذہانت، توجہ اور محنت نے اساتذہ کی نظر میں محبوب بنا دیا تھا، چنانچہ کوفہ میں ایک بار اپنے استاد ابوکریب کے مکان پر دوسرے طالبان حدیث کے ساتھ گئے، استاد نے شاگردوں

---

[1] معجم الادباء ج ۶ ص ۴۲۰ [2] معجم الادباء ج ۶ ص ۴۲۳ [3] معجم الادباء ج ۶ ص ۴۳۰،

کا امتحان لیا، اور چند سوالات کئے، ان سوالات کا پورا اور صحیح جواب دینے والا صرف ایک شاگرد تھا، ابن جریر! استاد خوش ہوگیا، اور اپنے حلقۂ درس میں اعزاز و اکرام کی جگہ دی[۱]،

ایک عرصہ تک تحصیلِ علم اور کسبِ کمالات کے بعد ابن جریر اپنے وطن طبرستان واپس آئے لیکن قدرت کو یہاں ان کا قیام منظور نہ تھا، ان کو ایسے مرکز میں رہنا چاہئے تھا، جہاں سے علوم و معارف کی پوری تبلیغ ہو سکے،

ہوا یہ کہ طبرستان میں جب یہ داخل ہوئے تو دیکھا کہ یہاں رفض و تشیع کے دروغ کو خوب ہی فروغ ہے، اور حضرات صحابۂ کرام پر عموماً سب و شتم جاری ہے[۲]،

اس موقع پر ابن جریر نے اپنے عالمانہ منصب کو محسوس کیا، اور حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کے فضائل و مناقب بیان کرنا شروع کیا، انجام کار حکومتِ وقت مخالف ہوگئی، اور ان کو ترکِ وطن کرکے بغداد میں قیام کرنا پڑا[۳]،

ساری عمر بغداد ہی میں علم و دین کی خدمت اور اعلائے کلمۃ حق میں بسر ہوئی، حکومت وقت نے بارہا چاہا کہ ان کی کچھ خدمت کرے لیکن ان کی غیور اور محتاط طبیعت نے کبھی اسکو قبول نہ کیا، خاقانی نے اپنے زمانۂ وزارت میں کافی دولت نذر کرنا چاہی لیکن وہ ان کی بارگاہ میں قبول نہ ہوئی، قضاء کا عہدہ پیش کیا، اس سے بھی انکار کر دیا، خیر اندیشوں نے عرض کیا کہ یہ تو ثواب کا کام تھا، اسے آپ نے کیوں چھوڑ دیا؟ اس پر ابن جریر ان لوگوں سے ناخوش ہوئے اور فرمایا کہ مجھکو تو یہ توقع تھی کہ اگر میں اس عہدہ کو قبول کرتا تو تم مجھ کو اس سے باز رکھتے نہ کہ تم خود مجھ کو ترغیب دیتے ہو[۵]؟

بغداد کے زمانۂ قیام میں بعض اوقات ابن جریر کے لئے بہت سخت گذرے، رفض اور الحاد کا الزام لگایا گیا، یہ الزام لگانے والے وہ لوگ تھے، جن سے اگر رفض اور الحاد کے معنی دریافت

---

۱ معجم الادبا ج ۶ ص ۴۳۱ ۲ حوالہ مذکور ص ۴۵۶ ۳ حوالہ مذکور ص ۳ طبقات شافعیہ،

کئے جاتے تو وہ اس کو سمجھ بھی نہ سکتے[۱]، حالانکہ ابن جریر نے رفض ہی کے فتنہ کی وجہ سے اپنے وطن طبرستان کو چھوڑا تھا، اور بغداد میں آکر پناہ لی تھی، بغداد میں حنابلہ نے بھی مخالفت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی، ان کے اختلاف کا سبب یہ تھا کہ ابن جریر نے جب اپنی کتاب اختلاف الفقہاء تصنیف کی جس کا ذکر آگے آتا ہے، تو اس کتاب میں امام احمد بن حنبلؒ کا ذکر نہیں کیا، وہ کہتے تھے کہ امام احمد محدث ہیں فقیہ نہیں ہیں، بہرحال اسی چیز نے حنابلہ کو آتش زیر پا کر دیا[۲]، ایک بار تو نوبت یہاں تک پہنچی کہ ابن جریر کے مکان پر مخالفین کے ہزاروں آدمیوں نے ہجوم کیا، اور اس قدر خشت باری کی، کہ دروازہ پتھروں سے پٹ گیا، مجبوراً پولیس آئی اور اس نے فتنہ فرو کیا[۳]،

یہ سب کچھ ہوا، لیکن اس سے ابن جریر کی عظمت، احترام اور ان کے تقدس میں کوئی فرق نہ آیا، اہلِ دولت کو یہی تمنا رہی کہ کاش ابن جریر ان کا تحفہ قبول کر لیں اور اہلِ علم ابن جریر سے روایت کو باعثِ فخر سمجھتے،

ان کی عظمت و شان کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ جب ان کا انتقال ہوا تو مہینوں شب و روز قبر پر نماز جنازہ پڑھی جاتی رہی، اور صدہا اہلِ دین و ادب نے مرثیے کہے،

ان مرثیوں میں ابن سعید بن الاعرابی اور ابن درید کے مرثیے بہت دردناک ہیں،

ابن سعید بن الاعرابی کے مرثیہ کا ایک شعر ہے،

قام ناعی العلوم اجمع لما — قام ناعی محمد ابن جریر

ابن درید نے اپنے مرثیہ میں کہا

ان المنیة لم تتلف بہ رجلا — بل اتلفت علماً للدین منصوبا

ان دونوں مرثیوں کو خطیب نے اپنی تاریخ میں نقل کر دیا ہے،

---

[۱] تاریخ کامل ج ۸ ص ۹۸ [۲] ایضاً [۳] معجم الادبا ج ۶ ص ۴۳۶،

شنبہ کو دن کے آخری حصہ میں ان کا انتقال ہوا، اور یکشنبہ ۲۷ شوال ۳۱۰ھ کو بغداد میں دفن ہوئے، ابن خلکان کہتے ہیں کہ مصر میں ایک قبر ہے جو لوگوں کی زیارت گاہ ہے، اور اس پر لکھا ہوا ہے کہ یہ ابن جریر طبری کی قبر ہے، لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ ابن جریر صاحب تاریخ ہیں، حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے ابن جریر بغداد ہی میں دفن ہوئے[۱]،

ابن جریر کے علوم | اس میں کوئی شک نہیں کہ ابن جریر کا جسم بغداد میں زیر زمین دفن ہو گیا لیکن ابن جریر کے نام کو بغداد کی سرزمین نہ دبا سکی، ابن جریر کی اصل چیز ان کے علمی عملی کارنامے ہیں خدا کا شکر ہے کہ ان کے کارناموں سے دنیا کسی حد تک واقف ہے اور ان کی معترف ہے،

ابن جریر علوم اسلامیہ کے بہت بڑے خادم اور مسلمانوں کے مخدوم ہیں، تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، تصوف، تاریخ، نحو، صرف، ادب، معانی، منطق، حساب، جبر و مقابلہ اور طب میں ان کو خاص کمال حاصل تھا،

ان کی انتیس تصنیفات میں سے ہمارے پاس صرف چھ مطبوعہ کتابیں موجود ہیں (۱) تفسیر ابن جریر (۲) تاریخ ابن جریر (۳) آثار الباقیہ عن القرون الخالیہ (۴) ذیل المذیل (۵) اختلاف الفقہاء (۶) الاعتقاد،

ایک کتاب تہذیب الآثار کے متعلق معلوم ہے کہ اس کے بعض حصے استنبول کے کتب خانہ میں موجود ہیں، بقیہ نوادر پردۂ خفا میں ہیں،

آیندہ صفحات میں ابن جریر کے انہی علوم اور انہی تصانیف کے اجمالی تعارف کی کوشش کی گئی ہے،

ابن جریر اور فن تجوید و قرأت | ابن جریر کے علوم اور تصانیف کو ہم قرآن پاک سے شروع کرتے ہیں،

---

[۱] ابن خلکان ج ۲ ص ۲۳۳،

اس سلسلہ میں پہلا فن تجوید و قرأت کا آتا ہے، سات سال کی عمر میں ابن جریر نے قرآن حفظ کیا،[۱]
سلیمان بن عبدالرحمٰن بن حماد طلحی قرآن کے استاد تھے، جب تک خود اپنی قرأۃ نہ اختیار کی حمزہ
جن کا شمار شموس قرار میں ہے، اُن کے طریق پر قرأت کرتے رہے، حمزہ سے انکی روایت کے دو سلسلے ہیں

(۱) طلحی عن خلاد عن سلیم بن عیسیٰ عن حمزہ،

(۲) عن یونس بن عبدالاعلیٰ عن علی بن کیسہ عن سلیم عن حمزہ،

یونس بن عبدالاعلیٰ (۲۶۴ھ) ہی کے ذریعہ سے بہ واسطہ ورش نافع کی روایت بھی انکو حاصل تھی،

قرآن اتنا اچھا پڑھتے تھے کہ دور دور کے قرا اس کے سننے کے لئے اور عام لوگ ان کے پیچھے نماز پڑھنے کے لئے آیا کرتے،[۲]

خطیب اپنی تاریخ (ج ۲ ص ۱۶۴) میں ابو علی طوماری کے ایک واقعہ کو نقل کرتے ہیں کہ ایک بار رمضان کی کسی آخری شب میں ابو علی طوماری اپنے استاذ ابو بکر بن مجاہد کے ساتھ تراویح کیلئے روشنی لئے ہوئے جارہے تھے، ابن مجاہد چلتے چلتے محمد بن جریر طبری کی مسجد کے سامنے کھڑے ہوگئے، طبری مسجد میں سورۂ رحمٰن پڑھ رہے تھے، دیر تک ان کی قرأت سنتے رہے، جب واپس لوٹے تو ابو علی طوماری نے عرض کیا کہ آپ نے لوگوں کو اپنا منتظر رکھا، اور یہاں قرآن سنتے رہے، ابو بکر بن مجاہد نے کہا کہ تمھیں کیا خبر کہ اللہ نے کیسا آدمی پیدا کیا ہے جو اسقدر اچھا قرآن پڑھتا ہے،

ابن جریر کو علم قرأت میں کامل دستگاہ حاصل تھی، اس میں اُنھوں نے امامت کا درجہ حاصل کیا تھا اور ان کا شمار ان لوگوں میں تھا جو مختلف قرأتوں میں سے کسی ایک کو ترجیح دے سکتے تھے،[۳]
اُنھوں نے اپنی کتابوں میں قرا سبعہ سے مقدم وہ قرأت بیان کی ہیں جو صحابۂ کرام کے عہد میں

---

[۱] معجم الادبا ج ۶ ص ۴۳۰ [۲] تمام حوالے معجم الادبا ج ۶ کے ہیں [۳] تبیان الجزائری ص ۹۰،

پڑھی جاتی تھیں اور جن سے وہ نماز پڑھتے تھے[1]

علم قرأت میں تصنیف | ابو علی الحسن بن علی الاہوازی ۴۴۶ھ کہتے ہیں کہ میں نے فن قرأت میں ابن جریر کی ایک کتاب آٹھ جلدوں میں دیکھی، اس میں انھوں نے تمام مشہور اور شاذ قرأت کو جمع کر دیا ہے، نیز ان سب میں اپنی پسندیدہ قرأتوں کا بھی ذکر کیا ہے، لیکن اپنے اس اختیار و انتخاب میں وہ قرأت مشہورہ سے الگ نہیں ہوئے[2]،

یاقوت نے معجم الادبار میں ان کی ایک اور کتاب الفصل بین القرآت کا ذکر کیا ہے جس میں ابن جریر نے حروفِ قرآن کے بارے میں قاریوں کے اختلافات کو واضح کیا ہے، نیز مکہ، مدینہ، کوفہ، بصرہ اور شام وغیرہ کے قاریوں کی تفصیل اور ان کی قرأتوں کی توضیح کی ہے، اور ان میں سے جس کو انھوں نے قابلِ ترجیح سمجھا ہے مع دلائل کے اس کا ذکر کیا ہے، ابو بکر بن مجاہد اس کتاب کیلئے کہا کرتے تھے، کہ اس سلسلہ میں اس سے عمدہ کتاب نہیں لکھی گئی،

ابن جریر اور تفسیر | قبل اس کے کہ ہم ابن جریر کی تفسیر پر گفتگو کریں ضروری ہے کہ ان سے پیشتر کی تاریخِ تفسیر پر اجمالی نظر ڈال لیں تاکہ صحیح رائے قائم کرنے میں آسانی ہو،

ابن جریر سے پیشتر تفسیر کے تین دور قائم ہو سکتے ہیں،

(۱) پہلا دور حضرات صحابۂ کرام (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کا ہے، جن کو بارگاہِ نبوت سے براہ راست فہم قرآن کا موقع ملا، ہر چند کہ حضرات صحابہ عموماً اہلِ عرب تھے اور انہی کی زبان میں قرآن نازل ہوا تھا، تاہم یہ فہم قرآن میں اپنے کو رسول کا پابند اور محتاج سمجھتے تھے، کوئی لفظ یا آیت ان بزرگوں کی سمجھ میں نہ آتی تو حضورؐ سے دریافت فرماتے، خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغمبرانہ فریضہ تھا، کہ امت کے سامنے وحی الٰہی کی تشریح و تبیین فرمائیں، اسلئے بسا اوقات ایسا ہوتا

---

[1] شرح سبعہ قرأت از مولوی محی الاسلام صاحب پانی پتی ص ۲۲ [2] معجم الادبار ج ۶ ص ۴۲۷،

کہ خود سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کسی آیت کے متعلق صحابہؓ سے دریافت فرماتے اور بعد کو اسکی توضیح و تشریح فرما دیتے،

اس کے ماسوا اکابر صحابہ اپنی علمی مجلسوں میں بھی قرآن مجید کے متعلق بہت سے نکتے حل فرماتے، قرآن کے غریب لفاظ کی شرح میں دیوانِ عرب سے کام لیتے، احکام قرآن پر غور فرماتے، مسائل کا استنباط کرتے، شانِ نزول بیان فرماتے، اگر کسی کو غلط معانی اخذ کرتے یا بیان کرتے ہوئے دیکھتے تو اسکی اصلاح فرما دیتے تھے،

اس طرح سے قرآن پاک کا سب سے مستند اور صحیح تفسیری ذخیرہ ان بزرگوں کے سینہ میں محفوظ تھا، اس مبارک عہد میں اسرائیلیات تفسیری روایات میں زیادہ دخل نہ پاسکیں، تاہم وہب بن منبہ اور کعب الاحبار کی روایات کا سلسلہ ضرور تھا، صحابہ کرام میں دس حضرات کو اس فن میں خاص امتیاز حاصل تھا، خلفائے راشدین، حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ، حضرت عبد اللہ بن عباسؓ، حضرت ابی بن کعبؓ ۲۰ھ، حضرت زید بن ثابتؓ ۴۵ھ، حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ ۴۴ھ، حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ، ان حضرات کے سوا حضرت انسؓ ۹۱ھ، حضرت ابو ہریرہؓ ۵۸ھ، حضرت ابن عمرؓ ۷۳ھ، حضرت جابرؓ ۷۴ھ، حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ ۶۳ھ سے بھی تفسیری روایات مروی ہیں، مگر بہت کم! حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ کی مرویات زیادہ تر قصص اخبار و فتن وغیرہ سے متعلق ہیں[1]،

خلفائے راشدین میں سب سے زیادہ تفسیری روایات حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ہیں، حضرت علیؓ کے بعد حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی روایات زیادہ ہیں، سب سے زیادہ تفسیری روایات حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی طرف منسوب ہیں،

---

[1] اتقان ج ۲ ص ۱۸۷،

عہدِ صحابہ میں ایک تفسیری مجموعہ کا انتساب حضرت ابی بن کعبؓ کی طرف ہے، اس سے ابن جریر طبری نے بہ کثرت اخذ کیا ہے، حاکم نے مستدرک میں نیز امام احمد بن حنبلؒ نے بھی اس سے اخذ کیا ہےؔ،

صحابۂ کرام کے بعد حضرات تابعین کا دور آتا ہے، اس دور میں مکہ اور کوفہ تعلیم قرآن کے لئے خاص اہمیت رکھتے ہیں، مکہ میں حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کے تلامذہ حضرت مجاہدؒ ۱۰۲ یا ۱۰۳ھ حضرت سعید بن جبیرؒ ۹۴ھ حضرت عکرمہؒ ۱۰۶ یا ۱۰۷ھ حضرت طاؤسؒ ۱۰۶ھ حضرت عطار بن رباح ۱۱۴ھ کا فیض جاری تھا،

کوفہ میں حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کے تلامذہ حضرت علقمہ بن قیسؓ ۱۰۲ھ، حضرت اسود ابن یزید ۷۵ھ، حضرت ابراہیم نخعی (۹۵ھ) اور امام شعبی ۱۰۵ھ خدمتِ دین میں مصروف تھے،

ان حضرات کے سوا اس عہد کے مشاہیر میں حضرت حسن بصری ۱۲۱ھ، عطار بن ابی سلمہ خراسانی، محمد بن کعب القرظی ۱۱۸ھ، ابو العالیہ رفیع بن مہران الریاحی ۹۰ھ، ضحاک بن مزاحم ۱۰۵ھ، عطیہ بن سعید العوفی ۱۱۱ھ، قتادہ بن دعامہ ۱۱۸ھ، ابو مالک، زید بن اسلم، ربیع بن انس، مرہ ہمدانی ۷۶ھ کے نام قابلِ ذکر ہیں، اس دور کی تفسیر کا بڑا سرمایہ حضرات صحابۂ کرام کی روایات اور ان کے اقوال ہیں، خود تابعین عظام بھی تلاش و تفحص اور اجتہاد نیز استنباطِ مسائل سے کام لیتے تھے، قرآن کے متعلق ان کی لغوی تشریحات کو امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں جمع کر دیا ہے، اس دور میں اسرائیلیات کو تفسیر میں زیادہ دخل ہوا، اہلِ کتاب مسلمان تورات، انجیل اور ان کے شروح و حواشی کو آیاتِ قرآنی کے ضمن میں بیان کرتے اور لوگ ان کو ذوق و شوق سے سنتے، اس عہد میں ابن جریج ۱۵۰ھ جو کہ نصرانی الاصل تھے، ان کی روایات زیادہ شہرت پذیر ہوئیں،

صاحب کشف الظنون نے جن کتبِ تفسیر کا ذکر کیا ہے، ان میں سے حضرات تابعین کی طرف

لہ مبادی التفسیر شیخ محمد خضری دمیاطی ص۱۱،

جن کا انتساب ہے وہ یہ ہیں،

(۱) تفسیر عکرمہ (۲) تفسیر عوفی (۳) تفسیر مجاہد (۴) تفسیر والبی (۵) تفسیر زید بن اسلم، ابن الوزیر یمنی نے ایثار الحق علی الخلق میں حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کے شاگرد علی بن طلحہ ہاشمی کی تفسیر، نیز تفسیر امام حسن بصریؒ تفسیر عطار بن رباحؒ تفسیر محمد بن کعب القرظی کا ذکر کیا ہے،

علی بن طلحہ کی تفسیر کے متعلق حافظ ابن حجر کا بیان ہے کہ اس کا ایک نسخہ امام لیث کے کاتب شیخ ابو صالح کے پاس تھا، امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ یہ نسخہ مصر میں ہے، اگر کوئی محض اس کے لئے مصر کا سفر کرے تو یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے، اس صحیفہ سے ابو جعفر نحاس ۳۳۸ھ نے اپنی کتاب الناسخ والمنسوخ میں کافی اخذ کیا ہے، ابن جریر نے بھی اپنی تفسیر میں اس سے تخریج کی ہے[۱]،

حضرت سعید بن جبیرؓ کی طرف بھی ایک تفسیر منسوب ہے، حضرت سعید بن جبیرؒ کی خدمت میں عبد الملک بن مروان نے لکھا کہ قرآن مجید کی تفسیر تحریر فرمائیں، چنانچہ امام موصوف نے تفسیر لکھی جو کتب خانہ شاہی میں رکھی گئی، یہی تفسیر تفسیر عطار بن دینار کے نام سے مشہور ہے[۲]،

حضرات تابعین کے بعد تبع تابعین کا دور آتا ہے، ان کا اصل کارنامہ اقوال صحابہ و تابعین کا جمع کرنا اور ان کی اشاعت ہے، دوسری روایات کو بھی اُنھوں نے جمع کیا، لیکن عموماً جرح و تنقید سے الگ رہے، الا ماشاء اللہ،

اس سلسلہ میں قابلِ ذکر حضرات یہ ہیں،

سفیان بن عیینہ ۱۹۸ھ، وکیع بن الجراح ۱۹۶ھ، شعبہ بن الحجاج ۱۶۰ھ، اسحاق بن راہویہ ۲۳۸ھ یزید بن ہارون السلمی ۲۰۶ھ، عبد الرزاق بن ہمام ۲۱۱ھ، آدم بن ابی ایاس ۲۲۰ھ، روح بن عبادہ ۲۰۵ھ، سنید ابن داؤد ۲۲۰ھ، ابوبکر بن ابی شیبہ ۲۳۵ھ، عبد بن حمید ۲۴۹ھ، ابن وہب ۱۹۷ھ،

---

[۱] مرآۃ التفسیر ص ۱۱۱ [۲] میزان الاعتدال ترجمہ عطار ابن دینار،

اس دور میں تفسیری دائرہ کو بہت وسعت ہوئی، بہ کثرت روایات کا سلسلہ پھیلا، صاحب کشف الظنون نے جن تفسیروں کا ذکر کیا ہے ان میں سے ذیل کی تفسیریں اس دور کی ہیں،

(۱) تفسیر ابن جریج ۱۵۰ھ (۲) تفسیر مقاتل ۱۵۰ھ (۳) تفسیر آدم بن ابی ایاس ۲۲۰ھ (۴) تفسیر شعبہ بن حجاج ۱۶۰ھ (۵) تفسیر عبد الرزاق بن ہمام ۲۱۱ھ (۶) تفسیر عبد بن حمید ۲۴۹ھ (۷) تفسیر وکیع بن الجراح ۱۹۷ھ (۸) تفسیر یزید بن ہارون ۲۱۱ھ (۹) روح بن عبادہ کے متعلق تہذیب میں جمع تفسیر کا ذکر ہے (۱۰) ابوبکر بن شیبہ کی تفسیر کا ذکر خطیب کرتے ہیں (۱۱) سنید بن داؤد کو بھی صاحب تفسیر مانا جاتا ہے[۱]،

صاحب کشف الظنون کی ذکر کردہ تفاسیر میں ذیل کی تفسیریں بھی ابن جریر سے پیشتر کی یا ان کے عہد کی ہیں (۱) تفسیر واقدی ۲۰۷ھ (۲) تفسیر ابن ماجہ ۲۷۳ھ[۲] (۳) تفسیر اشج (ابوسعید عبداللہ ابن سعید الکندی) ۲۵۷ھ (۴) تفسیر انماطی (ابو اسحاق نیشاپوری) ۳۰۳ھ (۵) تفسیر بقی (حافظ ابو عبد الرحمن بقی بن مخلد قرطبی) ۲۷۶ھ (۶) تفسیر دینوری ۲۹۰ھ،

تفسیر بقی کے متعلق ابن حزم کہتے ہیں کہ اس سے اچھی تفسیر نہیں لکھی گئی[۳]،

اس ضمن میں کسائی کی معانی القرآن اور فراء ۲۰۷ھ کی تفسیری کتاب کا ذکر بھی مناسب ہوگا معانی القرآن کی تفصیل تو معلوم نہیں ہے، البتہ فراء کی کتاب کے متعلق ابن ندیم کا بیان ہے کہ وہ عمر بن بکیر کی فرمائش پر لکھی گئی تھی، عمر بن بکیر فراء کے شاگرد تھے، اور امیر حسن بن سہیل کے ساتھ رہتے تھے امیر ان سے اکثر قرآن پاک کے مسائل دریافت کرتا، ان کو کبھی کبھی مشکل پیش آتی، اسلئے استاد سے درخواست کی کہ قرآن کے متعلق چند اصول یا مستقل کتاب تحریر فرمادیں، فراء نے شاگرد کی درخواست قبول کی، اور سورہ فاتحہ سے املاء کرانا شروع کیا، ابو العباس کا بیان ہے کہ اس سے پیشتر اس قدر اچھی

---

[۱] مراۃ التفسیر ۲ [۲] معجم المطبوعات ج ا ص ۲۳۲ [۳] مراۃ التفسیر ص ۴۵،

کتاب نہیں لکھی گئی،[1]

تبع تابعین کی تفسیروں میں دو تفسیریں اور قابل ذکر ہیں، ایک تفسیر سفیان ثوری ۱۶۱ھ جس کا قلمی نسخہ کتب خانۂ رامپور میں موجود ہے، اس میں وہی آیات تفسیر کے لئے منتخب کی گئی ہیں جن میں کوئی مشکل لفظ یا محاورہ یا کوئی تلمیح ہے، ہر تفسیر بیشتر تابعی یا صحابی اور کمتر خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچائی جاتی ہے، مفسر نے الفاظ تفسیر میں بے حد اختصار سے کام لیا ہے، کتاب آیت لا اکراہ فی الدین کی تفسیر سے شروع ہو کر سورۂ والطور کی آیت اولی کے آغاز پر ختم ہوتی ہے،[2]

دوسری تفسیر امام مالک کی ہے جس میں قرآن مجید کی تفسیر بروایت احادیث مسندہ ہے، حافظ سیوطی نے اس کو دیکھا ہے اور اس کی تعریف کی ہے لیکن یہ مشکوک ہے، کہ یہ خود امام کی تالیف ہے یا کسی شاگرد نے امام سے اس کی تعلیق کی ہے،[3]

مفسر ابن جریر: تفسیر کے ان اہم سلسلوں کے بعد وہ سلسلہ آتا ہے جس میں ابن جریر جیسا فاضل مفسر منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوتا ہے، جو اپنے پیشروؤں کا مخزن اور پس روؤں کا ماخذ بنجاتا ہے، جس کی تفسیر کے متعلق ایک بزرگ خواب دیکھتے ہیں کہ وہ ابو جعفر طبری کی محفل میں ہیں، ان کے سامنے ان کی تفسیر پڑھی جارہی ہے کہ یکایک ہاتف غیبی آواز دیتا ہے کہ جس کو قرآن اسطرح سننا ہو جسطرح کہ وہ نازل ہوا ہے تو اس کتاب کو سنے،[4]

ابو حامد احمد بن ابی طاہر اسفرائینی کہتے ہیں کہ اگر کوئی محض ابن جریر کی تفسیر کے لئے چین کا سفر کرے تو یہ کچھ زیادہ نہیں،[5]

ابن خزیمہ نے اس تفسیر کو کئی سال تک مکمل دیکھا پھر کہا کہ روے زمین پر ابن جریر سے بڑھکر کوئی عالم نہیں،[6]

---

[1] فہرست ابن ندیم ص ۱۹ [2] معارف ستمبر ۱۹۳۵ء [3] حیات مالک ص ۱۸ [4] معجم الادباء ج ۶ ص ۴۲۹
[5] خطیب ج ۲ ص ۱۶۳ [6] ایضاً ج ۲ ص ۱۶۴،

حافظ جلال الدین سیوطی کہتے ہیں کہ اگر تم مجھ سے پوچھو کہ کس تفسیر پر اعتماد کیا جائے اور اس کو دیکھا جائے تو میں کہونگا کہ تفسیر ابن جریر طبری جس پر علمار کا اتفاق ہے کہ اسکے مثل کوئی تفسیر نہیں لکھی گئی،[۱]

داؤدی مالکی کہتے ہیں کہ حسب اتفاق علمار ابن جریر کی تفسیر القرآن کے مثل کوئی تفسیر نہیں لکھی گئی،[۲]

خود ابن جریر کہتے ہیں کہ میں نے تفسیر لکھنے سے پیشتر تین برس تک خدا سے دعا کی اور تفسیر کیلئے اعانت کا خواستگار رہا، خدا نے یہ دعا قبول کی،

ابن جریر کی تفسیر پر علمار کا یہ اتفاق بلا وجہ نہیں ہے بلکہ وہ اپنی خصوصیات اور اپنے امتیازات کی بنار پر اسی کی مستحق تھی، مناسب ہوگا کہ اس موقع پر اجمالاً ابن جریر کی تفسیر کی خصوصیات کا ذکر کیا جائے

(۱) اس میں کوئی شک نہیں کہ ابن جریر سے پیشتر کئی تفسیری مجموعے موجود تھے جیسا کہ ہم تاریخ تفسیر کے ضمن میں ذکر کر چکے ہیں، مگر ان مجموعوں میں سے کوئی مجموعہ بہ ترتیب مصحف تمام قرآن کی تفسیر نہ تھا، بلکہ ان کی صورت یہ تھی کہ جس کے پاس جو تفسیری روایات تھیں، وہی تفسیری مجموعہ کی شکل میں آگئیں، ابن جریر کی تفسیر سے پیشتر کے تفسیری مجموعوں میں سے ہمارے پاس سفیان ثوری کی تفسیر موجود ہے، اسکے سوا بخاری، مسلم اور ترمذی کے ابواب التفسیر موجود ہیں، جو اس زمانہ کے اس طریق پر شاہد عدل ہیں،

احمد امین مصنف ضحی الاسلام کا قیاس ہے کہ فرار نے جس تفسیر قرآن کا قصد کیا تھا، ممکن ہے کہ وہ مکمل تفسیر ہو لیکن ظاہر ہے کہ یہ محض قیاس ہی ہے،

بہرحال ہمارے سامنے بہ ترتیب مصحف قرآن کی پہلی اور جامع تفسیر صرف ابن جریر کی ہے، جو خاص اصول و قواعد کے ماتحت لکھی گئی، یہ ابن جریر کی معمولی فضیلت نہیں ہے،

(۲) ابن جریر نے بہ ترتیب مصحف تمام قرآن کی تفسیر جمع کرنے کے بعد سب سے بڑا کام یہ کیا کہ

---

[۱] اتقان ج ۲ ص ۱۹۱ [۲] طبقات المفسرین نسخہ مخطوطہ بانکی پور۔

ان تمام تفسیری ذخیروں کو جو ان کے عہد میں تحریری یا زبانی طور پر موجود تھے، اپنی تفسیر میں جمع کرکے ان کو دست برد زمانہ سے محفوظ کر دیا، چنانچہ ذیل کے ماخذ ان کی تفسیر کا اصل قرار پائے،

(۱) کتب تفسیر مصنفہ عن عبداللہ بن عباسؓ خمستہ طرق (۲) کتب تفسیر عن سعید بن جبیر طریقین (۳) عن مجاہد ثلثتہ طرق او اکثر (۴) عن قتادہ بن دعامہ ثلاثتہ طرق (۵) حسن بصری ثلثتہ طرق (۶) عکرمہ ثلثتہ طرق (۷) ضحاک بن مزاحم طریقین (۸) عبداللہ بن مسعودؓ طریقاً (۹) تفسیر عبدالرحمن ابن زید بن اسلم (۱۰) تفسیر ابن جریج (۱۱) تفسیر مقاتل بن حیان،

ان کتابوں کے سوا دوسری احادیث مشہورہ مسندہ بھی حسب ضرورت ذکر کی گئی ہیں[۱]،

(۱) اس سے پیشتر ہم تفسیر ابی بن کعبؓ اور تفسیر علی بن طلحہؓ کے متعلق ذکر کر چکے ہیں کہ ابن جریر نے انکو بھی اپنی تفسیر کا ماخذ بنایا ہے،

اس تشریح کے بعد یہ شبہہ بھی دور ہو جاتا ہے، کہ ابن جریر سے پیشتر کے تفسیری مجموعے کیا تلف ہو گئے،؟ اور ہمارے سلف نے ان سے غفلت کی،؟ لیکن صورتِ حال یہ نہیں ہے، بلکہ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ ابن جریر نے ان تمام مجموعوں کو اپنی تفسیر میں شامل کرکے دنیا کو ان سے بے نیاز کر دیا، آج اگر کوئی چاہے تو ابن جریر کی تفسیر سے وہ تمام سابقہ مجموعے نکل سکتے ہیں، یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے کہ امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں تمام حدیثی ذخائر کو جمع کر لیا ہے اور آج بھی ان کی صحیح سے وہ کتابیں نکالی جا سکتی ہیں جنکے نام ان سے پیشتر ذکر کئے جاتے ہیں،

(۳) عموماً سمجھا جاتا ہے کہ ابن جریر نے اپنی تفسیر کی بنیاد محض نقلِ روایات پر رکھی ہے، لیکن یہ صحیح نہیں ہے، ابن جریر نے محض جمع و نقلِ روایات پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ تمام اقوال کو نقل کرکے مجتہدانہ شان کے ساتھ ان کی توجیہ اور بعض کو بعض پر ترجیح دینے کی کوشش کی[۲]، گویا انھوں نے روایت کے

---

[۱] معجم الادبارج ۶ صفحہ ۴۴۱-۴۲۲، [۲] اتقان ج ۲ صفحہ ۱۹۰،

ساتھ درایت سے بھی کام لیا، یہ ان کی وہ خصوصیت ہے، کہ جس میں انکے عہد تک کوئی انکا مقابل نہیں،

داؤدی طبقات المفسرین (نسخہ مخطوطہ بانکی پور) میں کہتے ہیں:۔

انہ جمع بین الروایۃ والدرایۃ	انھوں نے روایت اور درایت کو جمع
ولم یشارکہ فی ذالک احد	کردیا، اور اس میں ان سے پیشتر اور ان کے
لا قبلہ ولا بعدہ	بعد کوئی ان کا شریک نہیں ہی،

ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں ان کے مختارات کو نقل کیا ہی اور کہیں کہیں اختلاف بھی کیا ہی،

(۴) ابن جریر نے دستور زمانہ کے خلاف ایک قدم اور آگے بڑھا کر یہ کارنمایاں بھی انجام دیا کہ قرآن سے متعلق اس عہد تک کے تمام پیدا شدہ مباحث کو اپنی تفسیر میں شامل کرکے اس کو اس عہد تک کی قرآنی انسائیکلو پیڈیا بنا دیا، چنانچہ تجوید، نحو، صرف، لغت، فقہ، عقائد و کلام ملاحدہ اور فرقِ باطلہ کی تردید، علوم طبیعیہ کے متعلقہ مسائل، ان کی تفسیر میں صاف طور سے ملتے ہیں جن کے پڑھنے سے اس عہد تک کے اندازِ فکر کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہی،

تفسیر ابن جریر کے روایتی حصہ کے متعلق یہ امر ذہن نشین رہنا چاہئے کہ انھوں نے ان طرق سے جو قطعی غیر موثق ہیں، تخریج نہیں کی ہے، مثلاً محمد بن سائب کلبی، مقاتل بن سلیمان، محمد بن عمر الواقدی کہ تاریخ و سیر اور اخبار عرب کے سوا جس کے لئے یہی ذریعہ ہیں، اور کہیں ان سے اخذ نہیں کیا ہے،

تاہم چونکہ انھوں نے تمام تفسیری ذخائر کے جمع کرنے کا عزم کیا ہی، اسلئے سندی حیثیت سے ان کی روایات کے تمام طرق کی تصحیح نہیں کیجا سکتی، لیکن بقول مصنف ضحی الاسلام (صہ ۱۴۳) ان تفسیری روایات کو جو سندی حیثیت سے ضعیف ہیں، بالکل کم قیمت بھی نہ سمجھنا چاہیئے، یہ تسلیم کہ ان کی سند درست نہیں ہے، مگر یہ تو مسلم ہے کہ اس ضعیف السند روایت میں جو کچھ

کہا گیا ہی وہ اس آیت سے متعلق اس زمانہ کے کسی شخص کا خاص نتیجۂ فکر ہی، جو بہرحال لائق توجہ ہے،

ابن جریر کی مرویات پر حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں کہیں کہیں جرح کی ہی، خود ابن جریر نے بھی کہیں کہیں ضعف سند پر تنبیہ کی ہی، مثلاً ج ۱ ص ۲۵، ج ۵ ص ۲۷،

اوپر عرض کیا گیا ہی کہ ابن جریر کی تفسیر محض روایات کا مجموعہ نہیں ہی، بلکہ قرآن سے متعلق اس عہد تک کے پیدا شدہ مسائل کا ایک محفوظ ذخیرہ ہی، زیادہ وضاحت کیلئے اختصار کیساتھ تفسیر ابن جریر کے ان مباحث کے متعلق کچھ عرض کیا جاتا ہی،

تفسیر ابن جریر اور قرأۃ کلمات قرآن کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جنکو تمام صحابہ نے متفقاً یکساں پڑھا ہی، اور ان میں کوئی اختلاف ممکن نہیں ہی، دوسرے وہ کلمات ہیں جن کے طریق ادا اور قرأۃ میں اختلاف ہوا ہی، ہرچند کہ یہ اختلاف اختلاف تناقض و تضاد نہیں، تاہم استنباط احکام و مسائل میں اس کا اثر ضرور پڑتا ہے[1]، اسلئے مفسر کو اختلاف قرأت سے واقفیت بہت ضروری ہی، ابن جریر اس فن میں خاص مجتہدانہ شان رکھتے تھے، انھوں نے اپنی تفسیر میں تمام اختلافات قرأت کو نقل کیا ہی، نیز اس اختلاف قرأت سے مفہوم و مسائل کے تنوعات اور اختلافات پر بھی بحث کی ہی، سیاق و سباق اور دوسرے دلائل و شواہد سے ان میں سے کسی ایک کو ترجیح دی،

کبھی ایک ہی صحابی سے ایک ہی لفظ کے متعلق دو تفسیریں نقل ہوتی ہیں، شبہہ ہو سکتا ہی کہ یہ اختلاف کیوں ہی؟ ابن جریر اسکی گرہ کشائی یوں کرتے ہیں، کہ یہ اختلاف تفسیر بربنائے اختلاف قرأۃ ہی، مثلاً آیت

انما سکرت ابصارنا (حج) مست کر دی گئیں آنکھیں ہماری،

میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے دو قول منقول ہیں سکرت بمعنی سدت اور سکرت بمعنی خذت، اس اختلاف معانی کو نقل کرنے کے بعد ابن جریر، قتادہ سے نقل کرتے ہیں، کہ یہ اختلاف معانی اصل میں اختلاف قرأۃ کی بنا پر ہے، جس نے سکرت کو تشدید کے ساتھ پڑھا، اس نے (سدت) کے اور جس نے اسکو تشدید کے بغیر پڑھا اس نے (سحرت) کے معنی لئے ہیں، (باقی)

---

[1] اتقان ج ۱ ص ۸۲ .

یادِ پاستاں

از جناب مولانا امتیاز علی خانصاحب عرشی ناظم کتب خانہ ریاست رام پور

مذکورۂ بالا عنوان پر مولوی مقبول احمد صاحب صمدنی کا ایک پرمغز مگر بیحد دلچسپ مقالہ معارف میں باقساط شائع ہو چکا ہے، اس کی پہلی قسط میں جو جنوری کے پرچہ میں چھپی تھی، تاریخ محمدی کا بھی مذکور ہے، کتابخانہ عالیہ رامپور میں اس تراجم علماء و اعیان کے خزانے کی دوسری جلد کا بیش قیمت نسخہ محفوظ ہے، جو میری تحقیق کے مطابق خود مصنف کے قلم کا لکھا ہوا ہے،

مخطوطات عربیہ کی فہرست مرتب کرنے کے دوران میں مجھے اس کتاب کی افادی حیثیت کا علمی تجربہ ہوا، اس کی وسعتِ معلومات سے میں اس درجہ متاثر ہوا کہ اسی وقت سے یہ عزم کر لیا تھا کہ اسکی پہلی جلد کا نسخہ تلاش کرکے دونوں کو کتابخانہ کی طرف سے شائع کرنے کی کوشش کروں گا، برٹش میوزیم کی فہرستِ مخطوطاتِ فارسی میں ڈاکٹر ریو نے اس کے ایک قلمی نسخہ کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ یہ پورے دیباچے اور جلد اول و دوم کے انتخاب پر مشتمل ہے،

اس اطلاعِ جانفزا کو دیکھ کر میں نے فوراً اس کا فوٹو طلب کیا، مگر یہ نسخہ خود ہمارے ہی نسخے کی نقل نکلا، اور اس بنا پر ترتیب و تصحیح متن میں اس سے زیادہ فائدہ پہنچنے کی امید جاتی رہی، تاہم اشاعت کے ارادے میں وہی پختگی موجود رہی، مولانا صمدنی مدظلہ کے مضمون سے یہ معلوم کرکے بیحد خوشی ہوئی کہ اس کتاب کا مکمل نسخہ سید محمود علی صاحب رضوی رئیس چھپرہ مئو کے کتابخانہ میں موجود ہے، اور موصوف اس معاملہ میں اس درجہ دریا دل ہیں کہ مولانا کی فرمایش پر ایک انگریز کو اسکی نقل بھی عطا فرما چکے

ہیں، چونکہ ہم ہندوستانیوں کا حق ترجیح طلب ہے، اس لئے یقین ہوگیا کہ اگر موصوف سے استدعائے نقل کی گئی، تو وہ ضرور نوازش و کرم سے کام لیں گے، اور ہمیں پوری کتاب شائع کرنے کا موقع مل جائیگا۔

مولانا صمدنی نے اپنے فاضلانہ مقالے میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے، اس سے اس کتاب کے سنہ تصنیف اور عہدِ مصنف کے بارے میں غلط فہمی پیدا ہو جانے کا امکان ہے، بنا بریں ان امور کے متعلق کچھ کہنا ضروری ہے، مگر یہ جسارت خالص علمی دلچسپی کی بنا پر کی گئی ہے، اس لئے عرض کر سکتا ہوں کہ

خطا نمودہ ام و چشم آفریں دارم

مصنف کا نام و نسب مصنف کا نام محمد بن رستم بن قباد بن عبد الجلیل بن عبد الکریم بن طوغان حارثی بدخشی ہے، اس کا خاندان اصلاً بدخشاں کا رہنے والا ہے، اسی لئے یہ لوگ اپنے آپ کو بدخشی کہتے رہے ہیں، سب سے پہلے اس کے پردادا عبد الجلیل حارثی قندھار ہوتے ہوئے ہندوستان آئے، اور کشمیر میں فوت ہوئے، اس کے دادا قباد بیگ قندھاری المولد ہیں، اور دہلی میں رحلت کی ہے، باپ کی پیدائش راندیر کی ہے، اور ڈنکنکیرا میں عالمگیر کی چھاؤنی کے اندر انتقال کیا ہے،

حارثی نسبت سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ عربی خاندان کا آدمی ہے، اگر یہ صحیح ہے، تو پھر ناموں میں عجمیت ترکستان کی بود و باش کا نتیجہ ہوگی جس کی مثالیں اور نظیریں کم نہیں ہیں،

اس خاندان کے متعدد افراد کا تذکرہ کتاب میں ملتا ہے، ان تمام افراد کے مشاغلِ زندگی پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ تیغ و قلم دونوں سے کام لیتے رہے ہیں، چنانچہ حارثی کا پردادا فقیہ حنفی ہے، دادا بڑا معقولی خصوصاً ریاضی داں ہے، باپ مختلف علوم، قراءۃ، تفسیر، حدیث، فقہ، اصول، کلام، شعر اور ادب کا ماہر ہے، حکمیات و ریاضیات پر بھی اچھی نظر ہے، یونانی زبان پر اتنی قدرت ہے کہ علمی کتابوں کا عربی اور فارسی میں بلا تکلف ترجمہ کرتا ہے،

مصنف کی پرورش اسی بیت السیف و القلم میں ہوئی ہے، اس لئے اس نے بھی تمام مروجہ

علوم کی تحصیل کی ہے، کتاب میں اپنے ایک استادِ حدیث کا ذکر بھی کیا ہے، مگر برخلافِ آباء، مصنف کو ابتدا سے تاریخ سے دلچسپی تھی، اسی کا نتیجہ ہے کہ اس نے اپنی عمر کے ۲۶ ویں سال میں اس انسائیکلوپیڈیا کی ترتیب پر قلم اٹھایا ہے،

مصنف کی پیدائش | حارثی کی پیدائش ۱۲ رجمادی الاولی ۳۰ سنہ عالمگیری مطابق ۱۰۹۷ھ (۱۶۸۶ء) کو جلال آباد میں واقع ہوئی، تعلیم سے فارغ ہو کر ۲۵ رجمادی الآخرہ ۱۱۱۵ھ (نومبر ۱۷۰۳ء) کو سترہویں سال کی عمر میں شاہی ملازمت میں داخل ہوا، دورانِ ملازمت کے واقعات اور اس کی زندگی کے دوسرے کوائف کا پتہ نہیں چلتا، بجز اس کے کہ ۹ برس کی عمر میں باپ کا سایہ اس کے سر سے اٹھا تھا" عبرت نامہ" کے نام سے اس نے ایک کتاب لکھی تھی، جس کے دو نسخے انڈیا آفس کے کتبخانے میں موجود ہیں، اس کتاب کے آغاز میں خود اپنے حالات درج کئے تھے، افسوس کہ یہ کتاب ہمارے کتبخانے میں نہیں ہے، ورنہ اس کی زندگی پر مزید روشنی ڈالی جاسکتی تھی، ہاں، فہرستوں وغیرہ سے اسکی تصنیفات کے بارے میں کچھ باتیں معلوم ہوتی ہیں، جنھیں تصنیفات کے عنوان کے ماتحت لکھا جائیگا،

افرادِ خاندان | حارثی نے تاریخ محمدی میں اپنے متعدد عزیزوں کا ذکر کیا ہے، مگر اس کتاب کی ترتیب سنہ وار ہے، اس بنا پر ان لوگوں کے حالات ایک جگہ نہیں ملتے، میں آیندہ سطروں میں وہ تمام ٹکڑے خود حارثی کے لفظوں میں نقل کئے دیتا ہوں،

(۱) ۱۱۱۱ھ کے ماتحت اپنے والد کے متعلق لکھتا ہے:-

"رستم المخاطب بمعتمد خاں بن قباد الملقب بدیانت خاں بن عبد الجلیل الحارثی البدخشی الاصل الہندی المولد، کان جامعاً للعلوم، لاسیما الحکمیات، خصوصاً الریاضیات، فانہ کان فیہ فرید عصرہ، وکان لہ باع طویل فی اللغۃ والعربیۃ، وکان ذا مناسبۃ تامۃ بالقراۃ والتفسیر والحدیث والفقہ والاصول والکلام والشعر والآداب، وکان عارفاً باللسان الیونانیۃ

وکان یترجم کتبہم بالعربیۃ والفارسیۃ،

وہو والد محرر ہذہ الاوراق غفر اللہ لہما واحسن الیہما، وکانت ولادتہ فی شوال سنۃ ثمان واربعین والف ببلدۃ راندیر من بلاد الدکن، ومات یوم الاثنین الثامن عشر من جمادی الاولیٰ وقت الضحیٰ بقرب قلعۃ وانکنیکرا من بلاد الدکن فی معسکر سلطان العصر بالارث والاستحقاق ابی المظفر محی الدین محمد اورنگزیب بہادر عالمگیر باشاہ الغازی، اسکنہ الجنان، ثم نقل الی بلدۃ دہلی، وکان لراقم السطور یومئذ تسع عشر سنہ کاملۃ، ہزاری سوار"

اس بیان سے عارفی کے باپ کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑا معقولی تھا، منقولات پر بھی اچھی نظر تھی، یونانی کا ایسا عالم تھا کہ یونانی کتابوں کے عربی فارسی میں ترجمے کرتا تھا، ۱۰۴۸ھ ۱۶۳۸ء میں راندیر میں پیدا ہوا تھا، عالمگیر کے دربار میں ہزار سوار کا منصب دار تھا، دکن کی جنگ میں لشکر سلطانی کے ہمراہ تھا، وہیں ۱۱۱۶ھ (۱۷۰۴ء) میں فوت ہوا، اور دہلی میں نعش لاکر دفن کی گئی،

(۲) ۱۰۸۳ھ ۱۶۷۲ء کے وفیات میں اپنے دادا کے متعلق لکھتا ہے:-

"قباد بیگ المخاطب بدیانت خاں بن عبد الجلیل بن عبد الکریم الحارثی البدخشی، ولد بقندھار ونشاء بالہند وصار ذا منزلۃ عند السلطان الکبیر عالمگیر بادشاہ الغازی، وکان من علماء المعقول، لاسیما الریاضیات، فانہ کان فیہ وحید دہرہ وفرید عصرہ، مات فی رمضان بدہلی، ولہ ۷۰ سنۃ

وہو جد محرر ہذہ الارقام، وقد مرابوہ فی سنۃ، ہزار و پانصدی (اسماء وماثر عالمگیری)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عارفی کا دادا بھی بڑا معقولی و ریاضی داں تھا، عالمگیر کے دربار میں اسکی منزلت تھی، اور ہزار و پانصدی کا منصب رکھتا تھا، قندھار میں پیدائش اور دہلی میں وفات ہوئی، وقت انتقال ۷۰ برس کی عمر تھی، گویا ۱۰۱۳ھ ۱۶۰۴ء میں پیدا ہوا تھا، اسکی عمر اپنے باپ کے انتقال کے

وقت صرف آٹھ سال کی تھی،

(۳) ۱۰۲۰ھ ۱۶۱۱ء کے وفیات میں اپنے پردادا کے بارہ میں کہتا ہے :-

"عبد الجلیل بن عبد الکریم بن المولی طوغان الحارثی البدخشی، نزیل الہند، العالم الفقیہ الحنفی مات بکشمیر فی ہذہ السنۃ تقریبًا، وسیاتی ابناہ، قباد بیگ المخاطب بدیانت خاں فی سنۃ ۱۰۸۳ھ وحسن بیگ فی سنۃ ۱۰۷۴ھ (کذا سمعت من بعض رجال قومی)"

اس سے پتہ چلتا ہے کہ حارثی خاندان کا پہلا شخص جو وارد ہندوستان ہوا، عبد الجلیل تھا، یہ حنفی فقیہ تھا، غالبًا دنیوی جاہ و منزلت نصیب نہیں ہوئی، اس کا سنہ وفات بھی حارثی کو صرف تخمینی طور پر خاندان کے کسی بڑے بوڑھے سے معلوم ہوا ہے، کتاب میں عبد الجلیل کے باپ دادا کا ذکر نہیں ملتا، اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کے بہت سے غیر ہندی خاندانوں کی طرح اس خاندان کے تعلقات بھی بدخشاں سے بالکل ٹوٹ گئے تھے، اور پس ماندوں کو صرف عبد الجلیل اور اس کے اخلاف کا علم تھا،

(۴) عبد الجلیل کے ایک بیٹے کا ذکر کیا جا چکا ہے، دوسرے بیٹے حسن بیگ کے متعلق ۱۰۷۴ھ ۱۶۶۳ء کے ماتحت لکھا ہے،

"حسن بیگ المتخلص بہ آگہی، ابن عبد الجلیل بن عبد الکریم الحارثی البدخشی، در اوائل سال فوت شد، عمرش ۵۷ سال بود، بجودتِ نظم و نثر مشہور بود، و عم پدر مسودّ اوراق است و پدرش در سنۃ ۱۰۲۰ھ گذشت، (سماع)"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حسن بیگ ۱۰۱۷ھ ۱۶۰۸ء میں پیدا ہوا، اور ۳ برس کی عمر میں یتیم ہو گیا، یہ بڑا ادیب تھا، نظم و نثر دونوں پر قدرت رکھتا تھا، اور "آگہی" تخلص کرتا تھا،

میں نے خان آرزو کے تذکرہ مجمع النفائس، اور عاشقی کے تذکرہ، نشتر عشق میں آگہی کو ناشی

کیا، مگر ان دونوں میں اس کا ذکر نہیں ہے،

(۵) ۱۰۹۹ھ/۱۶۸۷ء کے ماتحت اپنے دادا کے چچازاد بھائی کا ان لفظوں میں ذکر کیا ہے:-

"ابو تراب بن عبد العزیز بن عبد الکریم الحارثی البدخشی من عرفاء العصر، مات بدکن ولہ ۶۵ سنۃ و ہو ابن عم جد مسود الاوراق"

(۶) ۱۱۰۱ھ/۱۶۸۹ء کے ذیل میں اپنے چچا کے بارہ میں لکھا ہے:-

"دیوانگن مخاطب بمعتمد خاں بن قباد مخاطب بدیانت خاں از امرای عالمگیری، در ماہ جمادی الاولی در دکن فوت شد، و دے عم مسود این اوراق است، عمرش ۶۳ سال بود، پدرش در ۱۰۳۸ھ گذشت، ہزار و پانصدی"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حارثی کا چچا ۱۰۳۸ھ/۱۶۲۸ء میں پیدا ہوا تھا، وہ اس کے باپ کا بڑا بھائی تھا، اسی لئے اپنے باپ کے منصب ہزار و پانصدی پر فائز بھی ہوا، ۶۳ سال کی عمر میں دکن کے اندر غالباً لشکر عالمگیری میں ۱۱۰۱ھ کو اس کا انتقال ہوا،

(۷) باپ کے ایک چچازاد بھائی کا ذکر ۱۱۲۴ھ/۱۷۱۲ء کے ماتحت کرتے ہوئے کہتا ہے:-

"محمد بیگ مخاطب بہ مخلص خاں بہادر بن احمد بیگ حارثی بدخشی، از کبار امرای شاہ عالمی، نیمروز سہ شنبہ ۱۲ صفر بحکم جہاندار شاہ بقتل رسید، سنش ۵۲ سال، و دے ابن عم والد محرر این ارقام بود، و اخلاق کریمہ بسیار داشت، پہ چہار ہزاری"

حارثی کا یہ رشتے کا چچا ۱۰۷۲ھ/۱۶۶۱ء میں پیدا ہوا تھا، یہ شاہ عالم بہادر شاہ اول کے دربار کا بہت بڑا سردار، اور چہار ہزاری منصب اور خطاب مخلص خاں بہادر سے سرفراز تھا،

(۸) اپنے حقیقی چچا کے بیٹے کا ذکر ۱۱۳۱ھ/۱۷۱۸ء میں اس طرح کیا ہے:-

"محمد غضنفر خاں بن دیوانگن مخاطب بمعتمد خاں بن دیانت خاں حارثی بدخشی، از امرای

عصر، ۷ رمضان، در شاہجہان آباد فوت شد، عمرش ۶۵ سال، وگاہے شعرہم میگفت، و وے

ابن عم مسود اوراق ست، و پدرش در ۱۱۰۱ھ گذشت"

یہ ۱۰۶۶ھ/۱۶۵۵ء میں پیدا ہوا، دہلی کے امرا میں سے تھا، شعر بھی کہہ لیتا تھا، ۶۵ برس کی عمر میں مرگیا،

(۹) حارثی نے اپنے ایک حقیقی بھائی کا بھی ذکر کیا ہے، چنانچہ ۱۱۳۵ھ/۱۷۲۲ء کے ماتحت لکھا ہے:-

" میرزا عبدالرحمن متخلص بغیرت بن رستم مخاطب بمعتمد خان بن قباد مخاطب بدیانت خاں

حارثی بدخشی، جوانِ مستعد طالبِ علم شاعر بود، و بمحاسنِ اخلاق اتصاف داشت، روز شنبہ

۵ ذی العقدہ در شاہجہان آباد فوت شد، یک پہر روز ماندہ عمرش .... سال و ۳ ماہ

و وی برادر اعیانی و جامعِ ایں اوراق بود"

حارثی کا بھائی اس خاندان کا تیسرا شاعر ہے، کتاب کے رامپوری نسخے میں اسکی عمر کے ہندسے

پڑھنے میں نہیں آئے، اس لئے یہ بتانا ممکن نہیں کہ یہ حارثی سے بڑا تھا یا چھوٹا، البتہ عبارت سے

یہ ضرور مترشح ہے کہ اُس نے جوانی میں انتقال کیا، محولۂ بالا دونوں تذکروں میں اسکا بھی ذکر نہیں ہے

(۱۰) ۱۱۵۴ھ/۱۷۴۱ء میں اپنی والدہ کا ذکر کیا ہے، کہتا ہے:-

" زاہدہ خانم بنت میرک بیگ بن خواجہ بیگ الحارثیہ، زوجہ محمد رستم المخاطب بمعتمد خاں

ابن قباد بیگ الحارثی، ووالدۃ جامع ہذہ الاوراق، میرزا محمد بن معتمد خاں، توفیت غرۃ

جمادی الاولی بشاہجہان آباد و لہا ۳ ۸ سنۃ الا اشہر، وکانت جامعۃ بخصال الخیر من الورع

والعفاف والسخا، ومحاسن الاخلاق، کثیرالبر والاحسان الی الاقارب الاباعد وقد مرز وجہا فی ۱۱۱۶ھ

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حارثی کی والدہ تقریباً ۱۰۷۱ھ/۱۶۶۰ء میں پیدا ہوئی تھی، اور اپنے شوہر سے

۲۳ سال چھوٹی تھی، خود حارثی کی والدہ کا خاندان بھی حارثی بدخشی ہے، اور اس لئے بعید نہیں ہے

کہ اوپر جاکر یہ سب عبدالجلیل کے کسی بزرگ سے مل جاتے ہوں،

(۱۱) اپنے ماموں کے متعلق ۱۱۲۰ھ/۱۷۰۸ء میں لکھتا ہے :-

" محمد خواجہ مخاطب بہ مختص خاں بن میرک بیگ بن خواجہ بیگ حارثی بدخشی، از امرائے عصر، در ماہ صفر بشاہجہان آباد فوت شد، عمرش ۴۴ سال و وے خال حقیقی جامع ایں اوراق بود"۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ محمد خواجہ ۱۰۷۶ھ/۱۶۶۶ء میں پیدا ہوا تھا، اور اپنی بہن سے عمر میں چھوٹا تھا، حارثی نے اسے بھی امرائے عصر میں ظاہر کیا ہے، اور مختص خاں خطاب بتایا ہے،

(۱۲) حارثی کے دوسرے ماموں کا نام نعمان بیگ بن میرک بیگ تھا، ان کے پوتے کا تذکرہ ۱۱۵۴ھ/۱۷۴۱ء کے ماتحت ان لفظوں میں کیا ہے :

" مظفر حسین متخلص بہ حسین بن محمد غیاث بن نعمان بیگ بن میرک بیگ حارثی بدخشی، شاعر خوش کلام، ۲۱-۲۲ شوال درہمراہی نجیب علی خاں .... فوجدار اٹاوہ در جنگ .... "

باقی عبارت حاشیہ کے ساتھ کٹ گئی ہے، یہ اس خاندان کا چوتھا ادیب ہے،

(۱۳) اسی خاندان کے ایک فرد کا تذکرہ ۱۱۳۹ھ/۱۷۲۶ء کے ماتحت کیا ہے، مجلد نے حاشیہ کے ساتھ کچھ عبارت کاٹ دی ہے، اس لئے مصنف سے اسکے رشتہ کا پتہ نہیں چلتا، اس کے متعلق کہتا ہے:

" میرزا محمد افلاطون بن جعفر بیگ الحارثی البدخشی ثم الدہلوی، الزاہد العالم الفقیہ الحنفی وکان کامل العقل وافرالدہر، مات بشاہجہان آباد، یوم الاثنین ۲۰ ربیع الاول، ولد سنہ ۱۰۶۶"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص ۱۰۶۶ھ/۱۶۵۵ء میں پیدا ہوا تھا اور دہلی میں فوت ہوا، یہ زاہد اور فقیہ تھا،

(۱۴) ایک اور فرد اسی خاندان کا ۱۰۲۵ھ/۱۶۱۶ء میں مذکور ہے، اسکے متعلق کہتا ہے :-

" جمیل بیگ بن ابو تراب حارثی، از امرائے اکبر شاہی و جہانگیر شاہی، در کشمیر فوت شد، و وے بصلاح و تقوی و علم و فضل اختصاص داشت، و عبد الجلیل کہ جد والد راقم ....."

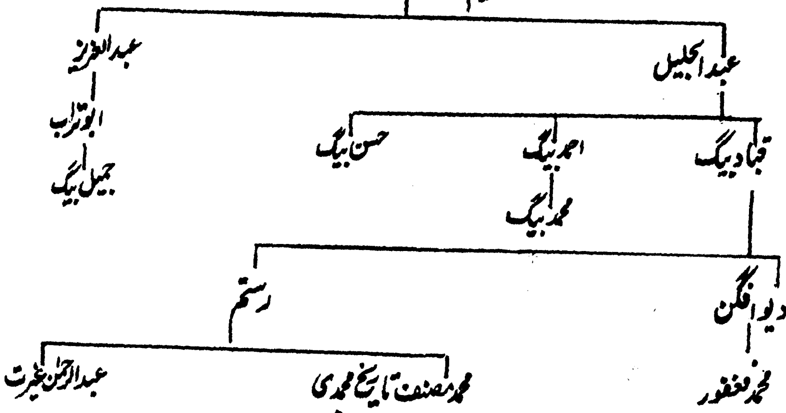
موصی الیہ بود۔ (کہذا رایت فی بعض مسودات قدمائے قومی، عرفات العاشقین)۔"

اصل کتاب میں چند لفظ کسی نے مٹا دئے ہیں، اسلئے رشتہ معلوم نہ ہوسکا، بظاہر یہ ابو تراب حارثی مصنف کے پر دادا عبد الجلیل کے بھائی عبد العزیز کا بیٹا ہے، اگر یہ صحیح ہے، تو پھر جمیل بیگ اس کے دادا کا چچازاد بھائی ہوا،

مطالعہ کرنے والوں کی سہولت کے خیال سے میں حارثی کے والدین کے خاندان کا شجرہ علیحدہ لکھے دیتا ہوں جو حسب ذیل ہے،

دادھیال کا شجرہ

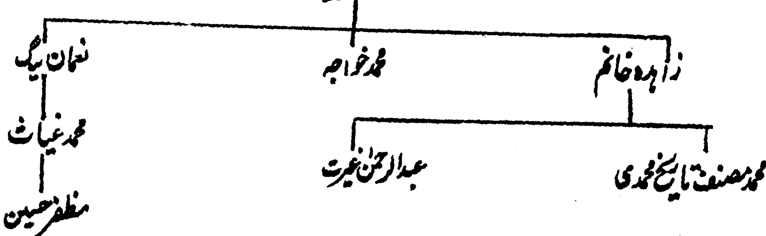
عبد الکریم بن طوغان حارثی بدخشی



نانہیال کا شجرہ

خواجہ بیگ حارثی

میرک بیگ



تعلیم و تصنیف | مصنف کے خاندان میں علم و دولت دونوں کی برکتیں پائی جاتی تھیں، اس بنا پر یقین ہے، کہ اس کی تعلیم و تربیت میں خاصی کوشش کی گئی ہوگی علوم آلیہ کے متعلق خود اُس کا کوئی بیان ہمارے سامنے نہیں ہے، البتہ ۱۱۴۳ھ کے ماتحت اپنے حدیث کے ایک استاد کا ان لفظوں میں تذکرہ کیا ہے:

"الشیخ مقرب اللہ بن جار اللہ بن نور اللہ بن نور الحق بن الشیخ المحدث عبد الحق بن سیف الدین الترک الدہلوی العلامۃ المتفنن الحنفی مات فی رمضان بدہلی، و لہ نحو ستین سنۃ، و ہو اول من قرأت علیہ الحدیث۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حارثی نے سب سے پہلے دہلی کے مشہور محدث خاندان کے بزرگ شیخ مقرب اللہ سے حدیث پڑھی،

ہمارے کتب خانہ میں پچاس ساٹھ مختلف فنون کی قلمی کتابوں پر مصنف کے دستخط اور مہریں ہیں، چنانچہ ابن الہیثم کی شرح مصادرات کے پہلے صفحہ پر جو الفاظ اس نے لکھے ہیں، وہ حسب ذیل ہیں:۔

"اللہ اکبر

من عواری الزمان عند العبد الضعیف الراجی رحمۃ ربہ المنان میرزا محمد بن معتمد خاں ختم اللہ لہ بالامن والایمان۔"

اس عبارت کے اوپر بیضوی شکل کی چھوٹی سی مہر ہے، جس میں "یا محمد" لکھا ہوا ہے، حیدر آباد کے کتاب خانے میں بھی متعدد کتابوں پر یہی عبارت اور مہر میں نے دیکھی ہے، تذکرہ صوفیہ پر ایک کتاب موسوم بہ "مختصر مجمع الاحباب" کتاب خانۂ عالیہ رامپور میں محفوظ ہے، اس کے پہلے صفحے پر حارثی نے اپنے قلم سے ۲۰ سطروں کا ایک نوٹ لکھا ہے، جس میں بتایا ہے، کہ یہ کتاب حلیۃ الاولیا ابونعیم اصفہانی اور صفوۃ الصفوہ ابن الجوزی کا اختصار ہے، اور اس کا مصنف محمد بن الحسن، علامہ نووی متوفی ۶۷۶ھ کے شاگرد تھے، کتاب کے حاشیوں پر جابجا تصحیحات اور ذیلی عنوانات اپنے قلم سے لکھے

ہیں، اور کتابوں پر بھی اس کی تصحیحیں پائی جاتی ہیں،

ان امور سے نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اُس نے تمام مروجہ علوم پڑھے تھے، اور ان علوم کی کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ جمع کیا تھا، مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اُسے زیادہ دلچسپی تاریخ و تذکرہ سے رہی ہے چنانچہ اس نے سب سے بڑی کتاب تاریخ ہی پر تصنیف کی، اور اس کا نام تاریخ محمدی رکھا، میں پہلے اسکی دوسری کتابوں کا تذکرہ کرتا ہوں :-

رد البدعۃ | ان میں کی پہلی "رد البدعۃ" ہے، شاہ محمد حمزہ صاحب مارہروی نے ۱۱۶۸ھ میں اس کتاب کا مطالعہ کیا تھا، تاریخ محمدی کے ورق ۱۵۵ الف کے حاشیہ پر شاہ صاحب لکھتے ہیں :-

"رسالہ رد البدعۃ، بل تحقیق المہا... از تالیفات مولف این تاریخ، مرزا محمد حارثی بدخشی در ۱۱۶۸ سنہ نزد این فقیر رسید، فوت والد خود محمد رستم ہفتدہم جمادی الاولی سنہ مسطورہ نوشتہ است، و این رسالۂ مذکورہ در عنفوان شباب بعمر بست سالہ ارقام ساختہ، تحقیقات خوب بکار بردہ"

اس تحریر سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ رسالہ رد البدعۃ ۱۱۱۱ھ کے قریب لکھا گیا تھا، اور یہ مصنف کی ابتدائی تصنیفات میں سے ہے،

مفتاح النجا | دوسری تصنیف مفتاح النجا فی مناقب آل عبا ہے، یہ عربی زبان میں اہل بیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مناقب پر لکھی گئی ہے، آنے والی دونوں کتابوں نزل الابرار، اور تحفۃ المحبین میں اس کا حوالہ ملتا ہے، جو اس بات کا ثبوت ہے، کہ ان دونوں سے پہلے مصنف نے اسے تصنیف کیا تھا

تحفۃ المحبین | تیسری تالیف تحفۃ المحبین بمناقب الخلفاء الراشدین ہے، جو عربی زبان میں خلفائے راشدین کے فضائل پر لکھی گئی ہے، اس کتاب کے خاتمہ سے پتہ چلتا ہے کہ جمعہ کے دن، ۲ رمضان ۱۱۲۵ھ / ۱۷۱۳ء کو فرخ سیر کے عہدِ حکومت میں مصنف نے اسے ختم کیا ہے،

کتاب خانۂ عالیہ رامپور میں اس کا ایک مخطوطہ ہے، جسے سید رحم علی کاتب نے ۱۳۶ صفحوں پر

نستعلیق خط میں لکھا ہے، اس کا اندازِ تحریر نمبر ۴ سے ملتا جلتا ہے، اور وہ ۱۱۹۴ھ (۱۷۸۰ء) کی نوشتہ ہے، بعید نہیں ہے کہ یہ بھی اسی سال کے قریب لکھی گئی ہو،

نزل الابرار | چوتھی کتاب نزل الابرار فی فضائل الائمۃ الاطہار ہے، یہ بھی عربی زبان میں لکھی گئی ہے، اس کا آغاز، ار رمضان ۱۱۲۶ھ (۱۷۱۴ء) کو ہوا تھا، اور دہلی کے کسی امیر کے نام معنون تھی کتاب خانہ عالیہ رامپور میں اس کا ایک قلمی نسخہ محفوظ ہے، جو بخط نستعلیق معمولی، اوسط سائز کے ۷۲ صفحوں پر ۱۴ ذیقعدہ ۱۱۹۴ھ (۱۷۸۰ء) میں لکھا گیا ہے، اس کا خط نمبر ۳ کے مشابہ ہے جس سے میں یہ قیاس کرتا ہوں کہ سید رحم علی ہی نے اُسے بھی لکھا ہے دیباچے میں مصنف نے کہا ہے کہ چونکہ مفتاح النجا میں مناقب کی ہر طرح کی حدیثیں جمع کی گئی تھیں اس لئے بعض احباب نے صرف صحیح حدیثوں پر مشتمل کتاب کی تالیف کی فرمایش کی، یہ کتاب اس فرمایش کی تعمیل میں مرتب ہوئی ہے،

عبرت نامہ | پانچویں تالیف عبرت نامہ ہے، یہ فارسی زبان میں لکھی گئی ہے، شروع میں مصنف نے اپنے حالات لکھے ہیں، ان کے بعد عالمگیر کی حکومت کے آخری تین سالوں کے مجمل حالات، اور بعد ازاں وفاتِ عالمگیر (۱۱۱۸ھ ۱۷۰۷ء) سے فرخ سیر کی وفات (۱۱۳۱ھ ۱۷۱۹ء) تک کے واقعات درج کئے ہیں،

ڈاکٹر ایتھے نے انڈیا آفس لائبریری کی فہرست مخطوطاتِ فارسی میں نمبر ہائے ۳۹۲ و ۳۹۳ پر اس کتاب کا ذکر کیا ہے، مگر پہلے نمبر پر اس کا نام عبرت نامہ اور دوسرے پر تاریخ محمد بن معتمد خاں لکھا ہے ڈاکٹر ریو نے برٹش میوزیم کے فارسی مخطوطات کی فہرست (ج ۳ ص ۹۴۴) میں محمد بخش آشوب کی "تاریخ محمد شاہی" کے ضمن میں اس کتاب کا اس لئے تذکرہ کیا ہے کہ آشوب اپنی تاریخ میں جابجا اس کے حوالے دیتا ہے، اور اس پر اعتماد ظاہر کرتا ہے، ڈاکٹر ریو اسے "یادداشتہائے میرزا محمد صاحب" کہتا ہے، ایتھے کا خیال ہے کہ ان یادداشتوں سے یہی "عبرت نامہ" مراد ہے،

تاریخ محمدی | حارثی کی سب سے بڑی اور قابلِ قدر کتاب تاریخ محمدی ہے، ہمارے پاس اس کا جو نسخہ بخطِ مصنف موجود ہے، اُس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ صرف وفیات کا سن وار تذکرہ ہے، مگر دیباچہ میں مصنف نے لکھا ہے کہ اس میں ملّتِ محمدیہ کے واقعات بھی بالاجمال بیان کئے گئے ہیں، مولانا صمدانی صاحب نے بھی چھپر اسئو کے نسخہ میں واقعات کا مذکور ہونا ظاہر فرمایا ہے،

کتاب کے شروع میں ایک مقدمہ ہے جس میں سیرت محمدی بعد ازاں سنہ ہجریہ کی ایجاد کا قصہ اور پھر سنہ وار وفیات درج ہیں، اس کتاب کے نام کے متعلق مصنف لکھتا ہے:-

"از آنجا کہ ایں کتاب مستطاب محتوی بر احوال اکابر امت مرحومۂ محمدیہ و زمان ظہور دولت یافتہ آنحضرت است و ذکر امم دیگر را شامل نیست، و جامع ایں اوراق پریشاں نیز باسم سامی حضرت خیر الانامی تسمی دارد، ایں کتاب والا انتساب را بدیں دو مناسبت تاریخ محمدی نام نہادہ شد"

کتاب کی ترتیب و تالیف میں جن پچھلی تصنیفات سے مدد لی ہے، دیباچے میں ان کی فہرست دیدی ہے، اور چونکہ ہر بار پورا نام لکھنے میں ہرج ہوتا؛ اسلئے دیباچہ میں ان کے مخففات بتا کر اصلِ کتاب میں ہر شخص کے نام کے اوپر یہ مخففات سرخ روشنائی سے لکھدئے ہیں، اپنے معاصرین کے ناموں کے اوپر عصری سرخ روشنائی سے لکھدیا ہے، دوسری جلد کے شروع میں بھی ایک دیباچہ لکھاہے، جس میں کتابوں کے رموز و علامات کا اعادہ کیا ہے،

سنہ تصنیف | مصنف دیباچہ میں آغازِ تصنیف کے متعلق کہتا ہے کہ

"بنا بریں امور، روز دوشنبہ بیست و ہفتم جمادی الآخرہ سال یکہزار و یکصد و بیست و چہار ہجری دریں مہم اہم شروع نمودم"

۱۲ جمادی الآخرہ ۱۱۲۴ھ ۱۷۱۲ء میں کتاب کے آغاز سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مصنف نے، جس کی پیدائش ۱۰۵۸ھ ۱۶۴۸ء

میں واقع ہوئی تھی، اپنی عمر کے چھبیسویں سال میں اس انسائیکلوپیڈیا کو شروع کیا،

کتاب خانۂ عالیۂ رامپور کے نسخے میں مصنف کے قلم کی تحریر ۱۱۶۲ھ میں ختم ہو جاتی ہے یعنی یہ آخری سنہ ہے جس کے ماتحت اُس نے وفیات درج کئے ہیں، اس کے بعد صرف ایک سنہ کا عنوان تو اس کے قلم کا لکھا ہوا ملتا ہے، مگر اس کے اندراجات دوسرے خط اور دوسرے اندازِ تحریر میں ہیں، بنابریں میرا قیاس ہے کہ ۱۱ شوال ۱۱۶۲ھ کے بعد کی کسی تاریخ کو مصنف کا انتقال ہو جانے کے باعث یہ سلسلہ منقطع ہوا ہے، اور اس صورت میں، ۳۷ سال کی طویل مدت اس کی ترتیب و تدوین میں صرف ہوئی ہے،

ڈاکٹر ریو اپنی فہرست (ج ۳ ص ۹۰۵) میں ۱۱۹۰ھ کو اس کا سالِ اختتام قرار دیتے ہیں، اور باقی آیندہ سالوں کے اندراجات کو کسی دوسرے کی طرف منسوب کرتے ہیں، مگر میں اسے غلط فہمی پر محمول کرتا ہوں، اور اس کا منشا برٹش میوزیم کے نسخے کو قرار دیتا ہوں، جس میں سنہ مذکور تک مسلسل ایک ہی قلم سے متوفی اصحاب کا تذکرہ لکھا گیا ہے، چونکہ میں ریو کے نسخے کو رامپور کے نسخہ کی نقل مانتا ہوں، اس بنا پر تاریخِ اختتام کے فیصلے کے لئے نسخۂ رامپور کو شہادت میں پیش کرنا چاہتا ہوں، لہذا پہلے ریو کے نسخے کے بارہ میں دو چار اہم باتیں لکھدینا مناسب ہوگا، برٹش میوزیم کے نسخے کے سرورق پر حسب ذیل نوٹ مندرج ہے،

"منتخبات از جلد اوّل و دوم تاریخ محمدی مملوکہ سید آل رسول مارہرہ والہ، کتاب ہذا از کتابیکہ بذریعہ محمد نصر اللہ خان ڈپٹی کلکٹر ضلع علی گڈھ دستیاب شد، بطور انتخاب از نقل گرفتہ شد، از جلد اول از ۱ سنہ تا نغایۃ ۵۹۹ سنہ دہ ورق، جلد دوم از ۶۰۰ سنہ تا نغایۃ ۱۲۰۸ سنہ ھ"

اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈپٹی نصر اللہ خان کی معرفت تاریخ محمدی کا کوئی نسخہ سید آل رسول صاحب مارہروی نے حاصل کر کے اس کے منتخبات جدا نقل کرائے تھے، نیز یہ کہ اس نسخے میں

جلد دوم کا آغاز ۱۱۶۰ھ سے اور اختتام ۱۲۰۵ھ پر ہوا تھا، سید آلِ رسول صاحب کے لئے یہ منتخب نسخہ ایک خوشنویس نے نقل کیا، چونکہ اصل میں ۱۱۹۰ھ سے عنوانات پر سنہ لکھکر ہر سنہ کے نیچے وفیات لکھے تھے، اس لئے کاتب نے بھی نقل میں اس کا اتباع کیا، بعدازاں بلاعنوان متعدد وفیات کا اصل میں اندراج تھا، اس حصہ کو منتخب کر کے کاتب نے بھی یوں ہی نقل کر دیا، ڈاکٹر ریو کے سامنے یہ نقل تھی، اُنھوں نے ۱۱۹۰ھ تک کے تسلسل کو پیش نظر رکھ کر یہ نتیجہ نکال لیا کہ اس سنہ تک اصل مصنف کا کام ہوگا، لہذا یہی سالِ اختتام ہے۔

اب ہمیں نسخۂ رامپور کی طرف متوجہ ہونا چاہئے، یہ نسخہ سید مہدی میاں صاحب نے، جو مارہرہ کے مشہور برکاتی خاندان کے ایک فرد تھے، نواب جنت مکان کے حضور میں پیش کیا تھا، یہ اوّل سے ناقص ہونے کے باعث ورق ۹ سے شروع ہوتا ہے، جس کے حصہ الف پر ۱۱۶۰ھ کے بقیہ متوفیین کے نام ہیں، اور حصہ ب سے ۱۱۶۰ھ کے وفیات شروع ہوتے ہیں ۱۱۶۱ھ تک جو ورق ۱۹۹ الف پر ختم ہوتا ہے، ایک ہی قلم کی تحریر ہے، صرف دو چار جگہ دوسرے قلم سے سادہ جگہ پر ایک دو ایسے نام بڑھائے گئے ہیں جو اصل مصنف سے رہ گئے تھے، ۱۱۶۳ھ سے مذکورۂ بالا دوسرے قلم کے اندراجات شروع ہوتے ہیں، ۱۱۲۳ھ سے سنوں کے سرخ عنوان بھی اسی قلم کے ہیں، ۱۱۹۰ھ تک کتاب سنہ وار ہے، مگر ورق ۲۱۸ ب پر ۱۱۹۱ھ سے ۱۱۹۶ھ تک متوفی اصحاب کو ایک ہی صفحہ پر لکھا ہے، اس کے بعد کا ورق ضائع ہو گیا ہے، ۱۱۶۳ھ کے ماتحت استاذ المحققین سید آل محمد قادری مارہروی کا نام لکھا ہے، اس نام کے ختم پر کسی اور شخص نے لکھا ہے "میاں ابن شاہ حمزہ فی ۱۱۹۵ھ" گویا یہ تیسرا قلم ہے جو اس کتاب پر چلا ہے، ایک دو جگہ اور بھی اس خط میں اضافے نظر آتے ہیں،

دیکھنا یہ ہے کہ یہ دونوں خط کس کے معلوم ہوتے ہیں، کتبخانہ رامپور میں اس خاندان کے ایک بزرگ سید شاہ آل احمد بن سید شاہ محمد حمزہ مارہروی کی دو کتابیں، آئینہ محمدی جلد پنجم اور کشکول محفوظ ہیں، ان دونوں کتابوں کی کتابت دو کاتبوں نے کی ہے، بلکہ ایک دو جگہ ایسا شبہہ گذرتا ہے کہ تیسرا شخص بھی شریک تھا، تاریخ محمدی میں آخری دو خطوں میں سے جو خط زیادہ پایا جاتا ہے

وہ ان دونوں کتابوں میں بھی موجود ہی، اور دوسرے خط کی عبارتیں بھی مذکورۂ بالا دونوں کتابو میں پائی جاتی ہیں،

خط اوّل کے بارے میں میری رائے یہ ہی کہ یہ شاہ آل احمد صاحب مارہروی کا ہی، چونکہ آئینۂ محمدی اور کشکول مسودے کی شکل میں ہیں، اس بناپر یہ قرینِ قیاس ہے کہ ہم اسے بخطِ مصنف و بخطِ دیگر قرار دیں اور اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ مصنف نے دوسرے کاتبوں کو کیوں شریکِ کتابت کیا، تو اس کے جواب میں ان دونوں کی ضخامت کے عذر کو پیش کریں، ریو کے نسخے کے سرورق پر جو تحریر ہے، اس کا انداز بھی کسی قدر اس شاہ آل احمد والی تحریر کے انداز سے ملتا جلتا ہی،

ان تمام امور کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ "تاریخ محمدی" کا لندنی نسخہ مارہرہ میں شاہ آل رسول صاحب کے لئے تیار ہوا، رامپور کا نسخہ مارہرہ کے اسی خاندان کے ایک بزرگ نے دربار رامپور میں پیش کیا تھا، اس نسخے کے اندر جن دو خطوں میں اضافے نظر آتے ہیں، اُن میں سے ایک خط شاہ آل احمد صاحب کی کتاب آئینۂ محمدی اور کشکول کے ایک خط کے مشابہ ہی، آئینۂ محمدی کے اس خط کے متعلق میری رائے یہ ہی کہ خود شاہ آل احمد صاحب کا ہی اگر یہ درست ہی تو پھر تاریخ محمدی کے اندراجات بھی انہی کے ہونگے، اور چونکہ لندنی نسخے کے سرورق کی تحریر بھی انہی کی معلوم ہوتی ہی، اس بناپر یہ قیاس درست ہوگا کہ لندنی نسخہ رامپور کے نسخہ کی نقل ہی،

یہ قیاس حدِ یقین تک پہنچ جاتا ہی، جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ لندنی نسخے کی جلد ثانی میں انہی لفظ اور فقروں کے لئے سادی جگہیں چھوڑ دی گئی ہیں، جو رامپور کے نسخے میں یا تو حاشیہ کیسا تھ کٹ چکے ہیں، یا کاغذ کے گل جانے کے باعث پڑھنے میں نہیں آتے، کیونکہ اگر وہ کسی دوسرے نسخہ کی نقل ہوتا تو دشوار تھا کہ دونوں نسخوں میں الفاظ و فقرات کا فقدان بالکل یکساں ہوتا،

مذکورۂ بالا دعوی کے ثبوت کے بعد یہ تسلیم کرلینا پڑے گا کہ تاریخ محمدی ۱۱ شوال ۱۲۶۱ھ

کے بعد ختم ہو گئی، اور ڈاکٹر ریو نے جون ۱۹۱۱ء تک اس کے زمانۂ تالیف کو دراز کیا ہے، یہ درست نہیں ہے، کیونکہ ۱۱۶۱ھ کے بعد کے اندراجات مارہرہ کے مشہور خاندانِ برکاتیہ کے بزرگوں نے اپنے قلم سے کئے ہیں، مولانا صمدنی صاحب نے تاریخ محمدی میں واقعاتِ تاریخی کا مجمل بیان بھی دیکھا ہے، ہمارے نسخہ میں بجز دس پانچ مقامات کے صرف وفیات درج ہیں، اربابِ تاریخ کی دلچسپی کی خاطر اس کے ایک سال کے اندراجات کا اعادہ مناسب معلوم ہوتا ہے، اگر خوفِ طوالت سے ایسے سنہ کو چنا گیا ہے، جس میں بہت کم اندراجات ہیں،

سنہ ۱۱۲۳ھ کے ماتحت لکھا ہے:۔

"سنہ الف و ثلث و عشرین و مائۃ، متوفیان این سال"

عصری، رسالہ سید نصرت اللہ احراری

"محمد منعم الملقب بمنعم خاں ثم بمعظم خاں خانخاناں بہادر ظفر جنگ وفادار، وزیر شاہ عالم بادشاہ روز دوشنبہ ۱۲ یا ۱۱ المحرم در نزدیکی لاہور بمرضِ ناسورِ قدیم فوت شد، عمرش شصت سال و چند ماہ، ہفت ہزاری"۔

کذا سمعت من اولادہ عاقبت محمود مخاطب بسرافراز خان بن نعمت اللہ مخاطب بسہراب خاں بن حسام الدین خاں بن نظام الدین خاں بن غیاث الدین علی مخاطب بآصف خاں از امرائے عالمگیر شاہی در برہان پور فوت شد"

عصری،

میرزا لشکر اللہ حسینی مخاطب بمرتضیٰ خاں از کبار امرائے شاہ عالمی و پسرش حفظ اللہ خاں در سنہ ۱۱۲۶ھ خواہد آمد"

عصری،

"الشیخ عبدالباقی بن الشیخ محمد وارث المترک لتاریخ الدہلوی جامع العلم والعمل صاحب

السجایا الرضیۃ والاخلاق المرضیہ، مات بدہلی ۲۱ صفر بمرض جمرالمثانہ وکان قد جاز الخمسین"

نسخۂ رامپور کی کیفیت | یہ نسخہ فلس کیپ سائز کے ۲۱۰ اوراق پر مشتمل ہی، کاغذ بادامی کشمیری ہو، عبارت کی روشنائی سیاہ اور عنوانوں کی شنگرفی ہو، پرانے صفحۂ داغ سے پتہ چلتا ہے کہ شروع کے ۸ ورق گم ہوگئے ہیں، کتاب پر آب رسیدگی، کرم خوردگی اور پیوندکاری کے نشان جابجا نظر آتے ہیں، خصوصاً پہلے ورق کی کچھ عبارت بھی ضائع ہو چکی ہے، کہیں کہیں مُجلّدِ کتاب نے حاشیوں کیساتھ الفاظ بھی تراش دالے ہیں، متعدد مقامات پر لکھا ہے" درمسودۂ اول باید دید"، "یا تحقیق باید کرد"، متعدد جگھوں پر ایک دو لفظ کے بقدر بیاضیں چھوڑی ہیں، ان باتوں سے مترشح ہے کہ یہ نسخہ خود مصنف کا مبیضہ ہی، چونکہ اس کا خط میرزا محمد بن معتمد خاں کے اُن خطوط جیسا ہے، جو مختلف کتابوں پر ثبت ہیں، اسلئے مجھے اس کتاب کے بخط مصنف ہونے میں کوئی شبہہ نہیں ہی،

وفات مصنف | حارثی کے سالِ وفات کے متعلق ہمیں کچھ معلوم نہیں، جس شخص نے ہزاروں انسانوں کے سنینِ وفات تحقیق کرکے لکھے، خود اس کے سنۂ انتقال کا معلوم نہ ہونا کتنا عبرتناک ہی، مگر یہ دنیا کی کوئی نئی رسم نہیں ہی، لاکھوں انسان آج اس زمین کے اندر دبے پڑے ہیں، جن کے بارے میں کوئی یہ بتانے والا تک نہیں، کہ کون تھے اور کیا تھے، ان میں جلیل القدر عالم بھی ہیں، جہانگشا بادشاہ بھی، اور خدارسیدہ صوفی بھی، مگر روح و مادے کی کوئی طاقت گمنامی کی تاریکی کو دور نہ کرسکی،

فاعتبروا یا اولی الابصار،

فارسی کے چند قدیم شعراء

از جناب غلام مصطفیٰ خاں صاحب ایم اے ایل ایل بی (علیگ) لکچرر کنگ ایڈورڈ کالج، امراوتی (برار)

فارسی کے چند قدیم شعراء یعنی معزی، سنائی، ادیب صابر، انوری وغیرہ کے چند سنین کے متعلق یہ معلومات پیش کرتا ہوں، مجھے خود احساس ہے کہ ان کے متعلق ابھی بہت کچھ محنت کی ضرورت ہے، لیکن فی الحال اسی کو پیش کیا جاتا ہے، اس مضمون میں کہیں کہیں بعض بزرگوں سے اختلاف رائے بھی ہے، لیکن اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ میری اصلاح فرمائیں تاکہ اس سلسلہ میں بعض اہم چیزیں بھی پردۂ خفا سے باہر آجائیں اور ہمارے ملک کو فائدہ پہنچے،

معزی: معزی کے سلسلہ میں اس کے باپ امیر الشعراء (عبد الملک) برہانی نیشاپوری کی تاریخ وفات کے متعلق قیاس آرائی کرتا ہوں جو ممکن ہے کہ صحیح ہو سکے، اسکے متعلق چہار مقالہ (مقالہ دوم حکایت پنجم) میں معزی کا بیان اس طرح ہے:

"..... پدرمن امیر الشعراء برہانی رحمۃ اللہ علیہ در اول دولت ملک شاہ بشہر قزوین از عالم فنا بعالم بقا تحویل کرد و دراں قطعہ کہ سخت معروف است مرا بسلطان ملک شاہ سپرد دریں بیت ؎

من رفتم و فرزند من آمد خلف صدق اورا بخدا و بخداوند سپردم،

پس جامگی و اجرائے پدر بمن تحویل افتاد و شاعر ملک شاہ شدم و سالے در خدمت پادشاہ روزگار گذاشتم کہ جز وقتے از دور او را نتوانستم دیدن و از اجرا و جامگی

یک من ویک دینار نیافتم...... روزے کہ فرداے آں رمضان خواست بود... دراں

دل تنگی بنزدِ علاءالدولہ امیر علی فرامرز رفتم کہ پادشاہ زادہ بود وشعر دوست وندیم خاص

سلطان بود وداماد او......"

علاءالدولہ امیر علی فرامرز جس کو یہاں ملک شاہ کا داماد کہا گیا ہی، میرزا قزوینی اپنے حواشی میں ارسلان خاتون کا شوہر تبلاتے ہیں جو جغری بیگ (المتوفی ۴۵۲ھ/۱۰۶۰ء) کی بیٹی اور ملک شاہ کی پھوپھی تھی اور جو پہلے خلیفہ قائم بامر اللہ کی بیوی تھی، اخبار الدولة السلجوقیة (ص۱۷) سے معلوم ہوتا ہی کہ خلیفہ قائم بامر اللہ کی یہ شادی ۴۴۸ھ/۱۰۵۶ء میں ہوئی تھی، اور صفحہ ۱۷ میں اس خلیفہ کی تاریخ وفات ۱۳ شعبان ۴۶۷ھ (مطابق پنجشنبہ ۲ اپریل ۱۰۷۵ء) ہے، اگر اس خاتون کا عقدِ ثانی خلیفہ کی وفات کے بعد ہوا تھا، تو وہ (عدت کے ایام کے بعد) ۴۶۸ھ/۱۰۷۵ء کے پہلے کیا ہوا ہوگا؟

اب دوسری طرف آئیے، ملک شاہ کی سلطنت کا زمانہ[1] ۴۶۵ھ/۱۰۷۲ء سے ۴۸۵ھ/۱۰۹۲ء تک تھا، چہار مقالہ کی حکایت میں یہ معلوم ہو چکا ہی کہ بُرہانی کی وفات ملک شاہ کے ابتدائی عہد میں ہوئی تھی یعنی بیس سال کی حکومت کے پہلے چوتھائی حصہ میں گویا زیادہ سے زیادہ ۴۷۰ھ/۱۰۷۷ء تک ضرور ہو چکی ہوگی، اور اس کی وفات کا زمانہ وہ تھا جبکہ علاءالدولہ امیر علی فرامرز سے اس خاتون کا عقد ثانی ہو چکا تھا، جو ۴۶۸ھ/۱۰۷۵ء کے پہلے نہیں ہو سکتا تھا، اس سے صاف ظاہر ہے کہ بُرہانی کی وفات ۴۶۸ھ/۱۰۷۵ء اور ۴۷۰ھ/۱۰۷۷ء کے درمیان کسی وقت واقع ہوئی ہوگی۔

اب معزی کے کچھ حالات اس کے کلام ہی سے معلوم کیجئے، اس کے کلام کے اجزار ہندوستان کے بعض کتاب خانوں میں ملتے ہیں لیکن شاید مکمل دیوان جیسا کہ ڈاکٹر محمد اقبال صاحب نے لکھا ہی (اورینٹل کالج میگزین ص۱۰۶، نومبر ۱۹۳۵ء) طہران میں پروفیسر سعید نفیسی کے یہاں ہی، بہرحال جو کچھ ہمکو مل سکتا ہی،

---

[1] اخبار الدولة السلجوقیہ (مطبوعہ لاہور) میں ملک شاہ کے باپ الپ ارسلان کی تاریخ وفات (ص۵۲) ۴۶۵ھ/۱۰۷۲ء ہی یعنی اسی سال ملک شاہ (ص۵۵) تخت نشین ہوا پھر ص۷۱ پر اس کی وفات کا سال ۴۸۵ھ/۱۰۹۲ء ہی لیکن راحت الصدور میں ۴۶۶ھ سے ۴۸۶ھ تک ہی،

اس میں سے یہ چند باتیں پیش کیجاتی ہیں،

ہم لکھ چکے ہیں کہ بُرہانی کا انتقال ۴۶۵ھ/۱۰۷۲ء کے پہلے ہو چکا تھا یعنی اُسوقت تک معزی نے ملک شاہ کے دربار میں رسائی حاصل کر لی تھی، اور اس بادشاہ کی خدمت میں اس کا سب سے پہلا کلام وہ دو رباعیاں ہیں جو مقالۂ دوم کی حکایت پنجم میں مذکور ہیں، لیکن جیسا کہ اسی حکایت میں ہے کہ نظام الملک کو شعر و شاعری پسند نہ تھی، اس لئے معزی اُن[1] کی مدح کیا لکھتا، پھر بھی ہم کو چند قصیدے اُن کی مدح میں ملتے ہیں جن کے کچھ اشعار یہ ہیں:-

به دُرّ و مشک ز ابر بہار و بادِ شمال | موشّح است زمین و معطر است جبال
نظامِ ملکِ شہنشہ قوامِ دینِ رسول | خدایگانِ وزیران و قبلۂ اقبال
ابو علی حسن آں صاحبے کہ حضرتِ اوست | امانِ لشکرِ امطال و قبلۂ آمال[2]

ایک قصیدے کا مطلع یہ ہے،

اے بتوفیق و ہدایت دینِ یزداں را قوام | اے بتدبیر و کفایت ملکِ سلطاں را نظام[3]

ملک شاہ (المتوفی ۴۸۵ھ/۱۰۹۲ء) کی مدح میں کئی قصیدے ہیں، ایک عید الفطر کے موقع پر لکھا تھا جس کا ایک شعر یہ ہے:

بر معزّ الدین ملک شہ آفتابِ اود دیں | روزِ عیدِ روزہ داراں فرخ و فرخندہ باد[4]

ذیل کا قصیدہ ۴۷۹ھ/۱۰۸۶ء میں جب کہ ملک شاہ، مملکتِ روم کو فتح کر کے پہلی مرتبہ بغداد پہنچا ہے لکھا ہوگا، اس کے متعلق یہ شعر کافی ہیں:-

---

[1] ان کا زمانہ درباری رسائی کی وجہ سے حاسدوں سے بھرا ہوا تھا، دولت شاہ نے قطران کے حال میں لکھا ہے کہ وطواط اپنے معاصرین میں صرف قطران کو شاعر سمجھتا تھا، اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ وطواط کی حدائق السحر میں راحت الصدور والے کوئی شاعر نہیں ہیں معزی کے حال میں دولت شاہ لکھتے ہیں کہ خاقانی نے معزی کو تسلیم کیا ہے، اور وطواط کے منکر ہیں اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ چہار مقالہ العروضی کو نہیں پہچاننا چاہتا [2] مونس الاحرار ص ۵۸۶ جیب گنج [3] انتخاب دواوین شعرائے متقدمین ورق ۵۸۲ الف حمیدیہ لائبریری، بھوپال [4] ایضاً ورق ۵۸۲ ب،

اے ز دار الملک فتنہ شدتے سوے سفر　　بازگشتی سوے دار الملک با فتح و ظفر
آں ظفر ہاے کہ در یک سال حاصل شد ترا　　صد مجلد بیش باید تا بگویم مختصر
در فتوحِ شام و روم امسال دیواں ساختم　　ساخت باید در فتوحِ ہند و چیں سالِ دگر
تو ببغدادی و در روم از نہیبِ لشکرت　　ہست قیصر مستمند و لشکرِ او سوگ ور[۵]

ملک شاہ کی مدح میں ایک بہت اچھا قصیدہ ملتا ہے جس کے کچھ اشعار یہ ہیں:۔

رسد ہر ساعت از دولت نشانے　　پیام آید ز گردوں ہر زمانے
کہ چوں سلطاں معز الدین ملک شاہ　　نہ باشد در جہاں صاحب قرانے
جہاں را راے او چوں آفتابے،　　زمیں را تختِ او چوں آسمانے
نہ جز در طاعتش پروردہ عقلے　　نہ جز در خدمتش آسودہ جانے
جہانے را ہمی ماند سپاہش　　عجب باشد جہانے در جہانے[۲]

پھر بقولِ دولت شاہ، معزی نے نظام الملک کے قتل پر یہ رباعی کہی تھی:۔

نشناخت ملک سعادتِ افسرِ خویش　　در منقبتِ وزیر خدمت گرِ خویش
بگماشت بلاے تاج بر لشکرِ خویش　　تا در سرِ تاج کرد تاجِ سرِ خویش

اور یہ مرثیہ بھی پایا جاتا ہے،

کے تواں گفتن کہ شد ملکِ شہنشہ بے نظام　　کے تواں گفتن کہ شد دینِ پیمبر بے قوام
شد شکارِ عالم آں کو کرد عالم را شکار　　شد بکامِ دشمن آں کو دید دشمن را بکام[۳]

اور دونوں (ملک شاہ اور نظام الملک) کی وفات پر معزی نے یہ شعر لکھے:۔

رفت در یک مہ بفردوسِ بریں دستورِ پیر　　شاہ برنا از پئے او رفت در ماہِ دگر

---

[۱] انتخاب دواوین شعرائے متقدمین ورق ۵۰۴ الف [۲] ایضاً ورق ۷۰۶ ب [۳] ایضاً ورق ۵۸۲ ب،

کردناگہ قہرِ یزداں عجزِ سلطاں آشکار قہرِ یزدانی ببین و عجزِ سلطانی نگر[۱]

پھر ارسلان ارغو (المتوفی ۴۸۹ھ/۱۰۹۶ء) کی مدح میں کئی قصیدے ملتے ہیں، کچھ اشعار ملاحظہ ہوں

سیدِ شاہانِ مشرق ارسلاں ارغو کہ ہست آفتابِ اصل و تاجِ دودہ و فخرِ تبار

اے جواں دولت جہاندارے ہمایوں شہریار اے بشاہی از ملک سلطاں جہاں یادگار[۲]

دوسرے شعر میں ارسلان ارغو کے والد ملک سلطان (برادر ملک شاہ) کا ذکر ہے، اس کے متعلق معزی کے ان اشعار میں بھی تذکرہ ہے۔

جہاں شدہ است بسلطانی تو خرم و شاد کہ یادگارِ جہانی تو از ملک سلطان

تو آں شہی کہ بہ آخر زماں نشاں دادہ است محمد عربی سیدِ زمین و زمان

رکابِ دست بلخ و نہیبِ ہیبتِ او ہمی رسد سوے ہندوستان و ترکستان[۳]

ایک جگہ اسی ممدوح کی مدح میں معزی نے "کینت" بھی بتائی ہے،

بُرد گوے دولت از شاہانِ گیتی سربسر ارسلاں ارغوں کہ بود شہ ارسلاں سلطان[۴]

کینتِ من ہست بوبکر و عمر نیزہ آمدہ است سخت شوریدہ ست و مشکل کارِ بوبکر و عمر[۵]

پھر نظام الملک کے بیٹے فخر الملک مظفر (المتوفی محرم ۵۰۰ھ جون ۱۱۰۶ء) کی مدح کے اشعار

۱؎ یہ دو شعر کئی جگہ ملتے ہیں، دولت شاہ نے تیسرا مصرع اس طرح لکھا ہے: "اے دریغا آں جہاں شاہے ، وزیرے این چنیں"

۲؎ انتخاب بھوپال، ورق ۷۰۸ الف ۳؎ ایضاً ورق ۷۰۰ ب ۴؎ انتخاب بھوپال ورق ۵۸۷ الف ۴۸۹ھ/۱۰۹۶ء اور ۵۱۱ھ/۱۱۱۷ء کے درمیان (عہد محمد بن ملک شاہ) کسی وقت معزی نے زین الملک کی فرمائش پر رودکی کا جواب لکھا ہوگا (چہار مقالہ مقالہ دوم حکایت دوم)

۵؎ تاریخ بیہق (ص ۷۰) میں مصنف نے لکھا ہے کہ فخر الملک کا قتل ۱۰ محرم ۵۰۰ھ میں ہوا ہے، اور مجھے خود وہ یاد ہے کیونکہ میں اس وقت بچپن میں نشاپور میں پڑھتا تھا لیکن یہ حقیقت ہے کہ کتاب میں ۵۰۰ھ (ابن خلدون جلد ۴، ص ۱۳۲) کے بجائے غلطی سے صرف ۵۰۰ھ رہ گیا ہے، کیونکہ مصنف تو ۴۹۹ھ میں پیدا ہوا تھا، اگر دوسرے سال واقعہ ہوتا تو وہ کیونکر یاد رکھ سکتا تھا آثار الوزراء (ورق ۶۲ بانکی پور) میں فخر الملک کے متعلق آذری کے (بیس) اشعار لکھے ہیں، جنمیں سے چند یہ ہیں،

فخرِ سنجر کہ بود فخرِ الملک بود بحرِ وزارتش را فلک
در زماں ولایت دیکیں فتح کرد او ممالکِ غزنیں
مجلسے ساخت بہرِ عیشِ وزیر پر ز اشراف جملہ شاہ و امیر
بود آں روز ساعتِ نوروز کرد بزمے بطالعِ فیروز

بھی صبح صادق ہیں :-

قوام شرع فخر الملک فرزند قوام الدین   مظفر کز ظفر دارد مزاج و صورت و جوہر[1]

اور غالباً جمال الملک بن نظام الملک کی مدح میں معزی کہتا ہے :-

جمالِ دولت باز آمد و زمانہ بخواست   کہ بے جمال بود دولتِ شہِ عالم
ز گفتۂ پدرِ من سزائے تست دو بیت   کزاں دو بیت شود طبع شاد و دل خرم
بلند بخت و دولت خدائے داد ترا   نہ خاص داد و نہ عام نہ خال داد نہ عم
بجاں عزیز بود تن نخواستہ نہ بود   چو جان بجائے بود خواستہ نیاید کم[2]

لیکن مجھے اس ممدوح کے متعلق کوئی تیقن نہیں ہے جس طرح کہ اسی شاعر کے یہ دو شعر بے نشان معلوم ہوتے ہیں :-

بمجلس بدرت عسجدی ز بہر طمع   مدیح برد بہ ایام جعفر و محمود
بمجلسِ تو من آوردہ ام ز بہرِ شرف   عزیز عقدے نگزیدہ از میانِ عقود[3]

سنجر نے ۵۱۱ھ میں بہرام شاہ کو غزنین میں تخت نشین کرایا، غالباً سنجر کی اسی واپسی پر معزی نے لکھا ہے :

شہِ مشرق ملک سنجر بدار الملک باز آمد   سپاس و شکر یزداں را کہ شاد و سرفراز آمد
ز دار الملک غائب شد ز بہرِ فتح و فیروزی   کنوں با فتح و فیروزی بدار الملک باز آمد
دگر چہ حرص و آز ما فزون است از ہمہ چیزے   عطائے او کہ بخشش را فزوں از حرص و آز آمد

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۱)

چوں گرفت آں وزیر جام بکف   بنظارہ ملوک صف در صف   ناگہاں جام او فگند از دست   از ہوا بر زمین زد و بشکست
جملہ گفتند ایں چہ حال افتاد   وایں چہ کردی چگونہ ات دل داد   داد پاسخ وزیرِ با تدبیر   کیں ندامت بہ از پئے تقصیر
کیں چنیں جوہرے بہ آلت لہو   صرف کردم بسے خطا بد و سہو   بود جوہر مناسبِ قندیل   کہ کنند از برائے کعبہ سبیل
ایں چنیں جوہرے ظریف و لطیف   بود لائق بداں مقام شریف   چوں بشد آں ہدایت از دستم   زدمش بر زمین و بشکستم،

[1] جلد سوم ورق ۱۰۶ الف [2] انتخاب بھوپال، ورق ۵۹۹ ب [3] ایضاً ورق ۵۸۳ ب،

بجز رشید و بچرخ اندر انگنم قشنہ از آن معنی — کہ خور رشید کمند آمد و چرخ نیزہ یاز آمد
ہمیشہ باخبر باشد کہ مر محمود غازی را — نشاط و شادی از زلف و بنا گوش ایاز آمد[۵۱]

پھر سنجر کے وزیر وجیہ الملک شرف الدین ابو طاہر سعد بن علی القمی کی مدح میں معزی کے متعدد قصیدے ملتے ہیں، اس وزیر کا انتقال ۲۵ محرم ۵۱۶ھ (چہار شنبہ ۵ راپریل ۱۱۲۲ء) کو ہوا تھا، کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

صاحب عدل ابو طاہر سعد بن علی — کہ شد از سعد و علو در ہمہ آفاق علم
آں کہ گشت از ہنرش فرع معالی عالی — واں کہ گشت از بخشش اصل معانی محکم

آثار الوزراء (ورق ۲۰۷ الف) میں ان اشعار کے ساتھ معزی کی یہ رباعی بھی اسی کی مدح میں شامل ہے:

اے بر سر خلق سایۂ اقبالت — آراستہ اخلاق تو چون احوالت
بے بہرہ نماندے کسے از افضالت — کہ در خور ہمت تو بودے مالت

اس کی مدح کا ایک طویل قصیدہ میرزا قزوینی کے بست مقالہ (ص ۵۹) میں ہے، اس کے علاوہ جیب گنج سے ایک قصیدہ صنعت سوال وجواب میں بھی پڑھئے، اس میں ۹ شعر ہیں لیکن صرف چند کافی ہیں:

گفتم بعقل دوش کہ اے احسن الصور — گفتا چگونہ یافتی از حسن من خبر
گفتم ضمیر من شجر باغ حکمت ست — گفتا شدہ ست باغ مزین بدین شجر
گفتم کہ این شجر ہمہ سالہ ثمر دہد — گفتا مدائح شرف الدین دہد ثمر
گفتم وجیہ ملک و پسندیدۂ ملوک — گفتا کہ زین دولت و پیرایۂ بشر
گفتم سپہر سعد و علو سعد بن علی — گفتا سر سعادت و پیرایۂ ظفر
گفتم جہان تن است خراسان از و سر ست — گفتا ہرات و مرو ازو ہمچو چشم و سر[۵۲]

---

۵۱ انتخاب بھوپال، ورق ۲۸۵ الف،
۵۲ مونس الاحرار ص ۱۰۲۷ تا ص ۱۰۲۸، جیب گنج،

اس وزیر کے بعد ہی نظام الدین تغزی[1] طغان بیگ محمد بن سلیمان الکاشغری محرم ۵۱۶ھ (اپریل ۱۱۲۲ء) سے مقرر ہوا، آثار الوزراء (ورق ۷۰، ب) میں یہی تاریخ ہے، اور اس کے علاوہ دستور الوزراء (ص ۱۹۲) میں بھی یہ بیان ہے کہ یہ وزیر دو سال اور کچھ ماہ تک مقرر رہا، معزی نے وزارت کی تہنیت میں لکھا ہے[2]:

صدر نیک اختر محمد بن سلیماں آں کہ ہست — چوں محمد دیں پرست و چوں سلیماں ملک دار
از نظام رسم او شد شغل گیتی بر نظام — وز نگار کلک او شد کار عالم چوں نگار
باغ ملت را ز رسم او پدید آمد درخت — سال دولت را ز عدل او پدید آمد قرار

پھر سنجر کے وزیر قوام الدین ابو القاسم (المتوفی ۵۲۸ھ ۱۱۳۴ء) کی مدح کی ہے:۔

ہست تشکر بار یاقوت تو اے عیار یار — نیست کس را نزد آں یاقوت تشکر بار بار
قاسم الارزاق قاسم آنکہ اندر حل و عقد — ہست عزم او میان نیک و بد دیوار وار[1]

حبیب السیر (جزو چہارم، جلد دوم ص ۱۰۰) میں تاریخ گزیدہ کے حوالے سے معزی کی دو رباعیاں اور ہیں جو سنجر کے گھوڑے سے گرنے اور پھر اسی گھوڑے کے حاصل ہو جانے پر معزی نے کہی تھیں لیکن سنجر کی مدح میں ایک قصیدہ ہمکو ایسا ملتا ہے جس سے شاعر کی مدح گوئی کا کچھ زمانہ معلوم ہو سکتا ہے:۔

داور گیتی ملک سنجر کہ اندر کار ملک — کس نیارد کرد با او گفت و گوے داوری
آں جہاں دارے کہ گر تازد بہ ہند و چین و روم — تازہ گرداند مسلمانی بجاے کافری

---

[1] اس کے نام میں بہت اختلاف ہے لیکن میرا خیال ہے کہ تغزی طغان بیگ ہی صحیح ہے جیسا کہ سید حسن غزنوی نے لکھا ہے:۔

امیر عادل تغزی طغان دریا دل — کہ جاں سپار دا از دل ہمہ سپاہ ترا

معزی کا ایک قصیدہ اس طرح شروع ہوتا ہے: (انتخاب بھوپال، ورق ۵۷۶ ب)

بفال فرخ و عزم درست شد راے صواب — سفر گزیدم و کردم سوے رحیل شتاب

اور سید حسن غزنوی اس طرح شروع کرتے ہیں:۔

چو عزم کردم سوے سفر براے صواب — بریدہ گشت امیدم ز دیدن احباب

[2] مجموعہ قصائد فارسی ص ۵۳ حبیب گنج یا مونس الاحرار ق ۱۰۹۵ ص ۱۰۹ حبیب گنج،

در میانِ کفر و دیں شمشیرِ تو سدّے قوی ست | در تو آں گفتم کہ در محمود گوید عنصری
من چو از زرِ سخن گنجے نہم در مدحِ تو | مہرِ آں زر ملک شاہی بود یا سنجری
خدمتِ سی سالہ را آخر بباید حرمتے | حرمتِ سی سالہ در خدمت بباشد سرسری[۱]

اگر اس "خدمتِ سی سالہ" کے متعلق ایک موٹا حساب عہدِ ملک شاہی سے کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ قصیدہ ۵۰۱ھ ۱۱۰۷ء میں لکھا گیا ہی، کیونکہ ۴۷۱ھ ۱۰۷۸ء تک جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا ہی، معزی کو ملک شاہی دربار میں رسائی ہو چکی تھی، اور اگر سنجر ہی کا زمانہ لیا جائے تو پھر ۵۱۱ھ ۱۱۱۸ء سے تیس سال ۵۴۱ھ ۱۱۴۶ء میں پورے ہوتے ہیں، اور سنجر کے تیر سے زخمی ہونے اور پھر اچھے ہونے کے بعد معزی کا ۵۴۲ھ ۱۱۴۷ء میں مرنا صحیح ہو سکتا ہی لیکن میرا خیال ہی کہ معزی کی وفات ۵۴۲ھ ۱۱۴۷ء کے پہلے ہو چکی ہو گی، کیونکہ قوام الدین ابو القاسم (المتوفی ۵۲۳ھ ۱۱۲۹ء) کی مدح کے بعد کسی اور ممدوح کی مدح ہم کو نہیں ملتی، اس کی یہ وجہ ہو سکتی ہی کہ ہمارے پاس مکمل دیوان نہیں ہی، یا یہ کہ معزی نے آخر عمر میں مدح گوئی کو بہت ہی کم کر دیا ہو گا، لیکن اگر اسکی وفات ۵۴۲ھ میں مان لیجائے تو پھر اُس نے عمر بہت زیادہ پائی ہو گی، کیونکہ ۴۷۱ھ ۱۰۷۸ء کے قریب اُس نے جو رباعیاں (مقالۂ دوم، حکایت پنجم) کہی تھیں وہ اس کی پختگیِ طبع کا ثبوت دیتی ہیں، جو اُسے تقریباً ۲۵ سال سے پہلے کیا حاصل ہوئی ہو گی، اس حساب سے ۵۴۲ھ ۱۱۴۷ء میں اس کی عمر ۹۰-۹۲ سال کی ہوگی جو محتاجِ ثبوت ہے۔

(باقی)

---

[۱] مجموعہ قصائد فارسی ص۲۰۷، ص۲۰۸ جیب گنج،

تلخیص و تبصرہ

کیرکٹر

زندگی کا جوہر کیرکٹر ہے، زندگی کی رفعت اور عظمت کا مدار صرف کیرکٹر پر ہے، انسانی فطرت کا بہترین مظہر کیرکٹر ہی ہے، کیرکٹر ایک اخلاقی نظام ہے، جس کا نمونہ ایک متوازن، مربوط اور مرصع شخصیت پیش کرتی ہے، سوسائٹی کا خمیر کیرکٹر ہی سے عبارت ہوتا ہے، صالح کیرکٹر ایک ایسی قوت ہے جو خلوت جلوت اور منبر و محراب کی ترغیبات سے بالاتر ہے، کھوٹے سکہ کی طرح کھوٹے کیرکٹر کی کمی نہیں، اس کو پرکھ لینا دشوار نہیں، صالح کیرکٹر آفتاب کی طرح بلند و بالا اور روشن ہوتا ہے، جس طرح آفتاب کی روشنی چھوٹے سے چھوٹے سوراخ سے دیکھی جا سکتی ہے، اسی طرح نہایت معمولی اور عام باتیں جو حسن، خوبی اور آبرو کی آئینہ دار ہوتی ہیں، کیرکٹر کو واضح کرتی ہیں،

کیرکٹر کی تکمیل بڑی صبر آزما ہوتی ہے، جس طرح سمندر کے اندر مونگے کی چٹانیں قرنوں میں چھوٹے چھوٹے کیڑوں کی مسلسل جد و جہد سے بنتی ہیں، صالح کیرکٹر اسی طرح دیر میں بنتا اور مکمل ہوتا ہے،

زندگی کی قدر و قیمت کا معیار اس کا اخلاقی وزن و وقار ہے، ضمیر کی رہنمائی میں کیرکٹر ہی انسان کو زندگی کی حقیقی نعمتوں سے آشنا اور ان سے مسرور رکھتا ہے، زندگی میں حقیقی کامیابی کے لئے دولت، قوت، چالاکی، نمود و نمائش اور شہرت ضروری نہیں، بلکہ صرف کیرکٹر سب سے زیادہ ضروری اور اہم چیز ہے، آپ کا کیرکٹر ویسا ہی ہو گا جیسا آپ اسکو بنانا چاہیں گے، فطرت کی بخششیں اور انعامات عام و ارزاں

ہیں، اور دماغ و ذہن کی روشنی میں یہ سب کا حصہ ہیں، یہ روشنی مختلف زاویوں سے مختلف قوت کے ساتھ لوگوں تک پہنچتی ہے، اکثر مدہم، کہیں روشن، کہیں بالکل ہلکی اور کہیں تقریباً معدوم، اس کا نام ضائع نہیں، ان خوبیوں کا ثبوت دیجئے جو ہر شخص کے حصہ میں آچکی ہیں، اور آپ بھی اس کے حصہ دار ہیں، خلوص، سنجیدگی، شفقت ترحم، عالی ظرفی کا نقیا اور تعیشات اور خفیف الحرکتی سے اجتناب، کیرکٹر انہی چیزوں سے عبارت ہے، قدرت نے آپ کو ان سے محروم نہیں کیا ہے، ان بخششوں کے باوجود اگر آپ کیرکٹر سے محروم ہیں تو یہ صرف آپ کی محرومی اور ذمہ داری ہے،

وہ بات کبھی نہ کیجئے جو باعثِ ندامت ہو سکتی ہے، صرف ایک اچھی رائے آپ کے لئے سب سے زیادہ اہم ہونا چاہیئے، اور وہ آپ ہی کی رائے ہے، یعنی آپ کا ضمیر مطمئن ہونا چاہیئے، مطمئن ضمیر مستقل نشاط ہے، یہ بات کیسی حیرت انگیز ہے کہ اکثر ہم دوسروں کو ترغیباتِ نفس کی دعوت نہیں دیتے لیکن خود کس آسانی سے اُن کا شکار ہوتے رہتے ہیں،

ہم اگر بلند نظر ہونا سیکھیں گے تو تنگ نظر اور پست نظر ہو جانا لازمی ہے، حُب جاہ اور ہوس پرستی کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اُن کی تکمیل کبھی نہیں ہو سکتی، جو لوگ ان کا شکار ہوتے ہیں، وہ سکینت اور تشکر کے جذبہ سے محروم ہو جاتے ہیں، انسان کو ترقی کرنی چاہیئے، لیکن ہم میں اکثر اپنی ترقی کس قیمت پر حاصل کرنا چاہتے ہیں، حوصلہ کی تشکیل اور تکمیل کے لئے ذرائع میں احتیاط بہت ضروری ہے، ناجائز ذرائع سے حاصل شدہ عروج جو بظاہر عروج ہے، لیکن درحقیقت زوال ہے،

ہمارا حوصلہ نفس پر قابو حاصل کرنا اور اس پر حکومت ہونا چاہیئے، یہ حقیقی بادشاہت ہر شخص کے اختیار میں ہے، حقیقی ترقی شخصیت کی تزئین اور علم و عمل سے حاصل ہوتی ہے، فرض کی ادائیگی انسان کا اولین اور بلند ترین حوصلہ ہونا چاہیئے، ہمارا علم، ہمارے خیالات و اعتقادات کچھ قیمت نہیں رکھتے اگر ہمارے اعمال ناقص ہیں،

دیانت اور صداقت کیرکٹر کے نہایت اہم اجزا ہیں، دیانت نہ صرف بہترین بلکہ واحد صحیح ترین حکمت عملی ہی، صداقت انسان کی متاعِ گرانمایہ ہی، صداقت سے انحراف، احترام خداوندی سے محرومی اور انسانوں سے مرعوبیت کی شہادت ہی، اپنی غلطی پر شرمندہ ہونا بہت مناسب ہی، لیکن غلطی کے اقرار پر کبھی بھی شرمندہ نہ ہونا چاہئے، انسان کو انسان بنانے کے لئے فرائض کی ادائگی اور زندگی کے کارنامول کے لئے بہت سی خوبیاں ضروری ہیں، ان میں سب سے اہم و ناگزیر خوبی جس کے بغیر انسان انسانیت اور زندگی کی بلندی و رفعت سے محروم رہتا ہی، صداقت ہی،

بڑوں کی بڑائیاں اور نیکوں کی نیکیاں اسلئے زندہ ہیں کہ وہ ایسے جری اور بہادر تھے کہ ان کی حقیقی اور ظاہری زندگی میں کوئی پردہ حائل نہ تھا، ان کی شخصیت حقیقت تھی، جس نے انکی یاد کو دوام بخشا،

جو شخص تنگ مزاجی اور خیالاتِ فاسدہ کا شکار ہو جاتا ہی، وہ اپنے دل میں ایک ایسے عفریت کو جگہ دیتا ہی جو حاکم مطلق بن کر اس کے سکون و مسرت کا خاتمہ کر دیتا ہی، رشک و حسد، فکر و بے چینی، جنون اور تنگ نظری سے اُس کی روح وجسم کا امتزاج و توازن برباد ہو جاتا ہی،

اقتدار اور قوت حاصل ہونے کے بعد ہمکو قہر وغضب کے بجاے انصاف و اخلاق کا نمونہ بننا چاہئے، صاحب اختیار کو کبھی یہ نہ سوچنا چاہئے کہ وہ کیا کر سکتا ہی، بلکہ دیکھنا چاہئے کہ کیا کرنا مناسب ہوگا، مسرت کا سیدھا راستہ یہی ہی،

گناہ کی معافی کا یہ مطلب نہیں ہی کہ ہماری سزا نہ ہوگی، سزا نہ ملنا نہ صرف ناممکن ہی، بلکہ بڑی بدقسمتی بھی ہے حقیقت یہ ہی کہ بدی میں خوشحالی سے محرومی ایک بڑی سخت محرومی ہی، گذشتہ غلطیوں کی یاد حال و مستقبل کو تلخ بنا دیتی ہی، جن کے ساتھ زیادتی کی گئی ہی وہ معاف کر سکتے ہیں، لیکن ان کی معافی سے مجرم اپنے جرم کی سیاہی اور سوزش میں اور زیادتی محسوس کرتا ہی، حقیقت یہ ہے کہ طور وطریقہ اور طرز وروش ہی سے زندگی عبارت ہے زندگی کی مسرت اور شادکامی کا مدار انہی چیزوں پر ہی، ظاہری امور کوئی اہمیت نہیں رکھتے، ماحول اور

فضا کی کوئی اہمیت نہیں، سب سے زیادہ اہم ہمارے اعمال ہیں، جن سے ہماری شخصیت بنتی ہے، اسلئے ہر روز نفس کا محاسبہ ضروری ہے، عمل سے عادت، عادت سے کیرکٹر اور کیرکٹر سے قسمت کی تشکیل و تکمیل ہوتی ہے ہم سب میں روزانہ کچھ نہ کچھ اضافہ ہوتا رہتا ہے، خواہ اچھا ہو یا برا، اس لئے ضروری ہے کہ ہم ہر شب میں سوچا کریں کہ ہم میں کیسا اضافہ ہوا،

ایک مشہور فلسفی شاعر کا خیال ہے کہ انسانوں کی دو قسمیں ہیں، اہل خیر اور اہل شر، اگر خدانخواستہ آپ کا تعلق موخر الذکر سے ہے تو آپ دوستوں کو دشمن، خوشگوار کو تلخ، زندگی کو پُرغم اور دنیا کو زندان بنا دیں گے، اس کے برعکس اگر آپ کسی کے دل میں ایک نیک اور مبارک خیال پیدا کر سکتے ہیں، یا کسی کی زندگی کی ایک ساعت پر مسرت بنا سکتے ہیں تو آپ کا یہ کارنامہ ایک فرشتہ کی لائی ہوئی رحمت کے مانند ہوگا، چند لمحوں کے لئے نفس کا محاسبہ ذکر و شغل کا ضروری جزو ہونا چاہئے، صرف نیکیوں پر غور کرنے سے آپ ہر اُس چیز سے بالاتر ہو جائیں گے، جسمیں بدی یا بُرائی کی آلودگی ہوگی،

شباب کو بہانہ نہ بنایئے، خالق کو شباب میں یاد کیجئے کہ اعلیٰ صفات کی متوازن تحلیل سے کیرکٹر بنتا، پرورش پاتا اور استوار ہوتا ہے،

"ن ص"

سیرۃ النبی حصہ ششم

یہ اخلاقی تعلیم پر مشتمل ہے، اس میں پہلے اسلام میں اخلاق کی اہمیت بتائی گئی ہے، اور پھر اسلامی و اخلاقی تعلیمات اور فضائل و رذائل اور اسلامی آداب کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، اور دکھایا گیا ہے کہ اخلاقی معلم کی حیثیت سے بھی رسول اسلام علیہ السلام کا پایہ کتنا اونچا ہے،

یہ کتاب چھوٹی اور بڑی دونوں سائز پر چھپی ہے، قیمت حسب ذیل ہے :- تقطیع کلاں قسم اول صہ دوم للعہ، تقطیع خورد قسم اول ہیعہ دوم صہ،

"مینیجر"

اخبار علمیہ

ایک قدیم تاریخی کھیل

جس طرح شطرنج بادشاہوں کا قدیم دماغی کھیل رہا ہے، اسی طرح گوے "چوگان" یا پولو دلپسند ورزشی کھیل رہا ہے، اس کا بہت قدیم زمانہ سے پتہ چلتا ہے، اور قدیم تاریخوں اور شاعری دونوں میں اس کا ذکر موجود ہے، "ہمیں میداں ہمیں چوگاں ہمیں گوے" سے ہر شخص واقف ہے، اس کا غالباً سب سے قدیم ذکر سکندر مقدونی کے حالات میں آتا ہے، اس کے متعلق یہ حکایت مشہور ہے کہ دارا نے اس کے پاس گیند اور بلا بھیجا تھا، اس سے یہ اشارہ مقصود تھا کہ سکندر اپنے گھر کی چار دیواری میں اس قسم کے کھیل تماشوں میں مشغول رہے، اور نظام دنیا سنبھالنے کا خیال چھوڑ دے، سکندر نے اس کا یہ جواب دیا تھا کہ "دنیا گیند ہوگی اور سکندر اس کا بلا ہوگا"، ایران کا مشہور بادشاہ اردشیر اس کھیل کا بڑا ماہر تھا، ایرانی داستانوں میں یہ افسانہ مشہور ہے کہ اس کو اس کھیل سے اتنی دلچسپی تھی کہ اُس نے اعلان کیا تھا کہ جو شخص گوے چوگاں کا سب سے اچھا کھلاڑی ہوگا، اس کو وہ اپنا متبنیٰ بنائے گا، اس اعلان پر ایک شخص نے اس کو اپنا کھیل دکھایا، اردشیر کو اتنا پسند آیا کہ اُس نے اس کو ولیعہد بنا لیا، یہ متبنیٰ ولیعہد شاپور تھا، فارسی شاعری میں غالباً سب سے پہلے رباعیات عمر خیام میں اس کا ذکر ہے، ایران میں عورتیں تک گوے چوگاں کھیلتی تھیں، نظامی نے خسرو شیریں میں شیریں کے کھیل کا نہایت دلکش منظر دکھایا ہے، ہارون رشید کو بھی اس سے دلچسپی تھی، چنگیز خاں کا ایک لڑکا اوقتی گوے چوگاں کا ماہر تھا، اور اُس نے اپنے

حاشیہ نشین بھی اس کھیل کے ماہر ہوتے تھے، تیمور لنگ کے متعلق مشہور ہے کہ اُس نے دمشق میں انسانی سروں کو گیند بنا کر کھیلا تھا، اصفہان میں اب تک میدان شاہ کے نام سے ایک میدان مشہور ہے، جس میں سولہویں صدی میں گوئے چوگاں ہوا کرتا تھا، اور شاہ عباس صفوی اپنے محل میں بیٹھ کر اس کا تماشہ دیکھا کرتا تھا، اور کبھی کبھی خود بھی کھیل میں شریک ہوتا تھا، چین و جاپان میں بھی یہ کھیل ایک مختلف شکل میں رائج تھا، ہندوستان میں اس کھیل کا مرکز منیپور (؟) شمار کیا جاتا تھا، اور یہاں کے باشندے سارے ہندوستان میں اس کے ماہر سمجھے جاتے تھے، کھیل کے میدان میں نہایت شاداب لان تھا اور چاروں طرف پتھر کی بلند فصیل تھی، یہاں کے باشندے اس کھیل کے ایسے شائق تھے کہ جب تک ان کے گھوڑے نہ تھک جاتے تھے، وہ نہ تھکتے تھے اور دن سے رات کی تاریکی تک کھیلتے رہتے تھے،

تحت البحر

آج کل تحت البحر یا ڈبکنی کشتی کو بڑی جنگی اہمیت حاصل ہے، گو یہ بھی ایک قسم کی کشتی ہی ہے، لیکن اسکی ساخت اور شکل و صورت سطح سمندر پر چلنے والے جہازوں سے بالکل مختلف ہوتی ہے، چونکہ پانی کی سطح کا اس پر بڑا دباؤ پڑتا ہے، اسلئے وہ نہایت ٹھوس اور مضبوط دھات کی بنائی جاتی ہے، اور سگار کی طرح نیچے اوپر اس کے کئی پرت لپٹے ہوتے ہیں، غوطہ زنی کے وقت اس کے تمام منفذ جنھیں اصطلاح میں دہانہ یا کھڑکی کہا جاتا ہے، مضبوطی کے ساتھ بند کر دیئے جاتے ہیں، نئی طرز کی تحت البحر میں تین دہانے ہوتے ہیں، پانی کی سطح کے اوپر لاتے وقت آگے پیچھے کے دو دہانے بند کر دئے جاتے ہیں، اوپر لانے کے لئے صرف درمیانی دہانہ کھلا رہتا ہے، غوطہ لگاتے وقت کشتی کو بھاری کرنے کے لئے اسکی ٹنکی میں ۷۰۰ ٹن سمندر کا پانی بھرا جاتا ہے، جس کے بوجھ سے کشتی اندر بیٹھ جاتی ہے، نئی طرز کی تحت البحر صرف بجلی کے پنکھوں کے ذریعہ چلائی جاتی ہے، اس میں اتنی کثرت سے اور ایسے باریک آلات ہوتے ہیں

کہ ساری جگہ گھیر لیتے ہیں، اسلئے اس کا اندرونی حصہ بہت تنگ ہوتا ہی، کپتان کے چلنے پھرنے کے لئے صرف تنگ راستے ہوتے ہیں، تاہم اس کے سونے، کھانے، پکانے اور نہانے وغیرہ کی جگہوں کا معقول انتظام ہوتا ہی، کپتان کیلئے سطح سمندر کے اوپر کی چیزوں کی نقل و حرکت کی نگرانی ضروری ہوتی ہی، ان کو دیکھنے کے لئے ایک خاص قسم کی دوربین ہوتی ہی، اسمیں اوپر نکلی ہوئی نلکی میں شیشہ لگے ہوتے ہیں اس سے اوپر کے جہازوں کی نقل و حرکت صاف نظر آتی ہی، صرف کپتان دشمن کے جہازوں کا اندازہ کرسکتا ہی، اور جہاز رانوں کو تحت البحر کا رخ اُن کی طرف پھیرنے اور ان پر تارپیڈو مارنے کا حکم دیتا ہی، ہر تحت البحر میں عموماً اوسط درجے کے بارہ تارپیڈو ہوتے ہیں، اور ایک بڑی مار کی توپ ہوتی ہی، جب تحت البحر کو پانی کی سطح کے اوپر لانا مقصود ہوتا ہے، تو کپتان پانی نکالنے کا آلہ دبانے کا حکم دیتا ہی، پانی نکلنے کے بعد تحت البحر ہلکی ہو کر اوپر آجاتی ہی،

ہندوستان میں پٹرول کا کارخانہ

موٹر، ہوائی جہاز، ٹینک اور دوسرے جنگی آلات کے علاوہ اکثر مشینوں کا دار و مدار بڑی حد تک پٹرول کے اوپر ہے، اس لئے موجودہ جنگ میں پٹرول کو بڑی اہمیت حاصل ہی، اس وقت دنیا کے پٹرول کے بڑے بڑے مخزن جن سے ۲۰۰ ملین ٹن سالانہ پٹرول نکلتا ہی، اتحادیوں کے قبضہ میں ہیں ۱۶۲ ملین ٹن ممالک متحدہ امریکہ سے نکلتا ہی، ۳۰ ملین ٹن سویٹ روس سے (اب سویٹ کا مخزن سخت خطرہ میں پڑ گیا ہے) اس کے مقابلہ میں محوری طاقتوں کے قبضہ میں صرف رومانیا کا مخزن ہی، جس سے کل ۱۲ ملین ٹن سالانہ پٹرول نکلتا ہی، ہالینڈ نے جاوہ کے تمام مخزن برباد کر دئے، ہندوستان میں کچھ دنوں پہلے تک پٹرول کے کارخانوں کا کوئی نشان نہ تھا، اب آسام اور شمالی ہند کے بعض حصوں میں اس کے کنویں نکلے ہیں، جہاں پٹرول نکالنے کے کارخانے قائم کر دیئے گئے ہیں، ان میں سے پٹرول خام

صورت میں نکلتا ہے جسے پکا کر صاف کیا جاتا ہی، اس کے لئے بڑے بڑے مینار نما حوض ہوتے ہیں، ان میں نیچے اوپر کئی درجے ہوتے ہیں، خام پٹرول پکنے کے دوران میں ان تمام درجوں سے گذرتا ہی اور آخری درجہ کا صاف شدہ پٹرول سب سے بہتر ہوتا ہی یہی ہوائی جہازوں میں استعمال ہوتا ہی، دوسرے درجہ کا موٹروں کے اور تیسرے درجہ کا روشنی کی گیس کے کام میں آتا ہی، ہندوستان میں سب سے اول ۱۹۱۵ء میں پٹرول کے کنوؤں کا اکتشاف ہوا، اور ۱۹۲۱ء میں اسکو نکالنے اور صاف کرنے کے لئے چھوٹا سا کارخانہ قائم کیا گیا لیکن ۱۹۳۹ء سے اس کو بڑے پیمانہ پر وسیع کر دیا گیا ہی، اور اس کے لئے جدید قسم کے تمام سامان مہیا کئے گئے ہیں،

حبشہ میں اسلامی عدالتوں کا قیام

حبشہ میں قدیم زمانہ سے مسلمانوں کی بڑی تعداد آباد ہی، اور یہاں اُن کو ہر قسم کی مذہبی سہولتیں حاصل ہیں، ہیلا سلاسی بادشاہِ حبش کی مسلمانوں پر بڑی نظرِ توجہ ہے، اور ان کے مذہبی امور سے خاص دلچسپی ہے، چنانچہ حال ہی میں اُنھوں نے مسلمانوں کی مذہبی عدالتوں کے قیام اور ان کے لئے قضاۃ کے تقرر کا حکم دیا ہی، مسلمانوں کے نکاح وطلاق، وراثت و وقف وغیرہ کے جملہ مذہبی مسائل ان عدالتوں کے سامنے پیش ہوا کریں گے، ابتدائی عدالت کے فیصلوں کی اپیل کے لئے عنقریب ایک عدالت العالیہ بھی قائم ہونے والی ہی،

لندن میں ایک نئی مسجد کی تعمیر

لندن میں ووکنگ کی مسجد عرصہ سے موجود ہی، اب مغربی لندن "وسٹ اینڈ" میں ایک بڑی اور وسیع مسجد اور اس سے متعلق ایک جلسہ گاہ اور کتبخانہ کی تعمیر کا مسئلہ زیرِ تجویز ہی اور اسکی ابتدائی کارروائی شروع ہوگئی ہی، حکومت نے مسجد کی تعمیر کیلئے ایک زمین جسکی قیمت ایک لاکھ گنی ہی تعمیر کی کمیٹی کے حوالہ کر دی ہی، عمارت کے مصارف کا تخمینہ کئی لاکھ گنی ہی، تمام اسلامی ممالک کو اس کارِ خیر میں حصہ لینے کی دعوت دیجائیگی، لندن کے مصری سفیر نشأت پاشا نے اس کام کو شروع کر دیا ہے،

"م"

ادبیات

جذب مجذوب

از جناب خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوب ریٹائرڈ انسپکٹر مدارس،

یا نویدِ وصل تھی یا موت کا پیغام ہے
عشق کا آغاز کیا تھا اور کیا انجام ہے

اب کہاں وہ دن کہاں وہ ساقیِ گلفام ہے
اب بجائے دورِ ساغر گردشِ ایام ہے

خیر ہے پردہ نشیں کیوں آج قصدِ بام ہے؟
آج ارادے کیا ہیں کیا منظور قتلِ عام ہے؟

راہ سے صحرا کی جا مجنوں ابھی تو خام ہے
عشق کے ہم پختہ کاروں میں ترا کیا کام ہے

کیا ہے اوجِ عشق ہر سیڑھی مری اک بام ہے
وہ مرا آغاز ہے اوروں کا جو انجام ہے

دم یہاں اکھڑا ہوا ہے نزع کا ہنگام ہے
کیا کہی ہے لو خدا حافظ ہمیں اب کام ہے

اُس مقامِ عشق پر اب ہوں کہ اے بلبل جہاں
نالہ و فریاد اک آوازِ بے ہنگام ہے

دل فقط دیکر تو بس تکلیف ہی تکلیف تھی
جان بھی دیدی تو اب آرام ہی آرام ہے

ربط و بے ربطیِ حسن و عشق کیا کیجے بیاں
بام بے زینہ ہے وہ یہ زینۂ بے بام ہے

میں تو ہوں ہی رند زاہد پارسا تو بھی نہیں
یں اگر ہوں جام بر کف تو نظر بر جام ہے

دم رکا سمجھو، اگر دم بھر بھی یہ ساغر رکا
میرا دورِ زندگی ہے یہ جو دورِ جام ہے

ہیں حرام اس مسلکِ رندی میں ایسی مستیاں
ہوش میں آ ہاتھ سے چھٹنے ہی کو اب جام ہے

جذب میں مجذوب مستانہ ہی آکو ٹھے پہ آ قابلِ دید اک تماشا آج زیر بام ہی
ہوگئیں مفقود کیا دنیا سے آنکھیں اے خدا پوچھتے پھرتے ہیں سب مجذوب کسکا نام ہی

یہ معانی یہ حقائق یہ روانی یہ اثر
شاعری تیری ہی اے مجذوب یا الہام ہی

فیضِ عشق

از جناب اسد ملتانی

عشق کے فیض سے موجود ہیں دیوانے چند دیکھ لو آج بھی آباد ہیں ویرانے چند
یہ نہ سمجھو کہ کوئی بندۂ محرم نہ رہا نظر آتے ہیں اگر بزم میں بیگانے چند
دامِ اُلفت میں خردمند بھی پھنس جاتے ہیں مرغِ دانا کیلئے بھی ہیں یہاں دانے چند
آگیا حضرتِ واعظ کی زباں میں بھی اثر یاد تھے اہلِ محبت کے جو افسانے چند
کم سے کم شہر کے مستوں میں تو ہمرنگی ہو ایک سی مے جو پلائیں یہی میخانے چند
ہوں میں اُن شوخ نگاہوں کے فسوں کا قائل جن سے مائل بہ جنوں ہوگئے فرزانے چند

حسن اور عشق میں ہے ربط بدستور اسد
شمع جلتی ہے تو آجاتے ہیں پروانے چند

رُباعی

از جناب سید احمد حسین صاحب امجد حیدرآبادی

دن رات کے ہمدم کو سمجھتے ہوتے دم بھر دمِ آدم کو سمجھتے ہوتے
یہ سچ ہے کہ "ہم جو چاہیں کر سکتے ہیں" اے کاش کہ ہم! ہم کو سمجھتے ہوتے

مطبوعات جدیدہ

محمد (صلعم) مولفہ توفیق الحکیم تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۰۵ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت معلوم نہیں، پتہ ہند پریس ساگر دت لین کلکتہ،

مصر کے ایک اہلِ قلم توفیق الحکیم نے عربی میں تمثیل کے پیرایہ میں سیرت نبوی لکھی ہے، مولانا عبد الرزاق صاحب ملیح آبادی نے اردو میں اس کا ترجمہ کیا ہے، جہاں تک واقعات کی صحت اور اُن کی افادی حیثیت کا تعلق ہے، قریب قریب کل واقعات مستند اور سبق آموز ہیں لیکن نفس تمثیل نبوت کی عظمت اور اسکے تقدس کے منافی ہے، مثلاً ایک مسلمان کو بغیر کسی تعظیمی لفظ کے ہر سطر میں تنہا "محمد" میں سوءِ ادب نظر آتا ہے، بعض مقامات پر ترجمہ میں بھی یہ فروگذاشت ہو گئی ہے اور اردو کے بعض پُرانے مصنفینِ سیرت کی طرح زبان کے مقابلہ میں احترام کے پہلو کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے، مثلاً "محمد ابو طالب کے گھٹنے پر کودا کرتے تھے" (ص۳۰) "محمد کو ہماری دیوار تک رگید لائے" (ص۲) گو یہ الفاظ کفار کی زبان سے ہیں لیکن ایسے سخیف ہیں کہ ایک سنجیدہ قلم سے کسی معمولی انسان کے لئے بھی ان کا استعمال زیبا نہیں ہے، نہ کہ خدا کے پیغمبر برحق کے لئے، اس مفہوم کو دوسرے الفاظ میں بھی ادا کیا جا سکتا تھا، یا آنحضرت صلعم، حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عائشہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے لئے بکثرت "چلانے" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، اس کے بجائے آسانی کے ساتھ "بلند آواز سے" کہا جا سکتا تھا، اس ظاہری فروگذاشت کے علاوہ معنوی اعتبار سے بھی بعض انتہائی ضعیف روایتیں درج ہو گئی ہیں، خصوصاً حضرت عائشہ صدیقہؓ کی سیرت کا کوئی اچھا نمونہ نہیں پیش کیا گیا ہے، سوکنوں اور سوتیلی اولاد کے ساتھ اُن کا طرزِ عمل نہ صرف ام المومنین

کی شان بلکہ احترام نبوت کے بھی خلاف ہے، مثلاً حضرت جویریہؓ کے بارہ میں آنحضرت صلعم سے ان کی تلخ گفتگو،
حضرت ابراہیمؑ کی پیدائش پر ان کا رشک وحسد، آنحضرت صلعم کے ابراہیم کو حضرت عائشہ کے پاس لانے پر
آپ سے ان کی بے رخی اور نامناسب گفتگو، ابراہیم کی موت پر ان کی مسرت نہ صرف ام المومنین کی شان
اور احترام نبویؐ کے خلاف ہے، بلکہ روایتی حیثیت سے بھی یہ واقعات حد درجہ ضعیف ہیں، ممکن ہے سیرت
کی کسی کتاب میں مل جائیں، لیکن مولانا کو سیرت کی روایات کا پایہ معلوم ہوگا، ایسی حالت میں انھوں نے
بغیر کسی تنقید کے انھیں کیسے قبول کر لیا، یہ صحیح ہے کہ اس کی ذمہ داری اصل مصنف پر ہے لیکن کم از کم
حاشیہ میں ایسی روایتوں کی حیثیت ظاہر کر دینا چاہئے تھا، پھر ایسے واقعات کا جن سے کوئی مفید سبق
نہیں ملتا، بلکہ الٹا اثر پڑتا ہے، ترجمہ کرنا کیا ضروری تھا، اپنے بعض ترجموں کی طرح وہ انھیں آسانی
کے ساتھ حذف کر سکتے تھے، اس قسم کی فروگذاشتیں اور بھی ہیں لیکن سب کا استقصا مقصود نہیں، بعض
مقامات پر ترجمہ کی بھی فروگذاشت نظر آئی مثلاً حضرت ابراہیم کی وفات پر آنحضرت صلعم کے اس ارشاد
"انا بک یا ابراهیم لمحزونون" کا ترجمہ کیا گیا ہے، ابراہیم ہم تیرے غم میں سوگوار ہیں، حالانکہ
صحیح ترجمہ یہ ہے کہ ہم تیری وجہ سے یا تیرے لئے غمگین ہیں، "سوگواری" نبوت کی شان سے بعید ہے
ان فروگذاشتوں سے قطع نظر کتاب مختلف حیثیتوں سے مفید ہے گو اس کا طرز ہمارے نزدیک پسندیدہ
نہیں ہے لیکن عام لوگ اسے دلچسپی سے پڑھیں گے، اور سیرت نبوی کی اشاعت کا اس سے پورا
فائدہ حاصل ہوگا،

جواہر العلوم، مترجمہ مولانا عبدالرحیم صاحب مولوی فاضل تقطیع بڑی ضخامت ۲۱۹ صفحے،
کاغذ، کتابت و طباعت بہتر قیمت ۶ مرتبہ، کتابستان پوسٹ بکس ۳۱۶۴ بمبئی ۳

اللہ تعالیٰ نے کلام مجید میں اپنے وجود اپنی توحید اور اپنی قدرت و حکمت کے ثبوت میں کائنات
عالم سے بکثرت شواہد پیش کئے ہیں، اور مختلف النوع حیوانات، بوقلموں نباتات، متواج سمندروں،

فلک بوس پہاڑوں، ابر و باراں، سیاروں کے نظام، آفتاب و ماہتاب کی گردش اور اسی قبیل کی دوسری ارضی و سماوی کائنات پر عبرت و بصیرت کے لئے غور و فکر کا حکم دیا ہے، ہر دور کے علماء نے اپنے زمانہ کے علم و نظر کے مطابق ان کے عجائبات کے اسرار و حکم اور اُس کے فوائد و مصالح بیان کئے ہیں، موجودہ دور کے اکتشافات اور فلسفہ و سائنس کی ترقی نے اپنی تحقیقات سے پہلے زمانہ سے زیادہ خدا کی قدرت و عظمت اور اسکی حکمتوں کا ثبوت فراہم کر دیا ہے، چنانچہ اس زمانہ کے ایک مشہور مصری عالم طنطاوی جوہری نے جو جدید علوم کے بھی فاضل ہیں، ان اکتشافات کی روشنی میں کلام مجید کے ان ایات قدرت کی ایک مستقل تفسیر لکھی ہے، تفسیر کے علاوہ اُنھوں نے اس موضوع پر مکالمہ اور گفتگو کے دلپذیر انداز میں ایک مستقل کتاب جواہر العلوم کے نام سے لکھی ہے، مولانا عبدالرحیم صاحب نے اردو میں اس کا ترجمہ کیا ہے، اس میں قدیم علوم اور جدید اکتشافات کی روشنی میں کلام مجید کے پیش کردہ عجائباتِ عالم کے اسرار و حکم اور فوائد و مصالح بیان کئے ہیں، ترجمہ سلیس ہے، اور نئی تعلیم یافتہ جماعت خصوصاً نوجوان طالب علموں کے پڑھنے کے لائق ہے،

گنجہائے گرانمایہ از پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۲۱۵ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد عامر، پتہ اردو بک ایجنسی علی گڈھ،

گنجہائے گرانمایہ پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے، جو اُنھوں نے اپنے بعض مخلص احباب اور قابلِ احترام اکابر کی وفات پر لکھے تھے، مولانا محمد علی، ڈاکٹر انصاری، مولانا سلیمان اشرف صدر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی، مولانا ابوبکر محمد شیث جونپوری ناظم دینیات، اصغر گونڈوی، مرتب کے مخلص دوست ایوب عباسی مرحوم، سر اقبال، مشہور شاعر مولوی احسن مارہروی مرحوم، ان میں ایوب عباسی مرحوم کے علاوہ قریب قریب سب متعارف اشخاص ہیں، اس سے پہلے رشید صاحب کے مضامین کے دو قابل قدر مجموعے نکل چکے ہیں، لیکن گنجہائے گرانمایہ کی نوعیت ان سے بالکل جدا ہے،

پہلے مجموعوں کے مضامین اُن کے دماغ کا نتیجہ ہیں اور یہ دلی محبت و احترام کا، اسلئے اُن سے دماغی تفریح ہوتی ہی، اور اِن سے دل متاثر ہوتا ہی، لکھنے والے کا دلی تاثر مضامین کی سطر سطر سے نمایاں ہے جس سے پڑھنے والا بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا جس سے جس نوعیت کا تعلق ہی، اسی نوعیت کا تحریر میں اثر ہی، مرنے والوں کی خصوصیات اور سیرت کا ایسا جاندار نقشہ کھینچا گیا ہی کہ ان کا مجسم وجود نگاہوں کے سامنے آجاتا ہی، اور اس آئینہ میں خود مصنف کی سیرت، اسکے اخلاقی معیار اور مختلف خیالات و رجحانات کا عکس نظر آتا ہی، یہ مضامین ادبی حیثیت سے بھی بلند پایہ ہیں، اس کے بہت سے فقرے تخیل اور طرز ادا کے اعتبار سے ادبی اور اخلاقی مقولوں کا درجہ رکھتے ہیں، اس مجموعے سے مصنف "خنداں" کے قلم کا ایک نیا پُرتاثیر رخ سامنے آتا ہی،

نشریات :- از پروفیسر ہارون خاں شروانی صدر شعبۂ تاریخ و سیاسیات جامعہ عثمانیہ تقطیع بڑی ضخامت، ۱۵۰ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ۱؎ کلدار ۶ر حالی پتہ سید عبدالقادر اینڈ سنس چار مینار و سید عبدالرزاق تاجر کتب مصطفےٰ بازار حیدرآباد دکن،

یہ کتاب پروفیسر ہارون خاں شروانی کی اٹھارہ ریڈیائی تقریروں کا مجموعہ ہی، تاریخی، یہ فلیس، اڈریانوپل، چین کا تمدن، قدیم ہندوستانی تمدن، زلزلۂ اناطولیہ، عید میلاد، بین اقوامی سیاسیات، "روزہ" ڈنمارک، ترکی، عربوں کا تمدن، عمومیت کا مستقبل، قومیت، عالمی وفاق کا مسئلہ، سیاسیات اور اردو زبان، چین، ہندوستان کے موجودہ مسائل، ان سب تقریروں میں اختصار کے باوجود موضوع سے متعلق تمام ضروری معلومات موجود ہیں، انداز بیان دلچسپ ہی، مذہبی تقریریں مقرر کے دینی جذبہ کی آئینہ دار ہیں، موجودہ حالات کے لحاظ سے سیاسیات کی تقریریں خاص طور سے زیادہ مفید اور پڑھنے کے لائق ہیں، ایک مقام پر غالباً سہواً ابن رشد کو عجمی علماء کے زمرہ میں شمار کیا گیا ہی، حالانکہ وہ عربی النسل ہی،

ذکرِ حسین :- از جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب تقطیع چھوٹی ضخامت ۳۲ صفحے، کاغذ کتابت

وطباعت بہتر قیمت ۳ر پتہ :۔ خان ایاس احمد مجیبی جامعہ نگر دہلی،

گذشتہ یادگار حسینی کے موقع پر ایک سچے ذاکر حسین نے یہ تقریر کی تھی اس موقع پر ہندوستان میں سیکڑوں پُرجوش تقریریں ہوئیں، لیکن یہ تقریر ان سب سے مختلف ہی، اس میں نہ جذبات کا طوفان ہی نہ شاعرانہ طرز بیان، نہ الفاظ کا طلسم بلکہ سادہ زبان میں چند حقیقتیں بیان کی گئی ہیں اور قوت وجبروت اور ظلم وطغیان کے مقابلہ میں احیاے حق کیلئے قربانی اور شہادت کی عظمت کی روشنی میں واقعہ شہادت کو نہایت موثر دلنشین اور فلسفیانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے اور ناکامی کی حکمت وعظمت اور حکم، حکمت اور حق کی وحدت کو بڑی خوبی سے دکھایا گیا ہی، گو یہ تقریر مختصر ہے لیکن معنویت کے اعتبار سے بڑی بڑی تقریروں سے زیادہ مفید اور سادگی کے باوجود زبان میں پوری شیرینی موجود ہی،

ہماری زبان :۔ سرتیج بہادر سپرو تقطیع چھوٹی ضخامت ۵۰ صفحے کاغذ وکتابت وطباعت بہتر، قیمت ۸ر پتہ انجمن ترقی اردو ہند انّی دہلی ؛

ڈاکٹر سپرو کو اردو زبان سے جو انس ومحبت ہی، اس کا اظہار انکی زبان وقلم سے برابر ہوتا رہتا ہی، انھوں نے اپنی تقریروں اور تحریروں میں اردو کے متعلق جو خیالات ظاہر کئے ہیں، ان کو انجمن ترقی اردو نے ہماری زبان کے نام سے ایک جگہ جمع کر دیا ہی، یہ تقریریں تنہا خیالات کا مجموعہ نہیں بلکہ اردو کی حمایت کے ساتھ اسکے دلائل بھی ہیں،

گرام سدھار :۔ از جناب عبدالشکور صاحب ایم اے بی ٹی علیگ بریلی کالج تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۱۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت ۸ر پتہ منیجر اسلامیہ گرلس ہائی اسکول، بریلی،

ہندوستان کی آبادی کا سب سے اہم عنصر کسان ہیں، لیکن بدقسمتی سے سب سے زیادہ ابتر حالت اسی طبقہ کی ہی، اب حکومت نے برائے نام اسکی اصلاح کی طرف توجہ کی ہے، کانگرسی حکومت کے زمانہ سے گرام سدھار شروع ہوگیا ہی، مؤلف نے اس کتاب میں اسی گرام سدھار کا نقشہ پیش کیا ہی، اور کسانوں کی بستی اُن کی زبون حالی اس کے وجوہ واسباب اور انکی مجبوری کو دکھلا کر اسکی اصلاح وترقی کی تدبیریں بتائی ہیں، جن لوگوں کو گرام سدھار سے دلچسپی ہی، ان کو اس کتاب میں بہت سی مفید باتیں ملیں گی،

"م"

جلد ۵۰ ماہ شعبان ۱۳۶۱ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۴۲ء عدد ۳

مضامین



شذرات

الحمد للہ کہ اس ہنگامۂ رستخیز میں جس میں مشرقی اضلاع پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے، اور ہفتوں تک ریل، ڈاک اور تار کے سلسلہ کے کٹ جانے سے ایک وحشت ناک بیخبری طاری رہی، دارالمصنفین اور دارالمصنفین کے رفقاء بخیریت رہے، اب دوبارہ امن وامان قائم اور آمد و رفت اور ڈاک کا سلسلہ جاری ہو چکا ہے، فللہ الحمد،

پچھلے مہینہ کا سب سے اندوہناک علمی حادثہ مولانا محمد سورتی کی وفات ہے، مرحوم اس عہد کے مستثنیٰ دل و دماغ اور حافظہ کے صاحب علم تھے، جہاں تک میری اطلاع ہے اس وقت اتنا وسیع النظر وسیع المطالعہ، کثیر الحافظہ عالم موجود نہیں، صرف و نحو و لغت و ادب و اخبار و انساب و رجال کے اس زمانہ میں درحقیقت وہ امام تھے، وہ چند ماہ سے مرض استسقا میں مبتلا تھے، علی گڈہ میں ان دنوں قیام تھا، اور وہیں ۷ راگست کو بروز جمعہ وفات پائی،

مرحوم کا اصلی وطن سورت (گجرات) تھا، وطن میں ابتدائی تعلیم پا کر یہ دلی آئے، اور رامپور میں مولانا محمد طیب صاحب مکی کا تلمذ حاصل کیا، میری ان کی پہلی ملاقات ۱۹۰۸ء میں ہوئی جب مولانا طیب مکی رامپور چھوڑ کر دارالعلوم ندوہ لکھنؤ میں ادیب اول کے عہدہ پر فائز تھے، فاضل استاذ کے ساتھ یہ لائق شاگرد بھی لکھنؤ وارد ہوا، اور اس زمانہ سے لیکر اخیر تک ان کے ساتھ میری علمی رفاقت رہی

ذاتی دوستی کا سلسلہ قائم رہا، معارف بھی ان کے رشحاتِ قلم سے کبھی کبھی مستفید ہوتا رہا ہے،

مرحوم اس فضل و کمال کے باوجود ہمیشہ پریشان حالی رہے، اور کہیں ایک جگہ جم کر بیٹھنا انکو نصیب نہ ہوا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے علم سے استفادہ بہت کم کیا جا سکا، اور کوئی کارآمد تصنیف بھی اپنی یادگار نہ چھوڑ سکے، اور نہ کوئی لائق شاگرد ہی اُن کا قائم مقام ہو سکا، البتہ چند جسمانی اولاد اُنکی یادگار ہیں،

ایک زمانہ میں جامعہ ملیہ دہلی میں معلم رہے، پھر بنارس کے جامعہ رحمانیہ میں مدرس ہوئے بعد کو بمبئی میں ایک اہلِ حدیث مدرسہ میں حدیث کا درس دینے لگے تھے، ٹونک کے مشہور کتبخانہ کی کشش بھی ان کو ٹونک لیجاتی تھی، انھوں نے شادی بھی ٹونک ہی میں کر لی تھی، قلمی کتابوں کی تلاش اور فراہمی اور نقل اُن کا ذریعۂ معاش رہ گیا تھا، اور اس تعلق سے وہ ٹونک، پٹنہ، رامپور، کلکتہ اور حیدرآباد کا سفر اکثر کیا کرتے تھے، لیکن آخرت کے سفر کے لئے ان کی تقدیر میں علی گڈھ کی مٹی لکھی تھی، ساٹھ کے قریب عمر پائی، سر بڑا، بدن گداز، اور ہاتھ پاؤں بھاری تھے،

مرحوم مسلکاً اہلِ حدیث تھے، اور اپنے مسلک میں بیحد غالی تھے، طبیعت بیقرار اور وارستہ تھی کسی ایک جگہ بیٹھ نہیں سکتے تھے، ساتھ ہی نہایت سادہ مزاج، بے تکلف، احباب پرور، فیاض اور مستغنی تھے، کھانے اور کھلانے کے بیحد شائق تھے، ہمیشہ مقروض اور خانہ بدوش رہتے تھے،

مرحوم کا پایہ علمِ ادب اور رجال و انساب و اخبار میں اتنا اونچا تھا کہ اس عہد میں اسکی نظیر مشکل تھی، جو کتاب دیکھتے تھے، وہ اُن کے حافظہ کی قید میں آجاتی تھی، سیکڑوں نادر عربی قصائد، ہزاروں عربی اشعار، لغات اور انساب نوکِ زبان تھے، ان کو دیکھ کر یقین آتا تھا کہ ابتدائی اسلامی صدیوں میں علما، ادبا اور محدثین کی وسعتِ حافظہ کی جو عجیب و غریب مثالیں تاریخوں میں مذکور ہیں، وہ یقیناً صحیح ہیں، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے،

نواب محمد یار جنگ بہادر (حیدرآباد دکن) کی وفات کا سانحہ بھی اسی اثنا میں پیش آیا، مرحوم نسلاً عرب تھے، اور ایک مرنج و مرجان بزرگ، نہایت مخلص، بے ریا، با خدا اور نیک طبع تھے، صوبہ داری کے منصب سے وظیفہ یاب ہو کر بلدہ میں مقیم تھے، حیدرآباد کی ہر علمی و تعلیمی تحریک میں وہ شریک رہتے تھے، دائرۃ المعارف اور مدرسہ نظامیہ کی اعزازی خدمت بھی ان کے سپرد تھی، دارالمصنفین سے مرحوم کو بیحد دلچسپی تھی اور ہمیشہ وہ اسکی مدد فرماتے رہتے تھے، اہل علم کے لئے ان کا گھر ایک مہمان خانہ کی حیثیت رکھتا تھا، اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی رحمتوں سے نوازے،

دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن کی چند تازہ مطبوعات شائع ہوئی ہیں، ان میں سے ایک تاریخ کبیر امام بخاری کی چوتھی جلد، اور تاریخ منتظم علامہ ابن جوزی کی دسویں جلد، رسائل محقق طوسی کا دوسرا حصہ اور ابوبکر محمد بن حسن الحاسب کا ایک اہم رسالہ انباط المیاہ الخفیہ ہے، اس اخیر رسالہ میں طبیعیات کی بعض اہم عجیب تحقیقات درج ہیں، اور بتایا گیا ہے کہ زمین کے اندر سے پانی نکالنے، چشموں کا پتہ لگانے اور نہروں کے بنانے کے کیا طریق ہیں،

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلا اڈیشن بحمد اللہ کہ ختم ہو رہا ہے، اب اس کے دوسرے اڈیشن کی فکر ہے، اس دوسرے اڈیشن میں بعض تصحیحات کا بھی خیال ہے، اگر کوئی صاحب نظر اس باب میں کچھ مشورے دینا چاہتے ہوں تو وہ مہینہ دو مہینہ کے اندر مطلع فرمائیں کہ ان کے مشوروں سے مستفید ہوا جا سکے، اس کا ہندی ترجمہ بھی پریس میں جا رہا ہے،

ہمارے فاضل دوست جناب مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی کا انگریزی ترجمۂ قرآن لاہور کی تاج کمپنی کی طرف سے چھپنا شروع ہو گیا ہے، مترجم نے اس ترجمہ میں خالص اہلسنت کی تفسیروں کی پیروی کی ہے، اور حواشی میں جو بکثرت ہیں شکوک و شبہات کا ازالہ کیا ہے، اور یہود و نصاریٰ کی کتابوں سے تائیدات بعض آیات کی جغرافی و تاریخی تحقیقات درج کی ہیں، امید ہے کہ نوجوان انگریزی خواں طبقہ اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریگا،

مقالات

امام رازی اور تنقید فلسفہ

از مولانا عبدالسلام صاحب ندوی

(ماخوذ از سوانح امام رازی)

جس طرح مسلمانوں کی علمی تاریخ میں بوعلی سینا اور فارابی نے فلسفۂ ارسطو کے شارح ہونے کی حیثیت سے شہرت عام حاصل کی ہے، اسی طرح امام رازی نے فلسفۂ ارسطو پر اعتراضات کرنے میں ناموری حاصل کی ہے، چنانچہ شہرزوری نے امام صاحب کے حالات میں لکھا ہے کہ "وہ بحث وجدال اور قیل وقال میں انتہائی درجہ کو پہنچے ہوئے تھے، اور اُن کے زمانہ میں کوئی شخص بحث میں ان کا ہمسر نہ تھا، انھوں نے حکما پر بہت سے شکوک وشبہات وارد کئے اور اُن کے بعض شبہے صحیح بھی ہیں"!

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ فلسفۂ ارسطو پر رد وقدح کرنے کا آغاز جو اسلام میں نہایت ابتدائی زمانہ سے ہو چکا تھا، اُس کی انتہا امام صاحب پر ہوئی، چنانچہ سب سے پہلے یحیٰی نحوی نے جو امیر معاویہؓ اور حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں تھا ارسطو کے رد میں ایک کتاب لکھی، اس کے بعد نظام معتزلی نے جو مامون الرشید کے زمانہ میں تھا، ارسطو کی کتاب کا رد لکھا، پھر اُسی زمانہ کے قریب ابوعلی جبائی نے جو مشہور معتزلی تھا ارسطو کی کتاب کون وفساد کا رد لکھا، تیسری صدی میں حسن بن موسیٰ نوبختی نے کتاب الآرا والدیانات لکھی، جس میں ارسطو کی منطق کے مہمات مسائل پر اعتراضات کئے جو

متکلمینِ اسلام سے ماخوذ تھے، نوبختی کے بعد ابوبکر باقلانی نے دقائق کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں فلسفہ کا رد لکھا، پھر علامہ شہرستانی المتولد ۴۷۹ھ نے برقلس اور ارسطو کے رد میں ایک مستقل کتاب لکھی، ابوالبرکات بغدادی نے اس میں سب سے زیادہ ناموری حاصل کی اور اپنی کتاب معتبر میں ارسطو کے اکثر مسائل و خیالات کو غلط ثابت کیا، یہ وہ لوگ تھے جن کا مقصد صرف رد و قدح تھا، اور وہ کسی مستقل فلسفہ کے بانی اور پیرو نہ تھے لیکن شیخ شہاب الدین مقتول المتوفی ۵۸۶ھ نے فلسفہ میں اپنا ایک مستقل طریقہ قائم کیا، جس کا نام انھوں نے فلسفۂ اشراق رکھا، جو مشائین یعنی ارسطو کے فلسفہ کا بالکل مخالف تھا، اس لئے اُنھوں نے اپنی کتاب حکمۃ الاشراق مشارع و مطارحات میں فلسفۂ ارسطو کے مسائل کی تردید کی،[۱] ان سب کے بعد امام رازی کی باری آئی اور اُنھوں نے اپنے اعتراضات کی کثرت سے فلسفۂ ارسطو کی رہی سہی وقعت بھی خاک میں ملادی اور متاخرین کے لئے فلسفۂ ارسطو پر رد و قدح کی ایک عام شاہراہ قائم کردی، چنانچہ علامہ شہرزوری جو امام صاحب کے مخالفین میں ہیں اُن کے حالات میں لکھتے ہیں:

اورد علی الحکماء شکوکا وشبها	اُنھوں نے حکما پر بہت سے شکوک و شبہات
کثیرۃ .... واکثر من جاء بعدہ	وارد کئے، اور ان کے بعد جو لوگ پیدا ہوئے
ضل بسببها ..... وبعضهم	وہ ان شبہات کی وجہ سے گمراہ ہوئے اور
زاد علیها ایضاً،[۲]	بعض لوگوں نے اس پر اضافہ بھی کیا،

یہ پتہ نہیں چلتا کہ امام صاحب نے حکما پر جو اعتراضات کئے ان کا ماخذ کیا تھا، اور اس معاملہ میں کون کون سی کتابیں ان کے لئے دلیل راہ بنیں، شہرزوری نے لکھا ہے کہ امام صاحب نے حکما پر جو اعتراضات کئے ہیں، وہ زیادہ تر ابوالبرکات یہودی سے ماخوذ ہیں، اور وہ اسی کی ایجادات سے ہیں[۳]، اور اس کی تصدیق

---

[۱] مولانا شبلی مرحوم نے "فلسفۂ یونان اور اسلام" کے نام سے ایک مستقل تاریخی مضمون لکھا ہے، اور ہم نے اس موقع پر اسی کی تلخیص کر دی ہے [۲] شہرزوری ص ۱۰۱ [۳] ایضاً ص ۱۰۱،

اس سے بھی ہوتی ہے کہ امام صاحب نے اپنی فلسفیانہ تصنیفات میں جا بجا اس کی کتاب معتبر کا نام لیا ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کتاب ان کے پیش نظر رہتی تھی، اس کے علاوہ امام صاحب نے اور کسی کتاب کا نام نہیں لیا ہے جس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب کے زمانہ سے پیشتر یہ کتابیں یا تو معدوم ہو گئی تھیں یا یہ کہ اُن سے امام صاحب نے فائدہ ہی نہیں اُٹھایا، یہ بھی واضح طور پر معلوم نہیں ہوتا کہ فلسفہ کی تردید سے امام صاحب کا مقصد کیا تھا؟ مولانا شبلی مرحوم نے علم الکلام میں لکھا ہے کہ

"فلسفہ کے رد سے علم کلام کو صرف اس قدر تعلق تھا کہ اس کے جو مسائل مذہب اسلام کے مخالف ہوں وہ باطل کر دئے جائیں، لیکن متکلمین نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ عام طور پر فلسفہ یونانی کی غلطیاں ثابت کیں جس کی وجہ یہ تھی کہ فلسفۂ یونان کا جب ترجمہ ہوا تو لوگ نہایت شیفتگی سے اس کے گرویدہ ہو گئے، اس گرویدگی نے یہ اثر پیدا کیا کہ فلسفہ کے ہر قسم کے مسائل پر خوش اعتقادی کی نظر پڑتی تھی، اور اس کے ضعیف مسائل بھی قوی معلوم ہوتے تھے، انہی میں اقل قلیل وہ مسائل بھی تھے جو بظاہر اسلام کے خلاف معلوم ہوتے تھے، متکلمین جب خاص ان مسائل کو باطل کرتے تھے تو معتقدین فلسفہ کو خیال ہوتا تھا کہ جس علم کے اور تمام مسائل صحیح ہیں اس کے وہی مسائل کیوں ضعیف ہوں گے جو اسلام کے مخالف ہیں، اس ضرورت سے متکلمین نے عام طور پر فلسفہ پر نظر ڈالی اور سیکڑوں مسائل کی غلطی ثابت کی، قدمائے متکلمین نے قدر ضرورت پر اکتفا کیا تھا لیکن متاخرین اور خصوصاً امام رازی نے سرے سے فلسفہ کی دھجیاں اڑا دیں"[۱] لیکن مولانائے مرحوم نے اس کی کوئی تاریخی شہادت پیش نہیں کی ہے، اس میں شبہہ نہیں کہ فلسفہ کی عام وقعت اور ارسطو و فلاطوں کے پر عظمت ناموں سے بہت سے لوگ مرعوب ہو گئے تھے، اور ان کے دلوں سے مذہب کا اثر زائل ہو گیا تھا، اس لئے اس بات کی ضرورت تھی کہ فلسفہ کے مسائل اور حکمائے کے خیالات پر تنقید کر کے اُن کی وقعت اور اُن کے اثر کو کم کیا جائے، متکلمین اسلام

---

[۱] علم کلام ص ۱۶۲ و ۱۶۶،

میں امام غزالی نے اسی ضرورت سے تہافتہ الفلاسفہ لکھی تھی، چنانچہ اوس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ میں نے ایک گروہ کو جو اپنے آپ کو ذہانت و فطانت میں اپنے ہمسروں سے ممتاز سمجھتا ہے، دیکھا کہ وہ مذہبی قیود و احکام سے بالکل آزاد ہوگیا ہے، اور شعائر مذہبی اور عبادات وغیرہ کو چشم حقارت سے دیکھتا ہے، اور ان کے کفر کی وجہ صرف یہ ہے کہ جب اُنھوں نے سقراط، بقراط، افلاطون اور ارسطو وغیرہ کے شاندار نام سنے اور ان کے متبعین نے ہندسہ منطق، طبعیات اور الٰہیات میں ان کی وقت نظری کی تعریف کی اور ساتھ ہی یہ بھی بیان کیا کہ باوجود اس علم وفضل کے یہ لوگ مذہب کے منکر تھے اور اس کو ایک مصنوعی اور نمائشی چیز سمجھتے تھے تو وہ بھی مذہب کے منکر ہوگئے تاکہ وہ بھی حکمائے زمرہ میں شامل ہوجائیں اور عوام جمہور کی تائید و مساعدت کی ذلت نہ گوارا کریں، اس بنا پر میں نے قدمار فلاسفہ کی تردید میں یہ کتاب لکھی اور الٰہیات کے متعلق اون کے عقائد کی کمزوریاں دکھائیں،

اس کا صحیح طریقہ تو یہ تھا کہ پہلے تمام فلاسفۂ یونان کے مسائل و خیالات یکجا جمع کئے جاتے، پھر یہ دیکھا جاتا کہ جن لوگوں نے یونانی زبان سے، اون کے فلسفہ کا عربی زبان میں ترجمہ کیا ہے، اُنھوں نے اس میں کیا کیا تحریف و تبدیلی کی ہے، امام غزالی ان دونوں باتوں سے واقف تھے لیکن اُنھوں نے تمام فلاسفۂ یونان میں سے صرف ارسطو کو منتخب کیا، اور اس کے فلسفہ کی جو شرح و تفسیر فارابی اور بوعلی سینا نے کی تھی صرف اُسی کو پیش نظر رکھا، اور اسکی وجہ یہ بیان کی کہ اور فلاسفہ کے مسائل و خیالات نہایت منتشر اور پراگندہ تھے، اور ارسطو ہی صرف ایک ایسا شخص تھا جس نے فلاسفۂ یونان کے فلسفہ کی تنقیح و تہذیب کی، اور اس کو حشو و زوائد سے پاک کیا، اسلئے میں نے صرف اسی کی تردید پر قناعت کی، اور اسلامی فلسفیوں میں فارابی اور بوعلی سینا سے بہتر کسی اور نے ارسطو کے مذہب کو نقل نہیں کیا تھا، اس لئے یہ دونوں جس چیز کو صحیح سمجھتے ہیں، میں نے اسی کی تردید پر اکتفا کیا، لیکن امام غزالی نے عام طور پر ارسطو کے فلسفیانہ

مسائل کی بھی تردید نہیں کی، بلکہ اس کے صرف چند مسائل منتخب کرلئے، اور اس کی وجہ یہ لکھی کہ مذہبی حیثیت سے جن فلسفیانہ مسائل سے اختلاف کیا جا سکتا ہے ان کی چند قسمیں ہیں،

(۱) ایک اختلاف تو محض لفظی نزاع کی حیثیت رکھتا ہے، مثلاً فلاسفہ خدا کو جوہر کہتے ہیں، لیکن جوہر سے ان کی مراد یہ نہیں ہے کہ وہ کسی حیز میں ہے، بلکہ یہ مراد ہے کہ کسی محل میں موجود نہیں بلکہ بذاتِ خود قائم ہے، لیکن ہمکو اسکی تردید کی ضرورت نہیں، کیونکہ خدا کا قائم بالذات ہونا تو بہرحال متفق علیہ ہی، اس لئے اگر اسکی تعبیر جوہر کے لفظ سے کیجائے تو یہ صرف ایک لغوی اختلاف ہو جاتا ہے،

(۲) دوسرے قسم کے وہ مسائل ہیں جن کے مان لینے سے مذہبی اصول کو کوئی صدمہ نہیں پہنچتا، جیسے چاند اور سورج کے گہن کا مسئلہ لیکن اس قسم کے مسائل کی تردید کی بھی ضرورت نہیں بلکہ جو شخص ان مسائل کی تردید کو مذہبی حیثیت دیتا ہے وہ خود مذہب پر دست درازی کرتا ہی، کیونکہ ان مسائل پر ہندسی دلائل قائم ہیں جو بالکل یقینی ہیں، اس لئے اگر یہ ثابت کیا جائے کہ یہ مسئلے شریعت کے خلاف ہیں تو جو شخص ان دلائل کی قطعیت سے واقف ہے اس کو ان دلائل میں تو شک پیدا نہ ہوگا، بلکہ اس کے برعکس خود مذہب ہی میں شک پیدا ہو جائے گا،

(۳) تیسرے قسم کے مسائل وہ ہیں جو اصولِ دین سے تعلق رکھتے ہیں، مثلاً حدوثِ عالم، صفاتِ باری، اور حشرِ اجساد کے مسائل، جن کا فلاسفۂ یونان نے انکار کیا ہی، اور یہی مسائل قابلِ تردید ہیں،

اس بنا پر امام غزالی نے الٰہیات کے چند مسائل لئے اور مذہبی حیثیت سے ان کی تردید کی، لیکن امام رازی کی حیثیت اس معاملہ میں امام غزالی بلکہ فلسفہ و منطق کے دوسرے

معترضین سے بالکل مختلف تھی، ان سے پہلے صرف دو گروہ تھے، ایک گروہ تو حکمائے قدیم کے جادہ سے سرِ مو تجاوز کرنا پسند نہیں کرتا تھا، اور ہر چیز میں ان کی موافقت کرتا تھا، دوسرا گروہ ہر مسئلہ میں ان پر جا بجا اعتراضات کرتا تھا، اور اُن اعتراضات کی بنا پر اپنے آپ کو ان کے زمرے میں شامل کرتا تھا، اس بنا پر اس بات کی ضرورت تھی کہ فلسفہ کی موافقت و مخالفت میں جو کچھ لکھا گیا ہے ان سب کو ایک جگہ جمع کیا جائے اور اُن پر مجتہدانہ نظر ڈالی جائے، اس کے بعد جو مسائل صحیح ہوں اُن کی تائید کی جائے، اور جو قابلِ اعتراض ہوں اُن کی تردید کی جائے، اس بنا پر امام صاحب کو امام غزالی سے بہت زیادہ وسعتِ نظر سے کام لینا پڑا، امام غزالی کی کتاب تہافۃ الفلاسفہ صرف یحییٰ نحوی کی کتابوں سے جیسا کہ شہرزوری نے تاریخ الحکما میں لکھا ہے ماخوذ تھی، اور یحییٰ نحوی نے مذہبی حیثیت سے صرف عیسائیوں کے خوش کرنے کے لئے ارسطو وغیرہ کے فلسفہ کی تردید کی تھی، اور غالباً اُسی قسم کے مسائل انتخاب کئے ہونگے، جو مذہب سے تعلق رکھتے ہوں گے یا یہ کہ فلسفہ کی وقعت کے کم کرنے کے لئے فلسفہ کے تمام مسائل پر جا و بیجا ہر قسم کے اعتراضات کئے ہوں گے، بہر حال امام رازی سے پہلے صرف دو ہی قسم کے لوگ موجود تھے، ایک تو وہ جو تمام مسائل میں حکمائے قدیم کی اندھا دھند تقلید کرتے تھے، دوسرے وہ جو اُن کے تمام مسائل پر اندھا دھند اعتراضات کرتے تھے، اس بنا پر امام صاحب نے ان دونوں کے درمیان ایک معتدل روش اختیار کی اور فلسفہ کے جو مسائل قابلِ تائید تھے اُن کی تائید کی اور جو مسائل قابلِ تردید تھے ان کی تردید کی، چنانچہ مباحثِ مشرقیہ کے دیباچہ میں لکھتے ہیں،

حکمائے قدیم کی کتابوں کو پڑھ کر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہر بات کا جو مغز ہو اُسکو حاصل کر لیں اور اس کو نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کر دیں جس میں نہ بہت زیادہ طوالت ہو نہ بہت زیادہ اختصار کہ اس سے پیچیدگی پیدا ہو جائے، اور اُس کی ترتیب یہ ہو کہ پہلے تمام مطالب کو ایک

دوسرے سے جدا کر دیں، پھر اس کے بعد یا تو ان کو مضبوط کریں یا اُن کی تردید کریں، پھر شکوک و اعتراضات کی باری آئے، اس کے بعد اگر ہم کو قدرت حاصل ہو تو ان شکوک و اعتراضات کو حل کریں، لیکن ان باتوں کے درمیان بعض اوقات ایسی باتیں پیش آجائیں گی جو مشہور کے مخالف ہونگی اور اُن سے جمہور کے کلام کی تردید ہو گی، جو لوگ تمام مسائل میں حکمائے قدیم کی موافقت پر اعتقاد رکھتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ حکمائے قدیم بھی بعض موقعوں پر اپنے قدمار کی مخالفت کرتے تھے، اُن کے کلام پر ان کو اعتراضات تھے، اور اس کا اظہار صراحۃً نہ کہ تعریضاً کرتے تھے، اس لئے اگر رد و قدح کی یہ روش پسندیدہ نہیں تو حکمائے قدیم پر بھی یہی الزام عائد ہوتا ہے، اور اگر یہ روش عمدہ ہے اور اس مقلد کے خیال میں ہمکو حکمائے قدیم کے نقشِ قدم پر چلنا چاہیئے، تو یہ دشوار گذار راستہ جس سے گذرنے کے لئے بعض مقبول اور مشہور چیزوں کا چھوڑنا ضروری ہی، سیدھا راستہ ہے اس لئے وہ حکمائے قدیم کی پیروی کا جو فتویٰ دے رہے ہیں، اسی سے یہ لازم آتا ہے کہ ہم ان کی تقلید کو چھوڑ دیں، اب جس طرح تم کو اس گروہ کی باتوں کا تناقض معلوم ہو گیا، اسی طرح ان لوگوں کے طریقہ کی خرابی بھی معلوم ہونی چاہیئے، جنھوں نے بڑے بڑے علمار و حکمار پر جا و بیجا رد و قدح کرنے کو اپنا مطمح نظر بنا لیا ہے اور ان کا خیال یہ ہے کہ چونکہ اُنھوں نے اس طریقہ سے اپنے آپ کو اُن حکمار و علمار کا حریف بنا لیا ہے، اس لئے وہ بھی ان کے زمرے میں شامل ہو گئے ہیں، لیکن اس سے صرف ان کی بلادت، غباوت اور جہالت کا اظہار ہوتا ہے، اس لئے جب ہم کو معلوم ہوا کہ یہ دونوں گروہ سیدھے راستہ سے ہٹ گئے ہیں، اور افراط و تفریط دونوں بری چیزیں ہیں، تو ہم نے ان دونوں کے درمیان اعتدال کی روش اختیار کی اور دونوں اقوال میں سے بہترین قول کو اختیار کیا اور یہ معتدل روش یہ ہے، کہ حکما کے جو مباحث و مسائل ہم تک پہنچے ہیں ان کے ثابت کرنے میں ہم پہلے انتہائی کوشش صرف کریں گے، اور اگر ہم ان کی تلخیص اور ان کے وجہ اثبات کے

اظہار سے قاصر رہے، تو اعتراضات کے وجوہ کی طرف اشارہ کریں گے پھر ان کے مجمل کی تاویل اور ان کے مفصل کی تلخیص کی جو ان کی متفرق کتابوں میں مذکور ہیں کوشش کرینگے پھر اسکے بعد انکے ساتھ ایسے اصول شامل کرینگے جنکی تحریر، تحصیل، تقریر اور تفصیل کی توفیق خدا نے صرف ہمیں کو دی ہے، قدمار کو انکی بالکل خبر نہ تھی، اسلئے ہماری یہ کتاب ان تمام مباحث پر مشتمل ہو گی، جو اس کے علاوہ اسی قسم کی اور کتابوں میں مذکور ہیں، لیکن اسی کے ساتھ اس میں اور بہت سے کلی اصول، حقیقی قواعد، علمی نکتوں اور سوالات و جوابات کا اضافہ بھی ہوگا اور ہمارے اس بیان کا اعتراف صرف وہی شخص کر سکے گا، جو عقلار کے اکثر مباحث اور علمار کی کتابوں کے مضمون سے پوری طور پر واقف ہو گا، اور اس طرح سے قدیم و جدید میں امتیاز کر سکے گا،

اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ

(۱) امام صاحب سے پہلے فلسفہ و حکمت کے متعلق قدمار نے جو کچھ لکھا تھا، امام صاحب نے اس میں سے منتخب باتیں لے لیں، لیکن قدمار کی تصنیفات اور ان کی معلومات سے واقف ہونے کے لئے نہایت وسعتِ نظر کی ضرورت تھی اور ہمارے نزدیک امام صاحب سے پہلے اور امام صاحب کے بعد اس معاملہ میں ان کا کوئی دوسرا ہمسر نہیں پیدا ہوا، شہرزوری نے تاریخ الحکمار میں لکھا ہے کہ عمر بھر ان کا صرف یہی کام رہا کہ وہ لوگوں کے اقوال کو جمع کرتے تھے، پھر کبھی ان کی تہذیب کرتے تھے، کبھی توضیح، کبھی ان کا اختصار کرتے تھے، کبھی بسط و تفصیل، کبھی عبارت کے ذریعہ سے ان میں تصرف کرتے تھے، اور کبھی ایک ورق سے دوسرے ورق میں، ایک مسودہ سے دوسرے مسودہ میں ان میں تغیر کرتے رہتے تھے، اس طرز تحریر نے اگرچہ ان کی تصنیفات میں یہ عیب پیدا کر دیا ہے کہ وہ ہر قسم کے رطب و یابس اور مکررات کا مجموعہ ہو گئی ہیں اور وہ اپنی تمام تصنیفات میں تھوڑے سے تغیر اور حذف و اضافہ کے بعد صرف ایک ہی بات کو بار بار کہتے ہیں اور ان ہی کو دہراتے ہیں، تاہم ان کی تصنیفات کو پڑھکر ہر شخص کو ان کی وسعت معلومات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے،

(۲) امام صاحب سے پہلے فلسفہ و حکمت کی بعض کتابوں میں حد سے زیادہ طوالت اور بعض میں حد سے زیادہ اختصار پایا جاتا تھا، جس سے معانی و مطالب میں نہایت پیچیدگی پیدا ہو جاتی تھی، امام صاحب نے ان دونوں طریقوں کو چھوڑ کر ایک درمیانی راستہ اختیار کیا جس سے معانی و مطالب کی وضاحت مقصود تھی، اور اُن کے اس طرزِ تحریر نے فلسفہ کو نہایت آسان اور سہل بنا دیا،

(۳) امام صاحب سے پہلے فلسفہ کے مسائل باہم گڈ مڈ تھے، امام صاحب نے ہر مسئلہ کو ایک دوسرے سے الگ کر کے ان کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ مرتب کیا،

(۴) ان تمام مراتب کے بعد یا تو ان مسائل کی تائید یا ان کی تردید کی، اگرچہ یہ ایک غیر جانبدارانہ اور منصفانہ طریقہ تھا، تاہم اس طرزِ تحریر نے ان کو فقہار، محدثین اور فلاسفہ دونوں کی نگاہ میں مبغوض بنا دیا، فقہار و محدثین کو تو ان پر یہ اعتراض ہے کہ وہ مخالفین کے شبہات کو نہایت قوت کے ساتھ بیان کرتے ہیں، اور ان کے جوابات میں کوتاہی کرتے ہیں، اُنھوں نے نہایۃ العقول میں خود تصریح کی ہو کہ وہ فریقِ مخالف کے مذہب کو اس قوت کے ساتھ ثابت کریں گے کہ اگر خود ان کا فریق ان کو ثابت کرنا چاہتا تو اس سے زیادہ نہیں کر سکتا تھا[1]، اور فلاسفہ کو یہ اعتراض ہے کہ اُنھوں نے بغیر سوچے سمجھے حکمائے قدیم پر اعتراضات کئے ہیں،

(۵) اس تائید و تردید کے سلسلہ میں امام صاحب کو بعض ایسی باتیں بھی کہنی پڑیں جو مشہور اور مذہبِ جمہور کے مخالف تھیں،

(۶) ان باتوں کے ساتھ امام صاحب نے منطق و فلسفہ میں اور بھی بہت سے تصرفات و تغیرات کئے جن کی وجہ سے اون کی حالت بالکل بدل گئی، مثلاً حکمائے قدیم کے یہاں منطق علومِ آلیہ کی حیثیت رکھتا تھا، یعنی وہ خود مقصود بالذات علم نہ تھا، بلکہ وہ علوم حکمیہ کا

---

[1] لسان المیزان جلد ۴ ص ۴۲۶،

ایک ذریعہ تھا، لیکن متاخرین حکمائے اسلام نے اس میں جو تغیرات کئے ان کی وجہ سے وہ ایک مستقل علم بن گیا، اور سب سے پہلے امام صاحب نے اس کو ایک مستقل علم بنایا، چنانچہ علامہ ابن خلدون مقدمہ تاریخ میں لکھتے ہیں،

ثم تکلموا فیما وضعوہ من ذٰلک	پھر متاخرین نے منطق کی جو شکل قائم کی اس
کلاما مستبحرا ونظروا فیہ من	میں بڑے وسیع پیمانے پر کلام کیا اور اسکو
حیث انہ فن براسہ لا من حیث انہ	اس حیثیت سے دیکھا کہ وہ ایک مستقل فن
آلۃ للعلوم فطال الکلام فیہ واتسع	ہے، صرف علوم کا ذریعہ نہیں ہی، اسلئے اس میں
واول من فعل ذٰلک الامام فخر الدین	بڑی لمبی چوڑی بحث پیدا ہو گئی، اور سب سے
ابن الخطیب ومن بعدہ افضل	پہلے ایسا امام رازی نے کیا، اور ان کے
الدین الخونجی[۱]	بعد افضل الدین الخونجی نے،

اس بنا پر منطق کی جو موجودہ شکل ہے، اس کے بانی اول امام صاحب ہی ہیں، فلسفہ کی جو موجودہ شکل ہے، اس کو بھی سب سے پہلے امام صاحب ہی نے قائم کیا، یونانیوں کے یہاں طبیعیات اور الٰہیات دونوں الگ الگ تھیں، اور الٰہیات کی ترتیب طبیعیات کے بعد تھی، اس کے بعد متاخرین حکمائے اسلام نے فلسفہ و حکمت میں کتابیں لکھیں، اور امام غزالی نے فلسفہ کی تردید کی تو متاخرین نے علم کلام اور فلسفہ کے مسائل کو باہم مخلوط کر دیا، جس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ان مسائل سے ان کو اپنے مباحث میں سابقہ پڑتا تھا، دوسرے یہ کہ علم کلام کا موضوع اور اس کے مسائل فلسفہ الٰہیات کے موضوع و مسائل سے مشابہ تھے، اس لئے یہ دونوں گویا ایک علم ہو گئے تھے، اس کے بعد طبیعیات اور الٰہیات میں حکماء کی جو ترتیب تھی اسکو بدل کر دونوں کو ایک علم کر دیا، اور اس میں سب سے پہلے امور عامہ

---

[۱] مقدمہ ابن خلدون صفحہ ۴۷۱

سے، پھر جسمانیات اور ان کے توابع سے، پھر روحانیات اور ان کے توابع سے بحث کی، امام رازی نے مباحث مشرقیہ میں یہی روش اختیار کی اور ان کے بعد تمام علمائے کلام نے اسکی تقلید کی، اور علم کلام اور فلسفہ و حکمت کے تمام مسائل مخلوط ہو کر ایک معجون مرکب تیار ہو گیا[1]،

بہرحال فلسفہ و منطق کی جو موجودہ شکل ہے وہ امام صاحب کی قائم کی ہوئی ہی، اور یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ امام صاحب کا کارنامہ صرف یہ ہے کہ اُنھوں نے فلسفہ کی شکل کو ہر ممکن طریقہ سے بگاڑا ہی، بلکہ اُن کا اس سے بڑا کارنامہ یہ ہی کہ اُنھوں نے جہاں تک ممکن ہو سکا ہی، فلسفہ کی تائید کی ہے، لیکن اسی کے ساتھ وہ حکمائے قدیم کے بالکل مقلد بھی نہ تھے، اس لئے تائید کے ساتھ فلسفہ کی تردید بھی کی ہی، چنانچہ جو شخص ان کی کتاب مباحث مشرقیہ کو پڑھے گا اس کو صاف نظر آجائیگا کہ اُنھوں نے سب سے پہلے فلسفہ کی دیوار کو جہاں تک ممکن ہو سکا ہے، مضبوط بنیاد پر قائم کیا ہے، اس کے بعد اس کے انہدام کی کوشش کی ہے، مثلاً مباحث مشرقیہ میں ہیولیٰ کے اثبات پر پہلے دو دلیلیں قائم کی ہیں، اور ان پر اعتراضات کئے ہیں، پھر تیسری دلیل خود قائم کی ہی، اور لکھا ہی کہ تیسری دلیل ان کی تائید میں ہم نے خود بہ تکلف ایجاد کی ہی، اس دلیل کے بعد لکھا ہے کہ "میں نے اسکو بہت سے ذہین اشخاص کے سامنے پیش کیا، لیکن اُنھوں نے اُس کے کسی مقدمہ پر اعتراض نہیں کیا، لیکن اس کے بعد خود مجھ کو اس کے بعض مقدمات میں شک پیدا ہوا، اس شک کے بعد لکھتے ہیں کہ اب تک ہم ہیولیٰ کے وجود پر کوئی دلیل نہیں قائم کر سکے ہیں، اس لئے جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے ان سب سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اب تک ہمکو اس بات پر کوئی دلیل نہیں مل سکی ہی کہ جسم ہیولیٰ اور صورت سے مرکب ہے، اسلئے ہم اس کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے، لیکن یہ بات کہ اس کی نفی کی بھی کوئی دلیل ہے، اس کی بحث اس کے بعد کی فصلوں میں آئے گی، غرض امام صاحب کا طرز یہ ہے کہ وہ ہر

---

[1] مقدمۂ ابن خلدون ص۴۱۳،

مسئلہ پر مخالف و موافق دونوں قسم کے دلائل کا ڈھیر لگا دیتے ہیں اور ساتھ ساتھ اُن دلائل پر تنقید کرتے جاتے ہیں، فلسفہ کے تمام مسائل پر وہ اسی طرح بحث کرتے ہیں، اور اس میں اس بات کی تفریق نہیں کرتے کہ کون سے مسائل مذہب کے مخالف ہیں، اور کون سے مسائل مذہب کے موافق ہیں، امام صاحب سے پہلے مسلمانوں میں جو حکمار و فلاسفہ گذرے ہیں، یعنی یعقوب کندی، فارابی، شیخ بوعلی سینا، وہ اگرچہ خود ارسطو و افلاطون کے ہمپایہ تھے، لیکن ان میں سے کسی نے فلسفہ کے مسائل پر چون وچرا نہیں کی تھی، متکلمین نے بے شبہہ مذہبی خیال کی وجہ سے فلسفہ کے مسائل سے اختلاف کیا تھا، لیکن ان لوگوں کو صرف ان مسائل سے اختلاف تھا جو اسلام کے مخالف تھے، یہ طرز بالکل نہ تھا کہ عام طور پر یونانی فلسفہ کے مسائل لئے جائیں اور ساتھ ساتھ اُن پر تنقید بھی ہوتی جائے، امام صاحب سے پہلے امام غزالی نے فلسفہ کے چند مسائل پر تنقید کی، پھر شیخ الاشراق اور ابوالبرکات بغدادی نے فلسفۂ ارسطو کے مسائل پر اعتراضات کئے، لیکن ان بزرگوں کی کوششیں محدود تھیں، امام رازی پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس طرز میں وسعت پیدا کی اور فلسفہ کے ہر قسم کے مسائل پر خواہ وہ مذہب کے موافق ہوں یا مخالف عام طور پر اعتراض کیا، اور اس کے بعد ایک عام شاہراہ قائم ہوگئی اور متاخرین نے اسی طرز پر فلسفیانہ کتابیں لکھیں،

امام صاحب کے نزدیک فلسفہ کا جو ذخیرہ تھا وہ مختلف خیالات کا مجموعہ تھا، اس مجموعہ میں کچھ دلائل تو وہ تھے جن کو خود یونانیوں نے ایجاد کیا تھا، اور متکلمین کو صرف انہی مسائل سے بحث تھی، لیکن حکماے اسلام نے اسلامی عقائد کو پیش نظر رکھ کر اس میں اور بھی بہت سے مسائل کا اضافہ کر دیا تھا، مثلاً نبوت، معجزہ، کرامت، وحی، الہام اور رویا وغیرہ کے متعلق فلسفہ کی کتابوں میں جو بحثیں ہیں، وہ حکماے اسلام کی ایجاد ہیں، فلاسفۂ یونان نے ان مسائل پر کچھ نہیں لکھا ہے، حکماے اسلام میں اس قسم کے مسائل پر سب سے جامع اور اچھوتی بحث

شیخ بو علی سینا نے کی تھی، چنانچہ شیخ نے نمط تاسع مین مقامات عارفین پر جو کچھ لکھا ہے اوس کے متعلق خود امام صاحب لکھتے ہیں کہ "اس کتاب کا یہ باب سب سے زیادہ اہم ہے کیونکہ شیخ نے صوفیہ کے علوم کو اس انداز سے مرتب کیا ہے کہ اس سے پہلے اور اسکے بعد کسی نے ان کو اس انداز سے مرتب نہین کیا"[1] لیکن باوجود اس اعتراف کے امام صاحب ان مین بہت سے مسائل کو فلسفیانہ اصول کے مطابق صحیح نہین سمجھتے، مثلاً شیخ نے اشارات میں نبی کی ضرورت پر جو دلیل قائم کی ہے، اسکا خلاصہ امام صاحب کے الفاظ مین یہ ہے کہ "جبتک چند اشخاص ایک جگہ قیام کر کے زندگی نہ بسر کرین انکی معیشت مکمل نہیں ہوسکتی لیکن ان اشخاص کا اجتماع شریعت کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا، اور شریعت کا وجود شارع کے بغیر نہیں ہوسکتا، پھر اس شارع کے پاس ایسے معجزات ہونے چاہئین جن سے یہ ثابت ہو کہ وہ شریعت کو خدا کے پاس سے لایا ہے، اور اس شریعت کو مختلف قسم کی عبادات پر مشتمل ہونا چاہیئے، غرض نبی کی ضرورت پانچ مقدمات سے ثابت ہوتی ہے،

(۱) ایک تو یہ کہ انسان اپنی معیشت کی اصلاح اجتماع کے بغیر نہین کرسکتا کیونکہ انسان کی غذا لباس اور مکان سب مصنوعی چیزین ہین، قدرتی نہیں ہیں، لیکن ایک شخص ان تمام چیزون کو نہیں بناسکتا بلکہ ایک بہت بڑی جماعت کی ضرورت ہے، جن مین بعض لوگ کاشتکاری کرین اور بعض لوگ کاشتکاری کے آلات بنائین، اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ انسان مدنی الطبع ہے۔

(۲) دوسرا یہ کہ یہ اجتماع شریعت کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا، کیونکہ ہر شخص تمام فوائد کو خود حاصل کرنا چاہے گا، اس لئے اگر ایک ہی شخص کو تمام جسمانی فوائد حاصل ہوجائیں تو دوسرا شخص ان سے محروم رہے گا، اور اس سے اس کے دل میں عداوت پیدا ہوگی، اس سے معلوم ہوا کہ اجتماع انسانی جھگڑوں کے پیدا ہونے کا سبب ہے، ایسی حالت میں اگر کوئی شریعت نہ ہوگی تو نہایت فتنہ و فساد پیدا ہوجائے گا،

---

[1] شرح اشارات جلد دوم صفحہ ۱۰۰

(۳) تیسرا یہ کہ ایک شارع کا وجود ضروری ہے، کیونکہ اگر ایک ایسے شخص کا وجود نہ ہو جو شریعت کو بیان کرے تو اس شریعت ہی کا وجود نہ ہوگا،

(۴) چوتھے یہ کہ اس شارع میں ایسی مخصوص باتیں ہونی ضرور ہیں جن سے یہ ثابت ہو کہ وہ اس شریعت کو خدا کے پاس سے لایا ہے، ورنہ اس کے قول کو دوسرے کے قول پر کوئی ترجیح نہ ہوگی، اور چونکہ اس بات کا علم کہ یہ معجزے اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ خدا اس کی تصدیق کرتا ہے اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک یہ علم نہ ہو کہ ایک خدا موجود ہے جو عذاب و ثواب دیتا ہے، اس لئے ان چیزوں کے علم کا حاصل کرنا بھی ضروری ہے، کیونکہ مصالح عالم کے انضباط میں شارع کا بہترین اصول ثواب کی ترغیب دینا اور عذاب سے ڈرانا ہے اس لئے عذاب و ثواب دینے والے خدا کا علم ضروری ہے،

(۵) پانچویں یہ کہ اس شریعت کو عبادات پر شامل ہونا ضروری ہے، کیونکہ مصلحت عالم کے لئے چونکہ خدا کا علم ضروری ہے اس لئے ایک ایسی چیز ہونی چاہئے جو لوگوں کو اس معبود کو یاد دلاتی ہے، اور یہ چیز صرف عبادات بدنیہ ہے، اس کے ساتھ حکمت کا اقتضا یہ ہے کہ یہ عبادات واجب ہوں اور ان کے بار بار کرنے سے یہ یاد دہانی قائم رہے، مثلاً جب نماز رات دن میں پانچ بار فرض ہوگی تو وہ نماز پڑھنے والے کو لازمی طور پر پانچ بار معبود کو یاد دلائیگی، اور یہ تکرار اس یاد دہانی کے استحکام کا سبب ہو جائیگی، اور اس طریقہ سے یہ عادلانہ شریعت جو حیات انسانی کے بقار کا سبب ہے، ہمیشہ قائم رہے گی، یہ تو ان عبادات کا دنیوی فائدہ ہے، اور آخرت میں اس کا فائدہ بہت بڑا ثواب ہے، امام صاحب کو شرعی حیثیت سے ان باتوں پر کوئی اعتراض نہیں ہے، البتہ ان کے نزدیک فلسفہ کی کتابوں میں جو باتیں فلسفیانہ طریقہ پر ثابت کی جائیں ان کو فلاسفہ کے اصول کے مطابق ثابت کرنا چاہئے، اور نبوت کے اثبات کا یہ طریقہ فلاسفہ کے اصول کے مطابق نہیں ہے، کیونکہ پیغمبر کی ضرورت کے یہ معنی تو نہیں ہو سکتے

کہ وہ واجب لذاتہ ہے، البتہ اگر معتزلہ کے خیال کے مطابق اس کے یہ معنی ہیں کہ خدا پر اس کا پیدا کرنا واجب ہے، تو یہ فلسفیون کا قول نہیں ہے، اور اگر اس سے یہ مراد ہے کہ پیغمبر کا وجود چونکہ نظام عالم کا سبب ہے اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ خدا تمام کمال اور تمام بھلائیون کی علت ہے اس لئے ضروری ہے کہ وہ اس پیغمبر کی بھی علت ہو، تو یہ بھی صحیح نہین، کیونکہ ہمارے نزدیک یہ ضروری نہین ہے کہ جو چیز اس عالم کے لئے مفید ہو اس کا اس عالم میں موجود ہونا بھی ضروری ہے، کیونکہ اگر اہل دنیا کو تمام فضائل کا مجموعہ بنا کر پیدا کیا جاتا تو یہ بات ان کی موجودہ حالت سے بہتر اور مفید ہوتی، حالانکہ اہل دنیا کو اس طریقہ سے پیدا نہیں کیا گیا، اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ پیغمبر کا وجود اگرچہ اس کے عدم سے زیادہ مفید ہے، لیکن اس کے ساتھ اس کا وجود ضروری نہین ہے، اور اگر اس کے کوئی اور معنی ہیں تو اس کو بیان کرنا چاہئے تاکہ ہم اس کے صحت و فساد پر بحث کرین،

یہ بات بھی کہ "پیغمبر کے لئے ایسے معجزات کی ضرورت ہے جن سے یہ ثابت ہو کہ وہ اس شریعت کو خدا کے پاس سے لایا ہے" فلسفیون کے اصول کے مطابق نہیں ہے، کیونکہ شیخ نے خود نمط عاشر مین بیان کیا ہے کہ پیغمبر کو معجزات پر اس لئے قدرت حاصل ہوتی ہے کہ اسکے نفس مین ایسی قوت موجود ہوتی ہے جو ان معجزات پر اس کو قادر کر دیتی ہے، لیکن وہ یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ یہ قوت ایک چھوٹے جادوگر کی روح مین بھی ہوتی ہے، اس لئے ایک سچے پیغمبر اور ایک جھوٹے جادوگر مین صرف یہ فرق ہے کہ پیغمبر نیکیون کی اور جادوگر برائیون کی دعوت دیتا ہے، اور نیکی اور بدی کا فرق محض عقل سے معلوم ہو سکتا ہے اور جب یہ حالت ہے تو پیغمبر اور غیر پیغمبر مین عقل بذات خود فرق کر سکتی ہے، اس کے لئے معجزات کی ضرورت نہین، اس کے علاوہ معجزات پیغمبر کی صداقت پر اس لئے دلالت کرتے ہین کہ وہ خود خداوند تعالیٰ کی تصدیق کے قائم مقام ہوتے ہین، اور یہ اس بات پر مبنی ہے کہ خداوند تعالیٰ جزئیات کا عالم اور فاعل بالاختیار ہے، لیکن فلاسفہ اس کا انکار کرتے ہین،

اس لئے یہ بات ان کے مذہب کے مطابق کیونکر صحیح ہو سکتی ہے، اسی طرح لوگوں کو گناہوں سے باز رکھنا فلاسفہ کے قول کے مطابق صحیح نہین ہے، کیونکہ گناہ گار کے عذاب کے متعلق ان کے قول کا حاصل یہ ہے کہ جن روحوں کا میلان دنیا اور تعلقاتِ دنیا کی طرف بہت زیادہ ہوتا ہے، جب وہ اپنے جسموں سے الگ ہوتی ہین تو انکی مشتاق ہوتی ہیں، لیکن وہ ان کو حاصل نہیں کرسکتیں، اسلئے عذاب میں مبتلا ہوجاتی ہیں، لیکن اگر ہم یہ فرض کریں کہ ایک انسان نے بہت سے لوگوں کو قتل کردیا اور انکے مال کو لوٹ لیا پھر اسکو بھول گیا اور اسی حالت میں مرگیا تو اسکی وجہ سے اس پر عذاب نہ ہوگا، کیونکہ عذاب شوق کیوجہ سے ہوتا ہے، اور ہم نے یہ فرض کرلیا ہے کہ اس کی روح میں یہ شوق نہیں پایا جاتا، اس سے معلوم ہوا کہ یہ مسئلہ فلاسفہ کے اصول کے مطابق صحیح نہیں ہے، ان اعتراضات کے بعد امام صاحب لکھتے ہیں،

واعلم ان السبب فی وقوع امثال	جاننا چاہئے کہ اس قسم کی باتین فلسفیون کی زبان
ھٰذہ الکلمات فی السنۃ الفلاسفۃ	پر اس لئے آئین کہ فلسفیون کے مذہب اور
انھم کرھوا التصریح بملخص مذھبھم	اعتقاد کی تصریح کو انھون نے پسند نہین کیا اسلئے
ومحصل معتقدھم فارادوا	اس قسم کے الفاظ کو بول کر مسلمانون سے بہت مشابہت
تشبہ بالمسلمین فی اطلاق	پیدا کرنی چاہی اور محقق پر یہ پوشیدہ نہین کہ
ھٰذہ الالفاظ والمحقق لایخفی	ان مین کوئی چیز ان کے اصول کے مطابق
علیہ ان شیأمنھا لایستقیم علی	صحیح نہین ۔
اصولھم	(باقی)

نٹشے

مشہور جرمن فلاسفر فریڈرک نٹشے کی سوانح عمری اور اس کے افکار وخیالات اور تصانیف پر بحث وتبصرہ ہے، قیمت ۱۲ر ضخامت ۱۰۲ صفحے، منیجر

ابن جریر طبری

از مولوی محمد اویس صاحب نگرامی ندوی

(۲)

تفسیر ابن جریر اور نحو و صرف عربی زبان کے صرفی و نحوی قواعد نزولِ قرآن کے بعد مرتب ہوئے ہیں، ان قواعد کی ترتیب اہلِ زبان کے استعمال کے استقرار سے ہوئی ہی، لیکن اس استقرار کے باوجود استعمالاتِ عرب میں ایسی ترکیبیں اور اعراب بھی ملتے ہیں کہ یہ قوانین مدونہ جن کے خلاف پڑتے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ ترکیب و اعراب تو غلط نہیں ہو سکتے، اس لئے کہ یہ اہل زبان کا استعمال ہی، جو کچھ قصور ہوگا وہ یا تو ان قواعد مدونہ کا کہ ان میں استقرائے تام سے کام نہیں لیا گیا، یا استقرائے تام تو ہوا لیکن بعض ترکیبیں اس استقرار سے پھر بھی الگ رہیں،

قرآن پاک کا نزول عرب کی فصیح و بلیغ زبان اور مذاق عرب پر ہوا ہی، اگر اس میں کوئی جملہ، کوئی ترکیب یا کوئی اعراب استعمالاتِ عرب کے خلاف ہوتا تو ظاہر ہے کہ وہ عرب جنھوں نے قرآن کے مقابلہ مین جان و مال کی بازی لگا دی تھی وہ اس پر اعتراض کرنے اور اس کا مضحکہ اُڑانے سے باز نہ رہتے، حالانکہ ان کو اسی قرآن کی تحدی بھی کیجا چکی تھی لیکن ہم کو پوری تاریخ میں اس قسم کے اعتراض یا استہزار کی کوئی صحیح روایت نہیں ملتی،

غیر عرب مسلمانوں کو فہم قرآن کے لئے ان ہی قواعد مدونہ سے کام پڑتا تھا، وہ قرآن کو انہی اصول پر منطبق دیکھنا چاہتے تھے اگر کہیں کوئی ترکیب یا اعراب ان کو مدونہ اصول و قواعد کے

خلاف نظر آتا تو شبہہ ہوتا کہ یہ نحو وصرف کے قواعد کے خلاف ہے، حالانکہ جیسا ہم نے اوپر کہا کہ غلطی ان تراکیب و اعراب کی نہیں بلکہ عدم استقرار تام کی ہے، یا اسکی غلطی ہی کہ انہی قواعد پر استعمالات عرب کو منحصر سمجھ لیا گیا ہی،

مفسر ابن جریر کے زمانہ میں یہ مشکلات نحویہ پیش آچکی تھیں، اُنھوں نے اپنی تفسیر میں ان پر تفصیل سے بحث کی، اور اس کا حل اس طرح کیا، کہ آیت متعلقہ میں علمائے نحو وصرف کے مذاہب بیان کئے اور اس میں علی بن حمزہ کسائی، یحییٰ بن زیاد الفراء، ابو الحسن اخفش، ابو علی قطرب کی کتابوں سے نفع اٹھایا،[۵] پھر انھوں نے یا تو ان مذاہب میں سے کسی ایک مذہب کو ترجیح دیا، اور اس ترجیح کو مدلل کیا، یا اس آیت کے متعلق دوسرے استعمالات عرب کو بطور نظیر کے پیش کیا، اور اس طرح مذاق عرب پر اس مشکل کا خاتمہ کیا،

مثال کے لئے ایک آیت پیش کی جاتی ہے،

سورۂ مومنون رکوع ۴ میں ہی کہ بعض مستحقین عذاب جب عذاب میں گرفتار ہوں گے تو ان سے کہا جائیگا،

قَدْ كَانَتْ اٰيَاتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ	میری آیتیں تم کو پڑھ کر سنائی جایا کرتی تھیں
فَكُنْتُمْ عَلٰى اَعْقَابِكُمْ تَنْكِصُوْنَ	تو تم اُلٹے پاؤں بھاگتے تھے تکبر کرتے ہوئے،
مُسْتَكْبِرِيْنَ بِهٖ سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ	قرآن کا مشغلہ بناتے ہوئے بیہودہ بکتے ہوئے

اس آیت میں موقع شبہہ یہ ہے کہ (سامرًا) کو (مستکبرین) کی طرح جمع ہونا چاہئے واحد کیوں لائے؟ ابن جریر لکھتے ہیں کہ یہاں (سمر) بمعنی وقت کے ہے یعنی تم لوگ رات کو بیہودہ بکتے ہو، اسی لئے اسکو واحد لائے ہیں، اس کے بعد اپنے اس قول پر کلام عرب سے سند پیش کرکے اس کو مدلل کیا ہی، اور اسکی

---

[۵] معجم الادبا ج ۶ ص ۴۴۱،

تائید میں تابعینؒ کے اقوال نقل کئے ہیں،

ابن جریر کی تفسیر کے نحوی پہلو کے متعلق یہ جان لینا ضروری ہے کہ جس وقت یہ تفسیر پوری ہوئی ہے بڑے بڑے علمائے نحو مثلاً ابو العباس احمد بن یحییٰ ثعلب، ابو العباس محمد بن یزید المبرد، ابو جعفر رستمی، ابو حسن ابن کیسان، ابو اسحاق الزجاج وغیرہ نے اس کو دیکھا کسی نے اختلاف نہیں کیا، بلکہ ان میں سے ہر شخص نے اس کی تعریف و توصیف کی،[۱]

تفسیر ابن جریر اور فقہ | ابن جریر کی تفسیر کے وہ حصے بھی بہت اہم ہیں جہاں اُنھوں نے آیات سے مسائل فقہیہ کا استنباط کیا ہے، وہ یہ خود مجتہد مستقل تھے، اور دوسرے مجتہدین کے مذاہب سے پوری طرح واقف تھے، اس لئے جو کچھ کہتے ہیں اس میں ایک خاص مجتہدانہ شان ہوتی ہے،

مثال کے طور پر ہم آیت وصیت کو پیش کرتے ہیں، سورۂ بقرہ میں ہے،

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ	تم پر فرض کیا جاتا ہے جب کسی کی موت نزدیک
الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ	معلوم ہونے لگے، بشرطیکہ کچھ مال بھی ترکہ میں
لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ	چھوڑا ہو تو والدین اور اقارب کے لئے معقول
بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى	طور پر کچھ نہ کچھ بتلا دیا جائے، جن کو خدا کا خوف
الْمُتَّقِينَ،	ہے، ان کے ذمہ یہ ضروری ہے،

اس آیت کا منشا یہ ہے کہ مرنے والے پر، اگر اس کے پاس کچھ دولت ہو تو وصیت واجب ہے عام مفسرین کا خیال ہے کہ یہ آیت سورۂ نساء کی اس آیت سے منسوخ ہے جس میں وارثوں کے حقوق خود اللہ تبارک و تعالیٰ نے مقرر فرما دیئے ہیں، ابن جریر کو اس نسخ سے اختلاف ہے وہ کہتے ہیں کہ نسخ تو اس حالت میں جائز ہوگا جب دونوں آیتوں میں جمع ممکن نہ ہو اور یہاں یہ صورت نہیں ہے، دونوں آیتوں

---

[۱] معجم الادباء ج ۶ ص ۴۳۳،

یں اس طرح جمع ممکن ہے کہ آیتِ میراث کو عام وارثوں کے حق میں رکھا جائے، اور آیتِ وصیت کو ان ورثہ کے حق میں رکھا جائے جن کو قانوناً حقِ میراث نہیں پہنچتا ہے لیکن وہ ضرورت مند ہیں،

ابن جریر کی اس رائے کو ہم حضرت الاستاذ علامہ سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہ کی تقریر کے مطابق اس طرح بیان کر سکتے ہیں کہ آیاتِ میراث کا تعلق اُن مسلمانوں سے ہے جو ایک عائلی نظام رکھتے ہیں، یعنی باپ، بیٹا، بھائی، بیوی، بہن الغرض تمام ورثہ مسلمان ہیں، اس صورت میں بیشک آیتِ میراث کے احکام جاری ہوں گے، لیکن اگر کسی مسلمان کے پاس نظام عائلی نہ ہو، مثلاً باپ مسلمان ہی، بیٹا مسلمان نہیں ہے، یا بیٹا مسلمان ہے، باپ مسلمان نہیں ہی، اور یہ لوگ ضرورت مند بھی ہیں تو ان لوگوں کے لئے آیتِ وصیت کی رو سے ثلث مال میں وصیت کی جاسکتی ہی،

قطع نظر اس غیر عائلی نظام سے خود عائلی نظام میں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ قریبی عزیز حقِ وراثت سے محروم ہو جاتے ہیں، مثلاً محجوب لارث وغیرہ، شریعت نے ان کے لئے آیتِ وصیت کا نظام باقی رکھا ہی،

ابن جریر کو وجوبِ وصیت پر اس قدر اصرار ہے کہ فرماتے ہیں، کہ جس طرح قدرت کے باوجود روزہ کا چھوڑنے والا گنہگار ہوگا، اسی طرح قدرت کے باوجود وصیت سے غفلت کرنیوالا بھی عاصی ہوگا۱،

تفسیر ابن جریر اور علم کلام | مسائل فقہیہ کی طرح ابن جریر نے آیاتِ قرآن سے کلامی مسائل کا بھی استنباط کیا ہی، جن کے پڑھنے کے بعد ابن جریر کی متکلمانہ حیثیت کا صحیح اندازہ ہوتا ہی،

ان کے بعض استنباطات تو اس قدر اہم ہیں کہ آج تک وہ مسلّم چلے آرہے ہیں، مثلاً حضرت سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج جسمانی کے متعلق قرآن پاک سے اُنھوں نے جو دلیل قائم کی ہی، اسکو ایسا حسنِ قبول حاصل ہوا کہ ان کے بعد سے امام رازی تک عام اہلِ علم اس کو نقل کرتے چلے آتے ہیں،

وہ فرماتے ہیں کہ آیتِ اسرا میں قرآن نے "بعبدہٖ" کا لفظ استعمال کیا ہی،

---

۱ ابن جریر ج ۲ صفحہ ۶۶،

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا ۔

وہ پاک ذات ہے جو اپنے بندہ (محمد) کو شب کے وقت مسجد حرام یعنی (مسجد کعبہ) سے مسجد اقصی (یعنی بیت المقدس) تک لے گئی،

اور عبد کا لفظ بول کر محض روح مراد لینا کسی طرح جائز نہیں، اس لئے یہ تسلیم کرنا ضروری ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج جسمانی ہوئی تھی،[۱]

اس سلسلہ میں ابن جریر کی دقت نظر کے لئے ایک دوسری آیت پر غور فرمایئے،

سورۂ نساء میں ہے،

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِاٰیٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِیْهِمْ نَارًا ؕ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَیْرَهَا لِیَذُوْقُوا الْعَذَابَ

(نساء-۸)

بیشک جو لوگ ہماری آیات کے منکر ہو گئے ہم ان کو عنقریب ایک سخت آگ میں داخل کریں گے، جب ایک دفعہ ان کی کھال جل چکے گی تو ہم اسکی پہلی کھال کی جگہ فوراً دوسری کھال پیدا کر دیں گے تاکہ عذاب ۲

ابن جریر اس آیت کے ماتحت ایک سوال قائم کرتے ہیں کہ اگر یہ جائز قرار دیا جائے کہ یہ نیا دوسری جسم بدل دئے جائیں گے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ قیامت میں عذاب ان اجسام پر نہ ہوگا، جو دنیا میں کفر و معصیت کے مرتکب ہوئے تھے، بلکہ ان کے سوا دوسرے اجسام ہوں گے؟

ابن جریر نے اس کے مختلف جوابات نقل کئے ہیں، پھر اپنے مختار مسلک کو یوں بیان کیا ہے، کہ عذاب تو اصل میں انسان کو پہنچتا ہے نہ کہ گوشت و پوست کو، گوشت و پوست تو انسان کے عذاب کے لئے واسطہ اور ذریعہ ہیں، فی نفسہٖ لذت و الم میں ان کو دخل نہیں ہے، پس اگر ہر لحظہ

---

[۱] ابن جریر ج ۱۵ ص ۱۳،

اللہ تبارک و تعالیٰ بے شمار اجسام دوزخ میں بدلتا رہے تو اس میں کوئی اشکال نہیں ہے، اس لئے کہ انسان تو بہر حال تکلیف اٹھا رہا ہے، اس تکلیف کے وسائط و ذرائع البتہ بدل رہے ہیں[۱]،

غور فرمائیے ابن جریر نہ صرف یہ کہ روحانی عذاب کے قائل اور اسی جسم پر عذاب کو منحصر جانتے ہیں، بلکہ اس آیت کے ماتحت ایک درمیانی مسلک نکالتے ہیں، کہ اصل عذاب روح پر ہے لیکن اس عذاب کے لئے جسمانی واسطہ ضروری ہے، اور اس جسمانی واسطہ کا تغیر و تبدل انسان کے درد دکھ کے لئے کچھ مضر نہیں،

ان استنباطات کے سوا ابن جریر نے تفسیر میں فرقِ ضالہ کا رد بھی کیا ہے، چنانچہ قدریہ، جہمیہ، معتزلہ، رافضہ کی تردید جا بجا موجود ہے،

دوسرے مباحث مذکورۂ بالا اہم مباحث کے سوا اور قابلِ قدر چیزیں بھی اس تفسیری ذخیرہ میں موجود ہیں، مثلاً مفردات قرآن کی بحث، الفاظ کی لغوی تفسیر، ان کے مصادر، تثنیہ، جمع اور واحد کا ذکر، حضرات صحابہ و تابعین سے الفاظ کی جو تفسیر منقول تھی ان کا بیان، نیز کلامِ عرب کے بکثرت استشہادات خود ابن جریر کا قابلِ رشک فصیح و بلیغ انداز بیان،

الغرض ابن جریر کی تفسیر کو محض روایات کا مجموعہ سمجھنا محض ناواقفیت ہے،

تفسیر کا زمانہ تصنیف اُسکی تلخیص، ترجمے اور اُس کی اشاعت ابن جریر کی تفسیر کا زمانہ تصنیف ۲۸۳ھ سے ۲۹۰ھ تک ہے[۲]، اس کو انھوں نے پہلے تیس ہزار صفحات میں لکھنا چاہا تھا، لیکن تلامذہ کی درخواست پر مختصر کر دیا، اور تین ہزار صفحات پر لکھا[۳] خود تفسیر میں جا بجا کہتے ہیں کہ میں طوالت سے بچنے کے لئے اختصار سے کام لے رہا ہوں[۴]،

ابن ندیم کا بیان ہے کہ بعض لوگوں نے ان کی تفسیر کا اختصار بھی کیا ہے، ان میں سے ایک شخص ابو بکر بن الاخشید بھی ہیں[۵]،

---

[۱] ابن جریر ج ۵ ص ۸۵ [۲] خطیب ج ۲ ص ۱۶۳ [۳] ایضاً ص ۱۶۳ [۴] تفسیر ابن جریر ج ۵ ص ۹۸ [۵] فہرست ابن ندیم ص ۲۳۶

کشف الظنون میں ہے کہ بعض متاخرین نے منصور بن نوح سامانی کے لئے اس کا فارسی ترجمہ بھی کیا ہے[۱]، اس ترجمہ یا تلخیص کے کامل نسخے کسی کتب خانہ میں نہیں پائے جاتے ہیں، البتہ اس کے اجزاء دو ایک مشہور کتب خانوں میں موجود ہیں، جن میں سے ایک کا حوالہ پیرس کی لائبریری (ببلوتیک نیشال) کی فہرست مرتبہ ڈاکٹر بلوشے میں پایا جاتا ہے، اس کے مقدمہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ غالباً دنیائے اسلام میں قرآن کی تفسیر کو عربی سے فارسی میں منتقل کرنے کی پہلی کوشش تھی، ذیل کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ علمائے ماوراء النہر کے فتویٰ کے بعد منصور بن نوح سامانی نے اس کتاب کے ترجمہ یا تلخیص کا انتظام کرایا،

"و ایں کتاب تفسیر بزرگ است از روایت محمد بن جریر الطبری ترجمہ کردہ بزبان پارسی و دری راہ راست و ایں کتاب را بیاوردند از بغداد چہل مصحف بود ایں کتاب نبشتہ بہ زبان تازی و بہ اسنادہائے دراز بود و بیاوردند سوئے امیر سید مظفر منصور بن نوح بن نصر بن احمد ابن اسمٰعیل و چناں خواست کہ مریں را ترجمہ کنند بہ زبان پارسی پس علماء ماوراء النہر را گرد کرد و از ایشاں فتویٰ کرد کہ روا باشد کہ ایں کتاب را بہ زبان پارسی گردانیم گفتند روا باشد۔۔۔ تفسیر قرآن بپارسی مر آں کسے راکہ او تازی نہ داند"[۲]

بہر حال یہ نادرۂ روزگار تفسیر پورے ایک ہزار گیارہ برس کے بعد پہلی بار ۱۹۰۱ء میں مطبعہ میمنہ مصر سے طبع ہوئی، اسکے بعد مطبع امیریہ بولاق نے تیس جلدوں میں شائع کیا،

ابن جریر اور حدیث | ابن جریر کے علم حدیث میں مرتبہ کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ محدثین کے تذکروں میں ان کو الامام العلم الفرد الحافظ[۳] کے القاب سے یاد کیا جاتا ہے،

نووی لکھتے ہیں کہ ان کا شمار ترمذی اور نسائی کے طبقہ میں ہے، اور ان کے مشائخ وہی

---

[۱] کشف الظنون ج ۱ ص ۳۰۳ [۲] معارف نومبر ۱۹۳۲ء ص ۳۶۱ [۳] تذکرۃ الحفاظ ذہبی ج ۲ ص ۲۷۰

ہیں جو بخاری اور مسلم کے مشائخ ہیں[۱]، ذہبی کہتے ہیں کہ میں نے ابن جریر کے طرق حدیث پر ایک کتاب دیکھی تو ان کے کثرت طرق کو دیکھ کر حیرت زدہ ہوگیا[۲]،

حدیث میں اُن کی اہم ترین کتاب تہذیب الآثار ہے، جس کے متعلق ذہبی کہتے ہیں "وہو من عجائب کتبہ" خطیب کا بیان ہے کہ میں نے ایسی کتاب نہیں دیکھی، اس کتاب کو حضرت ابوبکر صدیق رضی کی مرویات سے شروع کیا ہے، طریقہ یہ ہے کہ ہر شخص کی مرویات کو نقل کرنے کے بعد احادیث کے طرق اور علل پر کلام کرتے ہیں، پھر اس سے مسائل کا استنباط کرتے ہیں، علماء کے اختلافات بیان کرتے ہیں، دلائل اور لغت سے بحث کرتے ہیں[۳]،

افسوس کہ یہ کتاب ناتمام رہی، اس نادر کتاب کے بعض حصے استانبول کے کتب خانہ میں موجود ہیں[۴]، حدیث کے سلسلہ میں یاقوت نے معجم الادبار میں ابن جریر کی ایک مسند کا بھی ذکر کیا ہے، مگر اسکی تفصیل معلوم نہیں ہے، کتب حدیث کے ضمن میں ان کی چار کتابیں اور ذکر کیجا سکتی ہیں، جن میں سے تین اگرچہ مناظرانہ طور پر لکھی گئی ہیں، تاہم حدیث ہی سے متعلق ہیں،

(۱) ایک کتاب فضائل حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما میں ہے، جو روافض کے رد میں تھی،

(۲) دوسری کتاب حضرت علیؓ کے فضائل پر تھی، اس کی وجہ تصنیف یہ ہے کہ ابن جریر کو معلوم ہوا کہ ابن ابی داؤد حدیث "غدیر خم" پر معترض ہیں، اسی کے جواب میں اس کتاب کو لکھا، اور اس حدیث کے کثرت طرق کو بیان کیا۔

(۳) تیسری کتاب فضائل بنی عباس پر تھی،

(۴) چوتھی کتاب عبارۃ الرؤیا رہے[۵]،

---

[۱] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۷۹ [۲] ایضاً ص ۷۲ [۳] ایضاً ص ۲۰ [۴] تاریخ آداب اللغۃ العربیہ ج ۲ ص ۱۹۹،

[۵] معجم الادبار ج ۶ ص ۴۵۲،

ان میں سے ہر کتاب ناتمام رہی،

ابن جریر اور فقہ | فقہ میں ابن جریر کا شمار اُن کبار فقہار میں ہے جو مجتہد مطلق اور صاحب مذہب تھے، ابو العباس ابن سریج کہتے تھے کہ محمد بن جریر طبری فقیہ العالم ہیں[1]، ان کا مذہب پانچویں صدی ہجری کے نصف تک معمول بہ رہا ہے، اُنھوں نے فقہ شافعی مصر میں ربیع بن سلیمان سے اور فقہ مالکی یونس بن عبد الاعلیٰ اور بنی عبد الحکم سے پڑھی، اہلِ عراق کی فقہ رَے میں ابو مقاتل سے حاصل کی[2]، بغداد میں دس برس تک فقہ شافعی کے موافق فتویٰ دیتے رہتے[3]، لیکن ان کے علم کی وسعت نے ان کو کسی مذہب کا پابند نہ رکھا، بلکہ مجتہد کے درجہ پر پہنچا دیا، ان کی فقہ کے مشہور لوگوں میں سے علی بن عبد العزیز بن محمد دولابی، ابوبکر محمد بن احمد بن محمد بن ابی الثلج الکاتب، ابو الحسن احمد بن یحییٰ المنجم المتکلم، ابو الحسن الدقیقی الحلوانی، ابو الفرج المعافی بن زکریا النہروانی، ابو القاسم بن العراد، ابو الحسین بن یونس، ابوبکر بن کامل، ابو اسحاق ابراہیم بن حبیب السقطی الطبری وغیرہ قابلِ ذکر ہیں، ان میں ابو الفرج المعافی بن زکریا النہروانی فقہ طبری کے سب سے بڑے ماہر اور اس مذہب پر کثیر التصانیف تھے[4]، اور ان کے سوا مذکورۂ بالا لوگوں میں سے ابو الحسن احمد بن یحییٰ المتکلم نے فقہ طبری کے متعلق المدخل الیٰ مذہب الطبری و نصرتہ، اور کتاب الاجماع فی الفقہ علی مذہب الطبری کے نام سے دو کتابیں لکھیں، اور ابو الحسین ابن یونس نے مذہب طبری پر کتاب جامع الفقہ، کتاب الحیض، کتاب الشروط، کتاب الوقوف وغیرہ لکھیں[5]،

ابن جریر کی فقہی تصانیف | افسوس کہ دستِ بُردِ زمانہ نے اس جلیل القدر امام کی ایک کتاب کے سوا کوئی فقہی تصنیف ہم تک نہ پہونچنے دی، اس سلسلہ میں ہمارے پاس جو کچھ ہے، وہ ان کی کتابوں کے نام اور کسی قدر ان کے مضامین و عنوانات کا ذکر،

---

۱ طبقات شافعیہ سبکی ج ۲ ص ۱۳۵ و ص ۱۳۷ ۲ تاریخ التشریع الاسلامی ص ۲۰۴ ۳ طبقات سبکی ج ۲ ص ۱۳۷ ۴ تاریخ التشریع الاسلامی ص ۲۰۴ و فہرست ابن ندیم ص ۳۲۵ ۵ ابن ندیم ص ۳۲۶

ان کی فقہی تصانیف میں سب سے زیادہ مشہور کتاب اختلاف علماء الامصار فی احکام شرائع الاسلام ہے جس کے بعض حصے مصر میں چھپ گئے ہیں، اس کتاب کے متعلق خود ابن جریر کا قول تھا کہ کوئی فقیہ اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتا ہے، یہی اُن کی پہلی تصنیف بھی ہے، اس میں فقہاء کے اختلافات سے بحث کی گئی ہے، تین ہزار صفحات پر مشتمل تھی، اس کتاب پر جو ہنگامہ برپا ہوا تھا، اس کا ذکر پہلے آچکا ہے،

دوسری اہم کتاب لطیف القول فی احکام شرائع الاسلام ہے، یہ کتاب ڈھائی ہزار صفحات پر مشتمل تھی، اور ابن جریر کے متبعین کا مدار تھی، اس کے متعلق بھی ابن جریر کا قول تھا کہ اس سے کوئی فقیہ بے نیاز نہیں ہو سکتا!

ان دونوں کتابوں کے لئے اُنھوں نے الگ الگ غالباً بطور مقدمہ کے، دو کتابیں اور لکھی تھیں، چنانچہ اختلاف العلماء کے لئے جو رسالہ لکھا تھا وہ اگرچہ ناتمام رہا، مگر اس میں اجماع، اخبار آحاد وغیرہ پر بحث تھی، اسی طرح کتاب لطیف القول کے رسالہ میں اصول فقہ، اجماع، اخبار آحاد، مراسیل، ناسخ منسوخ، مجمل، مفسر وغیرہ کے مباحث تھے،

فقہ میں ان کی ایک اور اہم تصنیف بسیط القول فی احکام شرائع الاسلام ہے، اس کے لئے بھی انھوں نے مراتب العلماء کے نام سے بطور مقدمہ کے ایک کتاب لکھی، جس میں طلب علم اور تفقہ فی الدین کی ترغیب دلائی، فقہاء اور غیر فقہاء کی بحث کی،

ان کتابوں کے سوا اشلۃ العدول، آداب القضاء، مختصر مناسک الحج، مختصر الفرائض کے نام سے فقہی رسائل لکھے[۱]

سبکی کا بیان ہے کہ عباس بن حسن وزیر نے فقہ پر، ابن جریر سے ایک مختصر کی فرمائش کی، تو اُنھوں نے الخفیف فی احکام شرائع الاسلام تصنیف کی، یہ درحقیقت لطیف القول کا اختصار تھا

---

[۱] تمام حوالوں کے لئے دیکھو معجم الادباء ج ۶،

جو تقریباً چارسو صفحات پر مشتمل تھا۱؎، فقہ سے متعلق ان کی ایک اور کتاب ہے کتاب البیان عن اصول الاحکام، اس کا ذکر خود ابن جریر نے اپنی تفسیر میں آیت "والوالدات یرضعن اولادھن حولین کاملین" کے ضمن میں کیا ہے۲؎،

ابن جریر اور تاریخ | ابن جریر کو دنیا میں شہرت دوام بخشنے والی تفسیر کی طرح اُن کی تاریخ بھی ہے، تفسیر کی طرح یہ بھی چھ ہزار صفحات پر مشتمل تھی لیکن شاگردوں کی خواہش پر اس کو بھی مختصر کر دیا یہی مختصر تاریخ ہے جو اخبار الرسل والملوک کے نام سے اس وقت اہل علم کے پاس موجود ہے، ابتدائے آفرینش سے لیکر ۳۰۲ھ تک کے واقعات سند کے ساتھ اس میں مذکور ہیں، تفسیر کی طرح یہ تاریخ بھی بعد کے مورخین کے لئے مدار ہوگی،

اس تاریخ کے دو ذیل لکھے گئے، ایک ذیل عریب بن سعد الکاتب القرطبی کا ہے، جو ۲۹۲ھ سے ۳۲۰ھ تک کے حالات پر مشتمل ہے۳؎، دوسرا ذیل محمد بن عبد الملک ہمدانی متوفی ۵۲۱ھ کا ہے، جو ۴۸۷ھ تک کے حالات پر مشتمل ہے، اس کا ایک قلمی نسخہ پیرس کے کتب خانہ میں موجود ہے۴؎، صاحب کشف الظنون نے ابو محمد عبد اللہ بن محمد الفرغانی کے ایک ذیل کا ذکر کیا ہے۵؎، اور سبکی نے طبقات میں یاقوت نے معجم الادباء میں اسکے حوالہ سے واقعات بھی بیان کئے ہیں،

ابن جریر کی تاریخ کا اختصار بھی کیا گیا، اور اس کو حذفِ سند کے ساتھ لکھا گیا، اس سلسلہ میں ابن ندیم نے محمد بن سلیمان ہاشمی، ابو الحسین شمشاطی معلم کے نام لئے ہیں، ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے، کہ جن لوگوں نے ابن جریر کے بعد سے لیکر ہمارے اس زمانہ (۳۷۷ھ زمانہ تصنیف الفہرست) تک اسمیں الحاقات کئے ہیں، وہ قابلِ اعتماد نہیں ہیں، اسلئے کہ یہ لوگ صاحب علم وخبر نہ تھے۶؎،

۱؎ سبکی ج ۲ ص ۱۳۷ و معجم الادباء ج ۶ ۲؎ تفسیر ابن جریر ج ۲ ص ۳۴۲ ۳؎ معجم المطبوعات العربیہ ج ۲ ص ۱۲۳ ۴؎ تاریخ آداب اللغۃ العربیہ ج ۲ ص ۱۹۹ ۵؎ کشف الظنون ج ۱ ص ۲۲۸ ۶؎ ابن ندیم ص ۳۲۶،

حضرت شاہ عبد العزیز صاحب تحفہ اثنا عشریہ میں فرماتے ہیں:۔

"و ایں کتاب یعنی تاریخ کبیر بسیار عزیز الوجود است کم کسے را نسخۂ او میسر آمدہ آنچہ نزد مردم مشہور است مختصر او ست، کہ از محرفات سمساطی الشیعی است و بسبب حالہ انستار اللہ تعالیٰ، و مترجمین آں مختصر نیز اکثر شیعہ گذشتہ اند بس تحریف در تحریف دراں راہ یافتہ"

ابن جریر کی تاریخ کے حسنِ قبول نے اس کو مختلف زبانوں میں پہنچایا، چنانچہ منصور بن نوح سامانی کے حکم سے ابو علی محمد بلعمی نے اس کا فارسی خلاصہ کیا، ترکی زبان میں بھی اس کا ترجمہ ہوا[1] بلعمی کے ترجمہ سے فرانسیسی زبان میں ترجمہ ہوا، اور ۱۸۶۷ء میں چار جلدوں میں شائع ہوا بعض حصوں کا ترجمہ لاطینی زبان میں ہوا جو ۱۸۶۳ء میں شائع ہوا ہے[2]، ابن جریر کی دوسری تاریخی کتاب ذیل المذیل ہے جس کا زمانہ تصنیف ۳۰۰ھ ہے[3]، یہ کتاب بھی اپنی خصوصیات کے لحاظ سے بہت اہم ہے، اس میں ایک خاص ترتیب کے ساتھ حضرات صحابہ و تابعین سے لیکر اپنے زمانہ کے شیوخ تک کے حالات لکھے ہیں، اور اگر انہیں سے کسی پر کوئی اعتراض ہوا ہے، تو اس کو دور کرنے کی کوشش کی ہے، اس کا انتخاب تاریخ طبری کے ساتھ شائع ہو چکا ہے، تیسری تاریخی کتاب الآثار الباقیہ عن القرون الخالیہ ہے جو مصر میں ۱۹۱۹ء میں طبع ہوئی ہے،

دیگر تصانیف | ان اہم تصانیف کے سوا دوسرے علوم پر بھی ابن جریر نے قابلِ قدر تصنیفیں کی ہیں، مثلاً اخلاق و تصوف میں ادب النفوس الجیدۃ والاخلاق النفیسہ کے نام سے ایک کتاب ۳۱۰ھ یعنی انتقال کے سال لکھنا شروع کیا، پانچ سو صفحات تک پہونچ کر ناتمام چھوٹ گئی،

صاحب معجم المطبوعات نے الاعتقاد کے نام سے ایک مطبوعہ رسالہ کا ذکر کیا ہے[4]، یہ رسالہ

---

[1] کشف الظنون ج ۱ ص ۲۲۲۔ [2] تاریخ آداب اللغۃ العربیہ ج ۲ ص ۱۹۹ [3] معجم الادباء ج ۶ ص ۴۴۲،

[4] معجم المطبوعات ج ۲ ص ۱۲۳۱،

ہماری نظر سے نہیں گذرا، البتہ صریح السنۃ کے نام سے عقائد میں ایک رسالہ کا ذکر یاقوت نے کیا ہے، اس میں اپنے مذہبی عقائد بیان کئے ہیں، [۵۱]

اہل طبرستان میں کچھ مذہبی اختلافات پیدا ہو گئے تھے، ان میں سے ایک مسئلہ "اسم اور مسمیٰ" کا بھی تھا، اس پر تقریباً تیس صفحہ کا ایک رسالہ البصیر فی معالم الدین کے نام سے لکھا،

اسی طرح داؤد بن علی اصبہانی کے رد میں ایک کتاب لکھی جس کا نام الرد علی ذی الاسفار ہے، ایک کتاب علی بن عبد الحکم کے رد میں لکھی، الموجز فی الاصول کے نام سے بھی ایک نا تمام کتاب کا ذکر آتا ہے، الرمی بالنشاب کے نام سے ایک رسالہ ان کی طرف منسوب ہی، لیکن اہل تحقیق کا خیال ہے کہ غالباً یہ نسبت صحیح ہے، [۵۲]

---

[۵۱] علامہ صابونی ۴۴۹ھ نے اپنے رسالہ عقیدۃ السلف و اصحاب الحدیث میں الاعتقاد کے نام سے دو کتابوں کا ذکر کیا ہی، دونوں کو اُنھوں نے دیکھا ہی، اور دونوں کی کچھ عبارتیں بھی اس کتاب میں نقل کی ہیں، ان میں سے ایک "الاعتقاد"، تو ان ہی ابن جریر طبری کی ہی، صابونی کے انداز سے ایسا معلوم ہوتا ہی کہ اس کو ابن جریر نے خلق قرآن کی بحث پر لکھا ہی،

دوسرا رسالہ الاعتقاد ابن مہدی طبری کا ہی، جس کو اُنھوں نے اپنے اہل وطن کے لئے لکھا تھا، صابونی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن مہدی طبری کا فن کلام میں خاص پایہ تھا، اور اس میں اُنھوں نے کئی تصنیفیں کی ہیں [۵۲] تمام حوالوں کے لئے معجم الادباء ج ۶

فارسی کے چند قدیم شعرا

از جناب غلام مصطفیٰ خانصاحب ایم اے ایل ایل بی (علیگ) لکچرار کنگ ایڈورڈ کالج امراوتی برار

(۲)

سنائی | حضرت سنائی غزنوی[1] کی وفات کے متعلق ڈاکٹر ایتھے نے بوڈلین لائبریری کے فارسی مخطوطات کی فہرست (صفہ ۴۶۳) میں اور پھر علامہ سید سلیمان ندوی نے معارف (مارچ ۱۹۳۳ء) میں تفصیل کیساتھ بحث کی ہی، اس کا اختصار یہ ہے کہ محمد بن علی الرقا (الرفا) نے حدیقۂ سنائی کا جو دیباچہ لکھا ہی اسمیں اپنے استاد یا پیر سنائی کی وفات کا دن یکشنبہ ۱۱ شعبان (۳۰ دسمبر) تو صحیح لکھا لیکن ۵۴۵ھ ۱۱۵۰ء کی بجائے ۵۲۵ھ لکھ دیا ہے جو یقیناً غلط ہے، کیونکہ ۵۲۵ھ ۱۱۳۱ء میں تو حدیقہ ہی لکھا گیا تھا، اس کے بعد ۵۲۸ھ ۱۱۳۴ء میں سنائی نے ایک اور مثنوی طریق التحقیق لکھی جس کی تاریخ خود اس کے ایک شعر میں اس طرح ہے:

پانصد و بست و ہشت زآخر سال　　بود کیں نظم نغز یافت کمال

پھر سنائی نے معزی (م ۵۴۲ھ ۱۱۴۷ء) کی وفات پر مرثیے لکھے جن کا یہاں نقل کرنا تحصیل حاصل ہی، غرض ہمارے محققین نے اتنا ثابت کر دیا ہی کہ سنائی ۵۴۲ھ ۱۱۴۷ء تک ضرور زندہ تھے، ورنہ معزی کا مرثیہ نہ لکھتے علامہ سید سلیمان ندوی نے اُسی مضمون میں ایک مفید اشارہ یہ بھی کر دیا ہی کہ اگر سنائی کی زندگی میں سلطان بہرام شاہ غزنوی کا انتقال ہوتا، تو وہ ضرور اپنے اس ممدوح کا مرثیہ لکھتے،

اب ہم کو دوسری باتوں پر غور کرنا ہی، محمد بن علی کے دیباچہ میں جو حدیقہ کے بمبئی ایڈیشن میں

---

[1] پروفیسر براؤن نے (جلد دوم ص ۳۱۷) سنائی کو غزنین یا بلخ کا متوطن بتایا ہی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ سنائی کا مولد غزنین ہی، حدیقہ میں وہ خود کہتے ہیں،. گرچہ مولد مرا ز غزنین ہست　　نظم شعرم چو نقش ماچین ہست

بھی موجود ہے، ایک جگہ یہ عبارت ہے،

"آنچہ (سنائی) گفتہ بود قریب دہ ہزار بیت مسودہ اصل بہ بغداد فرستاد نزدیک خواجہ امام برہان الدین علی رحمۃ اللہ علیہ وانچہ بدستِ او بماند چند نسخت بداد ....."

اس عبارت میں "رحمۃ اللہ علیہ" کے فقرے سے معلوم ہوا کہ خواجہ امام برہان الدین علی ابن ناصر غزنوی، جن کے نام سنائی کا منظوم خط حدیقہ کے آخر میں موجود ہے، اس دیباچہ کی ترتیب کے پہلے قضا کرچکے تھے، اُسی دیباچہ میں ایک جگہ یہ عبارت ہے،

"یمین الدولہ امین الملت شاہنشاہ بہرام شاہ خلد اللہ ملکہ .... وچون از دیوان اعلیٰ شاہنشاہی معظمی مثال فرمودند من خادم ایں دہ ہزار بیت منتخب (؟) مودوم از بہر بارگاہ اعلیٰ شاہنشاہی اعز اللہ انصارہ، د بموقع احماد او فتاد و پسندیدہ مجلس اعلیٰ آمد....."

اس عبارت میں بہرام شاہ کے متعلق دعائیہ فقرے "خلد اللہ ملکہ" اور "اعز اللہ انصارہ" صاف بتارہے ہیں کہ یہ بادشاہ اُس وقت ضرور زندہ تھا، لیکن جیسا کہ ہم اوپر بھی لکھ چکے ہیں سنائی اور امام برہان الدین علی انتقال کرچکے تھے، اب اگر ہم امام موصوف کی تاریخ وفات سے واقف ہو جائیں تو کم از کم یہ ضرور مسلّم ہو جائیگا کہ اُس وقت تک بہرام شاہ[1] زندہ تھا، جیسا کہ اس دیباچہ سے ظاہر ہے، اس کے لئے ہم کو ذرا تفصیل سے کام لینا پڑے گا،

---

[1] بہرام شاہ کی تاریخ وفات ابن اثیر نے (جلد یازدہم ص ۸ مصری) رجب ۵۴۸ھ/۱۱۵۳ء لکھی ہے، لیکن طبقات ناصری (ص ۲۳-۲۴ طبع کلکتہ) سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۵۱۱ھ سے ۴۱ سال یعنی ۵۵۲ھ/۱۱۵۷ء تک سلطان رہا، اور یہی قول صحیح معلوم ہوتا ہے، کیونکہ راورٹی کے انگریزی ترجمے میں (ص ۱۱۴) بہرام شاہ کے بیٹے خسرو شاہ کے ایک سکے کی عبارت کا یہ ترجمہ ہے:-

"اول سالِ جلوس یعنی ۵۵۲ھ میں یہ سکہ مضروب ہوا"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بہرام شاہ نے ۵۵۲ھ/۱۱۵۷ء میں وفات پائی ہوگی،

بہرام شاہ کے درباری شعراء میں سید حسن غزنوی (م ۵۵۶ھ) ایک ممتاز درجہ رکھتا ہے، اس نے[۱] سیف الدین سوری کی شکست پر بہرام شاہ کی مدح میں ایک طویل قصیدہ اکیانوے اشعار کا لکھا تھا، جس کا مطلع یہ ہے:

سزد گر جبرئیل آید بریں فیروزہ گوں منبر کند آفاق را خطبہ بنام شاہ دیں پرور

اسکی تفصیل انشاء اللہ پھر کبھی لکھونگا، ابھی صرف اُس فتح کی تاریخ دیکھ لیجئے جو اسی قصیدہ کے ایک شعر میں ہے:

دوم روز محرم سال درش، م ، د الحق برآمد نامور فتحے کز اں گویند تا محشر

یعنی (جمعہ) ۲ محرم ۵۴۴ھ (۱۲ مئی ۱۱۴۹ء) میں بہرام شاہ کو یہ فتح حاصل ہوئی تھی، لباب الالباب (جلد دوم ص۲۶۷) سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شاعر (اس قصیدہ کی تصنیف کے پہلے) سیف الدین سوری سے مل گیا تھا، لیکن بہرام شاہ نے اس کی ایک فی البدیہہ رباعی[۲] کی وجہ سے اُسے معاف کردیا، بلکہ اپنا ندیم بھی بنا لیا، لیکن دوسرے تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شاعر کا یہ عروج دیر تک قائم نہ رہ سکا، کیونکہ اس کی سحر بیانی اور اس کے مریدوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو دیکھ کر بادشاہ کو خطرہ پیدا ہوا چنانچہ شہر بدر کرنے کیلئے اس کے پاس دو تلواریں اور ایک میان روانہ کیا،[۳] شاعر اشارہ سمجھ کر چل کھڑا ہوا اور حرین الشریفین روانہ ہوگیا، برٹش میوزیم کے مخطوطہ نمبر ۱۵۸۴ (ورق ۱۳۲ب) سے معلوم ہوتا ہے کہ اس بادیہ پیمائی میں سید حسن

---

[۱] فرشتہ (ص۵۰) اور طبقات ناصری (ص۲۴) وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بہرام شاہ کی تخت نشینی پر اس شاعر نے ایک قصیدہ پڑھا جس کا مطلع یہ ہے،

منادی برآمد ز ہفت آسماں کہ بہرام شاہ است شاہ جہاں

ما ورٹی کے ترجمہ (ص۱۱۰ حاشیہ ۱) سے معلوم ہوتا ہے کہ بالکل یہی مضمون (شعر) بہرام شاہ کے ایک سکہ پر منقوش تھا، اگر واقعی یہی شعر تھا، تو اس سے زیادہ ایک شاعر کی قدردانی اور کیا ہو سکتی ہے؟

[۲] وہ رباعی یہ تھی:-

آنی کہ فلک پیش تیغت ناید بخشش بجز از کعت چو میغت ناید
زخم تو کہ پیل کوہ پیکر نہ کشد بر پشہ ہمی زنی دریغت ناید

[۳] اسی سے ملتا جلتا قصہ مولانا روم کے والد سے بھی منسوب ہے،

نے ایک قصیدہ لکھا جس کا مطلع یہ ہے:۔

جاں می برد بعشرتِ حورانِ گلشنم — دل می کشد بخدمتِ دیوانِ گلخنم

اس کا آخری شعر ہے:۔

از سالِ پانصد و چہل و پنج گو بیا — در من نگر کہ معجزۂ جدِّ خود منم

اس کے بعد یہ مکہ معظمہ پہنچا، اور پھر مدینہ طیبہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں ایک زندۂ جاوید ترجیع بند پڑھا جس کا یہ مرجع اب تک اہلِ دل حضرات کی جان ہے:۔

سلموا یا قوم بل صلوا علی صدر الامین — مصطفیٰ ما جاء الا رحمۃ للعلمین[1]

مکہ معظمہ سے ایک قصیدہ سلطان سنجر (م ۵۵۱ھ/۱۱۵۶ء) کے دربار میں بھیجا تھا جس کا مطلع یہ ہے،

ہرگز بود کہ باز ببینم لقاے شاہ — شکرانہ در دو دیدہ کشم خاک پاے شاہ[2]

لیکن تاریخ بدایونی (طبع کلکتہ جلد اول ص ۴۸) سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصیدہ بہرام شاہ کو بھیجا تھا جس میں اس کا نام بھی آیا ہے:۔

بہرام شہ کہ جانِ سلاطیں فداش باد — باشد کہ جانِ ایشاں باشد سزاے شاہ

غرض یہ شاعر حرمین الشریفین سے واپسی پر بغداد پہنچا، جہاں وہ یقیناً ۵۴۶ھ/۱۱۵۱ء سے پہلے نہ گیا ہوگا کیونکہ ہم ابھی لکھ چکے ہیں کہ ۵۴۵ھ/۱۱۵۰ء میں وہ بادیہ پیمائی کرتے ہوئے حج کو جا رہا تھا، اسی قصیدہ میں ایک شعر یہ بھی ہے جس سے غالباً بیت المقدس کا عزم ظاہر ہوتا ہے:۔

اکنوں عزیمتِ سفرِ قدس کردہ ام — ہم کردہ داں بدولتِ بے منتہاے شاہ

لیکن اگر بیت المقدس نہ بھی گیا ہو اور ۵۴۵ھ/۱۱۵۰ء ہی کے ذی الحجہ میں حج کے بعد ہی بغداد کو چل دیا

---

[1] اس عربی شعر کا دوسرا مصرع مولانا روم نے سنائی کا سمجھ لیا ہے، (دیوان شمس تبریز طبع لکھنؤ ص ۲۳۶)

[2] راحت الصدور (ورق ۱۰۸ الف)

ہو تو وہ زمانہ ۵۴۶ھ ۱۱۵۱ء سے پہلے نہیں ہو سکتا، یہاں پہنچ کر اُس نے امام برہان الدین علی بن ناصر غزنوی (سنائی کے مکتوب الیہ) کی مدح میں ایک قطعہ لکھا، جس کا پہلا شعر یہ ہے :۔

امامِ عالمِ برہانِ دیں لسان الحق — تو ئی کہ خامہ ز دستِ تو میگسار شود

اُس کا آخر شعر یہ ہے جس میں شاعر نے غالباً اپنا ہموطن (غزنوی) ہونا ظاہر کیا ہے،

منم کہ بازِ ہمایونِ آشیانِ توام — وفاے باز نہ پرواز را شکار شود

ایک اور قطعہ لکھا جو اس طرح شروع ہوتا ہے :۔

اے کہ یزداں پادشاہت کرد بر ملکِ علوم — دیں گواہی پیشِ یزداں و زمخشری دہر

اسی شاعر نے ایک ترجیع بند سلطان ملک شاہ (بن محمود بن محمد بن ملک شاہ اعظم سلجوقی) کی تاجپوشی کے دن پڑھا تھا، یہ بادشاہ رجب سے شوال ۵۴۷ھ (اکتوبر ۱۱۵۲ء سے جنوری ۱۱۵۳ء) تک یعنی صرف چار ماہ حکومت کرتا رہا، اس کی مدح کے اس ترجیع[1] بند میں ایک شعر انہی خواجہ برہان الدین (علی بن ناصر) سے متعلق ہے، وہ شعر یہ ہے :۔

پرور بغداد گفتم خواجہ برہانِ دیں — کاے ملک تاریخ مہ سلطان شوی اینک شدی
(گفت مرا)

اس شعر سے صاف ظاہر ہے کہ رجب ۵۴۷ھ میں جب یہ ترجیع بند پڑھا گیا تھا، اس کے تقریباً ۵ ماہ قبل خواجہ برہان الدین یقیناً زندہ تھے، اس کے بعد ان کا حال مجھے کہیں نہیں ملا،

اتنا ثابت ہو جانے کے بعد اب محمد بن علی الرقا کے اُس دیباچہ کی طرف آیئے جو بہرام شاہ کی زندگی میں اور خواجہ برہان الدین اور سنائی کی وفات کے بعد لکھا گیا تھا، گویا اب یہ ثابت ہوا کہ وہ دیباچہ ۵۴۷ھ کے بعد لکھا گیا، کیونکہ اُس سال تک تو خواجہ موصوف زندہ تھے، اور بہرام شاہ بھی یقیناً اس کے بعد تک زندہ رہا، لیکن سنائی ضرور انتقال کر چکے تھے، جیسا کہ محققین ثابت کر چکے

[1] راحت الصدور میں یہ ترجیع بند ۲۵۱ سے شروع ہوتا ہے، لیکن مذکورہ صدر شعر کی تلمیح کے متعلق ڈاکٹر محمد اقبال صاحب کوئی ... نہ ... سکے تھے،

ہیں، حالانکہ انوری نے اپنے قصیدہ میں جو ناصر الدین ابو الفتح طاہر بن فخر الملک (وزیر سنجر، المتوفی ۵۴۸ھ) کے بیٹے قوام الدین حسن کی مدح میں ہے اور جس کی تفصیل انشاء اللہ انوری کے حال میں آئیگی، سنائی اور صابر کو (۵۴۸ھ کے بعد بھی) زندہ لکھا ہے جو صرف طرزِ سخن پر دلالت کرتا ہے، درحقیقت تاریخ نہیں معلوم ہوتی، وہ شعر یہ ہیں :-

گرچہ در بستم درِ مدح وغزل یکبارگی ... ظن مبر کز نظم والفاظ معانی قاصرم

این ہمہ بگذار با شعرِ مجرد آمدم، ... چون سنائی نیستم آخر نہ ہمچون صابرم

ہر یکے آخر از ایشان بے کفافے نیستند ... این منم کز مفلسی چون وزرِ روشن ظاہرم [۱]

لیکن سنائی ہرگز اُس وقت تک زندہ نہ تھے جیسا کہ ابو العلاء گنجوی کے ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے:

سخنوران ہمن امروز اقتدا آرند ... روا بود کہ منم قدوۂ ہمہ شعراء

چو رفت جانِ عمادی ہمن گذاشت لطف [۲] ... چو شد روانِ سنائی ہمن گذاشت سنا

تبارک اللہ پنجاہ و پنج بشمردم، ... بہشت باشد بستم چو شست گشتہ دوتا

بعقدِ سیتن گشتہ تست پنجۂ عمرم، ... گہ وداع رحیل ست از ین فنار فنا

سرِ ملوک منوچہر مہر چہر کزو ... شدہ است زندہ وفرخندہ خاندانِ نیا [۳]

ان کمیاب اور اہم اشعار سے اتنی باتیں معلوم ہوتی ہیں :-

(۱) دوسرے شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ عمادی (غزنوی) اور سنائی اس وقت انتقال کر چکے تھے

---

[۱] کلیاتِ انوری، ص ۳۰۰ [۲] کتب خانۂ حبیب گنج، مجموعۂ قصائد فارسی ۱/۴۲، استاذی قبلہ پروفیسر ضیاء احمد صاحب بدایونی مدظلہ (علی گڈھ) نے ان اشعار کی تصحیح فرمادی ہے اور اُن کا خیال ہے کہ دوسرے شعر میں "لطف" کی بجائے "عماد" ہوگا۔ [۳] انھوں نے ملک ارسلان ارغون (م ۵۹۶ھ، ۱۱۹۹ء) کی مدح بھی لکھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت عمر پائی (مونس الاحرار ص ۹۶، حبیب گنج) یہ عمادی غزنوی ہیں، سنائی جب بلخ کو گئے اس وقت عمادی نے لکھا، (مجموعۂ قصائد فارسی ص ۲۷۰، حبیب گنج) (بقیہ حاشیہ آیندہ صفحے پر ملاحظہ فرمائیے)

(۲) تیسرے اور چوتھے شعر سے صاف ظاہر ہے کہ اُس وقت ابوالعلار گنجوی کی عمر ۵۵ سال کی ہو چکی تھی اور چھٹی دہائی میں تھی،

(۳) آخری شعر کہہ رہا ہے کہ ممدوح یعنی منوچہر خاقانِ شروان اُس وقت زندہ تھا،

موسیو خانیکوف (Khanikof) نے تذکرۂ خاقانی (ترجمہ) اور نٹیل کا ئج میگزین اگست ۱۸۳۶ء صفحہ ۵۲) میں ابوالعلار گنجوی کی مفروضہ تاریخ پیدائش ۴۸۵ھ ۱۰۹۲ء اور ۴۹۰ھ ۱۰۹۷ء کے درمیان بتائی ہی، اس حساب سے مذکورۂ بالا اشعار شاعر کی ۵۵ سالہ عمر میں یعنی ۵۴۰ھ ۱۱۴۵ء اور ۵۴۵ھ ۱۱۵۰ء کے درمیان لکھے گئے ہوں گے، یعنی اُس وقت تک عمادی اور سنائی قضا کر چکے تھے، لیکن صحیح یہ ہے کہ ۵۴۲ھ ۱۱۴۷ء میں تو سنائی نے معزی کا مرثیہ لکھا تھا، اس لئے وہ اشعار یقیناً ۵۴۲ھ کے بعد کے ہوں گے، اب دوسری طرف آئیے، تو معلوم ہوگا کہ منوچہر خاقانِ شروان جس کی وفات Zambaur (Manuel de Genealogie ص ۱۸۲) کے قول کے مطابق ۵۵۵ھ ۱۱۵۵ء ہے، ان اشعار میں ممدوح ہے، اس سے صاف طور پر ثابت ہو گیا کہ وہ اشعار ۵۵۵ھ کے پہلے اور ۵۴۲ھ کے بعد لکھے گئے، یعنی سنائی کی وفات ان دونوں کے درمیان کسی وقت ہوئی ہوگی، اور بہت ممکن ہی کہ وہ زمانہ ۵۴۵ھ ۱۱۵۰ء ہی کا ہوگا جیسا کہ محققین کا خیال ہی،

(حاشیہ)

چوں سنائی افتاد از خطۂ غزنیں بہ بلخ ، ‏ تازہ کرد از مدحت قاضی حسن رُوے سخن

چوں مرا از لشکرِ سلطاں بری پیوست بخت ‏ بر درِ قاضی حسن دیدم معالی را وطن

اندراں فکرت کہ ایں قاضی چو آں قاضی بود ‏ از عرق در آبِ آتش رالے دیدم خویشتن

آسماں گفت آفتابا با عمادی گو..... ‏ خاکِ ایں قاضی حسن از خونِ آں قاضی حسن

اے دریغا روے آں بودے کہ مدحش گفتمے ‏ تا زمانہ فرق کردہ شعر او از شعرِ من

حدیقہ کے دیباچہ سے ضرور معلوم ہوتا ہے کہ سنائی نے چالیس سال سے گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی، لیکن ان اشعار کے علاوہ عثمان مختاری (المتوفی ۵۴۴ھ ۱۱۴۹ء) نے بہرام شاہ کے باپ مسعود سوم کی مدح میں بیاسی شعر کا جو طویل قصیدہ لکھا ہی اس میں بھی سنائی کی دنیا داری نظر آتی ہی، اس کا ایک شعر یہ ہی:- سنائی را اصلتہا بخش تا او ہمچنیں مدحے ‏ بپردازد کہ ہمتا نیست اندر شعر اقرانش

(دیوان مختاری - ورق ۱۰۵-۱۷۰ بانکی پور)

اور اگر وہ اشعار ۵۴۵ھ/۱۱۵۰ء ہی میں لکھے گئے ہوں گے تو پھر ابو العلاء گنجوی کی پیدائش بھی (۵۵ سال پہلے) ۴۹۰ھ/۱۰۹۷ء میں ماننا پڑیگی،

ادیب صابر ادیب صابر کی تاریخ وفات کے متعلق بہت اختلاف ہے، پروفیسر براؤن (جلد دوم ص ۳۳۳ حاشیہ نمبر ۲) نے جمادی الاول ۵۴۲ھ (اکتوبر ۱۱۴۷ء) دولت شاہ نے ۵۴۶ھ/۱۱۵۱ء اور ڈاکٹر ایتھے (فہرست انڈیا آفس جلد دوم ص ۹۲۳) نے ۵۳۰ھ، ۵۴۰ھ، ۵۴۴ھ، ۵۴۶ھ اور ۵۴۷ھ کی تاریخیں نقل کر دی ہیں، ان اختلافات کو رفع کرنے کے لئے فی الحال چند باتیں پیش کرتا ہوں،

ادیب صابر کا مکمل دیوان کاما لائبریری (بمبئی) میں موجود ہے، اس کے علاوہ حبیب گنج اور حمیدیہ لائبریری بھوپال سے بھی میں نے استفادہ کیا ہے، ان کے یہاں زیادہ تر سید مجد الدین ابو القاسم علی بن جعفر موسوی (رئیس خراسان) کی مدح[1] پائی جاتی ہے، نام اور خطاب کے لئے کچھ اشعار پیش کئے جاتے ہیں،

صدر اہل البیت مجد الدین ابو القاسم علی ناقدِ لفظ و معانی صاحبِ کلک و کتاب
سلالۂ نبوی، صدر شرق، مجد الدین کہ پیش ہمت او ہست پیشکار آتش
ز اصل گوہر پاک پیمبران عرب ز نسل نسبت شاہان خسروان عجم
تو جعفری و عمت ہست جعفر طیار ہمی ثنائے تو گوید بہ پیش جدّ تو عم
اگر ز حضرت تو دور بودہ ام بودہ ست دعائے دولت تو با دلم ہمیشہ بہم
کہ من ز اوّل ایام عمر تا امروز ز خدمت تو مقصّر نبودہ ام یک دم
جمال تاج معالی علی بن جعفر کز اکتساب معالی ہمی بیاساید
مجد دین صدر معالی تاج عز و صدر شرف عمدۃ الاسلام، ابو القاسم علی الموسوی

---

[1] ان کے علاوہ چند ممدوحین یہ ہیں :-

نصیر الدین محمد بن حسن، علاء الدین محمد بن حیدر، جمال الدین عبد اللہ،

یہ ابوالقاسم علی صدر سنجر کے وزیر مشیر رہ چکے ہیں جو ابوالقاسم (بن) حسن الدرگزینی (المتوفی ۵۲۸ھ ۱۱۳۴ع) سے مختلف معلوم ہوتے ہیں، اور جن کا حال مجھے کسی تاریخ یا تذکرے میں نہیں ملا، لیکن عبدالواسع جبلی (المتوفی ۵۵۵ھ ۱۱۶۰ع) کے کلام سے ان کی وزارت کا ثبوت ملتا ہے،

خداوندے کہ در تیرش نشاند نسر طائر پر　　　شہنشاہے کہ بر تاجش فشاند چرخ دار فر
سلاطیں را بحق وارث معزّ الدین ابو الحارث　　　شہ آفاق را برہان امیر المومنین سنجر
سلاطین و خلائف را بد و فخر است ہموارہ　　　چو سادات و اکابر را امجد دین پیغمبر
رئیس مشرق و مغرب ابوالقاسم علی صدر　　　کہ چوں ہم کنیت ہم نام خویش آمد بفضل و فر
امیر سادۂ عالم، چراغ گوہر آدم　　　مشیر خسرو اعظم، جمال دودۂ جعفر
بزرگی کز بیان و طبع و دست مدحش افزاید　　　قلم حرمت، کرم جاری، بخار و نق سخن مفخر

ادیب صابر کی تاریخ وفات کے متعلق روحانی غزنوی کے اس اہم سوگندنامے سے جو بہرام شاہ کے وزیر نجیب الملک حسین بن منتخب الملک حسن کی مدح سے شروع ہوتا ہے، مفید باتیں معلوم ہوتی ہیں،

زہے بفکرت روشن ز چشمۂ حیواں　　　در آفرینش عالم دلت معما خواں
تو ئی تو ئی کہ اگر خواہمت عطار دِ ارض　　　دریں سخن نبود خلق را مجال گماں
نجیب ملک حسین حسن برائے خدا　　　بہ تیغ دولت انصافم از جہاں بستاں
شنیدۂ تو کہ سوگند نامہا دیدی　　　ز گفتۂ دو سہ محراب کون لت انباں
یکے از ایشاں پنجک ستاں و پنبہ فروش　　　کہ کرد گردشِ چرخش چو چرخ سرگرداں

لہ سنائی کی طرح عمادی غزنوی نے بھی اس کی مدح کی ہے۔

گردوں تومی فرازی چوں خوامنت سحاب　　　سلطان تو می نشانی چوں گویمت وزیر
از مہر تو ستاند وز کینِ تو دہد　　　ابر دے شام و سمہ و بستانِ صبح شیر

ٹہ جبلی کا مکمل دیوان حبیب گنج میں ہے، اور انتخاب جامع مسجد بمبئی کے کتب خانے میں ہے،

دوم ادیبِ پریشاں سخن کہ بیہودہ ست | ہزار بار ببینہ ہمہ دبیرستاں
سوم رشید کہ وطواط زاژ خائے کہ ہست | چو کلج گندہ دماغ و چو درخ پنبہ ہاں
چہارمیں شاں کآں سہ کجا نہم بارے (؟) | چراغِ مردۂ دانش فرزدقِ بنباں (؟)
سیاہ روے، خنک اخترے سفید تنے | کہ روزگار بر و کرد خانہ چوں زنداں
چہ کفرہا و چہ سوگند ناہائے دروغ | کہ چشم شرع بماندہ ست در تحیرِ آں
ولیک ہم بخدائے کہ آفریدۂ اوست | باتفاق، نبات و معادن و حیواں
بعزِ ملکِ خدائے و بکام عالمِ امر | بنور جوہرِ عقل و بنطقِ گوہر جاں[1]

پھر قسمیں شروع ہوتی ہیں اور یہ چاروں شاعر (سیّد حسن غزنوی، ادیب صابر، رشید الدین وطواط اور فرزدق) جن کے سوگند نامے مردود کئے گئے ہیں، اسی سوگند نامے میں موجود ہیں :-

نعوذ باللہ امروز مثلِ صابر کیست | کہ روزگار بہ اشعارِ او زند دستاں
بجز رشید ندانم دریں زمانہ کسے | کہ زادِ فکرتِ او ہست چشمۂ حیواں
حسن کہ آئینہ نورِ نفس ناطقہ اوست | ازو چگونہ برم گوے نطق در میداں
فرزدقِ بنبانی (؟) کہ آیدیش بلا، | فزوں زریگِ بیابان و قطرۂ باراں

ان اشعار سے واضح ہوتا ہے کہ یہ شعراء اس وقت زندہ تھے اور جس کی تفصیل آیندہ آئے گی، یہ سوگند نامہ تاریخی حیثیت سے بہت اہم ہے، کیونکہ اس میں سلطان بہرام شاہ غزنوی کے زمانہ کے متعلق بہت کچھ صحیح مواد ملتا ہے جس کو میں انشاء اللہ سلطان کی مفصل تاریخ میں کبھی پیش کرسکونگا، ابھی صرف اتنا سمجھ لیجئے کہ یہ سوگند نامہ جیسا کہ اوپر کے اشعار سے ظاہر ہے، ادیب صابر، رشید الدین

[1] یہ ۳۰ شعروں کا سوگند نامہ حبیب گنج میں دو کتابوں میں ہے، مونس الاحرار (صفحہ ۲۱۱-۲۱۵) اور مجموعہ قصائد قلمی (صفحہ ۱۵۳-۱۵۶) اس کے آٹھویں شعر کی اصلاح کے لئے میں اپنے ادیبوں سے درخواست کرتا ہوں،

وطواط اور سید حسن غزنوی کے سوگند ناموں کے بعد لکھا گیا، ادیب صابر کا سوگند نامہ اس طرح شروع ہوتا ہے،

دلم بمہر اسیر است و تن بعشق فدی ہمی بگوشِ من آید زلفظِ عشق ندی

اس میں صابر کے اُسی ممدوح یعنی ابوالقاسم علی بن جعفر موسوی کی مدح ہے:

اجل رئیسِ خراسان و فخرِ موسویاں کہ اوست مالشِ فرعونِ ظلم را موسیٰ

خجستہ تاجِ معالی علی بنِ جعفر کہ علم جعفرِ صادق ہمی کند املیٰ

لیکن اس کی تاریخ ہم کو معلوم نہیں، اب رشید الدین وطواط کا سوگند نامہ دیکھئے، اس کے اشعار میرے استاد قبلہ پروفیسر ضیاء احمد صاحب بدایونی نے علی گڈھ کے مخطوطے سے نقل کرکے بھیجے ہیں، وہ اس طرح شروع ہوتا ہے،[۱]

زہے بہ جودِ تو ایام مکرمت مشہور خہے بہ جاہِ تو اعلامِ محمدت منصور

لیکن اس میں کسی ممدوح کا نام نہیں ہے، ظن غالب یہ ہے کہ ابوالمظفر اتسز خوارزم شاہ (المتوفی ۵۵۱ھ/۱۱۵۶ء) کی مدح میں ہوگا،

اب سید حسن غزنوی کا سوگند نامہ دیکھئے جس کے وزن کے علاوہ قافیے تک کی تقلید روحانی غزنوی نے اپنے سوگند نامہ میں کی ہے،

کشادہ صورتِ دولت بشکر شاہ دہاں چو بست زیورِ اقبال بر عروسِ جہاں

خدایگانِ سلاطینِ مشرق و مغرب علاءِ دینی و دیں خسرو زمین و زماں

ابوالمظفرِ بہرام شاہ بن مسعود کہ ہست نامش بر نامۂ ظفر عنواں

یہ سوگند نامہ غالباً سید حسن نے ۵۴۴ھ/۱۱۴۹ء میں لکھا ہوگا جب وہ پکڑا گیا تھا، اور بہرام شاہ

[۱] مجموعہ قصائد فارسی ۹۴؁ (حبیب گنج) ص ۱۴۵-۱۴۶،

اس سے ناراض ہوگیا تھا، اس خفگی کے متعلق قسموں کے بعد اشارہ ملتا ہے:۔

خدایگانا گندم نہ خوردہ چون آدم ۔ بروں فتادم ناگہ ز روضۂ رضواں

من اولاً کیم و آخر آں چہ سہو بود ۔ اگر کنم کہ ببخشایش تو ارزد آں

امید خلعت ثم اجتباہ می دارم ۔ کہ روز و شب شدہ ام ربنا ظلمنا خواں

اور اس سوگند نامہ کے بعد یعنی ۵۴۴ھ/۱۱۴۹ء کے بہت بعد روحانی غزنوی کا سوگند نامہ لکھا گیا ہوگا کیونکہ اس کا ممدوح جیسا کہ ہم اس کے اشعار میں دیکھ چکے ہیں، نجیب الملک حسین بن حسن (وزیر بہرام شاہ) ہے، ۵۴۴ھ/۱۱۴۹ء میں جب بہرام شاہ نے سوری کو قتل کیا، اُس وقت بہرام شاہ کا وزیر منتخب الملک حسن تھا، جو اسی نجیب الملک کا باپ تھا، دیکھئے سید حسن نے اپنے ایک قصیدہ میں اس سال کی فتح کی طرف اشارہ کیا ہے:۔

منت خدائے را کہ بہ اقبال پادشاہ ۔ ایمن شد از محاق و کسوف آفتاب و ماہ

منت خدائے را کہ شگفت و چمید باز ۔ ہم گلبن سعادت و ہم سرو بارگاہ

منت خدائے را کہ بہ طبع لطیف داشت ۔ روئے نکوئے منتخب از چشم بدنگاہ

بس چشم شور و روئے ترش بود منتظر ۔ تا چشم شاں سپید شد و روئے شاں سیاہ

بائے بہ اوج ماہ نہ بیند کسے سہا ۔ بائے بجائے سرو نہ بیند کسے گیاہ

خورشید مملکت حسن احمد آں کہ ساخت ۔ در سایۂ سعادت او ملک دیں پناہ

باز آمدی چوں باز سپید از گریز جائے ۔ باز آمدی چو شیر سیہ در شکار گاہ[1]

ان میں چوتھا شعر اُسی سوری (یا بقول ابن الاثیر، شوری) سے متعلق ہے، اور تیسرے شعر میں اس وزیر حسن بن احمد کا لقب "منتخب الملک" مذکور ہے، دوسرے اور آخر شعر میں صاف کہا گیا ہے

---

[1] انڈیا آفس، مخطوطہ ۹۳۱، ورق ۴۷-۴۸،

کہ وہ وزیر (سوری کے قتل پر) اپنی جگہ پر واپس آگیا، اس وزیر کا ایک جگہ اور ذکر ہے:۔

فرزانہ حسینِ حسنِ احمدِ خاصہ ‏ ‏ ‏ آں کردہ خدایش ز ہمہ خلق خلاصہ

فرخندہ جمالت کہ گلِ دولت و دیں است ‏ ‏ ‏ باغِ نظرِ منتخب الملک حسن باد[1]

ان اشعار میں بہرام شاہ کے تین وزیر (۱) احمد (۲) منتخب الملک حسن اور (۳) نجیب الملک حسین جو نسلاً بعد نسلٍ مقرر ہوئے تھے مذکور ہیں، اسی حسین کی مدح میں روحانی کا سوگند نامہ ہے جو یقیناً ۵۴۴ھ / ۱۱۴۹ء کے بعد لکھا گیا ہوگا، کیونکہ اس سال تک تو اس وزیر کا باپ حسن بن احمد ہی زندہ تھا اور اپنے عہدۂ وزارت پر جنگِ سوری کے بعد دوبارہ آیا تھا،

اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ روحانی کے سوگند نامے میں ادیب صابر، وطواط، سید حسن غزنوی اور فرزدق (؟) کو زندہ شمار کیا گیا ہے، اور جب یہ شعر کہ

نعوذ باللہ امروز مثلِ صابر کیست؟ ‏ ‏ ‏ کہ روزگار بہ اشعار او زند دستاں

اس شعر سے ادیب صابر کی زندگی کا کھلا ہوا ثبوت ملتا ہے تو وہ لوگ جو اُسے ۵۴۲ھ / ۱۱۴۷ء میں مردہ سمجھ رہے ہیں، یقیناً غلطی پر ہیں، کیونکہ یہ مصرع اور اس کا سوگند نامہ خود تاریخ کی سوگند کھا کر کہتا ہے کہ اس کی تصنیف ہی ۵۴۵ھ / ۱۱۵۰ء کے پہلے نہیں ہوئی تھی، اس لئے ظاہر ہے کہ ادیب صابر کی وفات ۵۴۶ھ / ۱۱۵۱ء یا ۵۴۷ھ / ۱۱۵۲ء کے پہلے نہ ہوئی ہوگی،

ادیب صابر کے یہاں ایک قصیدہ اتسز خوارزم شاہ (م ۵۵۱ھ / ۱۱۵۶ء) کی مدح میں بھی پایا

---

[1] انڈیا آفس، مخطوطہ ۱۳۹۹، ورق ۳۳ (الف)۔ ۲۵ب بہرام شاہ کے ان تینوں وزیروں کے متعلق تاریخیں خاموش ہیں، وزیر احمد کے متعلق مسعود سعد سلمان (المتوفی ۵۱۵ھ / ۱۱۲۱ء) کے یہاں بھی صاف تذکرہ ہے:۔

تا برآمد ز آتش شمشیرِ بہرامی شرار ‏ ‏ ‏ داد گیتی را فلک بر ملکِ بہرامی قرار

کرد بہرام افتخار از ملکِ شہ بہرام شاہ ‏ ‏ ‏ در ہمہ معنی کہ بر تر دیدہ از زین افتخار

در ہمہ معنی چو احمد بود بہرامی مضا ‏ ‏ ‏ از پے صدر وزارت کرد او را اختیار

(دیوانِ مسعود، مطبوعہ طہران، ص ۲۸۹)

جاتا ہے، اُس میں خوارزم کے سیلاب کے متعلق اشارہ ہے، جسکی تاریخ مجھے معلوم نہ ہوسکی، لیکن اس کا منشا شاید جاسوسانہ ہو، جس کیلئے شاعر سلطان سنجر کی طرف سے مقرر ہوکر گیا تھا، اس قصیدہ کے بعض اشعار یہ ہیں:۔

توئی کہ روے تو در مہرگاں بہارِ من ست | کہ چہرۂ تو گلستان و لالہ زارِ من ست
اگر ولایتِ خوارزم را زدہ سیلاب | زیاں رسید ز جیحوں کہ در جوارِ من ست
سبب منم زپے آں کہ آب جیحوں را | ہمہ مدو زغرلہاے آبدارِ من ست
دلم زعشقِ تو آخر بحقِ خویش رسید | کہ روزگارِ وصلِ تو حق گزارِ من ست
بہر چہ رائے کنم یابم از ملک یاری | ازاں کہ دولت خوارزم شاہ یارِ من ست[1]

لیکن وہاں وطواط کے مقابلے میں ادیب صابر کی کوئی وقعت نہ تھی، غالباً اسی وجہ سے اس نے وطواط کی ہجو قبیح لکھی جس کا صرف ایک شعر یہ ہے:۔

آں مخنث رشید دیں وطواط | جہل را ہجوِ علم را بقراط[2]

انوری اخبار "ہماری زبان" مورخہ ۱۶ ار جون ۱۹۴۲ء سے معلوم ہوا کہ پروفیسر حافظ محمود صاحب شیرانی کی تنقیدِ شعر العجم اب کتابی صورت میں شائع ہوگی، جو بیشک بہت مفید ثابت ہوگی، انوری کے متعلق ان کا بلند پایہ مضمون "اردو" (اکتوبر ۱۹۲۳ء) میں شائع ہوا تھا، کلیاتِ انوری میری نظر سے بھی گذرا ہے، اُس میں چند باتیں مجھے بھی مفید نظر آئیں جو اسی مضمون کے سلسلہ میں بیان کرتا ہوں

---

[1] انتخاب دواوین شعرائے متقدمین، ورق ۹۹ الف حمیدیہ لائبریری بھوپال۔ [2] ایضاً ورق ۹۹ الف لیکن جبلی تعریف کرتے ہیں:۔

عالم علم رشید الدین در باغِ خرد | آں درخت ست کہ پیوستہ ہنر بار دہد
گرچہ در گفتنِ اشعار جہاں منفرد ست | کہ ہمہ کس ببزرگیِ وے اقرار دہد
از قبل بخچہ کہ در انواعِ علوم ست اورا | خاطرِ خویش نہ زیبد کہ بہ اشعار دہد
گرچہ (او نیست) ز احرار و سلاطین و ملوک | کہ مرا او مراتبہ ہمہ خدمت بسیار دہد
خلعت آنست کہ او را سخن خویش ہمی | بملوک و بسلاطین و بہ احرار دہد

کلیاتِ انوری ص ۲۵ میں بھی غالباً وطواط ہی کا ذکر ہے، (مخطوطہ حبیب گنج)

اور جہاں کہیں "تنقید" کا حوالہ دوں گا، اس سے اُسی مضمون کی طرف اشارہ ہوگا، تنقید میں صحیح فرمایا گیا ہے کہ انوری کے مکان پر کوئی وزیر آیا تھا، اس کے خیر مقدم کے جو اشعار بعد میں پیش کئے گئے ہیں، اُن میں سے کلیاتِ انوری ص ۳۶۹ کے دو شعر یہ ہیں:-

مجیرِ دولت و دینی و اندر دیدۂ دولت   زر لے تست بینائی ز بختِ تست بیداری

تو آں صدری کہ عالم را کمال آمد وجودِ تو   نگر تا خوشتن را کمتر از عالم نہ پنداری

اسی وزیر کی مدح میں ص ۴۵۱ کا یہ قصیدہ بھی معلوم ہوتا ہے:-

اے وزارت را جمال و آفرینش را کمال   اے جہاں را صدر و دیں را مجد و دولت را مجیر

(یعنی صدرِ جہاں مجدالدین مجیر الملک)

پھر ص ۵۸ میں غالباً اسی وزیر کی آمد کا حال ہے:-

فرخندہ قدوم تو کہ کمتر اثر ے زو   تمکینِ ولا تست و مراعاتِ رعاتست

بوسیدنِ دستِ تو در آورد بمن جاں   در قلزمِ دستِ تو مگر آبِ حیاتست

اقبال مرا ز آمدنت نشو و نمو دار   ابریست قدومِ تو کہ اقبال نباتست

اس قصیدے کا مطلع یہ ہے،

صدرے کہ از و دولت و دیں جفت نباتست   آں خواجۂ شرع است کہ سلطانِ قضاتست

"خواجۂ شرع" "صدرِ جہاں" اور "مجدالدین" کے خطابات کا اطلاق جس وزیر پر ہو سکتا ہے مجدالدین ابو طالب بن نعمہ معلوم ہوتا ہے، جس کا حال آگے آئیگا،

معزی اور انوری والے قصے کے متعلق تنقید میں لکھا گیا ہے کہ پروفیسر براؤن نے اس پر کوئی تیقن ظاہر نہیں کیا؛ جو بے شک صحیح ہے، لیکن براؤن نے اُس پر بحث کرنے کی بجائے تنا مزد دکھا ہے،

"...though not worthy of much credence"

سلطان احمد پیروزشاہ کے متعلق غالباً تنقید میں صحیح فرمایا گیا ہی کہ سنجر (المتوفی ۵۵۲ھ/۱۱۵۷ء) کے عہد سے آٹھ نو سال بعد وہ بلخ اور ترمذ وغیرہ پر قابض ہوا تھا، اس کے متعلق کچھ تفصیل ملتی ہی،

اس پیروزشاہ (فیروزشاہ) احمد کے باپ کا نام "ابوبکر" تھا جیسا کہ اس شعر سے ظاہر ہوتا ہی،

پیروزشاہ باد ندا از زمانہ این　　　پیروزشاہ احمدِ بوبکر شاہ تست (ص۵۵)

لیکن ص۵۶۳ پر جو رباعی ہے اس سے معلوم ہوتا ہی کہ اس کے باپ کا نام طغان تگین تھا:۔

از چرخ کہ گاہے بسرا دم ننہاد　　　وز بخت کہ بندے ز امیدم نکشاد

فیروز شہ طغان تگیں دادم داد　　　فیروز شہ طغان تگیں شاد شواد

ص۵۵۹ پر بھی اسی طرح ہے،

ہم توسنِ چرخ زیرِ زیں را شاید　　　ہم گوہر خورشید نگیں را شاید

تا ظن نہ بری کہ آن و این را شاید　　　فیروز شہ طغان تگیں را شاید

اس لئے خیال یہی ہے کہ فیروزشاہ کے باپ کا نام "ابوبکر" تھا لیکن خطاب "طغان تگین" تھا اسی طغان تگین کا دوسرا بیٹا ملک شاہ تھا، جیسا کہ صاف بیان کیا گیا ہے،

مذکور بفرزندِ تاج دار　　　این جا بملک شہ طغان تگیں (ص۳۲۲)

پھر ص۳۳۶ - ص۳۳۷ پر بھی اسی ملک شاہ کی مدح ہی:۔

شاد باش اے خسروِ عادل عماد داد و دیں　　　دیر ماں اے ناصر جاہِ امیر المومنیں

اے ملک شاہِ معظم اے خداوندِ جہاں　　　اے تو دارائے ماں ہم تو دارائے زمیں

خسروانت زیر فرماں پہلوانانت بزیرِ حکم　　　آفتابت زیر رائے و آسمانت زیرِ نگیں

یہ ملک شاہ (برادرِ فیروزشاہ) یقیناً سنجر (المتوفی ۵۵۲ھ/۱۱۵۷ء) کے بعد تخت نشین ہوا، انوری

(حاشیہ ص۲۰۸) لے جلد دوم - ۳۷۹،

صاف کہتے ہیں :-

ماتم سنجر اگر قتل ملک شہ تازہ کرد   اے ملک شاہ معظم سور آں ماتم توئی (ص۱۴)

دوسرے مصرع میں اسی ملک شاہ بن طغان تگین کی طرف اشارہ ہی جو سنجر کے بعد ہوا ہی، میرا خیال ہے کہ فیروز شاہ جب بلخ سے ترمذ کو ہجرت کرتا ہی تب اس کے بھائی ملک شاہ کو بلخ کی حکومت حاصل ہوتی ہی، اس کے متعلق انوری کے یہاں صاف اشارہ ملتا ہی :-

از پس آں کہ بیک مہر دو الف ملکی   داشت در بلخ ملک شاہ بتو ارزانی

وز پس آں کہ ز انعام جلال الوزرا   بتو ہر سال دہ مہری و پانصد کانی (ص۲۲۵)

دوسرے مصرع میں اسی ملک شاہ کی طرف اشارہ ہے، جو بلخ کا حاکم تھا، اور جس کی تربیت حاصل کرنے کے بعد انوری اس کے بھائی فیروز شاہ کے وزیر جلال الوزرار کا مداح ہوا، اور ممکن ہی کہ ان دونوں بھائیوں میں سے کسی ایک کا خطاب طغرل تگین ہو جس کے عہد میں انوری کو حاسدوں کی وجہ سے بلخ والی مصیبت بھگتنی پڑی ہو اور جس کے سوگندنامے کی تاریخ انوری نے لکھی ہے :-

حبذا تاریخ ایں انشا کہ فرماندہ بہ بلخ   رایت طغرل تگیں بودہ ست و رائے ناصری

جلال الوزرار کی مدح میں ص۱۱ پر جو قصیدہ ہے اس کے چند شعر یہ ہیں :-

من بندہ کز ہیبتش نہ زد زخم درشتی   گردوں کہ نہ احوال من اورا بسر آمد

در مدت دہ سال کہ ایں گوشہ و سکنہ   در قبہ اسلام مرا مستقر آمد

ہر نور نظامے کہ در آمد ز در من   از جود تو آمد نہ ز جائے دگر آمد

اس کے پہلے شعر میں ممکن ہی کہ اُسی بلخ والی مصیبت کی طرف اشارہ ہو؛ جہاں وہ دس سال سے تھا، قبہ اسلام سے مراد یقیناً بلخ ہے جیسا کہ سوگندنامے (ص۲۴۰) میں بھی ہے :-

قبۃ الاسلام را ہجو لے مسلماناں کہ گفت ۔۔۔ حاش للہ بااللہ ار گوید جہود خیبری

اس قبۃ الاسلام (بلخ) میں انوری دس سال رہ چکا تھا، اور اسی وجہ سے اس کے حاسدوں نے اس کے ساتھ شرارت کی تھی:-

تا تو فرصت جوے کردی از کمیں گاہ حسد ۔۔۔ غصۂ دہ سالہ را با من بصحرا آوری (ص ۲۷۲)

ہجو بلخ والا زمانہ جیسا کہ تنقید میں کہا گیا ہے، وفات سنجر (۵۵۱ھ ۱۱۵۶ء)[1] کے بعد اور وفات قاضی حمید الدین (المتوفی ۵۵۹ھ ۱۱۶۴ء) کے پہلے ہوا ہوگا، کیونکہ قاضی صاحب سوگند نامے میں زندہ معلوم ہوتے ہیں، اور طغرل تکین اس وقت حاکم بلخ تھا[2] جو یقیناً سنجر کے بعد ہوا تھا، لیکن ظن غالب یہی ہے کہ ہجو بلخ کا زمانہ ۵۵۹ھ ۱۱۶۴ء کے قریب[3] کچھ پہلے ہوگا، کیونکہ سوگند نامے میں جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، بلخ والے حاسدوں کے دس سال کے حسد کا تذکرہ کیا ہے، اور یہ حسد غالباً مجد الدین ابو طالب بن نعمہ اور قاضی حمید الدین وغیرہ بلخی ممدوحین کی مدح کی وجہ سے پیدا ہوا ہوگا، اور ان لوگوں کی مدح اور تعلق کا زمانہ ۵۵۰ھ ۱۱۵۵ء کے پہلے نہیں معلوم ہوتا، کیونکہ اس کے پہلے انوری اپنے خاص ممدوح ناصر الدین ابو الفتح (المتوفی ۵۴۸ھ ۱۱۵۳ء) کی تربیت سے مستفیض تھا، جس کے بعد ہی اُسے کسی اور ممدوح کی ضرورت ہو سکتی تھی،

۵۵۰ھ ۱۱۵۵ء میں بلخ کے قاضی حمید الدین کی مدح میں ایک قطعہ لکھا، جیسا کہ اُس کے ایک شعر سے صاف معلوم ہوتا ہے:-

---

[1] وفات سنجر کی یہ تاریخ راحت الصدور (ورق ۷۶ ب) میں ہے، ورنہ روضۃ الصفا (جلد چہارم ص ۹۹) وغیرہ میں ۵۵۲ھ ہے۔ [2] کچھ مفید شعر اس کے متعلق یہ ہیں:-

اختیار تاج و تخت نیست ورنہ چیست کم ۔۔۔ از دگر ہا شان و شکوہ و شوکت طغرل تکیں
ہفت کشور زیر فرمان کرد و نوبت ہم نزد ۔۔۔ صبر کن تا پنج گردد نوبت طغرل تکیں
ملک اگر در نوبت سنجر بہ آخر بر گشت ۔۔۔ شد جواں بار دگر از نوبت طغرل تکیں

(ص ۲۳۳)

[3] براؤن نے (ج ۲ ص ۳۸۳) ہجو بلخ کو ۵۴۱ھ کے بعد قرار دیا ہے،

دیرماں اے بعد آں کہ پانصد و پنجاہ سال نظم و خطت بر نبوت حجت پیغمبر است

(کلیات انوری ص ۶۲۱)

اسی قطعہ کے کچھ اشعار یہ بھی ہیں :-

قطعۂ صدر اجل قاضی قضاۃ شرق و غرب آں کہ بر عالم نفاذ او قضائے دیگر است

چاکران حضرتش را نز دمن آورد وے چاکران حضرت او را چومن صد چاکر است

چوں نہادم بر سر و بر دیدہ آں تشریف را کز عزیزی داشت ہمچو دیدگانم در سر است

اور پھر ۵۵۱ھ/۱۱۵۶ء ہی میں جب مقامات حمیدی کی تالیف ہوئی تھی یہ شعر لکھے گئے ہونگے :-

ہر سخن کاں نیست قرآں یا حدیث مصطفیٰ از مقامات حمید الدین شد اکنوں ترہات (ص ۶۲۰)

ان اشعار کے علاوہ یوں بھی ۵۵۱ھ/۱۱۵۶ء کے پہلے انوری ہزل کی طرف متوجہ نہ ہوا ہوگا، کیونکہ ۵۴۸ھ/۱۱۵۳ء تک اس کا ممدوح ناصر الدین ابو الفتح اس کا کفیل رہا ہوگا، پھر اسی سال اس ممدوح کے انتقال کے بعد اور آخر سال میں سنجر کی قید پر اس نے "فغان خراسان" لکھی ہوگی جس کا مطلع یہ ہے :-

بر سمرقند اگر بگذری اے باد سحر نامۂ اہل خراساں ببر خاقان بر (ص ۱۶۷)

اس کی تاریخ پروفیسر براؤن نے (جلد دوم ص ۳۸۶) ۵۵۱ھ/۱۱۵۶ء لکھی ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ وہ یقیناً ۵۴۸ھ/۱۱۵۳ء کے بعد ہی کی تصنیف ہے، کیونکہ اس سال والی مصیبت ایسی نہ تھی کہ دو سال سے پہلے اس کے خلاف جوش نہ پیدا ہوتا،

پھر سنجر کی قید کے بعد ہی جب غزوں کا ایلچی طوطی حاکم بن بیٹھا تو انوری نے اسکی بھی مدح کی ہے جو ۵۴۹ھ/۱۱۵۴ء ہی میں لکھی ہوگی، مطلع یہ ہے :-

اے بہ استحقاق شاہ شرع را قائم مقام وز قدیم الدہر شاہاں پیشوائے خاص و عام (ص ۲۶۶)

اور اس کے بعد ہی انوری بلخ کی طرف متوجہ ہوا ہوگا، جس کی تاریخ اوپر مذکور ہو چکی ہے "اور یہی تاریخ (۵۵۵ھ) ایسی تھی جو ہجو بلخ والے واقعہ کے تقریباً دس سال پہلے واقع ہوئی تھی،

۵۵۱ھ سے قاضی حمید الدین ضرور انوری کے ممدوح بن گئے تھے، لیکن بلخ کے "صدر" مجد الدین ابو طالب بن نعمہ جن کا تذکرہ آگے آئیگا انوری کی طرف جلد متوجہ نہیں معلوم ہوتے، اسی لئے انوری کو کہنا پڑا:-

مدتے شد کہ دریں شہر مقیم است ہنوز — ہیچ در بانش نداند بدر ایچ سرائے
خدمت حضرت تو یک دو سہ بارش رفت — اندراں موسم غم پرور و شادی فرسائے
(۴۳۳)

دوسرے شعر میں "موسم غم پرور" کا ذکر ہے، وہ غالباً سنجر کی قید کا زمانہ ہے، جس کو غالباً پیرو شاہ احمد کی مدح والے قصیدہ میں بھی اس طرح کہا ہے:-

ہر شادی کہ فتنہ زمانوت کردہ بود — آں را بہ یک لطیفہ قضا کرد روزگار (۳۵۱)

اسی قصیدہ میں بلخ والے مجد الدین ابو طالب کی مدح بھی ہے اور پھر رے والے مجد الدین ابو الحسن عمرانی سے مقابلہ بھی ہے:-

اے مجد دین و صاحب ایام و صدر شرق — دیدی چہ خدمتے بسزا کرد روزگار
و آنجا کہ ذکر صاحب رے رفت و ذکر تو — بر عہد دولت تو دعا کرد روزگار
(۱۵۲)

(باقی)

شعر العجم حصہ چہارم

اس میں تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ ایران کی آب و ہوا اور تمدن اور دیگر اسباب نے شاعری پر کیا اثر کیا، کیا کیا تغیرات پیدا کئے اور شاعری کے تمام انواع و اقسام میں سے مثنوی پر بسیط تبصرہ، قیمت عہ

"مینجر"

تلخیص و تبصرہ

ادب و ادبی ذوق

اکثر لوگون کا خیال ہے کہ ادبی ذوق ایک ایسا بلند کمال ہے جس کا حاصل کرنا نہ صرف ان کی شخصیت کی تکمیل کا باعث ہوگا بلکہ انھین ایک معقول سوسائٹی کا موزون رکن بنا دیگا، وہ اپنی ادب ناشناسی سے دل مین اسی طرح شرمندہ ہوتے ہین، جیسے بعض ضروری آداب سے ناواقفیت پر، ان کا خیال ہے کہ انسان کو جن چند مخصوص چیزون سے واقف ہونا چاہئے انمین سے ادب ایک ضروری چیز ہے، اور لباس و اطوار و گفتار و کردار کے محاسن کے ساتھ، ادب سے روشناس ہونا بھی ان کے لئے لازمی ہے، ادبی ذوق ایک دلچسپ مشغلہ ہے جس سے دو مقاصد کی تکمیل ہوتی ہے، وہ صحیح معاشرت کی سند اور ذاتی تفریح کا وسیلہ ہے،

لیکن یہ خیال صحیح نہین، جو درا صل ادب اور اس کے منصب کو سمجھتا ہے، اس کی نظر مین یہ خیال بالکل مضحکہ انگیز ہے، جو لوگ ادبی ذوق کو صرف ایک کمال اور ادب کو صرف ایک دلچسپ مشغلہ سمجھتے ہین ان کو نہ تو اس کمال کے حصول مین حقیقی کامیابی حاصل ہوگی اور نہ اس کو وہ بطور دلچسپ مشغلہ کے اختیار کر سکین گے، گو ادبی ذوق ایک اعلیٰ ترین کمال اور ادب ایک نہایت دلچسپ مشغلہ ہے،

اصل یہ ہے کہ ادب بجائے ایک ضمنی شے کے، کمل معاشرت اور زندگی کا سنگ بنیاد ہے، جو ذوقِ ادب سے محروم ہے، اس کی مثال اس شخص کی ہے جو آزاد شہری کے حقوق سے

محروم ہے، یا قبل پیدائش کی نیند سے بیدار نہین ہوا ہے، بلکہ پیدا ہی نہین ہوا ہے، وہ پورے طور سے دیکھ نہین سکتا، صرف شکم پروری کر سکتا ہے، جو لوگ ادب کے حقیقی منصب سے واقف ہین اور اس سے استفادہ کر چکے ہین ان کے لئے اس سے زیادہ اذیت کا کوئی سامان نہین کہ کسطرح ہزارون آدمی اس خود فریبی مین مبتلا ہین، کہ وہ بیدار ہین، حالانکہ ان کی بیداری کسی طرح غنودگی سے کم نہین،

ادب کیا چیز ہے؟ اس کا واضح جواب کوئی نہین دے سکتا، یہ ایک راز ہے جس پر صرف شعاعین ڈالی جا سکتی ہین، اور اشارے کئے جا سکتے ہین، مین آپ ہی کے واقعہ سے اس راز کی جانب آپ کی رہنمائی کرون گا، ایک مخلص اور رازدار دوست کے ساتھ چہل قدمی مین کسی حسین منظر کے پرکیف نظارہ سے آپ لطف اندوز ہوتے رہے، تھوڑی دیر تک یہ مسئلہ آپ کے دل کا راز اور آپ کی توجہ کا مرکز بنا رہا، بالآخر وارداتِ قلب کی لطافت اور جذبات کے کیف سے سرشار ہو کر آپ نے ہمدرد دوست سے پورے لطف بیان کے ساتھ اس راز کو بیان کر دیا جس وقت ان تاثرات کا بے ساختہ اظہار آپ سے ہوا، اس وقت آپ ادب کی دنیا مین تھے،

اصل یہ ہے کہ یہان حقیقت کا سوال نہین، یہ سب دل کے تاثرات کا اعجاز ہے، تاثرات سے آپ متاثر ہو سکتے ہین، اور آپ کو ہونا چاہئے، دنیا معجزات سے معمور ہے، جمال کا منظر حسن کا ایک معجزہ تھا، نظر نے اس کا انکشاف کیا، دل نے اس کو قبول کیا، اس انکشاف کے کیف سے آپ لبریز ہو گئے، آپ نے محسوس کیا کہ دوسرون کو اس نظارے سے لذت آشنا کرنا آپ کا فرض ہے، آپ ایک جذبہ سے سرشار تھے، دوسرون سے اس کا اظہار لازمی تھا، آپ کے سامنے دنیا تھی جس کو آپ دعوتِ کیف دینا چاہتے تھے، غور کیجئے آپ کے دست نگ

آپکے تاثرات اور گفتگو کا کیا اثر ہوا، دوست کو معلوم تھا کہ جو کچھ آپنے دیکھا تھا وہ حسن مطلق نہ تھا نہ کوئی اس کو اس بات کا یقین دلا سکتا تھا، لیکن آپ نے اس کا نظارہ ایسی نگاہ اور اس اخلاص سے کیا اور وفور کیف سے کچھ اس طرح بیخود ہو کر دوست کو اس سے آشنا کرنا چاہا کہ دوست محسوس کرنے لگا کہ وہ اس سے قبل اس حسن کا نظارہ کرنے کے لئے محروم بصارت تھا، محروم تماشا کو حسن، حیرت اور اعجاز کے کرشمون کی دعوت دینا، اور ان سے آسودہ کرنا ادب کا منصب ہے،

ادب کا احیار اسی طرح ہوتا ہے، اور یہی ادب آفرینی کہلاتی ہے، آپ بیدار ہو گئے اور کسی حد تک دنیا کے حسن و جمال اور اس کی بوقلمونی کا نظارہ کرنے کے لئے آپ کی آنکھون اور کانون سے پردے ہٹ گئے، لیکن خود تنہا دیکھنا اور سننا کافی نہ تھا، بلکہ دوسرون کو بھی اس لطف مین شریک کرنا ضروری تھا، ان کو شریک کرکے آپنے بیدار کر دیا، ممکن ہے دوسرے ہی دن آپکے دوست نے حسن کا نظارہ کیا ہو، اور اس کو حسن کا معجزہ سمجھا ہو، یہ ادب کی کارفرمائی ہے،

بانیانِ ادب وہ ہستیان ہین جنھون نے کائنات کی معجزانہ دلچسپی اور دلکشی کو دیکھا اور محسوس کیا ہے، ادب کے بانیانِ اعظم وہ لوگ ہین جن کی نظرین نہایت وسیع اور جن کے احساسات نہایت عمیق ہین، ان کی زندگی کیف و انبساط کی ایک مسلسل کڑی ہوتی ہے، اسی لئے وہ ایک خشک و بے کیف دنیا کے وجود یا تصور سے انکار کرتے ہین، کیا یہ تصور کچھ کم اہم نہین کہ دنیا کوئی خشک و بے رنگ جگہ نہین ہے، اور کیا پہاڑی کے تنگ و تاریک سرنگ سے نکل کر کشادہ سرسبز وادی مین پہنچ جانا کوئی بات ہی نہین اور احساسات کی بیداری اور زندگی کے کیف و سرور سے دل مین تپش اور قلب مین حرکت کا پیدا ہونا بے معنی ہے، ادب کے بانی آپ کو اپنا ہمسر بناتے اور اپنی سطح پر لاتے ہین،

ادب کے مطالعہ کا مقصد فرصت کے اوقات کو لطف کے ساتھ گذارنا نہین ہے، بلکہ

اپنے کو بیدار کرنا متحرک زندگی بسر کرنا لطف، ہمدردی اور ادراک کی صلاحیتون مین زور اور قوت پیدا کرنا ہے، ادب کا اثر ایک نہین بلکہ چوبیس گھنٹہ ہونا چاہئے، ادب دنیاوی تعلقات مین یکسر انقلاب پیدا کر دیتا ہے، ادب کو پوری طرح سمجھنے سے دنیا کو صحیح طور پر سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے، ادب کا مقصد اس سے زیادہ ہرگز نہین ہے، ادب زندگی کے تمام شعبون کا مربوط اور متوازن خاکہ پیش کرتا ہے، ادب کی روح مختلف چیزون کو اتحاد کی لڑی مین پرو دیتی ہے، ادب شمع اور تارہ کو متحد کر دیتا ہے، ادب کے پیش کردہ خاکہ مین ایسا سحر ہوتا ہے کہ کل کا حسن جز مین نظر آنے لگتا ہے، جمال کو بے نقاب کرنے اور مختلف النوع چیزون کو اپنی روشنی کے گرداب مین لینے سے ادب آسودہ نہین ہوتا، بلکہ ہر جگہ سبب اور اثر کی بحث سے اخلاقی حکمت پیش کرتا اور اس کو قبول کراتا ہے، غرض ادب اول و آخر زندگی کا ایک وسیلہ ہے، اور ادبی ذوق حاصل کرنا ایک کارنامہ ہے جو ادب کو بہترین مصرف مین لانے سے مکمل ہوتا ہے، جو لوگ بیدار زندگی سے بیزار اور صرف سونا اور اونگھنا چاہتے ہین اون کا ادب سے دور ہی رہنا مناسب ہے،

ادب عالی | ہر ادب کی بلند پایہ، مستند اور معتبر تصانیف اور ان کے مصنفین کلاسکس (ادب عالی) کا درجہ اور نام حاصل کرتے ہین، یہ درجہ ان کو دوام بخشتا ہے، ان کی قدر و قیمت عوام کی قدردانی سے بلند اور اکثریت انسے ناآشنا اور فروتر ہوتی ہے، ادب عالی کا واسطہ صرف مخصوصین سے ہوتا ہے، بہت تھوڑی تعداد ادب عالی کے وزن و وقار کا تحمل کر سکتی ہے، اگر آج اس ناول کے متعلق ان لاکھون آدمیون کی رائے طلب کی جائے جو دس سال قبل اس کتاب کو پڑھکر بے اختیار وجد کرتے تھے تو آپ کو معلوم ہوگا، کہ وہ اس کتاب کو بالکل بھول چکے ہین، اور اس کے پڑھنے کا خواب بھی نہین دیکھ سکتے، اور اگر اس کو پڑھین گے بھی تو لطف اندوز

نہ ہون گے، اس کا سبب یہ نہین کہ وہ کتاب اس مدت مین پست ہوگئی یا پڑھنے والون کا مذاق بلند ہوگیا ہے، بلکہ اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ ان لوگون نے اپنے مذاق پر اعتماد کرنا نہین سیکھا جس کی مشق دائمی لطف اندوزی کا باعث ہوتی، آج بھی انھین یہ نہین معلوم کہ کس چیز سے وہ لطف اندوز ہو سکتے ہین،

اگر یہ سوال کیا جائے کہ کلاسیکل مصنفین کی اہمیت اور عالمگیر شہرت ابتک کیون قائم ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان مصنفین کی شہرت اکثریت کی بالکل مرہونِ منت نہین، وہ اکثریت کی داد و قدر دانی سے بالاتر ہین، ان کی شہرت بنیادی ہوتی ہے، جس کو وہ مخصوصین قائم رکھتے ہین جن کے قلب مین جذبات کی حرارت ہوتی ہے، کیا آپ کا خیال ہے کہ شیکسپیر کی شہرت ہفتہ عشرہ بھی قائم رہ سکتی تھی، اگر اس کے نقیب معمولی درجہ کے لوگ ہوتے؟ صف اول کے مصنفین کی شہرت کو ہمیشہ ان چند مخصوص ہستیون کی گرمیِ ذوق سے قوت پہنچتی ہے جن کے قلب جذبات سے گرم ہوتے ہین، مصنفین کی بعد از مرگ شہرت بھی صرف چند مخصوص عقیدت مندون کی عقیدت، اور استقلال کا نتیجہ ہوتی ہے، یہ مختصر لیکن عقیدت مند جماعت اپنے مصنف سے کبھی بے تعلق نہین ہو سکتی اور اس سے لطف اندوز ہوتی رہتی ہے، اسکا تذکرہ اور مطالعہ ایسے ذوق و شوق سے کرتی ہے اور اس کے بارے مین اپنے کو ایسا حکم سمجھتی ہے، اور اپنے مین ایسی خود اعتمادی محسوس کرتی ہے کہ بالآخر اکثریت اس مصنف کے نام سے مانوس ہو جاتی ہے، اور خاموشی کے ساتھ اس کے نظریہ سے اتفاق کرتی ہے کہ وہ مصنف عام انسانون کی سطح سے اونچا تھا،

ایسے مصنفین کی شہرت کا مدار صرف ان کے چند مخصوص اور پرشوق پرستارون پر ہوتا ہے جس کو وہ ہمیشہ زندہ رکھتے ہین، وہ جوہر کی تلاش کرکے اس کو روشن کرتے ہین، ان کا شوق دائمی ہوتا ہے، اس لئے بلند پایہ مصنفین کے فراموش ہو جانے کا امکان نہین، اکثریت شہرت

کو وجود مین ضرور لا سکتی ہے، لیکن وہ پھر اس سے بالکل بے پرواہ بھی ہو جاتی ہے، قلیل التعداد پرستارون کی کامیابی کا راز ادب سے ان کا حقیقی شغف ہے، وہ ادب مین شراب کی کیفیت محسوس کرتے ہین، یہ کیف، ان کے ذوق اور دلچسپی کو زندہ رکھتا ہے، اور تجربہ کی وسعت کے ساتھ ساتھ ان کا ذوق صحیح اور پختہ ہوتا جاتا ہے، اسی لئے یہ ممکن نہین ہے کہ آج کسی کتاب کے حسن وقبح کے متعلق ان کی ایک رائے ہو اور کل بدل جائے، جو کتاب ان کے نزدیک پسندیدہ نہین ہے، عوام مین اس کی مقبولیت کے باوجود وہ اس کے محاسن کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہون گے، اسی طرح کسی بلند پایہ کتاب سے عوام کی سرد مہری ان کے یقین کو متزلزل نہین کر سکتی، کتاب کی وہ کونسی خوبیان ہیں جو ان چند پُرشوق ہستیون کو اس کا گرویدہ بنا دیتی ہین، یہ ایک ایسا دشوار سوال ہے جس کا تشفی بخش جواب آجتک نہین دیا گیا ہے، آپ کہہ سکتے ہین کہ صداقت، بصیرت، آگہی، فراست، ظرافت اور دلکشی (حسن)، خوبیون کے عناصر ہین، لیکن ان مجمل الفاظ سے مقصد حاصل نہیں ہوتا، ان مین سے ہر لفظ محتاجِ تشریح ہے، خصوصاً اول و آخر کے الفاظ، ایک بلند پایہ شاعر اپنے لطیف انداز مین حسن کو صداقت اور صداقت کو حسن بتاتا ہے، بڑے بڑے ناقدین اس کی وضاحت نہ کر سکے کہ وہ کسی تصنیف کو کیون دلکش سمجھتے ہین، کتاب کی دلکشی کا سبب اس کا دلچسپ اور انبساط انگیز ہونا ہے، لیکن ایسا کیون ہے، اس کا کوئی جواب نہ دے سکا، مخصوص اصحابِ ذوق کا مخصوص بلند پایہ تصانیف سے لطف اندوز ہونا ایک راز ہے،

ادبیات عالیہ (کلاسکس) سے صرف مخصوصین لطف اندوز ہوتے ہیں، ان سے ان کی دلچسپی گہری اور دائمی ہوتی ہے، ادب عالی کا بقا کسی اخلاقی بنا پر نہین ہے، بلکہ وہ صرف اسی سے زندہ و باقی ہین کہ لطف و انبساط کا سرچشمہ ہین، خاص اصحاب ذوق اس کو اسی طرح نظرانداز نہیں کر سکتے، جس طرح شہد کی مکھی پھول سے بے نیاز نہین کر سکتی، ادب عالی مبالغہ سے مبرا

اور آورد سے پاک ہوتا ہے، اس کو عالی دماغ مصنف کا ذہنی توازن نشیب و فراز سے بلند رکھتا ہے، کلاسکس کے انبساط مین شدت نہین، بلکہ لطف و نزاکت ہے، اسکا حسن روح مین جذب ہوتا ہے، ضرب نہیں پہنچاتا،

اسلوب بیان | موضوع اور اسلوبِ بیان کا حقیقی و بنیادی تعلق ہے، خیال کی آفرینش الفاظ کے جامہ مین ہوتی ہے، یہی الفاظ کا جامہ اسلوبِ بیان ہوتا ہے، جو بالکل خیال کا پابند ہوتا ہے، اسلوبِ بیان کی وضاحت اور دلنشینی کا مدار خیالات کی وضاحت و حسن پر ہوتا ہے، سلاستِ خیال اور سلاستِ بیان دونون لازم ملزوم ہین، مصنف کا اسلوبِ بیان مقرر کے لہجہ و طرز بیان کا مترادف ہوتا ہے، جس طرح کسی کا طور طریقہ اس کے کیرکٹر کا آئینہ ہوتا ہے، اسی طرح مصنف کا اسلوبِ بیان اس کے خیال یا پیام کا آئینہ دار ہوتا ہے، موضوع کی خوبی و خرابی طرز تحریر مین جھلکتی ہے، مصنف کی کیفیات اس کی طرز نگارش مین نظر آتی ہین، وہ اس کا ایسا مرقع ہوتی ہے جس مین وہ خود مجسم نظر آتا ہے،

جب مصنف اپنے حدود سے بڑھکر آتش نوائی کرنے لگتا ہے تو اس وقت اسلوبِ بیان کا سوال نہین رہ جاتا، بلکہ وہ اپنے موضوع سے فضا کو گرم و متلاطم کر دیتا ہے، طرز نگارش موضوع مین گم ہوجاتی ہے، اس کیفیت کا تعلق صرف موضوع سے ہوتا ہے، اس وقت اسلوب کا حسن معطل اور مردہ ہوجاتا ہے، صرف موضوع کی کارفرمائی رہ جاتی ہے، لیکن جب مصنف اپنے صحیح مقام پر ہوتا ہے، اور وہ اپنے جذبات کو متوازن اور مربوط رکھتا ہے، اس وقت اس کی طرز نگارش اس کی حقیقت بلکہ اس کی کاملیت کی آئینہ دار ہوتی ہے، معلوم نہین تنہا طرز نگارش کی فریفتگی کا کیا مقصد ہے، محض حسن بیان سے کلام یا تحریر مین حقیقی روح اور دائمی زندگی پیدا نہین ہوتی، جبتک خیالات مین بلندی کی بجلی نہ کوندتی ہو، جو لوگ کسی مصنف کا مطالعہ صرف اس کی طرز تحریر کی کشش کیوجہ سے کرتے ہین

وہ بہت جلد اس سے اکتا جائین گے،

اصل شے مصنف کے خیالات و جذبات ہین، اس لئے کسی تصنیف کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ کو اپنے جذبات کا تجزیہ کرنا چاہئے کہ آپ اس سے کچھ مستفید بھی ہوئے یا صرف مصنف کی شیرین زبانی ہی سے محفوظ ہوتے رہے، اگر صرف شیرین زبانی سے محظوظ ہوتے رہے تو آپکو غور کرنا چاہئے کہ جو لطف و تفریح کا زمانہ آپ نے کسی تسکر وہن کے ساتھ بسر کیا ہے اس سے آپ کس طور پر متاثر ہوئے ہین، اور اگر مصنف کی ظرافت سے لطف اندوز ہوئے تو ایسے مصنف کا درجہ ایک مسخرے سے زیادہ نہیں ہے، لیکن اگر مصنف نے وہ بات کہی ہے جس کی اثر پذیری مسلم ہے، تو اس کی تحریر کی بے لطفی نظر انداز کرنے کے لایق ہے، دوست کا جسمانی صفا اور سیماب وشی کسی حد تک گران خاطر ہو سکتی ہے، لیکن اس کے اطوار کو ناپسندیدہ نہین کیا جاسکتا، اگر کسی مصنف کی طرز ادا نے فوراً ہی آپ کو بیخود و سرشار کر دیا، تو یہ آپ کو سوچنا چاہئے کہ اس شخص کے بارے مین آپ کی کیا رائے ہوگی جو پہلی ہی ملاقات مین آپ پر اپنی شخصیت کی باڑھ مارتا ہے، آپ کو غور کرنا چاہئے کہ جس شخص کو آپ اپنی عقیدت کا نذرانہ پیش کرتے ہین اس نے آہستہ آہستہ اپنا پیام آپ کو دیا ہے، یا تماشہ کی ابتدا، آتش بازی سے کی ہے،

طرز انشاء پر اسی طرح نگاہ ڈالنی چاہئے جس طرح زندگی کا جائزہ لیا جاتا ہے، بلا شبہہ طرز نگارش شخصیت کی بالکل تفسیر ہوتی ہے، اور اسکی اہمیت کو نظر انداز نہین کیا جاسکتا، اور یہ خیال صحیح نہین ہے کہ موضوع سے لطف اندوز ہونے مین، طرز انشاء حائل نہیں ہو سکتا، لیکن یہ خیال بھی صحیح نہین کہ صرف طرز انشاء کی خوبی کافی ہے، یہ دونون چیزین اپنی جگہ پر اہم ہین، اور ایک بلند پایہ مصنف کے لئے دونون کا لحاظ رکھنا ضروری اسوقت اس کی تصنیف کامیاب تصنیف کہلانے کی مستحق ہوگی،

"ن ص"

اخبار علمیہ

چاند کا کرہ اور زندگی

تمام سیاروں میں سب سے چھوٹا چاند ہے، اور سورج سے تو بہت ہی چھوٹا ہے، ہم کو اتنا بڑا اس لئے دکھائی دیتا ہے کہ زمین سے سب سے قریب یہی سیارہ ہے، اس کا فاصلہ زمین سے کل ۳۸۴،۴۰۰ کیلومیٹر ہے، جو دوسرے سیاروں کے فاصلہ کے مقابلہ میں بہت کم ہے لیکن اس قربت کے باوجود ہم کو اس کے اندرونی حالات سے بہت کم واقفیت ہے، بڑی اور طاقتور دوربینوں سے اتنا تو پتہ چلتا ہے کہ اس میں خشک زمین اور بے آب و گیاہ صحرا موجود ہیں، لیکن زندگی کا کوئی سراغ نہیں ملتا، ممکن ہے اس میں نباتات اور حیوانات کا وجود ہو، لیکن موجودہ دوربینیں اس کے بتانے سے قاصر ہیں، چاند کے اندر جو سب سے چھوٹی چیز دکھائی دیتی ہے وہ ایک عمارت کے حجم کے برابر ہے، اس سے چھوٹی کوئی چیز نظر نہیں آتی، اس لئے اگر وہاں زندگی ہے بھی تو اس کا دیکھنا ممکن نہیں ہے، اور ہمارے پاس قیاسات و قرائن کے علاوہ اس کے علم کا کوئی یقینی ذریعہ نہیں ہے، نباتی اور حیوانی زندگی کے لئے سب سے ضروری چیز پانی ہے، جس کے بغیر ان کا وجود ممکن نہیں ہے، اور پانی کا مشاہدہ دوربین کے ذریعہ آسانی کے ساتھ ہو سکتا ہے، مثلاً اگر چاند کے کرہ سے کرۂ زمین کو دوربین سے دیکھا جائے تو اس کے سمندر اور پانی کے بادل نظر آئیں گے لیکن زمین سے چاند میں پانی اور

اور اس کے بخارات کا کوئی نشان نہین ملتا، اس سے محققین نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ چاند کا کرہ بے آب و گیاہ بیابان ہے، جسمین زندگی ممکن نہین ہے، زندگی کا دوسرا ضروری عنصر ہوا بھی اسمین موجود نہین ہے، ممکن ہے تھوڑی بہت گیس پائی جاتی ہو، لیکن وہ ہوا نہین ہے، اس لئے وہان زندگی کا کوئی امکان نہین معلوم ہوتا، زمین مین، ہوا، بارش، جنگل اور برف کے عوامل ہمیشہ پہاڑون سے پانی رساتے رہتے ہین، لیکن چاند مین سرے سے یہ عوامل موجود نہین ہین، چاند کے اس پار بے شمار کرے ہین لیکن اس کا علم کہ وہ آباد ہین یا ویران ممکن نہین ہے، زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان مین گھاس جو زندگی کا ادنی ترین مظہر ہے موجود ہے، لیکن چاند کا کرہ ہوا اور پانی دونون سے خالی ہے، اس لئے اس مین کسی قسم کی نباتی اور حیوانی زندگی کا امکان نہین ہے،

ترکی مین پارچہ بافی کی ترقی

ٹرکی مین جمہوریت کے قیام سے پہلے روئی اور سوت کی کوئی قابلِ ذکر صنعت نہ تھی، اور اس مین وہ دوسرے ملکون کی محتاج تھی، لیکن اب روئی کی کاشت اور سوت کے کارخانون مین غیر معمولی ترقی ہورہی ہے، سب سے پہلے ترکی نے روئی کے بیج ہندوستان سے حاصل کئے تھے جمہوریہ ترکی روئی کی کاشت اور سوت کے کارخانوں کی ترقی کی انتہائی کوشش کررہی ہے، تاکہ مستقبل قریب مین کپڑون کے لئے وہ دوسرے ملکون کی محتاج نہ رہ جائے، اس کوششون کا نتیجہ یہ ہے کہ ۱۹۲۳ء سے لیکر ۱۹۴۱ء کے درمیان روئی کی کاشت تگنی ہوگئی ہے، چنانچہ اب ۱۰۰،۰۰۰ سے لیکر ۲۰۰،۰۰۰ بالہ (ایک بالہ ۲۰۰ کیلوگرام کا ہوتا ہے) تک روئی پیدا ہوتی ہے، عصمت انونو نے اپنی وزارت کے زمانہ مین ایک پروگرام بنایا تھا جس کے مطابق روئی کی کاشت کا رقبہ پہلے سو

بہت زیادہ بڑھ جائے گا، اور اس کی پیداوار ۰۰۰،۰۰۵ بالہ تک پہنچ جائے گی ازمیر کے علاقہ مین امریکی روئی کی کاشت کے جو تجربے کئے گئے ہیں وہ بڑے کامیاب ہوئے ہین، امید ہے کہ اس علاقہ مین بڑے ریشہ کی اعلیٰ قسم کی روئی جنوبی علاقہ کی روئی سے بہتر ہوگی، ان علاقون کے علاوہ ٹرکی اور روس کے سرحدی علاقے اور سقاریا کے نواح مین بھی روئی کی کاشت شروع ہوگئی ہے، وزیر زراعت نے ابتدائی تجربون کے لئے بہت سے نئے کھیت تیار کرائے، اور روئی کی قسمون کے مطالعہ کیلئے تعلیم گاہین قائم کی ہین، اس سے پہلے ٹرکی مین معمولی قسم کا موٹا کپڑہ بھی تیار نہ ہوتا تھا لیکن اب ہر قسم کے کپڑون کیلئے استنبول اور ازمیر مین جدید ترین طرز کے کارخانے قائم ہوگئے ہین، جن مین ہزارون مزدور کام کرتے ہین، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ادھر چند برسون کے اندر ترکی میں بیرونی کپڑون کی آمد کل دس سے پندرہ ہزار ٹن تک رہ گئی ہے، یہ کارخانے اپنے ملک کی روئی سے ہر قسم کے اعلیٰ سے اعلیٰ کپڑے تیار کرتے ہین، اگرچہ جمہوریہ ترکی کے قیام سے ابتک اس کے سامنے مختلف قسم کی مشکلات رہین، لیکن اس کے باوجود ملک کی ترقی کا قدم برابر آگے بڑھتا رہا، پارچہ بافی کے علاوہ اور بھی بہت سی مصنوعات کے کارخانے جن کے لئے ترکی دوسرے ملکون کی محتاج تھی قائم ہوگئے ہین، اس سے ملک کی ضروریات زندگی کی فراہمی اور اس کی اقتصادی حالات کی مضبوطی کے بارہ مین حکومت کی بیدار مغزی کا اندازہ ہوتا ہے،

اسلامی ممالک کی بعض تعلیمی خبرین

عراق کی وزارت تعلیم نے حال مین نوجوانون کے وطنی فرایض کی تعلیم کے لئے بغداد مین ایک مدرسہ قائم کیا ہے، عنقریب موصل مین بھی اسکی تقلید ہوگی، یہ حکومت کی جانب سے نظام تعلیم کی اصلاح کا پہلا قدم ہے، اس مدرسہ میں ابتک صرف بغداد کے تین سو طالب علم داخل

ہو چکے ہیں، طلبہ کے موجودہ رجحان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو سب سے زیادہ ذوق شہسواری، تیراکی اور امداد عامہ (ریلیف) کی تعلیم سے ہے، عنقریب فوجی افسر نوجوانون کے سامنے ان کی ان ذمہ داریون پر جو جنگ کے بعد ان پر عاید ہون گی لکچر دینگے،

برطانوی مشرقی افریقہ مین جمعیۃ انجمن اسلام کی جانب سے مسلمانون کی تعلیم کے لئے بہت سے مدارس قائم ہین، حال مین اس انجمن نے مصر کی وزارت تعلیم سے ان مدارس کو اپنی نگرانی مین لینے کی درخواست کی ہے، اور اس کے شرائط دریافت کئے ہیں،

سیال شکر

حال میں ایک امریکن ماہر کیمیا نے فلسطین مین سیال شکر بنانے کا تجربہ کیا ہے، یہ شکر سیب اور کیلہ وغیرہ ترمیوون سے بنتی ہے، یہ بازار مین بھی آگئی ہے، ہوٹلون اور قہوہ خانون مین شکر کے صرف مین پابندی کے قوانین پر بڑی سختی سے عمل ہو رہا ہے چنانچہ خریدارون کو قہوہ وغیرہ بغیر شکر کے دیا جاتا ہے، یہ لوگ تھوڑی شکر خود اپنے ساتھ رکھتے ہیں جسے منہ کا مزہ بدلنے کیلئے ڈال لیتے ہین '

زمین کی موجودہ آبادی

دنیا کی اقتصادی حالت کے سلسلہ مین جمعیۃ اقوام کی جانب سے جو تازہ بیان شائع ہوا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۳۹ء کے آخر مین دنیا کی آبادی دو ارب ۷۰۰ ملین تک پہنچ گئی ہے، اس مین ۵۰۴ ملین چین ۳۸۹ ملین ہندوستان اور ۷۳ ملین جاپان کی آبادی ہے، مختلف ملکون کے اموات کے اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگ کے مقتولین کی تعداد کے علاوہ جو ابھی صحیح نہین معلوم ہو سکی ہے ۱۹۴۰ء مین عام طور سے یورپ کے اکثر حصون مین اموات کی شرح بڑھ گئی ہے، " م "

ادبیات

"مواعظ تجدید"

از

جناب یحییٰ اعظمی

عجیب فتنہ ہی یارب جہاں میں دورِ جدید | نہ فکرِ روزِ قیامت نہ خوفِ یومِ وعید
ہے اس کی عقل تجدد نواز کا فتویٰ | جہانِ کہنہ کی ہر شے ہے لائق تجدید
اسے پسند نہیں اب یہ بزم فرسودہ | زباں پہ اس کی ہی اک تازہ انجمن کی نوید
نئی اساس پہ دنیائے نو کرو تعمیر | بنائے کہنہ کے ڈھانے کی ہی ہمیں تاکید
غرض یہ ہے کہ یہ بزمِ جہاں بدل جائے | وہ کر رہا ہے ہر اک انقلاب کی تائید
جدید طرز پہ ہو اجتہادِ فکر و نظر | کہ عہدِ نو میں خطا ہے قدیم کی تقلید
عبث ہیں آج روایاتِ سیزدہ صد سال | ہے اب یہ دفترِ پارینہ لائق تردید
قدیم عہد کے سرمایہ ہائے منقولات | جدید دور کے عقل و قیاس سے ہیں بعید
سنن، صحاح و مسانید کا دفترِ پارینہ | نئے سرے سے ہی محتاج خامۂ تنقید
اصولِ شرع میں بھی ناگزیر ہی ترمیم | کہ انقلابِ زمانہ کا اقتضا ہے شدید
اسے بھی ڈھال دو اب عہدِ نو کے سانچے میں | تمہارے پاس ہے موجود جو "کتاب مجید"
جہانِ نو میں نہیں اعتبار کے قابل | یہ فلسفۂ شریعت یہ فقہ بے تجدید

ضرورت اب ہے کہ ان کو جہان میں پیش کرو
یہ ذوقِ دانشِ حاضر بہ آب و رنگِ جدید
زبانِ پاک پہ دانش ورانِ حاضر کے
بڑی ہی شان سے ہیں یہ مواعظِ تجدید
ہزار حیف یہ نکتہ ہے ان سے پوشیدہ
بری ہے نسخ و تغیر سے مذہبِ توحید

شعلۂ نو

از

جناب روشؔ صدیقی

در پردۂ انجم نہ سر چرخِ بریں ہے
اے خوابِ محبت تری تعبیر ہیں ہے
محسوس ہوا سرحدِ امکاں سے گذر کر
اربابِ وفا کی کوئی منزل ہی نہیں ہے
انجام سے آزاد ہے آغازِ محبت
اس صبح کی آغوش میں خورشیدِ یقیں ہے
اے اہلِ نظر یہ بھی کسی پہ ہوا روشن
عالم ہے حسین یا نگہِ شوق حسین ہے
باطن میں ہر اک لمحۂ احساس ہے سجدہ
ظاہر میں کوئی در ہے نہ آغوشِ جبیں ہے
افلاک نشیں جس کی لپٹ سہ نہ سکیں گے
وہ شعلۂ نو زینتِ دامانِ زمیں ہے
دنیا سے ہے دل شاد نہ عقبیٰ سے ہے مانوس
تسکینِ محبت نہ یہیں ہے نہ وہیں ہے
جس قصرِ مسرت میں فروکش ہے محبت
وہ قصرِ مسرت تو مرا قلبِ حزیں ہے
اے شیخِ حرم حالِ روشؔ بھی ہوا معلوم
سنتے ہیں کہ اک رندِ خراباب نشیں ہے

باب التقریظ والانتقاد

حضرت مجدد کا تصور توحید

The Mujaddid's Conception of Tauhid

مصنفہ ڈاکٹر برہان احمد صاحب فاروقی ایم، اے، پی، ایچ، ڈی (علیگ) تقطیع اوسط ضخامت ۱۹۲ صفحے، کاغذ سپید، ٹائپ روشن، قیمت تین روپے، ملنے کا پتہ: شیخ محمد اشرف کشمیری بازار، لاہور،

از مولانا مسعود عالم ندوی کیٹلاگر اورنٹیل پبلک لائبریری، پٹنہ

(۱)

توحید اسلامی تعلیمات کی اصل اور بنیاد ہے، یہ ایک واضح اور صاف تصور تھا، جسے عرب کے بدو بھی اچھی طرح سمجھتے تھے، اور جس پر علمائے سلف عقل و فلسفہ کی خوشہ چینی کے بغیر پختہ اعتقاد رکھتے تھے، کچھ سرچشمۂ نبوت سے دوری اور کچھ بیرونی اثرات کے ماتحت، یہ صاف اور شفاف چشمہ رفتہ رفتہ گدلا ہونے لگا، اور ویدانت اور نوافلاطونی فلسفہ کے اثر سے مسلمان صوفیوں نے اسے "وحدت الوجود" کا نیم فلسفیانہ لباس پہنا دیا، یہ عقیدہ مسلم سوسائٹی کے جسم و جان میں اس طرح حلول کر گیا کہ زندگی کا ہر شعبہ اس سے متاثر نظر آنے لگا، مذہب، اخلاق، ادب، شعر، فنون لطیفہ کوئی چیز اس کے دائرۂ اثر و نفوذ سے باہر نہیں تھی، پوری سوسائٹی کو مارفیا کا انجکشن دیکر سست اور ڈھیلا کر دیا گیا ——— "یہ سب سے بڑی صداقت" قرار دی گئی، جہانتک ایک مرتاض انسان کی رسائی ہو سکتی تھی، بلکہ اسے اسلامی تعلیمات کا حاصل بتایا گیا، بزرگوں، ولیوں، صوفیوں اور مقدس روحوں نے اس کا تجربہ

کیا کشف و شہود کے واسطے سے ان پر یہ حقیقت منکشف ہوئی، یون تو وحدۃ الوجود، کا عقیدہ مسلمان صوفیون کے دلون میں تیسری صدی ہجری[۱] ہی کے اختتام پر اپنی جگہ پیدا کر چکا تھا، اور "احسان" کے حدود سے گذر کر تصوف نے "راہبانہ جاہلیت" کی شکل اختیار کر لی تھی، لیکن اس فلسفہ کی باضابطہ تدوین و تشکیل چھٹی اور ساتوین صدی ہجری کے متفلسف صوفیون کی ایک جماعت کے ہاتھون ہوئی، جس نے تصوف کو فلسفہ کے رنگ مین رنگ کر ایک مخصوص قسم کی غیر اسلامی الٰہیات (metaphysics) کا فکری نظام قایم کر دیا، اس طائفہ کے ممتاز افراد ابوالفتوح شہاب الدین یحییٰ بن حبش سہروردی مقتول (ف ۵۸۷ھ) ابن عربی (ف ۶۳۸ھ) ابن فارض (ف ۶۳۲ھ) ابن سبعین (ف ۶۶۸ھ) عفیف الدین تلمسانی (ف ۶۹۰ھ) اور ان کے ہم نوا حضرات ہین، ان مین سے اکثر صاحبون کا کلام اور تصنیفات عام آدمیون کے لئے ناقابل فہم اور ایسے الغاز و اوہام کا مجموعہ ہیں جنھین کتاب و سنت سے دور کا بھی تعلق نہین، لیکن جس شخص نے اس عقیدے کی سرگرم تبلیغ کی اور جس کے ہان جا کر یہ فلسفہ مکمل طور پر پختہ اور مدون ہو وہ شیخ محی الدین ابن عربی ہین، جو شیخ اکبر کے لقب سے یاد کئے جاتے ہین، سچی بات یہ ہے ان کی ذات اس فلسفیانہ تصوف کے عروج کی آخری منزل ثابت ہوئی، ان کی تبلیغ نے "وحدۃ الوجود" کو ایک اسلامی عقیدہ کی حیثیت دیدی، جس سے بڑے بڑے عالمون اور محققون کے قدم بھی ڈگمگا گئے، اور اس غیر اسلامی نظریے نے ایک وبائے عام کی صورت اختیار کر لی،

(۲)

اس وبائے عام کے خلاف جن برگزیدہ ہستیون اور سنت کے شیدائیون نے آواز

---

[۱] حسین بن منصور حلاج (ف ۳۰۹ھ) کی شخصیت اس کا بین ثبوت ہے،

آواز بلند کی، ان مین دو شخصیتین بہت ممتاز ہین، میری مراد امام تیمیہ (ف ۷۲۸ھ) اور مجدد الف ثانی حضرت احمد سرہندی (ف ۱۰۳۴ھ) سے ہے، لیکن امام ابن تیمیہ کی تردید ان مارگزیدہ لوگون کے حق مین اتنی کارگر نہین ہوئی جتنی مجدد الف ثانی کی، کچھ تو اس لئے کہ ابن تیمیہ کے زمانے مین (۶۶۱ھ ۔ ۷۲۸ھ) یہ زہر ابھی پوری طرح نہین پھیل سکا تھا، بعد کی صدیون مین، جب پوری قوم اخلاقی زوال اور سیاسی جمود و تعطل سے دوچار تھی، اس افیون کو زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی، اور زیادہ اس وجہ سے کہ اس مشرب کے صوفیا کے پاس قرآن و حدیث اور فہم عام، ہر دلیل کا ایک جواب ہے، یہ "خشک ملا تصوف اور طریقت کیا جاین؟ جہان قرآن کریم کا ظاہر اور باطن الگ الگ ہو، جہان طریقت کے آئین شریعت کے قانون سے میل نہ کھاتے ہون، جہان تصوف اور تمام قیود سے آزادی ہم معنی تصور کی جاتی ہو، وہان بیچارے امام ابن تیمیہ کی کیا چل سکتی تھی؟

لیکن مجدد الف ثانی کے بارے مین یہ لوگ کیا کہہ سکتے تھے، وہ خود تصوف کے تمام مقامات سے آگاہ تھے، سلوک کی تمام جانی اور انجانی منزلین طے کر چکے تھے، اور اس راہ کی ان بلندیون تک ان کی رسائی تھی، جہان اس زمرہ کے صوفیون کا طائر خیال بھی نہین گیا تھا، انھون نے اسی راہ کے واردات کی بنیاد پر وحدۃ الوجود کے عقیدے کی تردید کی، انھون نے کہا کہ ابن عربی کو دھوکا ہوا، جس مقام پر جا کر انھین وحدۃ وجود محسوس ہوا، وہ سلوک کی آخری منزل نہین، وحدۃ وجود کے تجربے تو اس راہ کی درمیانی منزلون کی واردات ہین، ان پر اعتماد کرنا بڑی غلطی ہوگی، ان درمیانی منزلون مین سالک کو محسوس ہوتا ہے کہ وجود ایک ہی ہے، اور اس ایک ذات کے سوا کچھ موجود نہین، لیکن آگے بڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض "وحدت شہود" ہے، (یعنی صرف ایسا نظر آتا ہے) وحدت وجود نہیں، (یعنی واقع مین ایسا نہین)

ابن عربی اور ان کے ہم مشربوں کو کشف اور اپنی باطنی حس پر ناز تھا، مجدد الف ثانی نے بھی اسی باطنی حس کے ذریعہ حقیقتوں کا بلاواسطہ مشاہدہ کرنا چاہا اور "وجودیت" "ظلیت" کے مدارج کو طے کرتے ہوئے "عبدیت" کے مقام بلند تک پہنچے، جہاں انھیں معلوم ہوا کہ "وجودیت" اور "ظلیت" کے درمیانی مدارج میں کہیں "وحدت" اور کہیں "ظلیت" کا دھوکا ہوتا ہے، اور ایک عرصہ تک "ظلیت" کی درمیانی منزل میں جد وجہد کے بعد وہ "عبدیت" کے مقام رفیع تک پہنچ کر دم لیتے ہیں، جہاں خالق کائنات اور کائنات کی جداگانہ حقیقتیں ان پر روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہیں، "اللہ اور دنیا دو چیزیں ہیں" انھیں اس کا پورا یقین ہو جاتا ہے، اور اسی مقام عبدیت پر آکر انھیں محسوس ہوتا ہے کہ ان کے اب تک کے صوفیانہ تجربے حقیقت میں داخلی (subjective) یعنی ان کے محسوسات کا پرتو اور اس لئے ناقابل اعتبار تھے، اور ان کی کوئی خارجی حیثیت (Objective validity) نہیں تھی، اور صوفیانہ کشف وشہود کی واقعی قدر وقیمت پر انہیں شک ہونے لگتا ہے، تا آنکہ وہ ایک متبع سنت مومن کامل کی طرح اعتراف کرتے ہیں، کہ کشف و باطنی حس کے ذریعہ ادراک حقیقت کا ادعا ہی غلط ہے اور جس چیز کے ادراک وشہود کے لئے صوفیہ اتنی تکلیفیں برداشت کرتے ہیں، وہ در اصل ادراک وشہود کی چیز ہی نہیں، اللہ کی ذات یا اس کی صفات کا کسی کو براہ راست ادراک نہیں ہو سکتا، اللہ کی ذات ہماری عقل و ادراک کی گرفت سے پرے ہے اور بہت پرے ہے، "ان اللہ وراء الوراء ثم وراء الوراء"، اس مقام پر آکر حضرت مجددؒ صاف صاف فرماتے ہیں کہ حقیقت کے ادراک کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے، یعنی "ایمان بالغیب"،

ڈاکٹر برہان احمد صاحب کی زیر نظر کتاب میں حضرت مجددؒ کے اس کارنامے کی تحقیق و تفصیل کی گئی ہے، کتاب کا آغاز "تمہید" (Preliminary) سے ہوتا ہے،

جس میں مجدد کی حقیقت، مجدد الف ثانیؒ کا مرتبہ، اور وحدت وجود کے متعلق ان کا نقطۂ نظر، تفصیلی طور پر پیش کرتے ہوئے، یہ چیز بھی واضح کر دی گئی ہے، کہ شیخ احمد سرہندی نے وحدت وجود کی مخالفت کلامی مذہب یا فلسفیانہ استدلال کی بنیاد پر نہیں کی، بلکہ ان کی تردید یکسر کشف پر مبنی ہے (ص۵)

اس کے بعد مختصر سوانح حیات درج کئے گئے ہیں، (ص۶-۴۱) اس سلسلہ میں ذاتی حالات ماحول، صوفیوں اور علما کا حال، اکبر کی پالیسی، کارنامے، بعد والوں پر ان کا اثر۔ تمام چیزیں اجمالی طور پر آگئی ہے،

سوانح کے بعد "تعارف" (Introduction) کو جگہ دی گئی ہے (ص۴۲-۵۷)

اس میں مصنف نے دکھایا ہے کہ شعور کی مختلف قسمیں ہیں، نظری اور عقلی شعور کے حدود اخلاقی شعور سے جدا ہیں، اسی طرح منطق اور اخلاقیات میں بھی فرق ہے، ایک اگر نظری شعور کے نتائج و احوال سے بحث کرتا ہے، تو دوسرے کا تعلق اخلاقی شعور کے قوانین و نتائج سے ہے، بالکل اسی طرح ایک مذہبی شعور بھی ہے، اور اس کے حدود نظری شعور سے قطعاً جدا ہیں، ان میں سے ہر شعور اسی وقت کارآمد اور منتج ہوگا جب وہ اپنے حدود کے اندر کام کرے لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مختلف قسم کے شعور ایک دوسرے کے حدود میں دخل انداز ہو جاتے ہیں، یہ کام فلسفہ کا ہے کہ ہر شعور کے حدود کی تعیین کرے، غلطیوں کو واضح کرے، اور یہ بتائے کہ کون شعور کہاں صحیح نتیجہ دے گا، مصنف کا کہنا یہ ہے کہ کائنات اور خالق کائنات کی وحدت کے تصور میں بھی ایسا ہی پیش آیا ہے، یہاں مذہبی وحدت اور نظری وحدت کے درمیان خلط ملط ہو گیا ہے، اور غیر ارادی طور پر ایک کی خصوصیات اور صفات دوسرے سے وابستہ کر دی گئی ہیں، فاضل مصنف نے اس مقام پر نہایت تحقیقی اور دلنشین گفتگو کی ہے، اور پوری کتاب میں یہی محسوس ہوتا ہے کہ وہ جدید فلسفہ کے ایک سنجیدہ طالب علم (سکالر)

ہیں، یہ حصہ کتاب کی جان ہے، اور اس فصل کے آخری صفحون پر اگر دل سے بے ساختہ داد نکل جاتی ہے،

تعارف کے بعد حسب ذیل ابواب ہیں۔

(۱) حضرت مجدد کا تصور توحید (ص ۱۳۹-۸۵)

(۲) مجدد الف ثانی کے تصور پر بعد والون کی موافق و مخالف رائین (ص ۱۷۰-۱۴۱)

آخر مین نتیجہ (Conclusion) ہے (ص ۱۸۷-۱۷۱) جس مین ساری بحث کا خلاصہ آگیا ہے، اور موافق و مخالف رایون پر محاکمہ کے ساتھ دلنشین پیرائے مین حضرت مجدد کے تصور توحید کی تائید کی گئی ہے، مصنف نے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی (ف ۱۱۷۶ھ) کے اس خیال کی خاص طور پر تردید کی ہے کہ ابن عربی اور مجدد الف ثانی کے نظریون مین کوئی بنیادی فرق نہین، بلکہ یہ صرف استعارات کا الٹ پھیر ہے، مصنف کا خیال ہے کہ دونون کے تصور کے درمیان صاف بنیادی فرق ہے، اور انھون نے اس کو مدلل طور پر ثابت کیا ہے۔

کتاب کا انتساب مصنف نے اپنے استاد ڈاکٹر سید ظفر الحسن صاحب (صدر شعبہ فلسفہ مسلم یونی ورسٹی، علی گڈہ) کے نام کیا ہے، اور آخر مین اشاریہ بھی ہے، کتاب کا سرسری خاکہ اور مباحث کا خلاصہ اوپر کی سطرون مین آگیا ہے، جہانتک اصل موضوع یعنی حضرت مجدد الف ثانی کی توضیح، تشریح اور تفہیم کا تعلق ہے، ہمین یہ کہنے مین ذرا باک نہین کہ فاضل مصنف اپنی کوشش مین بڑی کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے ہین، جس پر وہ مبارکباد کے مستحق ہیں، یہ کوشش اس لحاظ سے اور بھی قابل قدر ہے کہ یہ اپنے موضوع پر پہلی تحقیقی چیز ہے، اور فلسفہ کے ایک ایک فاضل کے قلم سے نکلی ہے، مسلم یونیورسٹی نے مصنف کو اس مقالے پر کاملیت (ڈاکٹریٹ) کی سند دیکر اپنی جوہر شناسی کا ثبوت دیا ہے، ہم نے ابھی کہا ہے کہ جہان تک اصل موضوع

کا تعلق ہے، مصنف اپنے مقصد مین پوری طرح کامیاب ہین، باقی جو چیزین انھون نے موضوع سے الگ ضمنی طور پر لکھی ہین، ان مین کچھ فروگذاشتین ہین جن سے اصل کتاب پر حرف نہین آتا، نمونے کے طور پر ہم بعض کوتاہیون کی طرف اشارہ کرتے ہین،

"بعد والون" پر حضرت مجددؒ کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے، شاہ ولی اللہؒ، حضرت سید احمد شہیدؒ، اور دوسرے خواص امت کے ساتھ سر سید احمد خان اور مولوی عبد اللہ چکڑالوی کو شامل کر کے تو مصنف نے غضب ہی کر دیا ہے، سر سید کی تحریفات کو "اصلاح" اور "تنقید عالی" سے تعبیر کرنا انتہائی حیرت انگیز ہے، اگر واقعی ان صاحبون کو "مصلحین امت" مین شمار کرتے ہین تو یہ ان کی ایک افسوس ناک غلطی ہے، یہ "خاصان خدا" کی بزم ہے، یہان فرنگی تہذیب کے شیدائیون اور فرنگی عقلیت کے فریب خوردون کا گذر نہین، خلوص نیت پر شک کئے بغیر، ان کے لئے دعاء مغفرت ہی کی جائے تو بہتر ہے، اور اگر اپنے علمی مرکز کی چاہ ہین وہ ایسا لکھ گئے ہین تو یہ ایک محقق کی شایان شان نہین، رہے چکڑالوی صاحب تو وہ قرآن مجید کے عالم کیا ہو سکتے ہین، ؟ کوئی حدیث کا منکر قرآن کا صحیح عالم ہو ہی نہین سکتا، جو نگاہین کتاب و سنت کو ایک دوسرے سے الگ دیکھتی ہین، وہ بینائی سے محروم ہین،

ص ۳۹ کے حاشیہ مین شیخ محمد بن عبد الوہاب (ف ۱۲۰۶ھ) "اہل حدیث" اور حضرت سید احمد بریلوی (ف ۱۲۴۶ھ) کے تعلق پر غیرون کی گڑھی ہوئی پرانی داستان دہرائی گئی ہے، حضرت سید احمد شہید اور ان کے نامدار رفقاء کا نجد کی دعوت تجدید یا شیخ محمد بن عبد الوہاب سے کوئی تعلق ثابت نہین، یہ اور بات ہے کہ اصل ماخذ (کتاب و سنت) کے ایک ہونے کے باعث دونون کے درمیان مماثلت پائی جاتی ہے، تو یہ ان دو بزرگون اور ان کے ماننے والون پر کیا منحصر ہے؟ کتاب و سنت کے علم بردار جہان بھی ہون گے ان کی روش ایک دوسرے سے

ملتی جلتی ہوگی، اس سلسلہ مین محمد بن عبد الوہاب کو عبد الوہاب کہا گیا ہے، اور ان کا سال وفات ۱۲۰۱ھ/۱۷۹۲ء بتایا گیا ہے، یہ غلطی مارگولیوتھ (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، مقالہ وہابیت) سے ہوتی ہے، اور غالباً فاروقی صاحب نے اسی پر اعتماد کیا ہے، شیخ کی وفات ۱۲۰۶ھ/۱۷۹۲ء مین ہوئی ہے، (ملاحظہ ہو راقم کا مقالہ "محمد بن عبد الوہاب": معارف مئی، جون ۱۹۴۱ء)

مصنف نے ایک جگہ سنت کا ترجمہ عادت (*Habit*) کیا ہے، (حاشیہ ص ۳۴) اور دوسری جگہ سنت اور نبی کو ایک کر دیا ہے، (ص ۳۹) پہلی بات غلط ہے، سنت کے لغوی معنی عادت کے نہیں، دوسری جگہ تعبیر کی غلطی ہے، کتاب و سنت کو دوسری زبانون مین بھی قرآن اور سنت رسول ہی کہنا چاہئے، کتاب کا آخری فقرہ بھی (*Back to Muhammad*) ہے (ص ۱۸۱) اگر یہ (*Back to the Quran*) ہوتا تو زیادہ مناسب ہوتا، گو آخری دونون صورتون مین مدعا مین خاص فرق نہیں پڑتا۔

ص ۱ کے حاشیہ مین مقلد کی یہ تعریف کی گئی ہے کہ جو اجماع اور قیاس کو اسلام کا ماخذ (*Source*) مانتا ہو، یہ بالکل صحیح نہین، اجماع اور قیاس اسلام کے ماخذ نہین اور نہ ہو سکتے ہیں، اگر ہین تو احکام اسلامی کے، نہ کہ اسلام کے، اور عام طور پر اصطلاح فقہا مین مقلد اس کو کہتے ہین، جو ائمہ اربعہ میں سے کسی کے اجتہادات کا پابند ہو، (اور خود براہ راست کتاب و سنت سے استنباط مسائل نہ کرتا ہو۔ (ص ۹) کے حاشیہ میں بھی اجماع کو اسلام کا تیسرا ماخذ (*Third source*) بتایا گیا ہے، اور اسی بنیاد پر بالکل غلط تعریف کی گئی ہے،

اصطلاحی عربی کلیات کا املا غنیمت ہے، کہین کہین کوتاہی رہ گئی ہے، جیسے وحی کو بار بار *wahi* لکھا گیا ہے، حالانکہ صحیح *wahy* ہوگا، اسی طرح *Ibn Taimiyah* کی *Taimiyya* ہونا چاہئے، وغیرہ،

بہرحال یہ تھوڑی بہت معمولی فروگذاشتین ہین، ان سے کتاب کی قدر و قیمت پر ذرہ برابر حرف نہین آتا کہ اس کی مرکزی بحث نہایت مکمل، مدلل اور شافی ہے،

کتاب چونکہ انگریزی مین ہے اس لئے افادہ کا دائرہ محدود رہے گا، حالانکہ اس قسم کی تریاق کی ضرورت زیادہ تر ان لوگون کو ہے جن کی اکثریت انگریزی نہین جانتی، فاروقی صاحب اسے اردو کا جامہ پہنا دیتے تو ایک علمی خدمت ہوتی، ہمین یقین ہے کہ وہ از خود اس کام کو کر چکے ہون گے، یا کر رہے ہون گے، گذارش صرف احتیاطاً پیش کر دی گئی ہے،

مطبوعات جدیدہ

وحی الٰہی، مولفہ مولانا سعید احمد صاحب ایم اے تقطیع بڑی ضخامت ۱۹۲ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد ۲ غیر مجلد عہ، پتہ:- قرولباغ، ندوۃ المصنفین، دہلی،

انکار حدیث کا فتنہ بڑھتے بڑھتے اب انکار وحی تک نوبت پہنچ گئی ہے، جس کا مظاہرہ کچھ عرصہ پہلے رائج الوقت متاع ادب کی ایک دکان سے ہو چکا ہے، اسی زمانہ مین اہل علم نے اس کے جوابات دیئے تھے، جیسے البیان امرتسر نے براہین الٰہی کے نام سے ایک خاص نمبر مین شائع کر دیا تھا، ان جواب دینے والون مین مولانا سعید احمد صاحب بھی تھے، اب انھون نے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب تالیف فرمائی ہے، اس مین عقلی ونقلی دونون پہلوؤن سے وحی کے منجانب اللہ ہونے کے دلائل اور اُس کے متعلق جو شکوک وشبہات پیدا ہو سکتے ہین، سب کے تشفی بخش جوابات دیئے ہیں، وحی الٰہی کی ضرورت اور اسکی حقیقت پر روشنی ڈالنے کے بعد آیات قرآنی سے وحی قرآنی کے منجانب اللہ ہونے کے دلائل، صفات باری، مثلاً نطق وکلام وغیرہ کی علینیت اور غیریت کے مسئلہ مین بعض غیر اہل سنت فرقون کی جانب سے جو اعتراضات پیش کئے جاتے ہین اس کے جوابات دیئے ہین، اور ملکۂ نبوت پر بحث کر کے اس بارہ مین محققین یورپ کے خیالات نقل کئے ہین، آخر مین کلام اللہ کے وجوہ اعجاز پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے، ہر بحث نہایت مفصل اور بہت سی مفید بحثون پر مشتمل ہے، انمین سے اکثر بحثین سیرۃ النبی جلد سوم، الکلام اور معارف مین اس سے زیادہ مفصل موجود ہیں، مولانا کی یہ دینی خدمت قابل قدر ہے، اور امید ہے کہ اس سے ان لوگون کو جو خود دینی بصیرت نہین رکھتے فائدہ پہنچے گا،

جگ بیتی حصہ اول، پنڈت جواہرلال نہرو، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۲۵۲ صفحے، کاغذ

کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد ۳ روپیے، پتہ مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، لکھنؤ، بمبئی نمبر ۳

پنڈت جواہرلال نہرو نے جیل کی فرصت مین اپنی لڑکی کے نام دنیا کے تمدنی ارتقار کی تاریخ پر خطوط کا ایک سلسلہ انگریزی زبان مین لکھا تھا، اس مین تمدنی دور کے آغاز سے لیکر اس وقت تک دنیا کی تمام متمدن قومون، ملتون اور ملکون کے تمدنی حالات عروج وزوال اور کارنامون کو اس طرح لکھا تھا جس سے مختلف تہذیبون کی پیدایش، دنیا کی مختلف قومون کی تمدنی حالت عہد بعہد کی ترقیان، قدیم وجدید تہذیب کی ارتقائی تاریخ سامنے آجاتی ہے، اصل انگریزی خطوط عرصہ ہوا کتابی شکل مین شائع ہو چکے تھے، اب جناب محمود علی خان صاحب نے اس کا اردو ترجمہ کیا ہے، اس حصہ مین عہد قدیم سے لیکر عہد وسطیٰ کے خاتمہ اور دور جدید کے آغاز تک کے حالات ہین اس مین ایشیا و یورپ کی قدیم تہذیبون کی پوری سرگذشت آگئی ہے، جا بجا ہندوستان کی سیاست کی جانب بھی اشارے ہین، اسلام اور مسلمانون کی تاریخ پر صحیح تبصرہ کیا گیا ہے، اور نفاق انگیز واقعات کی تردید کی گئی ہے، اردو مین دنیا کی تمدنی تاریخ پر کوئی ایسی جامع کتاب موجود نہین تھی، جناب مترجم نے اسے اردو مین منتقل کرکے ایک مفید خدمت انجام دی ہے، یہ کتاب تاریخ کے طلبہ اور تاریخ سے ذوق رکھنے والون کے مطالعہ کے لائق ہے، لیکن ان خطوط کے لکھتے وقت حوالہ کی کتابین سامنے نہ تھیں، اور نہ ان کی اشاعت کا خیال تھا، اس لئے ان مین عموماً سنین نہین دیئے ہین، اور ترتیب کا لحاظ بھی نہین رکھا گیا ہے، اگر یہ دونون خامیان نہ ہوتین تو کتاب کا فائدہ اور زیادہ بڑھ جاتا،

گارستان دی تاسی، مولفہ ڈاکٹر محی الدین، زور قادری تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۲۰

صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت عہ، پتہ سب رس کتاب گھر خیریت آباد حیدرآباد دکن،

مشہور فرانسیسی مستشرق گارستان دی تاسی اردو زبان کے ان محسنوں مین ہے جس کے احسان سے اردو کبھی سبکدوش نہین ہو سکتی، اس نے اس زمانہ مین اردو کی خدمت اور حمایت کی، جب خود ہندوستان مین اس کی قدر و قیمت پہچاننے والے کم تھے، عام طور پر لوگ اس کے خطبات کے علاوہ اردو زبان کے متعلق اس کی دوسری خدمات سے کم واقف ہین، اس کی ساری عمر اردو کی خدمت اور حمایت مین گذری، اردو کتابون کے فرانسیسی ترجمے کئے اس کے مختلف پہلوون پر مستقل کتابین اور بکثرت مضامین لکھے، یورپ مین اردو زبان کی اہمیت قائم کرنے اور وہان کی تعلیمگاہون مین اس کو مستقل زبان کا درجہ دینے کی کوشش کی، غرض اردو کی ترقی، اشاعت اور حمایت مین ہر ممکن کوشش صرف کی، جناب مصنف نے اس کتاب مین دی تاسی کے سوانح اور اس کی ان تمام خدمات کو تفصیل سے دکھایا ہے، اس سلسلہ مین اس کے کتب خانے کے اردو مخطوطات کی فہرست، اس کے اردو کے یورپین تلامذہ یورپ کی درسگاہون مین اردو کی تعلیم، دی تاسی کے دوسرے ہم عصر حامیانِ اردو اور مستشرقین کے مفید حالات بھی آگئے ہین،

ہماری غذا، مترجمہ جناب مبارز الدین احمد صاحب تقطیع بڑی، ضخامت ۱۵۲ صفحے،

کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت ؎ پتہ:- انجمن ترقی اردو ہندی دہلی،

انسانی صحت کے بقا و تحفظ اور جسمانی نشو و نما کا دار و مدار بڑی حد تک صحیح اور مناسب غذا پر ہے، لیکن اردو مین اس ضروری موضوع پر کوئی علمی کتاب نہ تھی، جناب مترجم نے ڈاکٹر رابرٹ میکرسن کی ایک انگریزی کتاب کا جو اس موضوع پر عالمانہ تصنیف ہے، ترجمہ کیا ہے، اس مین ان دونون امور یعنی جسمانی نشو و نما اور صحت کے بقا و تحفظ کے لئے جن حیاتی عناصر اور غذائی اجزاء کی ضرورت ہے ان کو بتانے کے بعد مختلف نباتی اور حیوانی غذاؤن مین ان کی مقدار کی پوری تفصیل بیان کی گئی ہے، اس ضمن مین انسانی جسم اور غذا کے متعلق بہت سے ضروری اور مفید معلومات آگئے ہین، اپنے

موضوع پر کتاب علمی اور محققانہ ہے، عام لوگون کے علاوہ اطبا کے لئے بھی اسکا مطالعہ مفید ہے،

رضا شاہ پہلوی، مولفہ جناب محمد اشرف خان صاحب تقطیع چھوٹی، ضخامت ۷۰ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت ۲ر پتہ:۔ مکتبۂ اردو، لاہور

اس کتاب مین رضا شاہ پہلوی کے مختصر حالات ہین، قاچاری دور کے ایران کی حالت دکھانے کے بعد اس کی تجدید وترقی مین رضا شاہ کے مساعی اور کارنامون پر روشنی ڈالی گئی ہے، اوران کے دور کے فوجی، تعلیمی، سلسلہ رسل ورسائل، دوسری قومون سے معاہدون اور دوسرے سیاسی اور اصلاحی کارنامون اور ترقیون پر مختصر تبصرہ ہے، آخر مین معزولی کا ذکر ہے، رضا شاہ کی شخصیت اور کارنامون کے مقابلہ مین یہ کتاب نہایت مختصر اور ناکافی ہے، اوراس کی حیثیت ایک مضمون سے زیادہ نہین تاہم کچھ نہ ہونے کے مقابلہ مین غنیمت ہے،

فارسی بھگوت گیتا، مرتبہ جناب محمد شفیع صاحب کنبوہ، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۲۳۲ صفحے، کاغذ نفیس، کتابت وطباعت بہتر، قیمت معلوم نہین، پتہ:۔ ایم ایس کنبوہ، خیالستان، گڑھی شاہو، لاہور

ہندوستان کی مشہور ومقدس کتاب بھگوت گیتا کا سب سے پہلا منظوم فارسی ترجمہ غالباً فیضی نے کیا لیکن اس مین محققین کا اختلاف ہے، کہ موجودہ جو ترجمے پائے جاتے ہین، وہ درحقیقت فیضی ہی کے ہین یا کسی اور کے، یہ ترجمہ اس سے پہلے بھی چھپ چکا ہے لیکن نہایت مسخ اور غلط تھا، اس لئے جناب محمد شفیع صاحب نے صحت اور طباعت کے اہتمام سے اسے دوبارہ مرتب کرکے شائع کیا ہے، کتاب کے شروع مین گیتا کے منظوم ترجمہ کے مختلف نسخون کا ذکر کرکے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ ترجمہ فیضی ہی کا ہے، اور گیتا کے موضوع اور مضامین پر مختصر تبصرہ ہے، اصل کتاب دوسو صفحون مین ہے، یہ ترجمہ ایک تاریخی یادگار کی حیثیت سے قابل قدر اورجن لوگون کو ہندو تصوف اور ویدانت سے دلچسپی ہو ان کے ذوق کی چیز ہے،

"م"

جلد ۵۰ ماہ رمضان المبارک ۱۳۶۱ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۴۲ء عدد ۴

مضامین



شذرات

۲۰ شعبان ۱۳۶۱ھ کو صوبہ بہار کے مشہور و ممتاز کہنہ مشق شاعر حافظ فضل حق آزاد عظیم آبادی نے اس دنیا سے دون کو الوداع کہا، مرحوم کی عمر اس وقت غالباً اسی سے زیادہ ہوگی، کانوں سے اونچا سننے لگے تھے، مگر اس سن وسال میں بھی ان کی شاعری کے شباب کا وہی عالم تھا، غزلوں کے کہنے کا اتفاق کم ہوتا تھا، مگر قومی و علمی و اخلاقی اور فلسفیانہ نظموں کا شوق زیادہ تھا، زیادہ تر اردو میں اور کبھی کبھی فارسی میں کہتے تھے، اور شاذ و نادر عربی میں بھی طبع آزمائی کی نوبت آجاتی تھی،

پٹنہ میں سرسید مرحوم کی تعلیمی و قومی تحریک کے علمبردار قاضی رضا حسین صاحب مرحوم تھے، یہ ان کے حیدرآباد کے وفد کے ایک رکن بھی تھے، قاضی صاحب مرحوم کی فیض بخش علمی صحبتوں میں بہار کے جو چند نوجوان ابھرے، بڑھے اور پھیلے اُن میں ایک نام حافظ آزاد مرحوم کا بھی ہے، چنانچہ سرسید مرحوم کے اُس ۱۸۹۱ء والے حیدرآبادی وفد میں جس کے دوسرے ممبر مولانا شبلی نعمانی اور مولانا حالی وغیرہ تھے، قاضی رضا حسین صاحب کے ساتھ آزاد مرحوم بھی تھے،

میں نے ان کو سب سے پہلے ۱۹۰۰ء میں جب میری نوعمری تھی ندوہ کے اجلاس پٹنہ میں اپنا ترکیب بند پڑھتے سنا، بلند قد، اونچی آواز، خود اعتمادی کے تیور، لہجہ پُرجوش، کٹہرے میں تیر کی گرج سی سنائی دیتی تھی، سامنے علماء اور مشائخ کی صفیں تھیں جن کی تعداد کئی سو سے کم نہ ہوگی، اکثر کی نورانی شکلوں کی یاد اب بھی دل کو منور کرتی ہے، شاعر نے جب ان کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرکے یہ شعر پڑھا ہے،

نشانِ کاروانِ رفتہ ہیں، دل کے اجالے ہیں　　　غنیمت ہی غنیمت ہیں کہ سب اللہ والے ہیں

تو تحسین و آفرین کی آوازوں سے ساری فضا گونج گئی تھی، اسی جلسہ میں آغا سنجر طرانی بھی تھے اور انھوں نے بھی اپنا وہ فارسی قصیدہ پڑھا تھا جس کا مطلع تھا

ستایش می سزد البتہ یکتا ذات یزداں را که او از نطق تشریف شرف بخشید انساں را

مولانا شبلی مرحوم سے ان کی ملاقات اسی عہد جوانی کی تھی، مولانا مرحوم نے جن دنوں ۱۹۰۸ء میں اپنی اُن فارسی غزلوں کا سلسلہ شروع کیا تھا جو بوئے گل اور دستۂ گل کے نام سے چھپ چکی ہیں، اور ملک میں اُن غزلوں کا پُرجوش خیر مقدم کیا جا رہا تھا، اور اہل سخن ان کے جواب میں غزلیں لکھا کرتے تھے تو ان میں سے ایک حافظ صاحب مرحوم بھی تھے، غالباً یہی سنہ تھا مولانا مرحوم کلکتہ سے لوٹ کر پٹنہ میں مولوی خدا بخش خاں مرحوم (کتبخانہ والے) کے یہاں ٹھہرے تھے، خاکسار بھی حاضر تھا، اتنے میں مولانا سے ملنے حافظ صاحب مرحوم بھی آگئے، اس زمانہ میں مولانا کی ایک فارسی غزل نئی نئی شاق افتادہ بود، طاق افتادہ بود نکلی تھی، وہ مولانا نے ان کو سنائی، انھوں نے بعد کو اس کا جواب لکھا، سب سے آخری دفعہ وہ ۱۹۲۶ء کے اجلاس ندوہ کانپور میں جس کے صدر حکیم اجمل خاں مرحوم تھے ادھر آئے تھے، اور اپنی ایک نظم پڑھی تھی،

مرحوم فطری شاعر تھے، کسی استاد سے کبھی اصلاح نہیں لی، مشکل قافیوں اور ردیفوں کا بھی شوق تھا، زبان و محاورات و روزمرہ کے بجائے دقیق مضامین و معانی کا شوق زیادہ تھا، اسی لئے مشکل الفاظ سے پرہیز نہ تھا، طبیعت میں ذکاوت و ذہانت تھی، اور اپنے لئے آپ راستہ پیدا کرنے کی دھن تھی، تقلید عام سے نفور تھے، جوانی میں شاد عظیم آبادی سے بھی بھڑتے رہتے تھے اور اپنچ میں مذاقیہ داد نظم بھی دیتے تھے، ادھر مدت سے خانہ نشین تھے، باہر کی آمد و رفت بند تھی، کبھی کبھی ایک آدھ نظم کسی رسالہ میں نکل جاتی تھی، اسی حالت میں اپنے وطن شاہو بگہہ ضلع گیا میں داعی اجل کو لبیک کہا،

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

اگست ۱۹۴۲ء کے معارف میں بیرونی کی کتاب الصیدلہ یا کتاب الصیدنہ کی اصل عربی یا فارسی ترجمہ کی بابت اہل علم سے استفسار کیا گیا تھا، مولوی سید حسن صاحب برنی مؤلف البیرونی نے اطلاع دی ہے کہ اس کا خلاصہ فارسی ترجمہ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے کتب خانہ میں موجود ہے، اور اس کا ذکر ان کی کتاب البیرونی کے صفحہ ۸۶ پر ملے گا،

ان کی کتاب البیرونی کو نکال کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ کتاب لغات الطب میں ہے، نسخہ ۱۳۰۰ھ کا لکھا ہے، اس کا ترجمہ ہندوستان ہی میں عثمان الکاشانی نے کیا تھا، کتاب کا طرز یہ ہے کہ پہلے ہر دوا کا عام نام لکھا ہے، پھر عربی، یونانی، سریانی، جرجانی، خوارزمی، فارسی، عراقی، ہندی، سندھی نام لکھے ہیں، اور پھر اس کی خاصیت بیان کی ہے،

جنوبی ہند کی دو یونیورسٹیوں میں اردو، فارسی اور عربی کی دو کرسیوں کے قیام سے اس دور افتادہ حصۂ ملک میں اسلامی ادبیات کی ترقی کی نئی راہیں نکلی ہیں، میسور یونیورسٹی نے اپنے یہاں اردو اور فارسی کی ایک کرسی قائم کی ہے اور اس پر حیدرآباد کے نوجوان ادیب پروفیسر عبدالقادر سروری کا انتخاب کیا ہے جس کے لئے یونیورسٹی اور پروفیسر دونوں کی خدمت میں ہدیۂ تہنیت پیش ہے، ٹراونکور یونیورسٹی نے سری چترا ترنال مہاراجہ کی منظوری سے اپنے یہاں عربی کی کرسی بڑھائی ہے، اور اس کے لئے کے محمد، ایم اے کو جو عربی کے لائق فاضل ہیں اور جن کے عربی میں خطوط میرے پاس وقتاً فوقتاً آیا کرتے ہیں، لکچرر مقرر کیا ہے، ان اطراف میں عربوں کی پرانی نوآبادی ہونے کے سبب سے عربی کی خاصی اہمیت ہے، اور اس بنا پر ٹراونکور یونیورسٹی کے اس ضروری اضافہ کی قدر سارے ملک میں کیجائیگی،

مقالات

امام رازی اور تنقید فلسفہ

از مولانا عبد السلام صاحب ندوی

(۲)

ملاحدہ کا ایک اعتراض یہ ہے کہ اگر خدا موجود ہے اور اُس نے دنیا کو علم و حکمت کے ساتھ پیدا کیا ہے، تو اس میں برائیاں کیوں پائی جاتی ہیں، اگر وہ دنیا کو خیر محض کے ساتھ پیدا کرتا تو اس سے اس کی قدرت و حکمت زیادہ نمایاں ہوتی اس بنا پر شیخ نے اشارات میں خیر و شر پر ایک مفصل مضمون لکھا ہے، جس کا خلاصہ امام صاحب کی تشریح کے مطابق یہ ہے کہ خیر و شر کے لحاظ سے موجودات کی صرف پانچ قسمیں ہو سکتی ہیں،

(۱) وہ موجودات جن میں صرف بھلائی ہی بھلائی پائی جائے،

(۲) وہ موجودات جن میں اگرچہ کچھ برائیاں بھی ہوں لیکن ان میں بھلائی برائی سے زیادہ ہو،

(۳) وہ موجودات جن میں بُرائی اور بھلائی دونوں برابر برابر پائی جائیں،

(۴) وہ موجودات جن میں بُرائیاں بھلائی سے زیادہ پائی جائیں،

(۵) وہ موجودات جن میں صرف برائی ہی بُرائی پائی جائے،

ان میں پہلی قسم کا وجود تو خدا کی حکمت اور رحمت کے بالکل مطابق ہے، دوسری قسم بھی

حکمت سے خالی نہیں، کیونکہ اگر چند برائیوں کی وجہ سے ان کا وجود نہ ہو تو بے شمار بھلائیوں سے دست بردار ہونا پڑیگا، مثلاً آگ میں جلانے کی جو خاصیت ہے، اس سے ہزاروں فائدے حاصل ہوتے ہیں، لیکن کبھی کبھی اس سے بعض انسان یا جانور جل بھی جاتے ہیں، اس لئے اگر اس برائی کی وجہ سے اس کو پیدا نہ کیا جائے تو یہ تمام فوائد بھی حاصل نہ ہوں گے،

دنیا میں جتنی قسمیں ہیں وہ انہی دونوں قسموں میں داخل ہیں، ان کے علاوہ تیسری، چوتھی یا پانچویں قسم کا وجود نہیں ہے، کیونکہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں اگرچہ آلام واسقام نہایت کثرت سے پائے جاتے ہیں، لیکن صحت و سلامت کا وجود ان سے بہت زیادہ ہے، اس سے معلوم ہوا کہ یہ برائیاں بالکل عرضی ہیں، یعنی جن چیزوں میں بھلائیاں زیادہ ہیں ان کے لئے یہ تھوڑی سی برائیاں بھی لازم ہیں، اور اسی لزوم کی وجہ سے وہ برائیاں ان سے الگ نہیں ہوسکتیں، لیکن امام صاحب کے نزدیک حکما، کے اصول کے مطابق خیر و شر کی بحث ہی نہیں پیدا ہوسکتی، کیونکہ حکما، نہ خدا کو فاعل مختار مانتے ہیں اور نہ حسن و قبح عقلی کے قائل ہیں، اور یہ بحث انہی دونوں اصول سے تعلق رکھتی ہے، کیونکہ جو لوگ خدا کو فاعل مختار مانتے ہیں اور ان کے نزدیک خدا کو ہر کام کے کرنے یا نہ کرنے کا اختیار حاصل ہے، اُن سے یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ خدا نے ایسا کیوں کیا؟ اور ایسا کیوں نہیں کیا، لیکن جب حکما، کے نزدیک خدا موجب بالذات ہے، اور اس سے جو افعال صادر ہوتے ہیں، ان کا صادر نہ ہونا محال ہے، تو یہ سوال ہی نہیں کیا جاسکتا، آفتاب سے روشنی بہر حال نکلے گی، خواہ یہ روشنی مضر ہو یا مفید؟ کیونکہ روشنی آفتاب کے لئے لازمی ہے، اور اس سے روشنی کا نہ نکلنا محال ہے، اسی طرح اس سوال کے لئے حسن و قبح عقلی کا قائل ہونا بھی ضروری ہے، جیسا کہ معتزلہ کا عقیدہ ہے، ورنہ جو لوگ حسن و قبح عقلی کے قائل نہیں ان کے نزدیک خدا کے کسی فعل میں برائی نہیں ہے، وہ جو کچھ کرتا ہے وہ بہتر و پسندیدہ ہے، جیسا کہ اشاعرہ کا خیال ہے، بہر حال یہ بحث صرف معتزلہ

کے اصول کے مطابق صحیح ہو سکتی ہے، جو خدا کو فاعل مختار مانتے ہیں اور اس کے ساتھ حسن و قبح عقلی کے بھی قائل ہیں، لیکن جو لوگ ان دونوں اصولوں کو نہیں مانتے یعنی حکماء و اشاعرہ ان کے لئے ایک غیر ضروری بحث ہے، البتہ حکما، اس مسئلہ پر دو حیثیتوں سے بحث کر سکتے ہیں،

(۱) ایک تو یہ کہ ان کو یہ معلوم ہو جائے کہ مخلوقات الٰہی ان پانچوں قسموں میں سے کس قسم میں داخل ہیں، یعنی ان میں صرف بھلائی ہی بھلائی یا بُرائی ہی بُرائی پائی جاتی ہے، یا اُن میں بُرائی اور بھلائی دونوں مخلوط ہیں،

(۲) دوسرے یہ کہ خدا کو ایک کامل ترین نظام کا علم ہونا اس نظام کے وجود کی علت ہے، اس لئے یہ معلوم ہونا ضروری ہے کہ وہ کامل ترین نظام کیا ہے؟ تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ یہی نظام پیدا کیا گیا ہے،

بہر حال امام صاحب نے فلسفیانہ مسائل کی تردید میں اس کی کوئی تفریق نہیں کی ہے کہ وہ مذہب کے موافق ہیں یا مخالف؟ بلکہ وہ فلسفہ کے تمام مسائل پر اعتراضات کرتے ہیں، البتہ انھوں نے فلسفیانہ مسائل پر جو اعتراضات کئے ہیں، اُن کے پیش نظر رکھنے کے بعد انسان کو یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ فلسفہ کوئی تشفی بخش چیز نہیں ہے، اس لئے اُس کے دل سے فلسفہ کی عظمت کا اثر بالکل زائل ہو جاتا ہے، اور وہ ایک ایسے علم کی جستجو میں مصروف ہو جاتا ہے، جو نکتہ چینی اور خردہ گیری سے بالاتر ہو، اور یہ چیز امام صاحب کے نزدیک قرآن مجید ہے، چنانچہ وہ خود اپنے وصیت نامہ میں لکھتے ہیں کہ "میں نے فلسفہ اور علم کلام دونوں کے طرز و روش کی جانچ کی تو ان میں وہ فائدہ نہیں دیکھا جو اس فائدہ کے برابر ہو جس کو میں نے قرآن مجید میں پایا کیونکہ وہ تمام عظمت و جلال کو صرف خدا کے لئے تسلیم کرواتا ہے اور اعتراضات و مناقضات میں تعمق کرنے سے روکتا ہے"

فلسفیانہ مسائل پر رد و قدح کی ابتدا اگرچہ ابتدا ہی سے ہو چکی تھی، لیکن امام صاحب نے

اس کو انجام تک پہنچایا اسلئے جو لوگ فلسفہ کے حامی تھے، اُنھوں نے خاص طور پر امام صاحب کی مخالفت کی، اور ان کے اعتراضات کے جوابات دیئے، فلسفہ و حکمت کی دو قسمیں تھیں، ایک حکمت ذوقیہ جس کا موجد افلاطون تھا اور دوسری حکمت نظریہ جو ارسطو کی طرف منسوب تھی، مسلمانوں میں اگرچہ عام طور پر حکمت نظریہ یعنی ارسطو کے فلسفہ کی اشاعت ہوئی اور امام صاحب نے اسی فلسفہ کو اپنے اعتراضات کا آماجگاہ بنایا، تاہم شیخ الاشراق کی وجہ سے بعض مسلمان فلسفیوں میں حکمت ذوقیہ کا ذوق بھی پیدا ہو چکا تھا، اس لئے ان لوگوں کو فلسفہ کی یہ بے وقعتی گوارا نہیں ہوئی اور اُنھوں نے امام صاحب کے اعتراضات کو اسی ذوق کی ناآشنائی کا نتیجہ قرار دیا، اور امام صاحب کی اس فلسفیانہ روش کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا، چنانچہ شہرزوری نے جو غالباً حکمت ذوقیہ کا ذوق شناس اور شیخ الاشراق کا نہایت مداح ہے امام صاحب پر نہایت سخت الفاظ میں نکتہ چینی کی، وہ امام صاحب کے تذکرے میں لکھتا ہے، کہ وہ بحث و مناظرہ اور رد و قدح میں درجۂ کمال کو پہنچے ہوئے تھے، اور اُن کے زمانہ میں کوئی شخص بحث و نظر میں ان کا ہمسر نہ تھا، وہ نہایت ذہین، اور کثیر التفکر تھے، اکثر علوم میں ان کی تصنیفات ہیں، لیکن حکما محققین کے زمرے میں ان کا ذکر نہیں کیا جا سکتا، اور دقیق النظر لوگوں کی صف اول میں اُن کا شمار نہیں کیا جا سکتا، اُنھوں نے حکما پر بہ کثرت شکوک و شبہات کئے، اور ان سے چھٹکارا نہ حاصل کر سکے، ان کے بعد جو لوگ پیدا ہوئے ان میں اکثر لوگ اُن کی وجہ سے گمراہ ہوئے اور ان شبہات سے چھٹکارا نہ حاصل کر سکے اور بعض لوگوں نے ان شبہات میں اور اضافہ کیا، ان شبہات کے حل نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے حکمائے قدیم کے مقاصد نہیں سمجھے، اُنھوں نے بحث کی بنیاد مشائین کے قواعد پر رکھی جو حکمائے کشف و ذوق کے نزدیک خود نہایت بے بنیاد تھے، ورنہ اگر انسان کو ذوق کے ذریعہ سے اصول صحیحہ کا علم ہو جائے تو اس کو ان کے حل کا طریقہ تھوڑی سی کوشش میں معلوم ہو جائے، اس قسم کے شبہات صرف اُن عامی اور زنگ آلود نفوس میں پیدا ہو سکتے

ہیں، جو فیض قدسی اور نزولِ نورِ الٰہی کے لئے تیار نہیں ہیں، یہی نور ہے، جس سے دل کھل جاتے ہیں اور اسی نور سے شبہات کا ازالہ ہوتا ہے اور حقائق و معارف حاصل ہوتے ہیں، ورنہ صرف ان کتابوں کے مطالعہ سے یقین علمی کا حاصل ہونا محال ہے، خدا اُس کے ملائکہ، اور اس کے ملکوت کے لطائف سے دوری کی علامت ان شبہات کا دلوں میں جڑ پکڑ جانا ہے، خلاصہ یہ کہ انھوں نے (امام رازی) حکمائے متالہین کا کوئی بھید نہیں پایا، اور علمائے قدیم کا مخفی علم حاصل نہیں کیا، بلکہ ان کا عمر بھر یہ کام رہا کہ لوگوں کے اقوال کو جمع کرتے تھے، اُن سے تفریعات کرتے تھے، اُن کی تحریر و تہذیب و توضیح کرتے تھے، کبھی ان میں اختصار پیدا کرتے تھے، کبھی ان کی تفصیل کرتے تھے، کبھی ایک ورق سے دوسرے ورق میں اور ایک مسودہ سے دوسرے مسودہ میں عبارت کے تغیر کے ساتھ ان کو منتقل کرتے رہتے تھے اور اس کا مقصد محض وہمی جاہ اور خیالی ریاست کا حاصل کرنا تھا، اور حکمت سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھانا تھا، ان کی سب سے عجیب غریب حالت یہ ہے کہ انھوں نے حکمت میں بہت سی کتابیں تصنیف کیں جس سے ان کو یہ وہم پیدا ہو گیا کہ وہ ان حکما میں سے ہیں جو انتہائی مرتبہ اور انتہائی مقاصد تک پہنچ گئے ہیں، حالانکہ وہ ان میں سے کمترین لوگوں کے مرتبہ کو بھی نہیں پہنچے، پھر وہ ابوالحسن اشعری متکلم کے مذہب کی طرف رجوع کرتے ہیں، جو یہ بھی نہیں جانتے کہ ان کے دونوں ہاتھوں میں سے کون سا ہاتھ زیادہ لمبا ہے، کیونکہ وہ حکمت بحثیہ اور حکمت ذوقیہ دونوں سے معرا تھے، اور حد کو مرتب کرنا اور دلیل کو قائم کرنا نہیں جانتے تھے، بلکہ وہ ایک غریب بڈھے ہیں، جو اپنے مذہب میں متحیر ہیں اگرچہ وہ (امام رازی) حکمت کے حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے، تاہم ان میں حکمت کی بڑی استعداد موجود تھی، اور حکمائے کے کلام سے فوائد اور لطائف کے نکالنے کی ان کے نفس میں بہت زیادہ قوت تھی، لیکن اُن کا عیب یہ ہے کہ وہ تجرد و سلوک سے بالکل ناآشنا تھے، اس لئے وہ فراغتِ قلب نہ حاصل کر سکے، اور یہ چیز صرف اسی سے حاصل ہوتی ہے، اس لئے وہ حکماء کے

مقامات تک ترقی نہ کر سکے اور اُن کے رموز و اسرار سے واقف نہ ہو سکے، ان کے بعض شبہات صحیح بھی ہیں، لیکن اخیر میں وہ اُن کی طرف اشارہ کرنے سے عاجز ہو گئے، کیونکہ ان کے پاس وہ اصل نہ تھی جس پر وہ اپنی بحث کی بنیاد رکھتے؛

اس میں شبہہ نہیں کہ امام صاحب نے حکمت ذوقیہ کی تحصیل نہیں کی اور اس کے لئے مجاہدہ و ریاضت کی زحمت کبھی نہیں اٹھائی، اس وقت مسلمانوں میں عام طور پر فلسفۂ مشائیہ کا رواج تھا، اور امام صاحب نے اسی فلسفہ کی تعلیم پائی تھی، اور اسی فلسفہ کے مسائل کو انھوں نے رد و قدح کے لئے سامنے رکھا تھا، اور اس فلسفہ کی نسبت خود شہرزوری کو تسلیم ہے کہ اس کی بنیاد مضبوط نہیں ہے، لیکن بدقسمتی سے مسلمانوں کا ایک بہت بڑا گروہ اسی فلسفہ کا گرویدہ تھا، اس لئے امام صاحب نے اسی بے بنیاد فلسفہ کی بنیاد کو اور بھی کھوکھلا کیا، اس لئے فلسفہ کی تردید سے اُن کا جو مقصد تھا حاصل ہو گیا،

امام صاحب کا دوسرا فلسفیانہ کارنامہ یہ ہے کہ فلسفہ کے متعلق جو اقوال اور دلائل فلسفہ کی کتابوں میں منتشر اور پراگندہ تھے، امام صاحب نے ان سب کو ایک جگہ جمع کیا، ان کی توضیح و تشریح کی اور ان سے نتائج نکالے، اس بنا پر انھوں نے فلسفہ کو نئے سرے سے مرتب کیا اور موجودہ شکل میں فلسفہ کی جو ترتیب پائی جاتی ہے وہ امام ہی صاحب کی ساختہ و پرداختہ ہے اور شہرزوری نے خود تسلیم کیا ہے کہ وہ عمر بھر اسی کام میں مصروف رہے،

شہرزوری امام صاحب کی ذہانت، اور فطانت کا بھی معترف ہے، اور ان کے بعض شبہات کو بھی صحیح سمجھتا ہے، اس بنا پر گو فلسفہ ذوقیہ کی ناآشنائی کی بنا پر وہ امام صاحب کو حکمائے محققین کے زمرہ میں نہیں شمار کرتا، تاہم جہاں تک حکمۃ بحثیہ یعنی فلسفۂ مشائیہ کا تعلق ہے شہرزوری کے نزدیک امام صاحب کے زمانہ میں بلکہ ان کے بعد بھی کوئی شخص ان کا ہمسر نہیں پیدا ہوا،

حکمت بحثیہ یعنی فلسفۂ مشائیہ کے حامیوں نے بھی امام صاحب کی فلسفیانہ تصنیفات کی

تردید میں کتابیں لکھیں، اور اُن کے اعتراضات کے جواب دیئے، چنانچہ سب سے پہلے سیف الدین آمدی نے امام صاحب کی شرح اشارات کی تردید میں ایک کتاب لکھی[۱]، اس کے بعد محقق طوسی نے بذات خود اشارات کی شرح لکھی، اور اس میں امام صاحب کے اعتراضات کے جوابات دیئے، پھر قطب الدین رازی نے محاکمات کے نام سے ایک کتاب لکھی، جس میں امام صاحب کے اعتراضات اور محقق طوسی کے جوابات کے درمیان محاکمہ کیا اور بدر الدین محمد بن اسعد یمانی نے بھی اس موضوع پر ایک کتاب لکھی، غرض امام صاحب کے زمانہ سے فلسفیانہ ہنگامہ آرائی کا ایک نیا دور شروع ہوا، اور فلسفیانہ مسائل کے ساتھ لوگوں کو جو عام دلچسپی پیدا ہوئی وہ اسی زمانہ سے ہوئی، اور فلسفیانہ مسائل کے بحث و تنقید کا کوئی پہلو تشنہ نہ رہ سکا، اس بنا پر فلسفہ کا جو ذوق آج تک موجود ہے وہ درحقیقت امام صاحب ہی کا پیدا کیا ہوا ہے، امام غزالی کے زمانہ تک فقہار و محدثین فلسفہ و منطق سے بالکل ناآشنا تھے، امام غزالی نے اس بیگانگی کو دور کیا، اور امام رازی نے اپنے زور تحریر اور دلائل کی قوت سے اس کو فقہار و محدثین کا دلچسپ ترین مشغلہ بنا دیا، یہی وجہ ہے کہ امام صاحب کے زمانہ سے لوگوں نے قدمار کی کتابیں چھوڑ دیں اور امام صاحب کی تصنیفات کے مطالعہ میں مشغول ہو گئے،

امام صاحب نے فلسفہ پر جو اعتراضات کئے ہیں، محقق طوسی نے اُن کے جو جوابات دیئے ہیں اور قطب الدین رازی نے اُن کے درمیان جو محاکمہ کیا ہے، اس موقع پر مناسب تو یہ تھا کہ ان سب کو نقل کر کے ان کے درمیان موازنہ کیا جاتا، لیکن یہ اعتراضات و جوابات نہایت دقیق اور غیر دلچسپ ہیں، اور اُن کے موازنہ کے لئے نہایت دقیق اور طویل الذیل بحث کی ضرورت ہوگی، جس سے اس مضمون کے ناظرین کو کوئی دلچسپی نہ ہوگی، اس لئے ہم اُن کو نظر انداز کرتے ہیں، البتہ ایک آسان مسئلہ

---

[۱] اخبار الحکما رقفطی ص۱۶۱،

کے متعلق امام صاحب اور محقق طوسی دونوں کی شرحوں کی عبارت کا خلاصہ درج کرتے ہیں، جس سے یہ اندازہ ہو سکے گا کہ امام صاحب فلسفیانہ مسائل کی تشریح کس جامعیت اور وضاحت کے ساتھ کرتے ہیں، شیخ نے قوت قدسیہ کے اثبات پر اشارات میں جو کچھ لکھا ہے اس کی شرح امام صاحب ان الفاظ میں کرتے ہیں :-

"شیخ جب فکر و حدس کے درمیان فرق بیان کر چکا، اور اس سے پہلے یہ بیان کر چکا تھا کہ انتقال حدسی نہایت دورس اور عمدہ ہوتا ہے، اور جس روح میں یہ ہوتا ہے اسی کا نام قوت قدسیہ ہے تو اب اسی قوت قدسیہ کو ثابت کرنا چاہتا ہے، کیونکہ تقسیم عقلی کے رو سے جس چیز کا فرض کرنا صحیح ہو اس کا وجود ضروری نہیں ہے، (اس لئے اس پر دلیل قائم کرنے کی ضرورت ہے) اور اس پر جو دلیل لائی جاتی ہے وہ کبھی انی ہوتی ہے، اور کبھی لمی اور شیخ نے اس فصل میں دلیل انی کو بیان کیا ہے، اور کہا ہے کہ قوت قدسیہ حدس کی ایک قسم ہے، اس لئے حدس کا ثابت کرنا ضروری ہے، لیکن تجربہ سے ثابت ہوتا ہے کہ حدس کا علم بدیہی ہے، کیونکہ ہر وہ شخص جس میں تھوڑی سی ذہانت بھی پائی جاتی ہی جب اپنی روح کا تجربہ کرتا ہے تو اس کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کو بعض اوقات ایسی چیزوں کا علم ہو جاتا ہے، جن کے حاصل کرنے کی وہ کوئی کوشش نہیں کرتا، لیکن حدس قوی یعنی قوت قدسیہ کے اسباب تو ہم کو یہ معلوم ہے کہ فکر کے لحاظ سے انسانوں کے مختلف درجے ہیں، بعض ایسے غبی انسان ہوتے ہیں جن کو فکر سے کسی نامعلوم چیز کا علم سرے سے حاصل ہی نہیں ہوتا، بعض میں تھوڑی سی ذہانت ہوتی ہے، بعض میں اس سے زیادہ قوت پائی جاتی ہے، اور وہ حدس کے قابل ہوتا ہے، اس لئے جس طرح نقصان کی انتہا ایسے شخص کی طرف ہوتی ہی، جس میں حدس سرے سے ہوتا ہی نہیں، اسی طرح زیادتی کی جانب ایسے شخص کی طرف انتہا ہونی چاہئے، جو اکثر حالات میں تعلم اور فکر سے بے نیاز ہو،

جاننا چاہئے کہ یہ دلیل دو طریقوں سے بیان کیجا سکتی ہے، ایک تو یہ کہ حدس میں کمی اور بیشی کے قبول کرنے کی صلاحیت ہے اسلئے اس طرح اس کمی کی انتہار ایسے شخص کی طرف ہوسکتی ہے جسمیں حدس موجود ہی نہ ہو، اسی طرح زیادتی کی انتہار ایسے شخص کی طرف ہونی چاہئے جس میں غیر معمولی حدس پایا جائے، دوسرے یہ کہ حدس کو فکر کے ساتھ نسبت ہے، اس لئے جس طرح یہ ضروری ہے کہ فکر کا جو طرف ناقص ہے، اُس کے مقابلہ میں ایک طرف کامل بھی ہونا چاہئے، اُسی طرح حدس میں بھی جس کا ایک پہلو ناقص ہے، اس کے مقابلے میں ایک پہلو کامل بھی ہونا چاہئے لیکن یہ دلیل دونوں طریقوں سے کمزور ہے، کیونکہ یہ محض ایک تمثیل ہے،

قوت قدسیہ کے اثبات کا عمدہ طریقہ یہ ہے کہ تصدیقات نظریہ کی انتہار تصدیقات بدیہیہ پر ہوتی ہے، اور تصدیقات بدیہیہ اپنے اجزار کے تصورات پر موقوف ہیں، مثلاً اس بدیہی قضیہ کا علم کہ "کل جزو سے بڑا ہوتا ہے"، جزء کل اور بڑے کے تصور پر موقوف ہے، اور اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ نفوس انسانی ان تصورات کے قابل ہیں پھر جب تصدیقات بدیہیہ کسی معلّم کی تعلیم پر موقوف نہیں ہیں، تو ان مفرد تصورات کو بھی بطریق اولیٰ کسی معلم کی تعلیم پر موقوف نہیں ہونا چاہئے، پھر تصدیقات بدیہیہ کی حقیقت جب یہ قرار پائی کہ اُن کے اجزار کا تصوّر ان کی تصدیق کے یقین کے لئے کافی ہو تو نفس انسانی بذات خود ان بدیہی قضایا کا علم حاصل کرسکتا ہے، اور اُن کا اجتماع ممکن ہے، اور اُن کی یہ حالت ہے کہ جب وہ مجتمع ہو جائیں گے، تو ان کے اجتماع سے لازمی طور پر علم نظری حاصل ہو جائیگا، تو جب تنہا نفس کا اُن تمام قضایا سے جن کے اجتماع سے لازمی طور پر علم نظری حاصل ہو جاتا ہے، متصف ہونا ممکن ہے تو اس علم نظری سے بھی کسی معلّم کی تعلیم کے بغیر اس کا متصف ہونا ممکن ہوگا، پھر جب علوم نظریہ کو باہم ترکیب دیجائیگی، تو اسکو دوسرے نظری علوم لازم ہونگے، اس لئے ہمارے اس بیان کا اقتضار یہ ہے کہ تمام نفوس انسانی کو تمام علوم نظریہ بغیر کسی کوشش

کے فوراً حاصل ہو جائیں، اور حدس کے یہی معنی ہیں لیکن نفس کا تدبیر بدن میں مشغول رہنا، اس میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے، اور خیال بھی سدِّ راہ ہوتا ہے، اس سے ثابت ہوا کہ حدس قوی فطرت اصلیہ کا اقتضا رہے، اور فکر کی ضرورت محض عوارض کی وجہ سے ہوتی ہے، اسی لئے رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ ہر بچہ اسلام کی فطرت پر پیدا ہوتا ہے "۔

شیخ کی اسی عبارت کی شرح محقق طوسی نے ان الفاظ میں کی ہے:

"شیخ قوت قدسیہ کے وجود کو ثابت کرنا چاہتا ہے، اور اس کے اثبات کا طریقہ یہ ہے کہ مطلوب تک پہنچانے میں کیف و کم کے لحاظ سے حدس اور فکر کے مختلف درجے ہیں، کیف کے لحاظ سے تو اس لئے کہ مطلوب تک یہ کبھی تیزی سے پہنچاتے ہیں اور کبھی دیری سے اور کم کے لحاظ سے اسلئے کہ کبھی مطلوب کی تعداد زیادہ ہوتی ہے، اور کبھی کم، کیف کا یہ اختلاف فکر میں زیادہ ہوتا ہی کیونکہ اس میں حرکت پائی جاتی ہے اور کم کا اختلاف حدس میں زیادہ ہوتا ہے، کیونکہ اُس میں حرکت نہیں پائی جاتی اور حدس نفس کی قوت سے پیدا ہوتا ہے، ان مختلف درجوں میں نقصان و کمال کی دو حدیں ہیں، نقصان کی حد تو یہ ہے کہ ایک شخص کی تمام فکریں مطالب کے حاصل کرنے سے قاصر ہیں اور کمال کی حد یہ ہے کہ ایک ہی شخص کو وہ تمام علوم دفعۃً حاصل ہو جائیں جو اسکی نوع کو مقدار کے لحاظ سے حاصل ہو سکتے ہیں، یا اسی کے قریب کیف کے لحاظ سے ایسے طریقہ پر کہ حدود وسطی پر مشتمل ہو تقلیدی نہ ہو، اور چونکہ نقصان کا پہلو عام طور پر نظر آتا ہے، اسلئے کمال کا پہلو بھی ممکن الوجود ہوگا"۔

ان دونوں عبارتوں کے موازنہ کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ امام صاحب پہلے تو خود دلیل کی تحلیل نہایت وضاحت کے ساتھ کرتے ہیں، پھر اُسکی کمزوریوں کو دکھاتے ہیں، اسکے بعد اگر ممکن ہوتا ہی تو خود اس مسئلہ پر مستقل دلیل قائم کرتے ہیں، لیکن محقق طوسی کی عبارت ان باتوں سے بالکل خالی ہی"

———— ۱ ————

حضرت مرزا مظہر جانجاناںؒ

از

جناب عبدالرزاق صاحب قریشی

جانِ جان نام، مظہر تخلص، شمس الدین حبیب اللہ لقب، علوی نسب، نقشبندی مشرب، مرزا صاحب کا سلسلۂ نسب ۲۸ واسطوں سے محمد بن حنفیہ کے توسط سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ تک پہنچتا ہے، مصحفی کا بیان ہے کہ

"والہ داغستانی در ریاض الشعراء مرزا مزبور را از سادات علویہ نوشتہ و ایں غلط محض است چراکہ مرزا بقول صحیح از اتراک توران است"[1]

نہیں معلوم مصحفی کو یہ غلط فہمی کیوں پیدا ہوئی، تمام تذکرہ نگار اس بات پر متفق ہیں، اور خود مرزا صاحب کا اپنا بیان ہے کہ ان کا سلسلۂ نسب حضرت محمد بن حنفیہ کے توسط سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ملتا ہے[2]، محض اس بناء پر کہ ان کے جد بزرگوار نے ترکستان میں سکونت اختیار کر لی تھی، ان کا سلسلۂ نسب تو نہیں بدل سکتا،

مرزا صاحب کے اجداد میں ایک بزرگ امیر کمال الدین (جن کا سلسلۂ نسب ۱۹ واسطوں سے محمد بن حنفیہ کے توسط سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ملتا ہے) آٹھویں صدی ہجری میں طائف سے ترکستان گئے، اور وہاں کے حاکم سردار الوس قاقشالاں کی لڑکی سے اُن کی شادی ہو گئی، چونکہ

---

[1] عقد ثریا [2] کلمات طیبات و سرو آزاد ص ۲۳۱۔

اس حاکم کے کوئی اولاد نرینہ نہ تھی، اس کی حکومت امیر کمال الدین کو مل گئی، جب ہمایوں نے شاہ ایران کی مدد سے اپنی کھوئی ہوئی سلطنت دوبارہ حاصل کی تو اس خاندان کے دو بھائی مجنون خاں اور بابا خاں بھی اس کے ساتھ ہندوستان آئے، حضرت میرزا مظہر جانجاناں، بابا خاں کی اولاد میں ہیں، مختصر شجرۂ نسب یہ ہے:-

میرزا جان جاں بن مرزا جان بن مرزا عبد السبحان بن مرزا محمد امان بن شاہ بابا سلطان ابن بابا خاں بن امیر غلام محمد بن امیر محمد بن خواجہ رستم شاہ بن امیر کمال الدین،

بابا خاں[۲] نے اکبر کے زمانہ میں بغاوت کی جس کی پاداش میں اس خاندان کے لئے مناصب عالیہ کے دروازے بند کر دیئے گئے، خود مرزا صاحب کا بیان ہے کہ

"پدرم بجرم خان مذکور (بابا خاں) کہ در عہد اکبری مصدر یغی شدہ بود بعار کم منصبی گرفتار بود"[۳]

لیکن خوشگو کا یہ بیان صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ

"ایں خاندان را در سرکار پادشاہی نوکر نمیگرفتند مگر میرزا جان والد شریفش کہ منصبدار عالمگیر بادشاہ بود"

یہ بالکل قرین قیاس ہے کہ بغاوت کی پاداش میں پنجہزاری، ہفت ہزاری وغیرہ کے عہدے اس خاندان کے لئے بند کر دیئے گئے ہوں لیکن یہ کہنا کہ سرکار شاہی میں کوئی عہدہ ہی نہ ملتا تھا حالات کو جانتے ہوئے، بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے، خود مرزا صاحب کا بیان ہے کہ

"خدمت در فاقت سلاطین گورگانیہ شعار مردم ایں خاندان بود"[۵]

---

[۱] کلمات طیبات، سفینہ خوشگو میں ہے:- کہ "از نبائر مجنون خان قاقشال است" لیکن کوئی وجہ نہیں کہ ہم خوشگو کے بیان کو مرزا صاحب کے بیان پر ترجیح دیں) [۲] ان کے حالات کے لئے دیکھئے اکبر نامہ، مآثر الامرا [۳] کلمات طیبات [۴] سرو آزاد ص ۲۲۳،

مرزا صاحب کے بڑے دادا مرزا محمد امان (بابا خاں کے پوتے) کی شادی اکبر بادشاہ کی لڑکی سے ہوئی تھی[1]، اس طرح ان کے دادا مرزا عبد السبحان تیموری خاندان کے نواسہ ہوتے ہیں،

مرزا عبد السبحان منصب شاہی پر فائز تھے[2]، وہ مرتبۂ عالی پر فائز ہونے کے باوجود بہت خدا ترس و خدا پرست تھے، طریقۂ چشتیہ میں لوگوں کو مرید کرتے تھے، اُن کی ماتحتی میں جتنے سپاہی سوار اور خدمتگار تھے، سب تہجد گذار تھے[3]،

مرزا صاحب کی دادی، وزیر الممالک آصف الدولہ نواب اسد خاں[4] عالمگیر شاہی کی بیٹی تھیں[5]، وہ شیعہ تھیں، لیکن شوہر کے فیض صحبت سے سنی ہو گئی تھیں، وہ اس قدر عبادت گذار تھیں، اور اُن کی صفائی باطن اتنی بڑھ گئی تھی کہ تسبیح جمادات سُن سکتی تھیں، وہ عورتوں کو مثنوی مولانا روم کا درس بھی دیتی تھیں[6]،

مرزا صاحب کی والدہ بیجاپور کے شاہی خاندان سے تھیں، وہ بہت پارسا، نیک اور عبادتگذار تھیں، اور جود و سخا میں تو اپنی نظیر نہیں رکھتی تھیں[7]،

مرزا جان حضرت مرزا کے والد بزرگوار کا نام مرزا محمد جان تھا، وہ اکثر علوم میں ماہر تھے، شعر و شاعری سے بھی لگاؤ تھا، جانی تخلص کرتے تھے، حضرت شاہ عبد الرحمٰن قادری کے مرید تھے[8]،

---

[1] [2] [3] معمولات مظہریہ ص۱۴ [4] محمد ابراہیم نام، پسر ذو الفقار خاں قرامانلو ست، نواسۂ صادق خاں میر بخشی و خویش یمین الدولہ آصف خاں، "اسد خاں خطاب شاہجہانی دربار سے ملا تھا، ترقی کرتے کرتے عہد اورنگ زیب میں منصب وزارت پر فائز ہوئے، (مفصل حالات کے لئے دیکھئے مآثر الامرا، جلد اول) [5] مخزن الغرائب (نسخہ دار المصنفین) مقامات مظہری، خزینۃ الاصفیا (معمولات مظہریہ میں خالہ زاد بہن لکھا ہے، صاحبان آب حیات و گل رعنا کا بھی یہی بیان ہے، گمان غالب ہے کہ ان دونوں حضرات کے سامنے معمولات ہی کا نسخہ تھا، مقامات مظہری، جس کے مصنف، صاحب معمولات کی طرح مرزا صاحب کے مریدوں میں ہیں، معمولات کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ صاحب مقامات نے معمولات کے اس بیان کو صحیح تسلیم نہیں کیا) [6] [7] معمولات مظہریہ ص۱۴،

[8] شاہ صاحب کا مزار شاہجہان آباد میں لاہوری دروازہ اور کابلی دروازہ کے درمیان واقع ہے، اس محلہ کو مسجد پری کہتے تھے، (مقامات مظہری، فٹ نوٹ ص۱۶)

مرزا جان ابتدائً سرکاری ملازموں میں تھے، لیکن دنیاوی بادشاہ کا دربار انھیں کچھ پسند نہ آیا، بادشاہ بادشاہان کے دربار میں عالی منصب حاصل کرنے کا خیال پیدا ہوا، اس لئے اپنے عہدہ سے مستعفی ہوگئے، صاحب گلشن بیخار کا بیان ہے کہ مرزا صاحب کسی سبب سے اورنگزیب سے ناراض ہوکر اپنے عہدہ سے مستعفی ہوگئے تھے، لیکن اس بیان کی تصدیق اور کسی ذریعہ سے نہیں ہوتی، بہرحال یہ یقینی ہے کہ مرزا جان نے اپنے عہدہ سے مستعفی ہوکر فقیری اختیار کرلی اور اپنا سارا مال و دولت راہِ خدا میں فقرا و مساکین میں تقسیم کردیا، پچیس ہزار روپیے لڑکی کے نکاح کے لئے رکھ چھوڑے تھے، ایک دن سنا کہ ایک دوست مالی مشکلات میں آن پڑے ہیں، پوری رقم ان کے حوالہ کردی[1]،

مرزا صاحب میں توکل بہت تھا، ایک بار گھر میں کدو کا بیج بویا تھا، لونڈی نے کہا آپ نے توکل کا دعویٰ رکھتے ہوئے بھی گھر میں کدو کی بیل لگائی ہے، ممکن ہے فاقہ کی حالت میں یہ خیال گذرے کہ اس کے پھل اور پتوں سے پیٹ بھرلوں، مرزا صاحب نے فوراً بیل کو اکھڑوا دیا[2]،

مرزا جان نے ۱۱۳۰ھ میں انتقال کیا،

میرزا جانجاناں وجہ تسمیہ	مولانا محمد حسین آزاد، آب حیات میں لکھتے ہیں، کہ

"آئینِ سلطنت تھا کہ امراء کے ہاں اولاد ہو تو حضور میں عرض کریں، بادشا خود نام رکھیں یا پیش کئے ہوئے ناموں میں سے پسند کردیں، کسی کو خود بھی بیٹا بیٹی کرلیتے تھے، یہ امور طرفین کے دلوں میں اتحاد اور محبت پیدا کرتے تھے، ان کیلئے ایک وقت پر سند ترقی ہوتے تھے، اور بادشاہوں کو اُن سے وفاداری اور جان نثاری کی اُمیدیں ہوتی تھیں"

---

[1] [2] مقامات مظہری ص۱۴۱،

چونکہ حضرت میرزا کے والد بزرگوار بھی امرا میں سے تھے، گو حضرت کی پیدائش کے وقت وہ مستعفی ہو چکے تھے، اس لئے جب حضرت مرزا پیدا ہوئے تو اورنگ زیب کو خبر بھیجی گئی، اس نے کہا چونکہ بیٹا، باپ کی جان ہوتا ہے، اور اس بچہ کے باپ کا نام مرزا جان ہے، اس لئے اس کا نام ہم نے جانِ جاں رکھا، لوگوں نے بڑھا کر جانِ جاں کو جانجاناں بنا دیا، اور یہ تغیر خود مرزا صاحب کی زندگی ہی میں ہو گیا تھا، چنانچہ خود مرزا صاحب نے اپنے مکاتیب میں ہمیشہ جانجاناں لکھا ہے، صاحب مجمع النفائس مرزا صاحب کے ہمعصر تھے، ان کا بھی بیان ہے کہ

"حالا بجان جاناں شہرت گرفتہ"

آزاد بلگرامی بھی مرزا صاحب کے ہمعصر تھے، وہ ان کے نام اور تخلص کے سلسلہ میں ایک دلچسپ نکتہ پیدا کرتے ہیں، لکھتے ہیں کہ

"نام و تخلص او گویا عنایت ترجمان اسرار قیومی مولانائے رومی است کہ پانصد سال پیش ازیں در دفتر ششم مثنوی ارشاد فرمودہ و کرامتی بحضار انجمن استقبال وانمودہ یعنی

جان اوّل مظہر درگاہ شد   جانِ جاں خود مظہر اللہ شد"

اس کے بعد آزاد لکھتے ہیں کہ

"لیکن نام او بر السنہ میرزا جانجاناں جاری شدہ"[1]

میر تقی میر کا بیان ہے کہ ان کے والد کا نام مرزا جان تھا بیٹے کو فرط محبت سے جانِ جاں کہا کرتے تھے، اور بالآخر وہ اسی نام سے مشہور ہوئے[2] لیکن یہ صحیح نہیں، مرزا صاحب کے نام کی اصل وجہ تسمیہ وہی ہے جو ہم نے اوپر بیان کی، ہم اپنے دعوے کے ثبوت میں مصحفی کا یہ بیان پیش کر سکتے ہیں،

"روزی وجہ تسمیہ خود را پیش فقیر بیان کردہ یعنی اسم والد من مرزا جان بود و چوں

---

[1] سرو آزاد، [2] نکات الشعراء، [3] عقد ثریا،

او اخر عصر خلد مکان قدم بعالم وجود گذاشتم و ایں خبر بسمع بندگانِ اقدس رسید، ارشاد شد کہ

نام ایں پسر جانِ جاں باید گذاشت[۵]"

مولانا محمد حسین آزاد، مرزا صاحب کے نام کے سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ ان کے والد نے اپنے طور پر ان کا نام شمس الدین رکھا، لیکن وہ عالمگیری نام کے سامنے نہ چمک سکا، مولانا عبد الحئی (صاحب گل رعنا) نے بھی "شمس الدین جانجاناں" نام لکھا ہے، لیکن اس کی تصدیق کسی ذریعہ سے نہیں ہوتی، بلکہ معمولات مظہریہ میں جو مرزا صاحب کے ایک مرید کی لکھی ہوئی کتاب ہے شمس الدین حبیب اللہ لقب بتایا گیا ہے،

سال ولادت | حضرت میرزا کے والد بزرگوار جب اپنے عہدہ سے مستعفی ہو کر دکن سے آگرہ آرہے تھے تو حضرت میرزا کالا باغ میں جو حدود مالوہ میں واقع ہے" اار رمضان المبارک شب جمعہ، وقت فجر پیدا ہوئے، مرزا صاحب کا سالِ ولادت عام طور پر تذکروں میں ۱۱۱۱ھ ملتا ہے، معمولات مظہریہ اور مقامات مظہری، دو کتابیں خاص مرزا صاحب کے حالات میں لکھی گئی ہیں، صاحب معمولات نے ۱۱۱۱ھ اور صاحب مقامات نے ۱۱۱۱ھ یا ۱۱۱۳ھ سالِ ولادت لکھا ہے، صاحب مقامات نے تاریخ پیدائش کے دو مادے بھی دیئے ہیں (۱) تولد صاحب شرع (۲) طلوع شمس الملت والدین، ان دونوں مادوں سے ۱۱۱۱ھ نکلتا ہے، لیکن یہ تاریخ کسی قدر مشکوک ہے، اور خود مرزا صاحب کے اپنے مختلف بیانات نے اُن کے سالِ ولادت کے متعلق اختلاف پیدا کر دیا ہے، مرزا صاحب نے اپنے سالِ پیدائش کا ذکر تین مختلف موقعوں پر کیا ہے،

(۱) مولوی غلام علی آزاد بلگرامی کی استدعا پر جب اپنے حالات (سرو آزاد) کے لئے لکھ کر بھیجے ہیں تو اس میں لکھا ہے کہ

"...... در عشرہ اولیٰ مائۃ ثانیہ بعد الف ولادتش (ولادت مرزا صاحب) اتفاق افتاد[۲]"

۱؎ عقد ثریا ۲؎ سرو آزاد ص ۲۳۱،

اس بیان کے مطابق ان کا سنہ ولادت ۱۱۱۰ھ سے پہلے ہونا چاہئے،

(۲) اپنے فارسی دیوان کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ

"امروز ہزار وصد و ہفتاد ہجری است و عمر بشصت رسیدہ"

اگر اس بیان کو صحیح مان لیا جائے تو اُن کا سالِ ولادت ۱۱۱۰ھ اور ۱۱۱۱ھ کے مابین قرار پاتا ہے،

(۳) اپنے ایک مرید کے اصرار پر اپنے مختصر حالات اسکو لکھ کر بھیجتے ہیں، اس میں اپنا سالِ پیدائش ۱۱۱۳ھ لکھتے ہیں، خود مرزا صاحب کے الفاظ یہ ہیں:-

"در ہزار وصد و سیزدہ ولادت فقیر اتفاق افتادہ[1]"

اسی مکتوب میں اپنے والد ماجد کے سال وفات کے متعلق فرماتے ہیں کہ

"در سال ہزار وصد و سی ہجری انتقال ازایں عالم فرمودہ...... در عمر شانزدہ سالگی گرد یتیمی بر رو نشست[2]"

مرزا صاحب کے والد کا انتقال ۱۱۳۰ھ میں ہوتا ہے اور مرزا صاحب کی عمر اس وقت سولہ سال کی ہے، تمام تذکرے مرزا صاحب کی اس عمر کے بارے میں متفق اللفظ ہیں، لہذا اگر اس بیان کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو مرزا صاحب کا سالِ پیدائش ۱۱۱۳ھ زیادہ قرین صحت معلوم ہوتا ہے،

بہر نوع اس قدر یقینی ہے کہ مرزا صاحب کا سالِ پیدائش ۱۱۰۹ھ اور ۱۱۱۳ھ کے مابین ہے، صاحب معمولات مظہریہ مولوی نعیم اللہ بہرائچی نے اس اختلاف کی طرف اشارہ کیا ہے اور نہایت وثوق کے ساتھ لکھا ہے کہ مرزا صاحب کا سالِ ولادت ۱۱۱۱ھ ہے نہ کہ ۱۱۱۳ھ،

[1،2] کلمات طیبات،

لیکن افسوس کہ اُنھوں نے اپنے دعوے کے ثبوت میں کوئی دلیل پیش نہیں کی، محض ان کا مرزا صاحب کا مرید ہونا تو ان کے دعوے کی سچائی کا ثبوت نہیں ہو سکتا،

وطن | جیسا کہ ہم اوپر عرض کر چکے ہیں، مرزا صاحب کے آبا و اجداد دراصل طائف کے رہنے والے تھے، وہاں سے ان کے جد بزرگوار امیر کمال الدین، ترکستان چلے گئے اور تین چار پشتیں وہیں گذر گئیں، پھر امیر بابا خاں اور مجنوں خاں ہمایوں کے ساتھ ہندوستان آئے، پہلے تو یقیناً اُنھوں نے دہلی کو اپنا مسکن بنایا ہوگا، لیکن جب اکبر نے آگرہ کو اپنا دار الخلافہ بنایا تو قیاس کہتا ہے کہ مرزا محمد امان (داماد اکبر بادشاہ) بھی آگرہ اُٹھ آئے ہوں گے، بہرحال یہ یقینی ہے کہ مرزا صاحب کے والد مرزا جان کا مسکن شہر آگرہ تھا، چنانچہ مرزا صاحب کی نشو و نما اور ابتدائی تعلیم و تربیت اکبر آباد ہی میں ہوئی، لیکن خود مرزا صاحب نے دہلی کو اپنا مسکن بنایا،[۱] اور یہیں ان کی تربیت باطنی ہوئی، دہلی میں مرزا صاحب کی خانقاہ جامع مسجد کے قریب کوچۂ امام میں تھی،[۱]

تعلیم و تربیت | مولانا محمد حسین آزاد، آب حیات میں مرزا صاحب کی تعلیم کے بارے میں فرماتے ہیں کہ

"مرزا صاحب کی تعلیم عالمانہ نہ تھی، مگر علم حدیث با اُصول پڑھا تھا"

لیکن حقیقت یہ ہے کہ مرزا صاحب کی تعلیم ہر حیثیت سے نہایت اچھے پیمانہ پر ہوئی تھی، صاحب خزینۃ الاصفیا کا بیان ہے کہ

"از ہر فن و علم ظاہری بہرۂ کامل حاصل نمود"

مرزا صاحب بہت چھوٹے تھے کہ اسی وقت سے ان کے والد نے ان کی تعلیم کا اہتمام

---

۱ گلشن بیخار صفحہ ۲۲۶ ۲ عمدہ منتخبہ بحوالہ ادوہ کیٹلاگ،

کیا اور ہمیشہ ان کو تاکید فرماتے کہ وقت اور عمر کا کوئی نعم البدل نہیں، اس کو ضائع نہ کرنا چاہئے[۱] اس سلسلہ میں مرزا صاحب کے ایک ہمعصر تذکرہ نویس کا بیان بھی سننے کے قابل ہے، احمد علی سندیلوی اپنے تذکرۂ مخزن الغرائب میں لکھتے ہیں کہ

"در صغر سن صرف و نحو، پارۂ از معقول و حدیث و تفسیر و عروض و قافیہ تلخیص المفتاح خواندہ متوجہ بشعر گوئی شدند"

ایک دوسرے ہمعصر تذکرہ نویس فتح علی گردیزی (صاحب تذکرۂ ریختہ گویاں) کا بیان ہے کہ

"از آنجا کہ علم فقہ و حدیث حظی وافر دارد و از کتب سیر و تواریخ بہرۂ متکاثر ...."

مرزا صاحب نے فارسی کی تکمیل اپنے والد ماجد سے کی، کلام اللہ قاری حافظ عبد الرسول دہلوی تلمیذ شیخ القرا شیخ عبد الخالق سے پڑھا اور علم تجوید و قرأت کی سند بھی انہی سے لی، والد کی وفات کے بعد علم حدیث و تفسیر اور دوسری کتب مبسوطہ حضرت حاجی محمد افضل سیالکوٹی تلمیذ شیخ المحدثین شیخ عبد اللہ بن سالم مکی سے پڑھیں[۲]،

مرزا صاحب کے والد ماجد ان کو اکثر یہ نصیحت فرمایا کرتے تھے کہ

"از برائے فہم معانی قرآن مجید و تدبیر در احادیث مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم، از محاورات عرب وقوف و اطلاع ضرورست، ہمچنیں برائے فہم معانی مقصودہ از محاورات مردم ایں دیار در وقت ہمکلامی نیز از وقوف تمام چارہ نیست تا در حضور عقلا از عدم فہم معانی مقصودہ انفعال کشیدہ نشود"[۳]

درسی اور متداول علوم کے علاوہ آداب بادشاہی، فن سپہ گری اور دوسرے متداول فنون کی بھی مرزا صاحب کو تعلیم دی گئی تھی اور انھوں نے ہر ہنر میں وہ کمال پیدا کیا تھا کہ لوگ

---

[۱] مقامات ص۱۵ [۲] کلمات طیبات [۳] معمولات ص۱۴۱،

ان سے اپنے اپنے ہنر کی داد مانگتے اور ان کو اپنا اُستاد تسلیم کرتے[۱]،

استعمالِ اسلحہ میں وہ کمال پیدا کیا تھا کہ فرماتے تھے کہ اگر بیس آدمی تلوار سے مجھ پر حملہ کریں اور میرے ہاتھ میں صرف ایک لکڑی ہو تو انشاء اللہ کوئی مجھے زخمی نہیں کر سکتا[۲]،

ایک مرتبہ مغرب کی نماز پڑھ رہے تھے، جب سلام پھیرا تو ابر کی تاریکی میں کسی شخص نے ان پر خنجر کا وار کیا، اتفاق سے بجلی چمکی اور اُنھوں نے اس کی چمک میں خنجر کو دیکھ لیا، اور اس کے ہاتھ سے چھین کر پھر اس کو دیدیا، اُس نے پھر حملہ کیا، اُنھوں نے پھر چھین لیا، اور اس کو دیدیا، اس نے سات بار حملہ کیا اور ساتویں بار مرزا صاحب نے خنجر اس کے ہاتھ سے چھین لیا، آخر وہ قدموں پر گر پڑا، اور معافی کا خواستگار ہوا[۳]،

ایک بار گھوڑے پر سوار کہیں جا رہے تھے کہ راستہ میں سامنے سے ایک مست ہاتھی آرہا تھا، ہاتھی نے قریب پہنچکر ان کو سونڈ میں لپیٹ لیا، اُنھوں نے میان سے خنجر نکالا، اور ہاتھی کے سونڈ پر اس زور سے مارا کہ اُس نے بیتاب ہو کر ان کو چھوڑ دیا اور وہ سلامت بچ گئے[۴]،

مرزا صاحب کپڑا کاٹنا خوب جانتے تھے، چنانچہ صاحب مقامات کا بیان ہے :-

"تقطیعِ سراویل ایشاں رابہ پنجاہ طرز می آید"

تربیت باطنی | مرزا صاحب کے والد مرزا جان نے ۱۱۳۰ھ میں وفات پائی، اُس وقت مرزا صاحب کی عمر سولہ سال تھی، مصحفی عقد ثریا میں لکھتے ہیں کہ

"بعد فوتِ والد ماجد خود مال و اسباب فراواں کہ بدستش افتادہ بود بذلِ مجالس و دعوتِ یاران نمود و در ہیزدہ سالگی ہمہ را پاک فروختہ کلاہِ درویشی بر سر گذاشت"

مرزا صاحب نے والد کی وفات کے بعد دو سال دنیا طلبی میں گذارے اور اس بات کی

[۱-۲] معمولات ص۵، [۳] مقامات مظہری ص ۱۱، [۴] ایضاً ص۱۲

کوشش کی کہ دربار میں کوئی منصب مل جائے، اُن کے والد کو انتقال کئے ہوئے کوئی دو برس ہو چکے تھے، کہ ایک دن کچھ لوگ سفارش کی غرض سے اُن کو بادشاہ (فرخ سیر) کی خدمت میں لے گئے، اتفاق سے بادشاہ کو زکام ہو گیا تھا، اور وہ اس دن دربار میں نہ آسکا، اس لئے مرزا صاحب کو مایوس و ناکامیاب لوٹنا پڑا، اُسی رات خواب میں دیکھا کہ ایک بزرگ کے مزار پر گئے ہیں، صاحب مزار قبر سے باہر آئے، اور اپنی ٹوپی (طاقی) ان کے سر پر رکھی، اس خواب کے بعد مرزا صاحب نے دنیا طلبی کا خیال چھوڑ دیا،[۱]

ایک دن اپنے گھر پر بیٹھے تھے، اسباب طرب بھی تھا اور مجمع احباب بھی، اتفاقاً کسی نے حضرت سید نور محمد بدایونی[۲] کا ذکر کر دیا، اور ان کے اوصافِ حمیدہ بیان کئے، نہ جانے مرزا صاحب کے دل میں کیا سمائی کہ تمام دوستوں کو چھوڑ کر اسی وقت آستان بوسی کے لئے روانہ ہو گئے، حضرت سید نے استخارہ مسنونہ کے بعد ان کی صلاحیت و استعداد کے مطابق ان کو ذکر طریقۂ عالیہ بتایا، ان سے کہا کہ آنکھیں بند کرو اور خود توجہ دینی شروع کی، چنانچہ ایک ہی توجہ میں "لطائف خمسہ را ذاکر کردہ رخصت نمودند"[۳]

یہ بتا دینا ضروری ہے کہ مرزا صاحب کا حضرت سید نور محمد بدایونی کی خدمت میں حاضر

---

[۱] معمولات مظہریہ ص۱۵ [۲] حضرت سید نور محمد بدایونی نے کسب سلوک حضرت شیخ سیف الدین فرزند و خلیفہ عروۃ الوثقیٰ حضرت محمد معصوم فرزند سجادہ نشین حضرت مجدد سے کیا تھا، علوم ظاہر و باطن دونوں میں کمال حاصل تھا، ان کا استغراق اور قوت جذبی بہت بڑھی ہوئی تھی، سنت نبوی کا اتباع بہت سختی سے کرتے تھے، کثرت مراقبہ کی وجہ سے پیٹھ خم ہو گئی تھی، اہل دنیا کی صحبت سے سخت اجتناب تھا،

مرزا صاحب کو ان سے غایت درجہ محبت تھی، ان کا نام زبان پر آتے ہی آنکھیں پرنم ہو جاتیں (مقامات مظہری)

۱۱ ذیقعدہ ۱۱۳۵ھ کو انتقال فرمایا، مزار شریف بیرون کوٹلہ سلطان المشائخ، جانب پائیں واقع ہے [۳] معمولات مظہریہ ص۱۶،

ہونا محض ایک اتفاقی بات نہ تھی، بلکہ عشق ایزدی ان کے خمیر میں موجود تھا، اور بچپن ہی سے ان کے والد نے ہمیشہ ان کے کانوں میں اسی قسم کی باتیں ڈالی تھیں، صاحبِ معمولات مظہریہ کے الفاظ میں مرزا جان مرزا صاحب کو ہمیشہ یہ نصیحت فرمایا کرتے تھے کہ

"ہر کہ دلش بداغ عشق برشتہ نمی شود خاشاکِ طبیعت او سوختہ و پاک نمی گردد و زمین طینتِ او صلاحیتِ تخمِ محبتِ الٰہی ندارد زیراکہ عشق مجازی زینۂ عشق حقیقیست پس ما دامیکہ رشتۂ عشق مجازی طوق گلو کردہ، در کوچۂ و بازار رسوا و خوار نسازید، روح فقیر از شما راضی نخواہد شد اما غیر از وسیلہ امری دریں راہ منظور نباشد، چوں بوسیلۂ ایں دولت راہی مطلب کشادہ گردد جانبازی در راہ مولیٰ کہ پادشاہ پادشاہانِ معشوقانِ اعلیٰ و ادنیٰ است اختیار باید نمود کہ سعادت جاودانی مربوط بآنست"

"آشنائی در حقیقت کیش و آئینِ مردانست .... جز و اعظم دریں باب جوش و گرمیست"

بہرحال ۱۸ سال کی عمر میں مرزا صاحب حضرت سید نور محمد بدایونی کے حلقۂ مریدین میں داخل ہوئے اور طریقۂ نقشبندیہ پر عمل کرنے لگے، چار سال تک اُن کی خدمت میں رہنے کے بعد ولایت کبریٰ و خرقہ و اجازتِ مطلقہ حاصل کی[۱]

حضرت سید نور محمد بدایونی نے ۱۱۳۵ھ میں انتقال فرمایا، لیکن مرزا صاحب نے اب بھی اس آستانہ کو نہ چھوڑا، چھ سال تک ان کے مزار کی مجاوری کی اور بطریق اویسیت کسب ولایت علیا کیا، شیخ علی کیثری شیخ العرب رحمۃ اللہ علیہ نے جو حضرت شیخ محمد صدیق سرہندی نبیرۂ حضرت مجدد الف ثانی کے خلفائے اجل میں سے تھے، اس بشارت کی شہادت دی تھی،[۲]

---

[۱] معمولات مظہریہ ص۱ [۲] ایضاً ص۱،

حضرت سید نے انتقال کے چھ سال بعد ان کو خواب میں فرمایا کہ

"مقصود حق است و آں غیر متناہی، پس عمر متناہی خود را تمام در طلب صرف باید کرد و مقصود بدست باید آورد"[1]

اس خواب کے بعد مرزا صاحب حضرت جیو[2] کی خدمت میں، جو ان کے شیخ الحدیث تھے، پہنچے، انھوں نے فرمایا تم نے تو حضرت سید سے علیٰ سبیل البصیرۃ کسب سلوک کیا ہے اور مجھ میں قوت کشفی اتنی نہیں ہے، چنانچہ شیخ جیو سے مرزا صاحب نے صرف کتب احادیث پڑھیں، لیکن خود مرزا صاحب کا بیان ہے کہ اثنائے سبق میں فیض باطن بھی ان کو ضرور پہنچتا تھا،[3]

اس کے بعد مرزا صاحب، حضرت شاہ گلشن[4] رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بغرض استفادہ

---

[1] معمولات مظہریہ ص ۱۶ [2] حاجی محمد افضل سیالکوٹی عالم متبحر اور فاضل دانشور تھے، محبۃ اللہ نقشبند فرزند و خلیفہ حضرت محمد معصوم سے دس سال تک استفادۂ فیوض باطنی کیا تھا، بارہ سال تک حضرت شیخ عبد الاحد فرزند و خلیفہ شیخ محمد سعید فرزند و سجادہ نشین حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں رہ کر مقامات عالیہ طے کئے علوم معقول و منقول و حدیث بھی حضرت شیخ عبد الاحد سے حاصل کئے تھے، شیخ سالم بصری ثم المکی سے بھی حدیث پڑھی تھی، حاجی صاحب کا استغراق بہت قوی تھا، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے حدیث حاجی صاحب ہی سے پڑھی تھی،

حاجی صاحب کو کتابوں سے بہت شغف تھا، نقد کی صورت میں جو ہدیہ ملتا اسکی کتابیں خرید لیتے اور وقف کر دیتے، ایک بار کہیں سے پندرہ ہزار روپئے آئے، انھوں نے پوری رقم کی کتابیں خرید لیں اور حسب دستور وقف کر دیا، حاجی صاحب نے ۱۱۴۶ھ میں وفات پائی، مزار شریف حضرت خواجہ باقی باللہ کے مزار کے متصل ہے،

[3] معمولات مظہریہ ص ۱۶،

[4] حضرت شاہ گلشن، حضرت شیخ عبد الاحد مجددی نبیرۂ حضرت مجدد کے خلیفہ تھے، کمال ظاہری و باطنی، علوم شریعت و طریقت و حقیقت و زہد و ورع و تقویٰ میں کمال حاصل تھا، تین تین دن کے بعد کھانا کھاتے، تیس سال ایک ہی کمل میں گذار دیئے، جامع مسجد دہلی میں سکونت تھی، جب پیاس لگتی تو مسجد کے حوض میں سے دو تین چلو پانی، جو اکثر گرم ہوتا، پی لیتے، ۱۱۵۳ھ میں انتقال فرمایا،

حاضر ہوئے، وہاں پہونچ کر معلوم ہوا کہ شاہ صاحب نے اپنے مریدوں کو حضرت محمد زبیر[۱] قدس سرہ کو سپرد کر دیا ہے، مرزا صاحب ان کی خدمت میں پہنچے، انھوں نے فرمایا کہ تم کو حضرت سید سے نسبت صحیحہ مل چکی ہے، اسی کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرو، اس کے بعد مرزا صاحب حضرت حافظ سعد اللہ[۲] کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بارہ سال تک اُن سے استفادہ کیا،

حضرت حافظ سعد اللہ کے انتقال کے بعد جب حضرت شیخ محمد عابد سنامی[۳]، سرہند سے شاہجہان آباد آئے تو مرزا صاحب ان کی خدمت میں حاضر ہوئے،

"حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ تمامی بشارات حضرت سید را مسلّم داشتہ از ہماں نقطۂ آخر ولایت علیا و آغاز کمالات نبوت کسب مقامات کنانیدند و در عرصۂ ہفت سال بحقیقت صلوٰۃ رسانیدند"

اس کے بعد "بطور سیر مرادی" ایک بار پھر ابتدا سے انتہا تک ایک سال کے اندر ان تمام مقامات کو طے کرایا، اور خصوصیات مجددیہ میں محبت و محبوبیت، غنیمت کبریٰ وغیرہ کی بشارت دی، اور طریقہ قادریہ، چشتیہ و سہروردیہ کی بھی اجازت دی، اس دوران میں اکثر مبتدیان خانقاہ نے حضرت میرزا سے کسب فیض کیا[۴]، مرزا صاحب حضرت شیخ عابد کی خدمت میں اُن کی وفات (۱۱۶۰ھ) تک رہے،

مشیخت و ارشاد تقریباً تیس سال تک مشائخ نقشبندیہ و مجددیہ سے کسب فیض کرنے کے بعد

۱؎ حضرت محمد زبیر حضرت محبّ اللہ نقشبندی کے خلیفہ تھے، بہت عبادت گذار تھے، ۱۱۵۰ھ میں انتقال فرمایا،
۲؎ حضرت حافظ سعد اللہ، حضرت محمد صدیق فرزند و خلیفہ حضرت محمد معصوم کے خلیفہ ہیں، تیس سال تک انکی خدمت میں رہ کر مقامات عالیہ طے کئے، حافظ صاحب کا لقب خانقاہ میں "سید الصوفیہ" تھا، مزاج میں خاکساری و فروتنی بہت تھی، علوم ظاہری میں کوئی خاص مرتبہ نہ تھا، لیکن نسبت باطنی بہت قوی تھی، ۱۱ر شوال ۱۱۵۲ھ کو انتقال فرمایا، مزار شریف بیرون اجمیری دروازہ، شاہجہاں آباد میں ہے ۳؎ حضرت شیخ عبد اللہ کے خلیفہ تھے، سلسلہ نسب حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ملتا ہے، بہت کثیر العبادت اور کثیر الذکر تھے، حرمین شریفین کو پیادہ تشریف لے گئے تھے، ۱۸ر رمضان المبارک ۱۱۶۰ھ کو انتقال فرمایا ۴؎ معمولات مظہریہ ص ۱،

جب مرزا صاحب خود صاحبِ کمال ہوگئے تو مسندِ ارشاد و ہدایت پر بیٹھے اور اپنا سارا وقت طالبان حق کی رہنمائی کے لئے وقف کر دیا، اُن کی ساری دلچسپیاں مریدوں اور اُن کی فلاح و بہبود کیلئے وقف تھیں، ۳۵ سال تک خانقاہ مجددیہ کو رونق بخشی، کوئی دن ایسا نہیں جاتا تھا کہ تقریباً سو طالبانِ حق کو توجہ نہ دیتے رہے ہوں، چنانچہ خود فرماتے ہیں :۔

"در حلقہ ہر دو وقت قریب صد کس حاضر میشوند، حیرانم کہ قوتِ توجہ از کجی می آید"

(کلمات طیبات، مکتوب سی و پنجم)

ابتدا میں کچھ دنوں تک درس و تدریس کا بھی سلسلہ رہا، لیکن جب نسبتِ باطنی نے غلبہ کیا تو یہ شغل ختم ہو گیا اور صرف رشد و ہدایت کا سلسلہ باقی رہا، مرزا صاحب کا آفتابِ رشد و ہدایت صرف دہلی تک محدود نہ تھا، بلکہ اس کی شعاعیں دہلی سے باہر دوسرے علاقوں کو بھی منور کر رہی تھیں، وہ باوجود شکایتِ ضعف پیری دہلی سے باہر دوسرے علاقوں میں خصوصاً روہیلکھنڈ اکثر جایا کرتے تھے، چنانچہ ایک مکتوب میں خود فرماتے ہیں کہ

"انشاء اللہ تعالیٰ در ماہ صفر ارادہ سنبھل دارم کہ از چندیں سال ہر سال اتفاق می فتد ہیم"

(مکتوب بست و ہفتم)

ایک اور مکتوب میں فرماتے ہیں :۔

"فقیر از سیر امروہہ و مراد آباد فارغ شدہ است و قصد تماشائے شاہجہانپور دارد، انشاء اللہ تعالیٰ عنقریب می رسد، دو سہ مقام در بریلی کردہ روانہ پیشتر می شود و پنج و شش مقام در شاہجہانپور نمودہ مراجعت بہ سنبھل می نماید ابعد ازاں بدہلی می رود، و باوجود ضعف پیری ایں حرکت عنیفت را بر خود پسندیدن بنا بر اغراض صحیحۂ اخرویہ است کہ خدا میداند اشتیاق بقدر

ـــــــــــــــــــــــــــــــ

۵ معمولات مظہریہ ص ۱۵،

اشتیاقِ صاحبان است"۔ (مکتوب پنجاہ و دوم)

مرزا صاحب کے مریدوں میں روہیلوں کی تعداد نسبتہً زیادہ تھی، چنانچہ خود فرماتے ہیں:۔

"ہجوم روہیلہ ہا برائے اخذ طریقہ بحدیست کہ تمام روز توجہ فرصت نیست"۔ (مکتوب ہفتاد و چہارم)

اسی مکتوب میں مندرجۂ ذیل عبارت بھی ملتی ہے، جس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ان کے حلقۂ مریدین میں روہیلوں کی تعداد زیادہ تھی، لکھتے ہیں:۔

"مردم از قوم روہیلہ اکثر و از مردم ہندی کمتر اخذِ طریقۂ علیہ نمودند و منور و متاثر گردیدند"

غالباً یہی وجہ ہے کہ جب دہلی کی حالت روز بروز بد سے بدتر ہوتی جارہی تھی تو مرزا صاحب کے دل میں ایک مرتبہ یہ خیال پیدا ہوا کہ دہلی چھوڑ کر اور کہیں اپنا مسکن بنائیں، چنانچہ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"بجذب قسمت و جاذبۂ احباب فقیر از دہلی بسنبھل رسید و امروہہ و مرادآباد را ہم دید تا بانتخاب پردازد کہ رختِ اقامت در کجا اندازد و متعلّقاں را طلبیدہ نگاہ دارد کہ از تشویشات ہر روزۂ دہلی تنگ آمدہ ام .... مردم سنبھل و مرادآباد و امروہہ کہ سہ بلاد سماجت نمودند کہ اینجا باید بود جاذبۂ حقوق نواب رشادخاں بہادر سلمہ، بہ نگذاشت کہ قصد جاے دیگر کنم و طالبان طریقہ نیز درین شہر بسیار اند، عزم اقامت نمودہ ام برائے طلب متعلقان فرستادم، آنہا عذر ہاے مسموع نوشتند، ناچار بمراجعتِ دہلی اتفاق افتاد"۔ (مکتوب چہلم)

اوپر بتایا جاچکا ہے کہ مرزا صاحب تقریباً سو آدمیوں کو ہر روز توجہ دیتے تھے، ان کے ایک اور مکتوب سے پتہ چلتا ہے کہ مریدوں کی بہت کثرت تھی، فرماتے ہیں:۔

"میر مبین خاں را کہ از مقامات مصطلحہ گذشتہ و اجازت مطلقہ یافتہ و در توجہ گرمی بسیار دارند و اتفاقاً درین ایام از شہر برائے دیدن فقیر رسیدہ بودند، بجاے خود درین بلاد گذاشتہ ام، مردم از صحبت این بزرگ زادہ بسیار فیض می گیرند، و خیلی رجوع کردہ اند، اما کار یک کس

نیست کہ از عہدۂ این قافلہ برآید، بخاطر دارم کہ شمار اہم طلبیدہ بعض شہر را بہ شما و بعض را بہ میر مبین خاں تفویض نمایم" (مکتوب ہفتاد و چہارم)

مولوی ثناء اللہ سنبھلی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"شما در آنجا رفتہ جائے فقیر گرم سازید کہ در آں ضلع عالمی فہمیدہ و درویشی صاحب نسبت نیست (مکتوب بست و ہشتم)

آخر عمر میں مرزا صاحب کی صحت خراب اور قویٰ کمزور ہو گئے تھے، اس کے اشارات بھی ان کے مکتوبات میں ملتے ہیں، ایک مکتوب میں ارقام فرماتے ہیں:۔

"قویٰ آں قدر تحلیل رفتہ کہ طاقتِ قیام در نماز فرض ماندہ است و بس" (مکتوب بست و ہفتم)

ایک اور خط میں ہے،

"ضعف پیری است معہ امراض و عوارض" (مکتوب سی و یکم)

ایک دوسرے مکتوب میں ہے:۔

"تحریر جواب خطوط از ضعف نمی توانم نمود، حالا بدوستاں نوشتہ ام کہ امید وارد منتظر جواب نباشد کہ معذورم و مردہ ام و مرا طاقت رفتن بمسجد جامع بروز جمعہ نماندہ است ...... ضعف و ناتوانی از حد گذشتہ است و امراض متعددہ مستولی شدہ، نماز فرض ایستادہ خوانم و بس" (مکتوب سی و پنجم)

ایک دوسرے صاحب کو لکھتے ہیں:۔

"عمر آخر است و ضعف و پیری از حد زیادہ، خدا خاتمہ بخیر کرداند، توقع ملاقات تہا ضعیف است اما از قدرتِ الٰہی امید قویست" (مکتوب پنجاہ و ہفتم)

یک پیری و صد عیب، بڑھاپے میں صرف ہاتھ پیر ہی نہیں کمزور ہو جاتے ہیں، بلکہ دوسرے

اعضا بھی جواب دیدیتے ہیں، چنانچہ درازیٔ عمر کے باعث مرزا صاحب کی بصارت میں بھی کمی آگئی تھی، خود فرماتے ہیں:-

"از ضعف بصر، رونق در تحریر نماندہ و طاقت تحریر ہم نہ، یاران بعد ازیں از جواب خطوط معذور دارند" (مکتوب سی و یکم)

لیکن اس ضعف و ناتوانی کے باوجود وہ اپنے کام میں برابر لگے رہے، اور اپنے مریدوں کو فیوضِ باطنی پہنچاتے رہے، خود فرماتے ہیں:-

"چہ کنم از ضعف پیری و کثرت تعلیم طریقہ کہ روزی صد کس را بل زیادہ ازآں توجہ اتفاق می افتد" (مکتوب بست و ہفتم)

ایک دوسرے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:-

"فقیر معہ توابع با کمال ضعف و ناتوانی زندہ است و ہنوز قریب صد کس را ہر دو وقت توجہ میسر می آید" (مکتوب ہفتاد و پنجم)

ارشاد و ہدایت کا یہ سلسلہ بذریعہ مکاتیب بھی جاری رہتا تھا، ایک مرید کو تنبیہ کرتے ہیں:

"فقیر در معاملہ معلوم کردم کہ والدۂ شما در باطن ناخوش اند، ناخوشیٔ والدہ موجبِ خسارت دنیا و آخرت است" (مکتوب سی و ہشتم)

ایک دوسرے مکتوب میں ارقام فرماتے ہیں:-

"تا رسیدن فقیر یارانِ طریقہ کہ در دہلی ہست اند بخدمت مولوی عبد الرزاق، کہ بظاہر و باطن لیاقتِ ارشاد و تعلیم طریقہ دارند، رجوع نمایند و صحبت ایشاں را غنیمت دانند، عزیزانِ دیگر کہ از فقیر استفادہ کردہ اند و اجازت یافتہ صحبت آنہا ہم خالی از فائدہ نیست" (مکتوب بست و نہم)

ایک مرید کو یوں نصیحت فرماتے ہیں:-

"باید برخوردار بظاہر مقید بشرع و در باطن مشغول بذکر طریقہ باشد کہ فلاح دو جہاں دریں منحصر است" (مکتوب سی و ہفتم)

قاضی ثناء اللہ پانی پتی کو تنبیہ فرماتے ہیں،

"برادر من! عجب کاریست کہ ہر واحد از مردم پانی پت لبریز شکایت شما می آید معلوم نیست چہ عمل از شما واقع میشود، اگر راستی و دیانت شما باعث آزار مردم است ازاں راستی بگذرید، برائے حفظ حرمت بتاویل ہم خاطر مردم مرعی دارید کہ طریقہ بزرگان طریقہ بدنام میشود برائے خاطر ایشاں دیگراں را آزردہ کردن و خود را بدنام ساختن بایں کمالات ظاہری و باطنی دور از عقل است" (مکتوب ہفتاد و ہفتم)

مریدوں کی تربیت باطنی کے علاوہ جہاں تک ہو سکتا مرزا صاحب ان کے دنیاوی امور میں بھی کوشش پیروی سے دریغ نہ کرتے، لیکن یہ سفارشیں زیادہ تر اپنے مریدوں اور دوستوں ہی سے کرتے، اس لئے کہ مرزا صاحب نے امراء و روسا اور ارباب اقتدار سے کبھی کوئی تعلق نہ رکھا،

ظفر علیخاں خلف نواب ارشاد خاں بہادر سے مرزا صاحب کو خاص طور پر محبت تھی، انکی تعریف میں لکھتے ہیں کہ

"جواہر پارہ ایست کہ قیمت ندارد، فقیر بے سبب گرفتار او نیستم، خوب بہاے اورا شناختہ ام"

ان کی سفارش کسی سے ان الفاظ میں کرتے ہیں :-

"بخدمت تصدیع میدہم کہ بحق دوستی ہاے قدیم و التفاتی کہ بر فقیر مبذول است شفقتی کہ لائق بزرگیہاے آں مہرباں باشد درحق ایں جگر گوشہ کہ مرا عزیز تر از جان است بذل فرمائید" (مکتوب چہل و چہارم)

اسی طرح ایک مکتوب میں لالہ برج لال کی سفارش ہے، لالہ صاحب تلاش معاش میں دہلی گئے ہیں، لالہ صاحب کے متعلق مرزا صاحب نے یہ الفاظ فرمائے ہیں :-

" لالہ برج لال نام جوانی از دوستان مقرری کہ در حسن سلیقہ متصدیگری و صحبت داری بزعم فقیر نظیر ندارد و عمدہ زادہ و عمدۂ روزگار بودہ است " (مکتوب سی و ششم)

اسی خط میں آگے چلکر ان کو " نسخۂ صحیحۂ آدمیت " کے لقب سے یاد کرتے ہیں،

غرض اسی طرح مختلف مریدوں اور دوستوں کی سفارش اپنے ذی استطاعت دوستوں اور مریدوں سے کرتے ہیں،

خیام

خیام کے سوانح، تصنیفات اور فلسفہ پر تبصرہ، اور فارسی رباعی کی تاریخ اور رباعیات خیام پر مفصل مباحث اور آخر میں خیام کے چھ عربی و فارسی رسالوں کا ضمیمہ اور اس کے قلمی رباعیات کے ایک نسخہ کی نقل شامل ہے، خیام کے مباحث پر اس سے زیادہ مفصل، مکمل اور محققانہ کتاب اب تک نہیں لکھی گئی، قیمت مجلد للعہ ر غیر مجلد ہے، ۵۲۰ صفحے از مولانا سید سلیمان ندوی،

انتخابات شبلی

مولانا شبلی کی شعر العجم اور موازنہ کا انتخاب جس میں کلام کے حسن و قبح اور عیب و ہنر اور شعر کی حقیقت اور اصول تنقید کی تشریح کی گئی ہے، قیمت عہ، ضخامت ۲۲۰ صفحے،

"مینیجر"

فارسی کے چند قدیم شعراء

از جناب غلام مصطفیٰ خاں صاحب ایم اے (علیگ) لکچرر کنگ ایڈورڈ کالج، امراوتی

(۳)

ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ ۵۵۱ھ میں جب مقاماتِ حمیدی تالیف ہوئی انوری نے اسکی تعریف میں کچھ اشعار لکھے تھے لیکن اس سال کے بعد اور ۵۵۳ھ کے پہلے ضرور کوئی ایسا وقت گذرا ہی جب کہ انوری نے مدح سرائی کچھ عرصہ کے لئے روک دی تھی، اس کا ثبوت ہم کو صاف طور پر کلیات میں ملتا ہے:-

نیستم بیگانہ از اعمال و احکام نجوم در بیانِ او بغایت اوستاد و ماہرم[ل]
من ز لقمان و فلاطون نیستم کم در حکم ور ہمی باور نہ داری رنجہ شو من حاضرم
با بزرگاں مستفیدم با فرو دستاں مفید عالمِ تحصیل را ہم وارد و ہم صادرم
غصہا دارم ز نقصاں از ہمہ نوعے ولیک زیں یکے آوخ کہ نزدیکِ تو مردِ شاعرم
گرچہ در بستم درِ مدح و غزل یکبارگی ظن مبر کز نظم و الفاظِ معانی قاصرم
ایں ہمہ بگذار با شعرِ مجرد آمدم چوں سنائی نیستم آخر نہ ہچوں صابرم
ہر یکے آخر از ایشاں بے کفافے نیستند ایں منم کز مفلسی چوں ذرہ روشن ظاہرم

آخری شعر ہے:-

قدرِ من صاحب قوام الدین حسن داند از انک صدرِ او را یادگار از ناصر الدین طاہرم

ل علم نجوم کا [illegible] انوری کو بہت [illegible] تھا اور آخر میں اسی کی [illegible]

یہ قوام الدین حسن دراصل ناصر الدین ابو الفتح طاہر بن فخر الملک بن نظام الملک (المتوفی ۵۴۳ھ؍۱۱۴۸ء) کے بیٹے ہیں، ان کے متعلق تاریخ بیہق (ص ۸۲) میں ہے:۔

"اما قوام الدین الحسن بن ناصر الدین کہ وزارت سلطان سلیمان و نیز سلطان محمود خان بمکان او آراستہ بود، در بیہق مقیم است من سنۃ ثلاث و خمسین و خمس مائۃ الیٰ یومنا ہذا (اختتام کتاب ۵۶۳ھ شوال)"

سلطان سلیمان (بن محمد بن ملک شاہ؟ المتوفی ۵۵۶ھ؍۱۱۶۱ء) کے عہد میں اس قوام الدین حسن کی وزارت کا وقت مجھے معلوم نہیں ہو سکا، لیکن سلطان محمود خاں (بن محمد خاں بن بغرا خاں المتوفی ۵۵۹ھ؍۱۱۶۳ء) جو سنجر کا بھانجا تھا اور سنجر کی قید اور وفات کے بعد اس کا قائم مقام ہوا، ضرور اس کی وزارت سے مستفید ہوا ہو گا، اور یہ وزیر وزارت کے بعد ۵۵۳ھ؍۱۱۵۸ء سے تاریخ بیہق کے بیان کے مطابق بیہق میں مستقل طور پر مقیم ہو گیا، اس سے صاف ظاہر ہے کہ انوری نے جیسا کہ اوپر والے پانچ شعر سے معلوم ہوتا ہے ۵۵۳ھ؍۱۱۵۸ء کے پہلے ضرور کسی وقت مدح سرائی اور غزل گوئی چھوڑ دی تھی، اور وہ وقت ۵۵۱ھ؍۱۱۵۶ء کے بعد ہو گا، کیونکہ اس سال مقامات حمیدی کی تالیف پر انوری نے اشعار لکھے تھے، مدح سرائی ترک کرنے کی وجہ غالباً ممدوح کو وفات سنجر (المتوفی ۵۵۱ھ؍۱۱۵۶ء) کا غم دکھانا ہے، یا خود ممدوح کے والد ناصر الدین ابو الفتح طاہر (المتوفی ۵۴۳ھ؍۱۱۴۸ء) کی وفات کا اثر ظاہر کرنا ہے، جس سے شاعر نے یکبارگی شاعری چھوڑ دی، یا انوری شاعری کرتے کرتے اُکتا گیا ہو، تنقید میں یہ صحیح فرمایا گیا ہے کہ سلطان احمد پیروز شاہ[1] نے انوری کو ترمذ بلایا تھا، اس کی تاریخ کلیات انوری (ص ۳۵) میں یہ ہے:۔

اندر آمد ز در حجرۂ من نیم شبے — روز پنجشنبہ یعنی دوم بہمن ماہ
سال بد پانصد و سی سہ ز تاریخ عجم — گفت برخیز کہ از شہر بروں شد ہمراہ

---

[1] مجمل فصیحی، ورق ۲۷۵ بانکی پور ۵۴۲ھ پر فیروز شاہ کی ہجرت بلخ کے متعلق اشعار ہیں، جہاں وہ پھر آیا ہے،

علامہ شبلی نے بھی یہی قصیدہ اور تاریخ نقل کی ہے لیکن سہواً ایک جگہ اس تاریخ عجم کو ۵۴۳ھ لکھ دیا ہے جو چنداں قابلِ اعتراض نہیں تھا، کیونکہ سہو ظاہر ہے، تنقید میں اس تاریخ عجم (یزدجردی) کی مطابقت ۵۶۰ھ/۱۱۶۴ء سے کی ہے، اور قیاس سے بھی یہی زمانہ صحیح معلوم ہوتا ہے، کیونکہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ہجو بلخ والا معاملہ ۵۵۹ھ/۱۱۶۴ء کے قریب ہی واقع ہوا تھا، اور اس پر اتفاق بھی ہے کہ ترمذ کو انوری اس واقعہ کے بعد گیا تھا، کیونکہ اس کے پہلے وہ بلخ ہی میں دس سال کے قریب رہ چکا تھا،

در مدت دہ سال کہ این گوشہ وسکنہ — در قبۂ اسلام مرا مستقر آمد (ص۱۱۲)

اور یہ قیام جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں ۵۴۹ھ کے بعد ہی سے شروع ہو سکتا تھا،

انوری کی طلبی کا زمانہ ایک جگہ اس طرح مذکور ہے :-

مثالِ عالیِ دستور چوں بہ بندہ رسید — قیام کرد و ببوسید و بر دو دیدہ نہاد
مرا بخدمتِ شہ خواندۂ کہ خدمتِ او — کند سپہر کہ ہست او زمانہ را بنیاد
عمادِ دولت و دین آنکہ حصنِ دولت و دین — پس از وفور خرابی شدند از و آباد
شہِ مظفر فیروز شہ کہ فتح و ظفر — ز سایۂ علم و شعلۂ سنانش زاد
بروز یازدہم از رجب روانہ شوم — کہ کپ ز شہر تموز است وبیج از مرداد
اگر ستارہ بہ اتمامِ عزم باشد رام — وگر زمانہ بہ اعطاے عمر باشد زاد
بشکل باد روم زاں کہ باد در حرکت — بیاورد زبیابانِ آبِ جیحوں یاد
چو زیر ران کشم آں مرکبے کہ رایضِ ام — کہ در ریاضت او باد را بود استاد
عنانِ صولتِ جیحوں چناں فرو گیرم — کہ از رکاب گرانم برآورد فریاد (ص۱۲۸-۱۲۹)

یعنی جلال الوزراء (وزیر فیروز شاہ) نے بادشاہ کے ایماء سے انوری کو ترمذ طلب کیا تھا، اور پانچویں شعر میں ۱۱ رجب کو انوری کی روانگی کی تاریخ ملتی ہے جو "مرداد" کی بجائے "خرداد" (یزدجردی ماہ)

ہی کے مطابق ہو سکتی تھی، لیکن یہ تاریخ ضرور ٹل گئی ہوگی، کیونکہ ترمذ پہنچنے کا زمانہ تقریباً ۲ ماہ بعد بہمن کا مہینہ تھا[۱]، جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے، تنقید میں ایک جگہ فرمایا گیا ہے کہ ص۵۱ پر ذیل کا قصیدہ کسی شاعر نے انوری کی مدح میں لکھا تھا،

اے در ہنر مقدمِ اعیانِ روزگار   در نظم و نثر اخطل و حسانِ روزگار

لیکن میرا خیال ہے کہ وہ اشعار انوری ہی کے ہیں اور ایک ہی سلسلے میں آخر تک ہیں، اس کے تین شعر قابلِ توجہ ہیں:۔

داند مہتران لقیم انوری و لیک   چر خم ہمی چہ خواند خاقانِ روزگار
اے خر سوار ہ پیشِ کسے لاف می زنی   کو شد سوار فضل بمیدانِ روزگار
نے نے بمدح باز شو و پس بگوے زود   کاے ثابت از وجود تو ارکانِ روزگار

شعر العجم میں غالباً کاتب کی بے اعتنائی سے ابو طالب نعمہ، صفی الدین عمر مفتی، تاج الدین احمد محتسب اور نظام الدین احمد کے نام کچھ تبدیل ہو گئے تھے، جن کی صحت بے شک ضروری ہے، یہ وہ لوگ ہیں جن کو براؤن (ج ۲ ص۳۱) اور مولانا شبلی دونوں نے انوری کے نجات دہندگان میں شمار کیا ہے، لیکن تنقید میں صحیح فرمایا ہے کہ شاعر کا مقصد صرف اس قدر ہے کہ جب بلخ میں ایسے ایسے مشاہیر فضلا و علما جمع ہیں تو ان کی موجودگی میں بھلا میری کیا مجال ہو سکتی ہے کہ بلخ کی ہجو کا خیال بھی دل میں لاؤں"، اور اس کے ثبوت میں دو شعر بھی دئے ہیں،

ان بزرگوں میں نظام الدین احمد کو پروفیسر شیرانی صاحب نے قاضی القضاۃ کہا ہے اور سوگند نامے سے یہ شعر پیش کئے ہیں:۔

---

[۱] مجھے خود اس یزدجردی تاریخ کی مطابقت کے لئے عیسوی اور ہجری سال کی تحقیق نہیں ہے، اس کے لئے۔ سلاطین ہند کی کتاب Manuel اس صوبے میں سننے میں بھی نہ آئی ہوگی جبکہ یہاں معمولی کتابیں بھی نہیں ہیں،

افتخارِ خاندانِ مصطفیٰ در بلخ و من　　کردہ ام در خدمتش حسانی و هم بوتری
آں نظامِ دولت و دیں کانتظامِ عدلِ او　　در دلِ اغصان کند بادِ صبا را رہبری
در پناہِ سدۂ جاہِ رعیت پرورش　　بر عقابِ آسمان فرماں دہد کبکِ دری
ہم نبوت در نسب ہم پادشاہی در حسب　　کو سلیمان تا در انگشتش کند انگشتری
مسندِ قضی القضاۃ شرق و غرب افراشتہ　　آں کہ ہست از مسندش عباسیاں را برتری
آنکہ پیشِ کلکِ و طبعش آں دو سحر آنکہ حلال　　صد چو من ہستند چوں گوسالہ پیشِ سامری
آب و آتش را اگر در مجلسش حاضر کنند　　از میانِ ہر دو بردارد تشکوہش داوری

ان اشعار میں سے آخری تین شعر میرے خیال میں قاضی القضاۃ حمید الدین کی مدح میں ہیں کیونکہ نظام الدین کو پہلے شعر میں "سید" کہا ہے، اور ان تین شعروں میں سے دوسرا مصرع کسی عباسی کی مدح میں ہے یعنی حمید الدین، جن کو "قاضی قضاۃ" کے خطاب سے ص۶۲ پر بھی یاد کیا ہے، ع

قطعۂ صدرِ اجل قاضی قضاتِ شرق و غرب

اور نظام الدین کی مدح میں تو سوگند نامے کا یہ شعر بھی کافی مبالغہ پیدا کر دیتا ہے :-

بازوے برہاں ز تقدیرِ نظام الدیں قوی است　　آنکہ از تعظیم کردے جبرئیلش چاکری

علاء الدین غوری کے دربار میں انوری کی طلبی کا واقعہ مولانا شبلی کی طرح پروفیسر براؤن (جلد دوم ص۳ و ص۳۸۳) نے بھی نقل کیا ہے لیکن تنقید میں اس کی صحت سے انکار کیا گیا ہے ثبوت یہ دیئے ہیں، (۱) بروایتِ مشہور علاء الدین، انوری سے صاف نہیں تھا (۲) انوری ۵۴۷ھ میں پیروز شاہ کے پاس ترمذ جاتا ہے اور اس کی مدح عرصہ تک کرتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سنہ سے ایک عرصہ بعد تک وہ مدح سرائی اور شعر گوئی سے تائب نہیں ہوتا، اور (۳) علاء الدین غوری ۵۵۶ھ میں وفات پاتا ہے، اس لئے انوری کی عزلت نشینی کے زمانہ تک اس کا زندہ رہنا

ناممکن ہے"؛ اور پھر یہ بھی فرمایا ہے کہ وہ بادشاہ جس نے طلب کیا تھا اور جس کو انوری نے ۵۹۲ھ والا معافی نامہ لکھ بھیجا تھا وہ غوری کے علاوہ کوئی اور تھا، جس نے ۵۹۵ھ والے اشعار انوری کو لکھے تھے مجھے خود اس واقعہ کے متعلق شک ہے، لیکن اسی کے ساتھ مذکورۂ بالا دلائل میں بھی شک ہے، وہ "روایتِ مشہور"، مجمل فصیحی میں ۵۴۷ھ[۱] کے تحت اس طرح ہے جو اجمالاً عرض ہے:۔

سلطان سنجر کے مقابلے کے لئے علاء الدین حسین، شمس الدین محمد اور علی چتری مل کر دراوبہ پر آئے، لیکن ان لوگوں کو شکست ہوئی، علی چتری قتل کر دیا گیا اور شمس الدین کو پچاس ہزار دینار پر رہا کر دیا، لیکن علاء الدین حسین نظر بند رہا، ایک رات سنجر نے اس کو قیمتی جواہرات کا ایک طبق دیا اُس نے یہ رُباعی فی البدیہہ کہی:۔

بگرفت و نہ کشت شہ مرا در صفِ کیں   یا آں کہ بدم کشتنی از روے یقیں
واں گہ بہ طبق می دہدم دُرِّ ثمیں   بخشایش و بخششم چناں کرد و چنیں

سنجر[۲] خوش ہوا تو علاء الدین نے جانے کی اجازت مانگی، انوری نے کہا:۔

چوں بندگی تہمت نمی آید خوش   با ملک چہ آب و دولتے چوں آتش
برخیز و بسیج آں جہاں خوش خوش   وآنجا علف و گلخنِ دوزخ می کش

علاء الدین کو اس بات سے بہت خفت اور ناراضی ہوئی، سنجر کی وفات کے بعد فخر الدین خالد سے ایک خط انوری کو لکھوایا کہ وہ غزنین آئے، لیکن اس شاعر نے ایک خط علیحدہ بھی لکھا، جس میں یہ شعر تھے:۔

اے آنکہ در ہنر بہمہ جا رسیدۂ   نیک و بدِ زمانہ عنداردیدۂ

---

[۱] مخطوطہ بانکی پور ورق ۲۶۵ [۲] صبح صادق ورق ۱۱۲ میں سنجر کی خوشنودی کی وجہ یہ ہے کہ غوری نے اس کے پاؤں کے خاک کا بوسہ لیا اور ایک اور رباعی کہی،

اصلت زقاین است و نشستت بہ کوشنک دانم کہ نیم بیتِ دگر راشنیدۂ

انوری سمجھ گیا کہ جانا مناسب نہیں ہے، چنانچہ اُس نے وہ قطعہ لکھ بھیجا، ع

کلبۂ کاندر و بروز و لشب الخ

اس قطعہ میں انوری کو قاینی کہا ہے، حالانکہ خاوران اس کا وطن تھا، ممکن ہے اس کے آباؤ اجداد کی اصل قاین کی رہی ہو، بہرحال اگر یہ قصہ صحیح ہے تو گویا انوری کی طلبی کے لئے (انتقام کی خاطر) یہی ایک معقول بات ہو سکتی تھی، اس قصہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ وہ انوری کو سنجر کی وفات کے بعد اور وہ بھی غزنین میں بلوانا چاہتا تھا، اور یہی زمانہ یعنی ۵۵۲ھ کے بعد اور ۵۵۳ھ کے پہلے ایسا تھا جب کہ انوری نے کچھ عرصے کے لئے یقیناً شاعری اور مدح سرائی چھوڑ دی تھی، اور اس کا ثبوت ہم اوپر دے چکے ہیں، اور پھر ص۵۹ والے شعر جو کسی بادشاہ کی طرف سے ہیں ہمارے خیال کی تائید کرتے ہیں، کیونکہ علاء الدین غوری کے اشعار کئی جگہ ملتے ہیں، ایک رباعی تو اوپر مذکور ہوئی، اور دو نظمیں غزنین کے تباہ کرنے کے زمانہ میں اس نے لکھی تھیں، جو طبقاتِ ناصری میں مذکور ہیں، ایک رباعی اور ملتی ہے جو اُس نے بہرام شاہ کے بیٹے خسرو شاہ کو تکین آباد کے متعلق لکھ بھیجی تھی، اور جو فرشتہ (ص۲۵) اور مجمل فصیحی (ورق ۱۶۲ الف) میں ملتی ہے، اس لئے ممکن ہے کہ وہ شعر بھی اسی بادشاہ کے ہوں، بہرحال جیسا کہ میں نے عرض کیا، اس واقعہ میں شک ضرور ہو سکتا ہے،

اب انوری کے چند ممدوحوں کے متعلق کچھ عرض کرتا ہوں، انوری کے خاص ممدوح وزراء سنجر میں سے ناصر الدین ابو الفتح طاہر بن فخر الملک بن نظام الملک تھے، جو قوام الدین ابو القاسم کے معزول ہونے پر مقرر ہوئے تھے، قوام الدین ابو القاسم کے قتل کی تاریخ مجمل فصیحی (ورق ۱۶۳ الف) اور تاریخ صبح صادق (جلد سوم، ورق ۲۶ ب بانکی پور) میں ۵۲۸ھ ۱۱۳۴ء ہے[۱]، لیکن ناصر الدین طاہر کی تاریخ

[۱] قوام الدین نے عین القضاۃ ہمدانی کو جو قتل کرایا تھا اس کی تاریخ خزینۃ الاصفیاء (جلد ۲ ص۲) (باقی حاشیہ ص۲۸۲ پر)

وزارت کے متعلق آثار الوزرار ورق ۱۳۵ الف بانکی پور) تک میں غلط بیانی ہی :۔

" ناصر الدین طاہر ...... بعد از قوام الدین ابو القاسم، وزارت سنجر تقلّد نمود داما

درآں سال سلطان را نکبت غز برسید و ایں وزیر از منصب تمتعے نیافت و در ناکامی وفات یافت"

تاریخ صبح صادق (ورق ۱۰۶۲ الف) میں بھی بالکل یہی ہے :۔

" (ناصر الدین) بعد از قوام الدین ابو القاسم در کزینی وزیر سنجر شد و در ہماں سال

سلطان بدست غزاں گرفتار گشت وناصر الدین از وزارت تمتع نیافتہ ہمدراں آوان درگذشت"۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ناصر الدین طاہر ۵۴۸ھ ۱۱۵۳ء کے بہت پہلے وزیر ہو چکا تھا مثلاً ۴ ذی الحجہ ۵۴۰ھ

دیکشنبہ ۱۴ مئی ۱۱۴۶ء) کو انوری نے اس کی مدح میں لکھا ہے :۔

بحکم دعوی زیج و گواہی تقویم | شب چہارم ذی حجہ و سن تا میم
شبے کہ بود شب ہفدہم ز آباں ماہ | شبے کہ بود نہم شب تیر ماہ قدیم
نماز خفتن یکشنبہ از مہ بہمن | کہ بادوال سفندار بود از تقویم
چو درگذشت ز شب ہست ساعت رصدی | براں قیاس کہ رائے منجم ست و حکیم
بجز و اصل رسید آفتاب نہ گردوں | بخانۂ بہیں آفتاب ہفت اقلیم
خدایگان وزیراں کہ جز کمال خدائے | نیافت ہیچ شرف بر کمال او تقدیم
سپہر فتح ابو الفتح طاہر آں کہ شرف | ابد ز زادن امثال او شدہ ست عقیم

(کلیات انوری صفحہ ۳۰)

اس زمانہ میں سنجر کے دربار میں انوری کی رسائی ہو چکی تھی، کیونکہ یہ وہی زمانہ تھا جبکہ سنجر نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲) میں ۵۳۳ھ یقیناً غلط ہے، مسالک السالکین (جلد دوم صفحہ ۲۶) میں لکھا ہے کہ ہمدانی کو آگ میں بھی ڈالا تھا، ہمدانی کی ایک رباعی ندوہ کے بیاض اشعار ۱۴۶۱ میں بھی ملتی ہے :۔

در کوی مراد منزلے باید نیست | وز کشتۂ عشق حاصلے باید نیست
گفتی کہ بصبر کار تو نیک شود | با صبر تو دانی کہ دلے باید نیست

المستنصر خوارزم شاہ کو وہ تیر بھیجا تھا جس پر انوری کے اشعار لکھے ہوئے تھے، اسی ناصر الدین ابو الفتح طاہر[1] نے قلعہ ہزار اسپ کو (۵۴۲ھ، ۱۱۴۷ء) فتح کرنے میں کوشش کی تھی، جس کے متعلق انوری صاف طور پر کہتا ہے:۔

نصر فزاینده باد ناصر دیں را ۔۔۔ صدر جہاں، خواجۂ زمان وزمیں را
صاحب ابو الفتح طاہر آں کہ ز رایش ۔۔۔ صبح سعادت دمید دولت و دیں را
حصن ہزار اسپ اگرچہ بود در آں ملک ۔۔۔ سد قدیم است حصنہائے حصیں را
کعبۂ دہلیز شد چو دید فصیلش ۔۔۔ سجدہ کناں بر زمیں نہاد جبیں را
تیر سریع شہاب کلک تو بس بود ۔۔۔ رجم چناں صد ہزار دیو لعیں را
خود مدد تیغ بادشہ بچہ کار است ۔۔۔ خاصہ تہیائے کارہائے چنیں را
غیبت خوارزم شاہ کز پس شش ماہ ۔۔۔ چشمۂ خوں کرد چشم حادثہ بیں را
دست بفتراک اصطناع تو در زد ۔۔۔ معتصم ملک کرد حبل متیں را

(کلیات انوری ص ۱۰۱)

یہ وزیر انوری کے علم اور قابلیت سے مرعوب معلوم ہوتا ہے، جیسا کہ اس شعر میں اشارہ پایا جاتا ہے:

بمن سوال وجواب امور دیواں را ۔۔۔ تعلقے بنود کاں شعار و رسم شماست

(کلیات انوری ص ۱۴)

اسی قصیدے کے بعض اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ انوری کا تعلق اس وزیر سے ایک عرصہ سے ہے، لیکن حاضری سے معذور ہے، چنانچہ کہتا ہے:۔

---

[1] راحت الصدور (ورق ۱۱۵ ب) سے معلوم ہوتا ہے، کہ چغری بیگ (المتوفی ۴۵۲ھ، ۱۰۶۰ء) کے زمانہ سے مرو سلجوقی دار الحکومت ہو گیا تھا، لیکن کلیات انوری (صفحہ ۶۵ - ۱۴۳) سے معلوم ہوتا ہے، کہ ناصر الدین ابو الفتح نشاپور میں ہے اور وہی دار الحکومت بھی معلوم ہوتا ہے،

نہ صبا جیا، ملکا زار روے خدمت تو | دلم قرینِ عذاب ست و دیدہ جفتِ بکاست
و یک آمدنم نیست ممکن از پئے آں | کہ رفتنم بسرین و نشستنم بقفاست
ہمی بہ پشت چو کشتی سفر نیارم کرد | کہ راہِ وادی دشوار و عبرہ چوں دریاست
سرم نظلِ عنایت بپوشش بس باشد | کہ سالہاست کہ درتفِ آفتاب عناست

(کلیاتِ انوری، ص ۴۰۳)

انوری کے کلام میں دو مجد الدین ہیں، ایک مجد الدین ابو طالب بن نعمہ جن کا صحیح نام مولانا شبلی نے بھی لکھا تھا، کلیاتِ انوری (ص ۴۸۵) میں ہے:-

عالمِ مجد کہ بر بار خدایاں ملک ست | مجد دیں اے بسزا بر ملکاں بار خدائے
میر بو طالب بن نعمہ کہ بے نعمتِ او | آسماں تنگ و زمیں مفلس و خورشید گدائے

اسی "نعمہ" کی رعایت اس رباعی میں ہے،

بو طالب نعمہ آنجہانی ہمہ مرد | ہرگز غمِ ایں جہانِ خونخوار نخورد
ہر طالبِ نعمت کہ بدو روے آورد | از نامِ پدر دامنِ حرصش پُر کرد

(ص ۵۶۹)

یہ ابو طالب، سید بھی تھے،

سید و صدرِ روزگار کہ ہست | ز آلِ یاسیں چو از نبی یاسیں
میر بو طالب آں کہ مطلوبش | نیست در ملکِ آسمان و زمیں

(ص ۱۲۴)

اور بلخ میں تھے:-

در بلخ چو پیری و جوانی بہم افتاد | اسباب فراغت بہم افتاد جہاں را
بو طالب نعمہ چو شہابِ کی از جود | یک چند کم آورد چہ دریا و چہ کاں را

(ص ۱۰)

سوگند نامے میں بھی مذکور ہیں:-

مجد دیں بو طالب آں عالم کہ گم شد در؟ | عقلِ کل آں کردہ از بیرونِ عالم اطہری

(ایضاً)

دوسرے مجد الدین کا نام ابو الحسن عمرانی تھا، اور وہ بلخ میں نہیں بلکہ رے میں تھے :-

چوں مرادِ خویش را با ملکِ رے کردم قیاس | در خراساں تازہ بنہادم اقامت را اساس
تا خداوندے چو مجد دین و دولت بو الحسن | حق شناسِ بندگان باشد چہ غم او را اناس

صفحہ ۴۸۹ میں بھی اسی "صاحب رے" کا حال ہے، جس کا مطلع یہ ہے :-

اے بدرگاہِ تو برقصہ رساں صاحب رے | رہ نشینِ سرِ کوے کرمت حاتم طے
صاحب صدرِ جہانی و جہان زندہ بہ تست | عقل داند کہ بجاں زندہ بود قالب حے

اس قصیدہ میں ایک نئی بات اور ملتی ہے :-

بخلافِ پدرت سر چو بیاور د فرود | بوزارت کہ کند رائے ترا قانع کے

ان کا پورا نام مجد الدین ابو الحسن علی (ابن عمر) عمرانی معلوم ہوتا ہے، اور وہ وزیر بھی رہ چکے تھے

دستورِ شہر یارِ جہاں مجد دین کہ دین | از جاہِ او بمنفعتِ جاوداں رسید
محسودِ جاوداں علی ابنِ عمر کہ عدل | از رائے او بر دیتِ نوشیرواں رسید (۱۶۲)

یہ یقیناً وہی خوش قسمت بزرگ ہیں جن کی مدح سنائی (دیوان، ص۵۲ بمبئی) نے بھی کی ہے، اور انوری کے ان اشعار کے ساتھ سید حسن غزنوی کے اشعار ٹکرا گئے ہیں، پہلے انوری کے اشعار سنئے :-

دلم اے دوست تو داری دانی | جان ببر نیز اگر بتوانی
بدلے صحبتِ تو نیست گراں | چہ حدیث ست بجاں ارزانی
نہ گرم بوسہ دہی جانِ منی | کہ گرم جاں ببری ہم جانی
گاہم از عشوہ گری می خوانی | گاہم از طیرہ گری می رانی
با فلک یار مشو در برِ من | از بہر نکوئے ارزانی
تا چو از حد ببری فاش کنم | قصۂ درد زبے درمانی

تا ترا از سر من باز کنند مجددین بوالحسن عمرانی (ج ۲)

اب سید حسن غزنوی کے چند اشعار سنئیے اور لطف اُٹھائیے:۔

اے کہ تن را دل و دل را جانی | از دل و جاں چہ نکوتر آنی
از تو دل در بر من عاریتے | بے تو جاں در تن من زندانی
گاہ در دل چو جہاں پیدائی | گاہ در سینہ چو جاں پنہانی
عاشق زار توام سے بینی | بندۂ خاص توام می دانی
قصۂ آتش دل من چہ کنم | خود چو تو آب فرو می خوانی
زلف پرُ فتنہ تنشانی ہر دم | فتنۂ زلف چرا نہ نشانی
بر دل من کہ تو داری مسکن | ہرچہ از جور و جفا بتوانی
عذر من از تو نہ خواہد روزے | مجددین بوالحسن عمرانی

یہ مجدالدین ابوالحسن عمرانی کم از کم ۵۴۵ھ تک یقیناً زندہ تھے، انوری کہتا ہے،

مجددین بوالحسن کہ ہست عقیم | ما در عالم از چو او فرزند
عدد سالہائے عمرش باد | ہمچو تاریخ پانصد و چہل اند (ج ۱۵۱)

انوری کو اس ممدوح سے جلد فائدہ حاصل ہوا تھا، اور یہ مبالغہ حقیقت آمیز معلوم ہوتا ہے،

بندہ را در دو سہ مہ تربیت دولت تو | کارہا شد ہمہ با رونق و ترتیب و نظام
گشت در مجلس ارکان جہاں از اعیاں | تاکہ در خدمت درگاہ تو ہست از خدام (ج ۲۴۱)

صفحہ ۱۹۲ پر بھی ہے:۔

ا؎ مخطوطہ برٹش میوزیم ۵۱۲ورق ۱۲۲ شعرالعجم (حصہ اول) میں منوچہری کا بھی ایک قصیدہ اس ممدوح کے متعلق ہے جو غالباً علی قلی ہدایت کے اڈیشن سے ماخوذ ہے، لیکن وہ قصیدہ یقیناً الحاقی ہے، کیونکہ منوچہری کے بہت بعد یہ ممدوح ہوا ہے،

نام من بندہ بہ یک ماہ بہر ہفت اقلیم — گشت مشہور صغار از تو و معروف کبار

یہ وزیر جیسا کہ مذکور ہوا ۵۴۷ھ (۱۱۵۲ء) تک یقیناً زندہ تھا لیکن شاید اسکے بعد وہ "محبوس" ہوا،

خلق را بے وجہ وزی اعمر خواہد بود دنے — وجہ روزی از کجا چوں بوالحسن محبوس شد ([illegible])

اور بعد میں قتل کر دیا گیا[1]

پانزدہ سال فزوں باشد تا کشتہ شدہ ست — بوالحسن آں کہ ز احسانش سخن می رانی ([illegible])

اس کے قتل سے انوری کو دلی صدمہ ہوا

ہیچ می دانی کہ در گیتی ز مرگ بوالحسن — چرخ جز قہر و ستم دیگر چہ دارد فائدہ ([illegible])

یہ مجدالدین ابوالحسن عمرانی سید نہ تھے لیکن مجدالدین ابو طالب نعمہ کی سیادت اوپر ظاہر ہو چکی ہے، غالباً یہی سید تھے، جن کی وفات کسی سلخ رجب کو (بلخ میں) واقع ہوئی تھی جس کے متعلق انوری کہتا ہے:۔

شہر پُر فتنہ و پر مشعلہ و پُر غوغاست — سید و صدر جہاں بار نہ داد ست کجاست
اے ز اولاد پیمبر وسط عقد بپرس — کز فراق تو بر اولاد پیمبر چہ عناست (ص ۵۵-۵۶)
بر وفات تو جہاں ماتم اولاد رسول — تازہ تر کرد مگر سلخ رجب عاشوراست

بہت ممکن ہے کہ ان کا شمار راحت الصدور (ص ۱۶۸) والے ان "صدور جہاں" میں ہو جن کو مذہب نے وہ سیاسی اقتدار بخشا تھا، کہ گورخاں خطائی (۵۳۶ھ ۱۱۴۱ء) کو بھی اسکے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑا تھا، یہ ابو طالب انوری کے سوگند نامے کی تالیف کے وقت تک یعنی ۵۵۹ھ کے قریب (جیسا کہ پہلے ثابت ہو چکا ہے) ضرور زندہ تھے، اس کے بعد ان کا پتہ نہیں چلتا،

---

[1] مجمل فصیحی (ورق ۳۵۱) میں وزرائے سنجر کی فہرست میں کسی قدر تغیر کے ساتھ یہی نام ملتا ہے، جس کے ساتھ یہ جملہ بھی ہے "و در آخر بسعی و غمز جمعے بقتل رسانیدند" اسلئے انوری کا یہ قول صحیح ہے کہ وہ وزیر بھی تھے اور آخر میں قتل ہوئے،

انوری کا ایک ممدوح مودود شاہ (مؤید الدین) ہے، جس نے سنجر کے بعد وفات پائی، ملک ۵۵۹ پر ہے:-

جہاں ز رفتنِ مودودشہ مؤید دیں | بماند دو مزاج و بماند و سرشت
چہ دفتریست جہاں لا الٰہ الا اللہ | کہ روزگار در و جز قضائے بد ننوشت
چہ سود ازاں کہ ازیں پیش خسرواں کردند | ز رزم گاہ قیامت بہ بزم گاہ بہشت
چو عاقبت ہمہ را تا بہ سنجر اندر مرد | شدہ ست بستر خاک و شدہ ست بالین خشت
کدام جاں کہ قضا تش ز ورائے چرخ نبرد | کدام تن کہ فنا تش از فرود خاک نہشت

اور آخری شعر میں اس کے باپ ناصر الدین کی طرف اشارہ ہے:-

خدائے ناصر دیں را بزرگ اجرے داد | کہ وہر خورد بساطے ز ملک در ننوشت

اسی مودود شاہ بن ناصر الدین کا لقب مؤید الدین، بعد میں ہوا ہے، انوری نے اُس وقت لکھا ہے:-

حاسدا مودود شاہ ناصر الدین القب | اگر مؤید شد تو زیں معنی چرا باشی بدرد
چوں پدر مودود نامش کرد تا یابد خدائے | از سیم حرف و چہارم حرف او یک حرف کرد (ناقص)

یہ مودود شاہ "مؤید"، غالباً "ملک مؤید ہے جو سنجر کے خاص غلاموں میں تھا اور جو سنجر کی وفات کے بعد محمود خاں بغرا خانی پر غالب آگیا تھا[1]، یہ غالباً قطب الدین مودود شاہ بن عماد الدین زنگی (والی موصل و مضافات) سے مختلف ہے، مؤخر الذکر کی مدح ملک سے اس طرح شروع ہوتی ہے:-

خوشا نواحیِ بغداد جائے فضل و ہنر | کہ کس نشاں ندہد در جہاں چنیں کشور

انوری اس کے پاس پہنچتا ہے،

بریں نوید رسیدم دریں دیار و زمن | بگوش حضرت شاہِ جہاں رسید خبر
مرا بحضرت عالی تقربے فرمود | برائے شاہ بپرداختم یکے دفتر

---

[1] روضۃ الصفا، جلد چہارم ص ۱۲۵ (۱۹۱۵ء)

بہر دو ماہ بسازم ز علم تصنیفے — براے دولتِ منصور خسرو صفدر

لیکن وہاں مایوسی رہتی ہے ۔

ولیک شاہ بفتح بلاد مشغول است — نمی کند بپرستندگانِ خویش نظر

مودود نام کا ایک اور ممدوح ہے، یعنی ضیاء الدین مودود احمد عصمی، یہ مجد الدین ابو الحسن عمرانی کا ہمعصر تھا، جو تقریباً ۵۴۰ھ ۱۱۴۵ء میں ضرور برسرِ اقتدار تھا اس کا ہمعصر ہونا ان اشعار سے ثابت ہے:

با آں کہ چند سال بدیدم بتجربت — کز کلّ خواجگانِ جہاں بو الحسن بہ است
پنداشتم کہ بازوے احساں قوی تر است — آنجا کہ بر کفت علمِ پیرہن بہ است
مودود احمدِ عصمی عشوہ ایم داد — گفتم کہ او سر است، سر آخر ز تن بہ است (ص ۲۲۳)
راغب شدم بخدمتِ او تا شدم چنانک — حالِ سگانِ بو الحسن از حالِ من بہ است

اور یہ مودود دراصل "نائبِ دستور" تھا،

گفتا کہ کلکِ نائبِ دستورِ بحر و بر — آں لطف گاہ بر و سیاست بروز بار (ص ۱۹۶)
مودود احمد عصمی کز مکانِ اوست — بنیادِ دیں و قاعدۂ دولت استوار

اسی لئے اس کو "صدرِ آلِ نظام" یعنی ناصر الدین ابو الفتح طاہر بن فخر الملک بن نظام الملک) کا "ثانی اثنین" (نائب) کہا ہے،

مملکت را بکلک داد نظام — ثانی اثنینِ صدرِ آلِ نظام
ہمچنیں جاوداں ز کلکش باد — ملکِ گیتی برونق و بہ نظام
صدرِ دنیا ضیاءِ دینِ خدا — سدِّ دولت مؤیّد الاسلام (ص ۲۲۶)
میر مودود احمدِ عصمی، — آں بہ از جنبش و بہ از آرام

اس ضیاء الدین مؤیّد الاسلام مودود احمد عصمی کی مدح میں جیب گنج کے مخلوطہ

سے عبد الواسع جبلی کے بھی کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیے،

اے بزرگے کہ ذو الجلال بجود　　از عدم تا وردہ چو او موجود
صدرِ کافی مؤید اسلام　　بلمعالی ضیاء دین مودود

لیکن جبلی کے ذیل کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ضیاء الدین مودود غزنین میں بھی رہ چکے ہیں :۔

سپاس از ایزد کآمد بشارت غزنین　　بصحت تنِ صدر اجل ضیاء الدین
ابوالمعالی مودود احمدِ عصمی　　کہ وقتِ خشم چو ناراست وگاہ حلم چو طین
مؤیدے کہ ز خلق وز قدرِ او گویند　　شرف سپہر اثیر و لطف بہشت برین

ان کے علاوہ انوری کے اور بھی ممدوح ہیں جن کا حال تحقیق طلب ہے،

شعر العجم حصہ اوّل

فارسی کی شاعری کی تاریخ جس میں شاعری کی ابتدا، عہد بعہد کی ترقی اور اُن کے خصوصیات و اسباب مفصل بحث کی گئی ہے، اور اسی کے ساتھ تمام مشہور شعراء (عباس مروزی سے نظامی تک) کے تذکرے اور اُن کے کلام پر تنقید و تبصرہ ہی، قیمت :۔ ع۴ر

ایضاً حصہ دوم

شعرائے متوسطین کا تذکرہ (خواجہ فرید الدین عطار سے حافظ اور ابن یمین تک) معہ تنقید کلام، قیمت :۔ عہ۴ر

"منیجر"

اردو صحافت کا ارتقاء

از جناب سید ابو عاصم صاحب ایم اے علیگ

۱۴۹۸ء میں واسکوڈی گاما نے ہندوستان کیا دریافت کیا کہ اس سونے کی چڑیا پر اہل یورپ کی حریصانہ نظریں پڑنے لگیں، کہیں اقتصادی اور معاشی سدھار کے لئے تجارتی تعلقات کے ریشمی پھندے ڈالے گئے، کہیں روحانی اصلاح کے لئے مشنریوں کا جال بچھایا گیا، اس کار خیر میں یورپ کا ہر ملک ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانا چاہتا تھا، اور یہ کشمکش اتنی بڑھی کہ جنگوں کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا، آخر کار برطانیہ اپنی فطری صلاحیت کی وجہ سے دوسری قوموں پر غالب رہی اور ہندوستان کو تہذیب و شائستگی کا سبق پڑھانے لگی اور اُس کے مذہبی اداروں نے چھاپے کی بنیاد ڈالی، اور اب یہ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں برٹش پریس کی بانی اول مشنریاں تھیں[1] مشنریوں کا سب سے پہلا قدم مدراس میں آیا، اس لئے یہ بعید از قیاس نہیں ہے کہ پہلا تامل ٹائپ ۱۶۷۸ء میں جاری ہوا، اور دوسری کوشش ۱۷۱۰ء میں ٹرانکوبار مشین کے لئے ہوئی، پھر ۱۷۶۱ء میں حکومت مدراس نے دیبری پانڈیچری مشین کو پریس کے استعمال کی اجازت دی،[3] بنگال میں یوں تو انگریز اورنگزیب کی اجازت سے بہت پہلے فورٹ ولیم تعمیر کر چکے تھے، لیکن ابھی ان کے قدم جمے نہیں تھے، اور نگ زیب کے انتقال کے بعد ۱۷۱۴ء میں اُنھوں نے فرخ سیر

---

[1] Rise of Christian power by Basu. [2] Newspaper-History Times. Page 118. [3] Encyclopedia of India - Vol IV P. 688.

سے گجرات، دکن اور بنگال میں بلا محصول تجارت کرنے کی اجازت حاصل کرلی ۱۷۳۹ء میں نادرشاہ کے حملے نے سلطنت مغلیہ کو ہلا دیا، اسکی مرکزیت ختم ہونے لگی، اور اس کے صوبے آزاد اور خود مختار ہونے لگے، اس وقت بنگال میں علی وردی خاں نواب بن بیٹھا، مرہٹے الگ اپنی طاقت بڑھا رہے تھے، اودھ کا تعلق دلی سے برائے نام رہ گیا تھا، ادھر سکھ بھی ہاتھ پاؤں نکال رہے تھے، بنگال میں علی وردی خاں کے انتقال کے بعد ۱۷۵۶ء میں سراج الدولہ تخت پر بیٹھا، اسکی اور انگریزوں کی نہ بنی کیونکہ وہ اب تجارت سے ملک گیری کا خواب دیکھنے لگے اور پھر سازشوں کا ایک جال بچھ گیا اور جنگ پلاسی ۱۷۵۷ء میں بنگال اور جنگ بکسر ۱۷۶۵ء میں دہلی اور اودھ کمپنی کے زیر اثر آگئے، اور اس کو بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی مل گئی، گویا بنگال برطانوی علاقہ ہوگیا، اس کے بعد وہاں ایسی لوٹ مچی کہ وہاں کے تمدن و معاشرت اور صنعت و حرفت کو شدید نقصان پہنچا، اس ظلم و ستم کی داستان اتنی عام ہو چکی تھی کہ جب کلایو نے خودکشی کی تو ڈاکٹر جانسن نے اس کے متعلق کہا کہ "جس شخص نے اپنی قسمت ایسے جرائم سے بنائی تھی، اسکے ضمیر نے اُسے خودکشی پر مجبور کر دیا" اگر اس وقت کی دلی کی تباہی کا نقشہ دیکھنا ہو تو سودا کا "شہر آشوب" دیکھ لیجئے،

۱۷۷۲ء تک کمپنی نے مدراس، بمبئی اور بنگال کی پریسیڈنسی قائم کرلی، اور جنوبی ہند میں بہت بڑے علاقہ پر قبضہ کرلیا، گویا کل کے تاجر اب تاجدار بن بیٹھے، انگلستان کی پارلیمنٹ نے ۱۷۷۳ء میں "ریگولیٹنگ ایکٹ" پاس کیا، اس سے کمپنی پارلیمنٹ کے ماتحت ہوگئی، اور تین پریسیڈنسیاں ایک نظام میں آگئیں، جس پر ایک گورنر جنرل مقرر کیا گیا، اور چار ممبر کونسل، بنگال دارالسلطنت اور ہسٹنگز پہلا گورنر جنرل بنا، اس زمانہ سے انگلستان اور ہندوستان کے تمدنی اور معاشرتی تعلقات اور مضبوط ہوئے، اس سے پہلے جو انگریز آتے تھے وہ ذہنی، اخلاقی اور معاشرتی حیثیت سے نہایت پست ہوتے تھے، اس دور سے کچھ انسان بھی آنے لگے، مارٹن ولکن ۱۷۶۵ء میں ہندوستان

آیا، وہ فارسی اور بنگالی ٹائپ کا بانیِ اوّل تھا[1]، یہ پریس اٹھارہویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی
کے شروع میں رائج ہوا، یہ بات قابلِ غور ہے کہ ٹائپ لیتھو گرافی کے قبل وجود میں آیا، اس ٹائپ کا
استعمال نہ صرف فورٹ ولیم کے سرکاری کاغذات کے لئے ہوتا تھا، بلکہ مولانا سید احمد بریلوی شہید
اور مولوی کرامت علی صاحب جونپوری نے اپنی اصلاحی تحریک ۱۸۲۶-۲۷ء کی اشاعت
کے لئے بھی اسی سے فائدہ اٹھایا، جب کلکتہ میں پورا استحکام ہوگیا تو سب سے پہلے جیمس آگسٹس ہکی
(James Augustus Hicky) نے ۲۹ جنوری ۱۷۸۰ء میں بنگال گزٹ
نکالا، یہی ہندوستان کا پہلا اخبار کہا جا سکتا ہے، یہ ہیسٹنگز پر خوب حملہ کرتا تھا، اس لئے زیادہ
دن زندہ نہ رہ سکا، ۱۷۸۰ء سے ۱۸۳۵ء تک ہندوستانی اخباروں پر جو زیادہ تر انگریزی تھے،
بہت سی پابندیاں عائد کر دی گئی تھیں، عبدالرزاق صاحب نے پنڈت کیفی پر اعتراضات کرتے
ہوئے لکھا ہے کہ "سب سے پہلا اخبار ۱۸۳۵ء میں شائع ہونا بتایا گیا ہے یہ صحیح نہیں ہے، گورنمنٹ
ہند نے فتحِ دلّی کے بعد یہ ضروری سمجھا تھا کہ سرکاری کاروبار کی اطلاع اہلِ ہند کو دی جانی چاہئے
یہ ضرورت اس لئے پیش آئی تھی کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسروں پر اخبارات سختی کے ساتھ نکتہ چینی
کرتے تھے اور وہ اُن کو بعض اوقات جلاوطن کر دیتی تھی" اس لئے اوّل اوّل بعض حکام کی سرکاری
تحریرات کے ذریعہ اطلاعیں دی گئیں، بالآخر ۱۸۴۷ء میں انڈین گزٹ جاری کیا گیا، اس کی
اشاعت ہفتہ وار ہوتی تھی، ملاحظہ ہو "دی بنگال اینول ۱۸۵۳ء" "انڈین ڈیلی میل ۱۸۳۱ء"[2]، معلوم نہیں
فتحِ دہلی سے کون فتح مراد ہے، میرا خیال ہے کہ موصوف کو غلط فہمی ہوئی، اس کی مزید
تشریح کی ضرورت تھی، اٹھارہویں صدی کے آخر میں انگریزی کے بہت سے اخبار نکلنے لگے
تھے، مثلاً کلکتہ گزٹ، اورینٹل ایڈورٹائزر، لیکن ۱۷۸۰ء کے قبل کسی اخبار کا وجود ثابت نہیں[3]

---

۱ Cultural History of India ۲ رسالہ اردو ۱۹۳۵ء
۳ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا،

انڈین گزٹ ضرور ایک اخبار تھا، جو بعد میں شائع ہوا،

۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج میں پریس کھل گیا، اور یہاں سے ڈاکٹر گلکرسٹ اور کالج کے منشیوں کی تصانیف شائع ہونے لگیں، اسی زمانہ میں سرام پور کے پادریوں نے بھی ایک مطبع کھولا جس میں مختلف ہندوستانی زبانوں میں کتابیں چھپتی تھیں، یہ وہ وقت تھا جب ولزلی گورنر جنرل تھا، اور ابھی تک ہندو مسلم تعلقات بہت خوشگوار تھے، ان کے لباس اور طرز معاشرت میں بڑی حد تک یکسانیت تھی، سراج الدولہ اور مہاراجہ نبب کشن کا لباس ملایئے تو کوئی فرق نظر نہ آئیگا، تعلیمیافتہ لوگوں کی زبان فارسی تھی جس کو ہندو مسلمان دونوں سیکھتے تھے، اسی لئے جب شاہ عالم نے کلایو کو بنگال کی دیوانی عطا کی تو یہ شرط بھی رکھی تھی کہ سرکاری زبان فارسی رہے گی، اس کا اثر یہ ہوا کہ جتنے اخبارات نکلے سب فارسی زبان میں، سب سے قدیم فارسی اخبار جام جہان نما ہے، جو غالباً مئی ۱۸۲۲ء میں کلکتہ سے نکلا تھا، سرام پور سے ایک بنگالی اخبار سماچار درپن ۱۸۱۸ء میں پہلے ہی نکل چکا تھا، فارسی کا یہ پہلا اخبار تھا ۱۸۲۳ء میں ایک اردو ضمیمہ بھی شائع کرنے لگا تھا، لیکن یہ ضمیمہ مقبول نہ ہو سکا، اس کے بعد بہت سے فارسی اخبارات جاری ہوئے، آئینہ سکندر ۱۸۳۱ء، سلطان الاخبار ۱۸۳۵ء میں، اس کے اڈیٹر اردو کے مشہور انشاپرداز رجب علی سرور تھے، سراج الاخبار[۱] ۱۸۴۱ء یہ مغل دربار کا کورٹ گزٹ تھا، اور بہادر شاہ کے زیر سرپرستی دلی سے نکلتا تھا، اور بھی بہت سے اخبار نکلے جن کی تفصیل غیر ضروری ہے،

۱۸۰۳ء ہندوستان کی تاریخ میں بہت اہم ہے، کیونکہ اسی سال لارڈ لیک نے دلی پر قبضہ کر لیا، اور مرہٹوں کا اقتدار ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا، شاہ عالم مرہٹوں کے بجائے انگریزوں کے

---

[۱] انسائیکلوپیڈیا آف انڈیا، نیوز پیپر ہسٹری، ٹائمس لندن، ہسٹوریکل جرنل میں ایک مضمون بہ عنوان ... وغیرہ کی تحقیق یہی ہے کہ بنگال گزٹ پہلا اخبار ہے،

ہاتھوں کٹھ پتلی بن گیا، گویا سلطنت مغلیہ کی راجدھانی بھی بدیسی ہاتھوں میں چلی گئی اور قدیم دیرینہ عظمت ہندوستانی معاشرت کے مرکز میں بھی گھن لگ گیا، گو شاہ عالم ۱۸۰۶ء تک زندہ رہا، اور اکبر ثانی ۱۸۰۶-۱۸۳۷ء اور بہادر شاہ ۱۸۳۷-۱۸۵۷ء تک بادشاہ کہلائے، لیکن ان کی حقیقت شاہ شطرنج سے زیادہ نہ تھی، اس وقت سے عجیب ذہنی کشمکش شروع ہوئی، نئی تہذیب و تعلیم پرانی معاشرت و تعلیم سے دست و گریبان نظر آنے لگی، اس کشمکش کا ہلکا سا عکس مولوی نذیر احمد صاحب کی کتاب ابن الوقت میں نظر آتا ہے، سیاسی اقتدار کے بعد (۱۸۱۵ء) سے اقتصادی، تعلیمی اور ادبی ترقی کا دور شروع ہوا، تعلیمی دلچسپی کچھ بڑھ گئی، جدید تعلیم کی بنیاد رکھی جانے لگی، اور بہت سی معاشرتی تحریکیں اس تعلیم کا نتیجہ تھیں شروع ہوگئیں، اس زمانہ میں بنگال کی خاص اہمیت ہوگئی تھی، اور وہاں کا متوسط طبقہ ترقی کر رہا تھا، اس ترقی نے دوسروں کو بھی ترغیب دی، فورٹ ولیم کالج کی وجہ سے دیسی زبان پھیل رہی تھی، ۱۸۱۶ء میں ہندو کالج قائم ہوا اور راجہ رام موہن رائے نے قدیم سنسکرت تعلیم کے خلاف آواز بلند کی، اس وقت سے سارے ہندوستان میں ایک تعلیمی اور مذہبی کشمکش شروع ہوگئی، ۱۸۳۵ء میں مکالے کی تجویز پر انگریزی کو ذریعہ تعلیم تسلیم کر لیا گیا، ہمارے پرانے قانون بھی اپنی اصلی حالت پر نہ رہے، بلکہ وہ ہندو لا، مسلم لا کے بجائے اینگلو ہندو لا اور اینگلو مسلم لا ہوگئے، مغرب اور اس کے فلسفیانہ خیالات نے بھی ایک ہلچل مچا دی، اسی زمانہ میں مولانا سید احمد بریلوی نے تجدید و اصلاح اور سکھوں کے خلاف جہاد کا علم بلند کیا، مولانا کرامت علی جونپوری کی تحریک مشرقی بنگال میں اردو کے ذریعہ اپنا کام کر رہی تھی، ان تحریکوں نے اردو کو ترقی دی، لیکن اردو ٹائپ مقبول نہ ہوسکا، اور دلی میں ۱۸۳۷ء میں لیتھو پریس قائم ہوا، ۱۸۳۵ء میں شمالی ہند میں دفتری زبان فارسی سے اردو ہوئی، اور پریس کو بھی آزادی ملی، ۱۸۳۶ء میں مولوی محمد حسین آزاد کے والد مولوی باقر نے دہلی سے اردو اخبار نکالا، اردو صحافت میں اولیت

کا فخر اسی کو حاصل ہے، یہ ۱۸۵۵ء تک خوب چلتا رہا"، علمی نقطۂ نگاہ سے اردو اخبار اور اُس کے مطبع کو اشاعتِ خیالات، تربیتِ رائے عامہ، طباعتِ کتب میں اوّلیت کا امتیاز حاصل ہے، اس میں ادبی حیثیت کو زیادہ اہمیت تھی، چنانچہ ذوقؔ، مومنؔ اور غالبؔ کی غزلیں، کبھی ہم طرح غزلیں، کبھی زبان و محاورات کی بحث، کبھی شہیدی کی شاعری پر مباحثہ وغیرہ موضوعوں پر مضامین ہوتے تھے، ۱۸۴۳ء میں مولوی باقر علی نے اردو کا ایک دوسرا اخبار مظہر حق نکالا، معلوم نہیں کتنی مدت تک زندہ رہا،

دوسرا اخبار سید الاخبار ہے جس کو سر سید احمد خاں کے بھائی سید محمد خاں نے ۱۸۳۸ء میں نکالا تھا، موصوف کا عین شباب میں انتقال ہوگیا، کچھ دنوں تک سر سید نے بھی اس کو مولانا حالی حیاتِ جاوید میں لکھتے ہیں:۔

"سید الاخبار کا اہتمام اگرچہ برائے نام ایک اور شخص کے سپرد تھا، مگر زیادہ تر سر سید خود اس میں مضامین لکھا کرتے تھے، لیکن یہ اخبار ایک مدت تک جاری رہکر بند ہوگیا"

"فوائد الناظرین"، ماسٹر رام چند دلی سے نکالا کرتے تھے، پہلے یہ ماہوار رسالہ تھا، لیکن ۱۸۴۶ء سے ہفتہ وار ہوگیا، اس اخبار میں مشہور اشخاص کی تصویریں اور مختلف مقامات کے نقشے بھی ہوتے تھے، یہ چیز پہلے کہیں نظر نہ آتی تھی، نقشے، سائنٹفک مضامین، علمی آلات اور تاریخی اشخاص کی تصویریں اسکی خصوصیات میں سے تھیں، ۱۸۴۵ء میں ایک اور اخبار قران السعدین پنڈت دھرم نرائن بھاسکر کی ادارت میں دلی سے نکلا، یہ بارہ برس تک زندہ رہا، ۱۸۴۷ء میں قمر الدین نے بھیلی بازار آگرہ سے ہفتہ وار اخبار "اسعد الاخبار" نکالا، دیوان تفتہ کا پہلا حصہ اسی اخبار کے مطبع سے ۱۸۴۹ء

۱؎ آب حیات محمد حسین آزاد ۵۰۰۔ ۲؎ آدھی صدی پہلے کے اردو اخبارات، کیفی رسالہ اردو ۱۹۳۵ء،

۳؎ یہ ایک فارسی اخبار تھا،

میں شائع ہوا، اس میں قطعۂ تاریخ اور کتابوں کا اشتہار نظم میں درج ہوتا تھا، ۲۰ر نومبر کی اشاعت میں مرزا حاتم علی مہر کا وہ قطعہ جو اُنھوں نے لارڈ ڈلہوزی کے خیر مقدم میں کہا تھا درج ہے، ؎

اے صبا در تہنیت ایں مژدہ گو ڈلہوزی است رونق بخشِ ہند
افتخارِ ہند باد انجم تو مصرعۂ تاریخ مقدم گفت مہر

۱۵ر جولائی ۱۸۵۱ء کے نمبر میں یہ خبر درج ہے کہ بدرالدین علی خاں نے ملکہ وکٹوریہ اور پرنس البرٹ کے لئے مہریں کھود کر دیں،

احسن الاخبار مطبوعہ ۲۲ر اکتوبر ۱۸۴۸ء میں لکھا ہے کہ" صادق الاخبار کے اڈیٹر صاحب نے رفتہ رفتہ اپنے اخبار کو اردو زبان کا اخبار بنا دیا ہے، سمجھ میں نہیں آتا کہ فارسی زبان سے کیوں رابطۂ الفت منقطع کر دیا، شاید اخبار کے خریداروں نے تقاضا کیا ہوگا کہ فارسی زبان ترک کرد و اور اُردو زبان جاری کردو" اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اردو زبان کا مطالبہ روز بروز بڑھ رہا تھا، بادشاہ دہلی کے مقدمہ کے سلسلہ میں، اس کے بعض حالات پر روشنی پڑتی ہے،، ایک گواہ کشن سنگھ نامی کا بیان ہے کہ

"جمال الدین ایک ہفتہ وار اخبار نکالتا تھا، جس کے مضامین قطعی انگریزی حکومت کے خلاف ہوتے تھے، اس کا نام صادق الاخبار، سچی خبریں تھا، دلی میں بڑا اخبا سمجھا جاتا تھا"

کریم الدین مصنف تذکرۂ شعرار نے مطبع رفاہ عام قائم کیا، اور ایک اخبار" کریم الاخبار" کے نام سے جاری کیا، ۱۸۴۹ء میں شیخ محمد ضیاء اللہ نے ضیار الاخبار نکالا،

یہ وہ وقت تھا جب ڈلہوزی ہندوستان کا گورنر تھا، جو مغربی تہذیب کی برتری کے

خبط میں مبتلا تھا، اس نے دیسی ریاستوں کے الحاق کا ایک طوفان بپا کر رکھا تھا، لیکن اسی کے ساتھ اسکے عہد میں سائنس کے فیوض و برکات بھی نظر آنے لگے، ٹیلیگراف، جہازرانی اور ڈاک میں سہولتیں ہوتی گئیں، کارڈ کی قیمت ایک پیسہ اور لفافہ کی دو پیسہ تھی، انگریزی تعلیم اور سرکاری ملازمتوں کی وجہ سے اردو تحریر کے تکلفات ختم ہونے لگے اور ایک کاروباری زبان پیدا ہونے لگی، جس نے اسکو پھیلنے میں بڑی مدد دی[۱]، ۱۸۳۵ء سے لیکر ۱۸۵۷ء تک کا زمانہ اخباروں کی انتہائی آزادی کا زمانہ تھا، یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ میں اردو اخبارات بڑی تیزی سے بڑھنے لگے اور ایشیاٹک جرنل کی زبان میں "انگریزی نہیں بلکہ دیسی اخباروں نے ہندوستان میں معاشرتی، اخلاقی، مذہبی تعلیم اور مادی انقلاب پیدا کیا ہے"؛ دیسی اخبارات اپنے حقوق کے لئے لڑتے رہے اور یہ مطالبہ کرتے رہے کہ ہندوستانیوں کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا جائے[۲]، واقعہ یہ ہے کہ قوم کی بیداری میں ان اخباروں کا بہت بڑا حصہ ہے، اسی وقت سے اردو صحافت نے اپنے ہونہار ہونے کا پورا ثبوت دیدیا تھا، یہ اخبارات اس وقت کی معاشرت اور مذاق کے آئینہ دار ہیں،

کوہ نور کے اجرار سے اردو صحافت نے ترقی کی راہ میں ایک قدم اور آگے بڑھایا، یہ نہ صرف پنجاب بلکہ ہندوستان کا اپنی طرز کا پہلا اخبار تھا، جسے ۱۸۵۰ء میں منشی ہرسکھ رائے نے لاہور سے نکالا، منشی ہرسکھ رائے مضافات سکندرہ کے رہنے والے تھے، مولانا احسن مارہروی نے اسکا سنہ اجرار ۱۸۴۹ء تبلایا ہے[۳]، یہ وہ وقت تھا جب ہندوستان میں بڑی کثرت سے اردو اخبارات نکلتے تھے، دتاسی کے بیان کے مطابق چھبیس اخبارات اور رسائل صرف صوبہ شمالی مغربی سے نکلتے تھے، جن میں تئیس ہندوستانی زبان کے تھے، دو فارسی کے اور ایک بنگالی کا،

---

[۱] کلچرل ہسٹری آف انڈیا [۲] Press after Mutiny Historical Journal
[۳] تاریخ نثر اردو،

دوسرے صوبون کے اخبارات کو ملاکر پچاس تک تعداد پہنچ جائیگی ۱۸۵۰ء کے آخر ہی مین کوہ نور کے خریداروں کی تعداد ۵۰۰ تک پہنچ گئی تھی، اس کے خریداروں میں سر جان لارنس لفٹننٹ ایلیس، مسٹر میکلورڈ، مسٹر سیلن، مسٹر میگریگر اور دوسرے انگریزوں کے نام بھی ملتے ہیں، یہ مدراس، بمبئی اور کلکتہ تک پھیلا ہوا تھا ۱۸۸۳ء میں یہ اخبار ہفتہ وار سے روزانہ ہو گیا، لیکن پھر ہفتہ وار ہو گیا، یہ وہی اخبار ہے، جس کے عملہ میں منشی نولکشور بھی کام کرتے تھے، اس کے دامن سے اس دور کے بہت سے ہندو اور مسلمان ادیب اور اہل قلم وابستہ رہے، مثلاً نادر علی، تاج الدین منشی نول کشور، مرزا موحد، منشی نثار علی شہرت، مولوی سیف الحق ادیب، مولوی محمد دین فوق اور منشی محرم علی چشتی وغیرہ اس کے اڈیٹر رہے، بعض عیسائی بھی اس کے اڈیٹر تھے، اس کا نام اتنا مقبول ہوا کہ ہندوستان کے بہت سے اخباروں نے اپنے نام میں نور کا جزء لگایا، مثلاً دریائے نور لاہور، نور الاخبار اور افشاں لدھیانہ، نور الانوار و مطلع نور ۱۹۰۴ء میں یہ نامی گرامی اخبار بند ہو گیا،

اس زمانہ کے اکثر اخبار اردو اور ہندی دونوں میں شائع ہوتے تھے، اور بعض اخبارون میں انگریزی اور اردو ساتھ ساتھ ہوتی تھی، مثلاً آگرہ گورنمنٹ گزٹ یہ سرکاری اخبار تھا جو انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں نکلتا تھا، اندور سے آٹھ صفحوں کا ہفتہ وار اخبار مالوہ نکلتا تھا، اس کے ایک کالم میں ہندی اور دوسرے میں ہندوستانی ہوتی تھی، اس کے اڈیٹر دھرم نرائن بہت اچھے شاعر تھے، انھوں نے مل کی پولیٹیکل اکانومی اور انگلستان کی تاریخ کا ترجمہ بھی کیا ہے، راجہ بھرت پور کی سرپرستی میں بھرت پور صوبہ آگرہ سے ایک اخبار مظہر السرور نکلتا تھا، اس میں بھی ہندی اور اردو دونوں ہوتی تھی،

بنارس سے ۱۸۵۰ء میں ہرکارہ جاری ہوا، بریلی سے عمدۃ الاخبار، لکشمن پرکاش کی

ادارت میں نکلا، انھوں نے ایک علمی اخلاقی انسائیکلوپیڈیا بھی لکھی جس کا نام مشرقی طرز پر مشرقی زینت رکھا[۱]، مرزاپور سے امریکی پروٹسٹنٹ مشنریوں کا اخبار خیر خواہ جاری ہوا، شملہ سے شیخ عبد اللہ نے شملہ اخبار نکالا، موصوف انگریزی اور ہندوستانی دونوں سے واقف تھے ۱۸۵۳ء میں دیوان چندر رئیس سیالکوٹ نے ہمائے بے بہا کے نام سے مطبع چشمۂ فیض سے جاری کیا، نہ اخبار وکٹوریہ پیپر کے نام سے بہت دنوں تک زندہ رہا، کلکتہ سے اردو گائڈ نکلا، مولانا احسن مارہروی نے خورشید عالم سیالکوٹ اور طلسم لکھنؤ کا بھی ذکر کیا ہی، یہ دونوں اخبار ۱۸۵۶ء میں جاری ہوئے تھے، اس میں طلسم لکھنؤ اس لئے اہم ہے کہ اس سے ۱۸۵۷ء کی شورش کا کچھ حال معلوم ہوتا ہی لیکن اس کی خبریں زیادہ تر افواہیں ہوتی تھیں[۲]، اسی کے بعد پہلا دور ختم ہو جاتا ہے،

اس دور میں سیاسی اور خارجی امور اخباروں کی توجہ کا مرکز تھے، پریس کی آزادی کی وجہ سے لب و لہجہ میں بہت کچھ بے باکی تھی، خالص اشتہار کا اب تک رواج نہیں ہوا تھا، اخباروں کی زبان گو باغ و بہار جیسی نہ تھی، پھر بھی قدیم تھی، فارسی انشار کا تتبع اب بھی کیا جاتا تھا، اس قسم کی ترکیبیں اکثر دیکھنے میں آتی ہیں، "راقم چیٹھی، صاحب چیٹھی، انتخاب ایک چیٹھی، اجازت اندر جانے کی بی بیگم صاحب بیٹھی تھی، چوں بجائے چونکہ، بحصولِ اجازت حکام واسطہ خرید نیلام اسباب لوٹ کے، چارج عہدہ جج کا تھا، وے وہ کی جمع، نسبت سابق صحت رکھنے میں، کرا سیاند نسبت بجائے نامہ نگار کے، بلا حصول پاس حاکم کے"، فقروں اور جملوں کو کسی قسم کے وقفوں کے نشانات سے جدا نہیں کرتے تھے، انگریزی املا کی صحت کا اسقدر خیال تھا کہ سپتمبر اور ڈسمبر ہی لکھتے تھے، بمبئی بمبئ کی جگہ لکھتے تھے، اس زمانہ کی صحافت کی مدعا نگاری قابلِ تعریف ہی، وہ اپنا مطلب خوبی سے ادا کر لیتے تھے[۳]،

---

[۱] خطبات گارسان دتاسی ص ۲۵ [۲] Cultural History of India ص ۵۹ [۳] اس دور کی خصوصیات پنڈت کیفی کے مضمون اب سے آدھ صدی کے اردو اخبار" رسالہ اردو ۱۹۳۵ء اور Historical JOURNAL AND PYESS AFTER MUTINY سے ماخوذ ہے،

تلخیص و تبصرہ

راجہ ٹوڈر مل کے لڑکے

یو۔ پی ہسٹاریکل جرنل کے جولائی ۴۲ء نمبر میں راجہ ٹوڈر مل کے لڑکوں کی نسبت ایک محققانہ مضمون شائع ہوا ہے، جس کی تلخیص حسب ذیل ہے:۔

اکبر کے نامی گرامی وزیر ٹوڈر مل کے لڑکوں کے حالات بہت کم معلوم ہیں، لیکن پھر بھی ہمارے پاس مستند تاریخیں موجود ہیں جن سے اُن کی زندگی کے حالات کا علم ہو جاتا ہے،

اکبر نامہ میں دھارو، گوردھن (غالباً گوردھن) اور کلیان داس کا ذکر ہے، ایک سنسکرت ڈرامہ کام سادھ مصنفہ سیشہ کرشن میں راجہ ٹوڈر مل کے ایک لڑکے کا نام گوندھاری بتایا گیا ہے، کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دھاری گوندھاری کا مخفف ہے، جس کو والدین نے پیار سے دھارو کر لیا ہے، اور یہی نام دونوں سے زیادہ مشہور ہے، بعض لوگوں نے غلطی سے دھارو اور گوندھاری کو ایک ہی سمجھ لیا ہے، کھتریہ اتہاس کا مصنف تو ایک قدم اور آگے بڑھ گیا ہے، وہ گوندھاری کو بڑا بھائی کہتا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ گوندھاری یا دھارو راجہ ٹوڈر مل کا بڑا لڑکا تھا، بیورج (Beveridge) کے اکبر نامہ میں صرف دو لڑکوں دھاری اور کلیان کا ذکر ہے،

اکبر نامہ میں دھارو کا سب سے پہلے ذکر اس وقت آیا ہے، جب فتح دھولکا جو ۲۶ جون ۱۵۷۳ء

میں مرزا مظفر حسین اور میر علی کے خلاف نصیب ہوئی تھی، وہ اس خبر اور منتخب ہاتھیوں کو گجرات سے دربار لیجانے کے لئے تعینات ہوا تھا، قیاس ہے کہ اس مہم میں اپنے باپ کے ساتھ ساتھ وہ بھی شریک جنگ تھا، جو کام اس کے سپرد تھا اس سے ظاہر ہوتا ہے، کہ یہ اس کی بہادری کا صلہ اور اُس کی حوصلہ افزائی تھی، دوسری بار اس کا ذکر اس طرح آتا ہے، ۲۸ شہ جلوس شاہی کا زمانہ تھا، عرب بہادر جو صوبہ بہار میں ترہت اور چمپارن کے درمیان خان اعظم سے شکست کھاکر جون پور کی طرف بڑھا آرہا تھا، اس کی سرکوبی کے لئے اکبر کے حکم سے اپنے باپ کی طرف سے بھیجا گیا تھا، گوردھن نے باغی کو پہاڑی علاقہ میں بھگا دیا، یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ جونپور میں مقرر ہو چکا تھا یا دربار آگرہ سے بھیجا گیا تھا، اکبر نامہ میں ایک جگہ لکھا ہے کہ شمشیر خاں ۲۴ جلوس شاہی کو بہار سے بنارس آیا تاکہ راجہ ٹوڈرمل کی فوجوں کو وہاں سے لے کر بہار کے باغی کو سر کرے، راجہ اس وقت دارالسلطنت میں تھا، اس لئے ممکن ہے کہ اس کا لڑکا عارضی طور پر بنارس میں یا مستقلاً جونپور میں مقرر ہوا، ایک اور ثبوت یہ ہے کہ وہ اپنے باپ کی موت کے بعد جونپور سے دربار میں حاضر ہوا تھا اور ۳۵ شہ جلوس شاہی سے غالباً وہ کئی سال تک جونپور ہی میں مقیم تھا، پانچ سال بعد ایک واقعہ کا اور ذکر ہے، جس سے یقین ہو جاتا ہے، کہ وہ جونپور کا حاکم تھا، وزیر خاں کے انتقال کے بعد شہباز خاں بنگال سے لوٹ رہا تھا تو اُس نے وزیر خاں کے بیٹے صالح کو اس عہدہ پر مقرر کیا تھا، خود ۴۳ شہ جلوس میں دربار میں حاضری کے لئے روانہ ہو گیا، اُس کے جاتے ہی صالح کے دماغ میں بغاوت کا مادہ پکنے لگا، اور وہ موقع ڈھونڈھنے لگا، جب بادشاہ کو یہ معلوم ہوا تو اُس نے میر مراد کو ضروری احکامات بھیجے، وہ اس وقت بہار اور بنگال کے امرار کا سزاول نامزد ہو کر بھیجا گیا تھا، اُس نے وزیر خاں کے تمام سپاہیوں کو بھرتی کرنا شروع کیا، جو ان دونوں صوبوں کے امرار کی خدمت کے لئے تیار تھے، اور اس کا انتظام کیا کہ باقی سپاہیوں کی مدد سے صالح کو دربار میں

حاضر کردیں، صالح کے تمام عذر لنگ مراد کے لئے قابل قبول نہیں تھے، وہ اپنے فرض سے واقف تھا، راستہ میں دغا فریب اور رشوت سے اس بات کی کوشش کی کہ افسروں کے اندر ایک انتشار پیدا ہو جائے، اور جب وہ جونپور پہنچا تو دھارو کو دھوکہ دینے میں کامیاب ہوگیا، شہزادہ کی ہدایت کے مطابق صالح کے ساتھ ایک نگراں کا رہنا ضروری تھا، لیکن راجہ کے لڑکے سے یہ چوک ہوگئی اور اس نے صالح کو بغیر کسی چوکیدار کے آگے بڑھنے دیا، راستہ میں اس نے خوب سیم وزر لٹائے اور بہت سے سپاہیوں کو اکٹھا کر کے میر کے علاقہ فتحپور ہنسوا کی طرف کوچ کر گیا، میر کو اس کی سازش کا پتہ چلا اور وہ قریب کے قلعہ میں پناہ گزیں ہوگیا، اس باغی نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا، اور اطراف میں لوٹ مار اور غارتگری شروع کر دی، ابو الفضل کہتا ہے:

"یک بیک قصبات اور دیہات کے جاگیرداروں کو اس ہنگامہ کی خبر ہوئی، اور وہ وہاں پہنچ گئے، سب سے پہلے آنے والوں میں الہ بخش مورال تھا، جس نے اپنے ساتھ ایک اچھا فوجی دستہ بھی لایا۔"

اس کو گوند دھاری نے جونپور سے بھیجا تھا، صالح فوراً گھر گیا اور دربار میں لایا گیا،

اس واقعہ سے دھارو کی اپنی غلطی کے احساس اور اس کے بر وقت تدارک کی صلاحیت کا پتہ چلتا ہے، لیکن اس سے زیادہ یہ واضح ہوتا ہے کہ راجہ کا لڑکا اس وقت جونپور کا جاگیردار تھا، پھر یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ اسی زمانہ میں اس نے بنارس میں ایک تہوار کے تماشہ کو رونق بخشی تھی، جو بشیشر کے اعزاز میں ہوا تھا، ایک سنسکرت ڈرامہ کا نام سودھ مصنفہ سیشہ کرشن" جو اسی کی سرپرستی میں لکھا گیا تھا، جب یہ ڈرامہ اس تہوار میں کھیلا گیا، تو وہ بھی شریک تھا، اس ڈرامہ کے شروع میں ایک اشلوک ہے جس میں اس کو راجہ گوردھن دھاری کے ارشادِ امیر سلطنت سے خطاب کیا گیا ہے،

۱۵۸۹ء میں دھارو جونپور میں تھا، اس سال کے آخر میں اس کے باپ کا انتقال لاہور میں ہوا، اُس نے ہمیشہ کے لئے جونپور چھوڑ دیا، اور ۱۵۹۰ء کے وسط میں بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوا، اور اپنے باپ کے خادموں کو پیش کیا، اور خاطر خواہ انعام پایا، اسی سال مرزا عبدالرحیم خانخاناں ملتان کا صوبہ دار مقرر ہوا اور مرزا خان بیگ ترخان کے خلاف سندھ کی مہم پر مامور کیا گیا، گو دھارو جس کو بہادر خان کا خطاب مل چکا تھا، اپنے دستہ کے ساتھ خان خانان کی کمک کو پہنچ گیا، دھارو نے بہت ہی نمایاں خدمات انجام دیں اور دشمن کے ساتھ بہت سی جنگوں میں بڑی بہادری سے لڑتا رہا، آخرکار اُس کی پیشانی پر ایک نیزہ لگا، اور وہ گھوڑے سے گر پڑا، یہ بڑا کاری زخم تھا، آخرش ۱۵۹۲ء میں ایک سچے سپاہی کی طرح بہادری سے لڑتے ہوئے اس نے جان دیدی،

اس ہونہار نوجوان کے متعلق مشہور ہے کہ وہ اپنے گھوڑوں کو سونے کی نعل لگاتا تھا، ابوالفضل کے بیان کے مطابق اس کا نام ہفت صدی سپہ سالاروں کی فہرست میں نظر آتا ہے، اور اس کی ماہانہ تنخواہ قریب قریب آٹھ ہزار روپیہ تھی، اور اسکو باسٹھ ۶۲ گھوڑے، بائیس ۲۲ ہاتھی اور چھیالیس ۴۶ باربرداری کے جانور رکھنے کی اجازت تھی،

راجہ ٹوڈرمل کے دوسرے لڑکے کلیان داس کو کہیں راجہ کلیان سنگھ اور کہیں راجہ کلیان مل کے نام سے یاد کیا گیا ہے، اس دور میں کلیان بہت لوگوں کا نام تھا، اس لئے اس میں بہت کچھ غلطی ہو گئی ہے، لاہور کے پروفیسر شرما نے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ تزک میں راجہ کلیان سنگھ کو غلطی سے راجہ ٹوڈرمل کا لڑکا بتلایا ہے، اپنے دعوی کے ثبوت میں تین دلیلیں پیش کی ہیں،

(۱) مآثر الامراء نے راجہ ٹوڈرمل کے کسی لڑکے کا یہ نام نہیں بتلایا ہے، اور نہ وہ کسی ایسے لڑکے کا ذکر کرتا ہے، جو اتنا ممتاز ہو،

(۲) بہارستان غیبی نے راجہ مان سنگھ کے لڑکے کا نام کلیان سنگھ بتلایا ہی، اس کتاب سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کلیان سنگھ اپنے باپ کے ساتھ دربار میں حاضر ہوتا تھا،

(۳) مان سنگھ کا ایک لڑکا کلیان سنگھ تھا،

فاضل پروفیسر کو حیرت ہے کہ سرجدوناتھ سرکار نے کس طرح تزک کو تسلیم کریا، اور بہارستان اور تزک کے اختلاف کو نظرانداز کردیا، لیکن، افسوس ہے کہ پروفیسر مذکور کو یہ نظر نہ آیا کہ سرجدوناتھ سرکار کی دلیلوں کی بنیاد زیادہ مضبوط ہے،

اگر مآثر میں راجہ ٹوڈرمل کے کسی لڑکے کا ذکر نہیں ہے، تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس کے کوئی لڑکا نہیں تھا، اکبرنامہ جو کہیں زیادہ بہتر اور قریب تر معاصرانہ تاریخ ہے نہ صرف اس کا ذکر کرتی ہے، بلکہ راجہ ٹوڈرمل کے لڑکوں کے کارناموں کی بھی اس میں تفصیل ہے،

پروفیسر مذکور کی دوسری دلیل بھی کچھ زیادہ وزنی نہیں ہے، وہ شاید بھول گئے کہ ناتھن جس پر انکو پورا بھروسہ ہے، اُس نے بھی اپنی کتاب بہارستان غیبی چوتھے باب ملا۲ اور پھر دسویں باب میں "راجہ کلیان ولد ٹوڈرمل" لکھا ہے" یہ بھی قابلِ غور ہے کہ جہاں پر راجہ مان سنگھ کے لڑکے کلیان سنگھ کا ذکر ہے، وہاں راجہ کا لفظ شامل نہیں ہے، یہ صحیح ہے کہ راجہ مان سنگھ کا ایک لڑکا کلیان سنگھ تھا، لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جہاں کہیں راجہ کلیان سنگھ کا نام آیا ہے، اس سے مان سنگھ کا لڑکا ہی مراد ہو، جہانگیر کے وقت میں راجہ ٹوڈرمل کے لڑکے کا نام راجہ کلیان یا راجہ کلیان سنگھ اور کبھی راجہ کلیان بھی لیا گیا ہے، اس کے علاوہ مان سنگھ نے بھاؤ سنگھ اور دوسرے مہا سنگھ (جگت کا لڑکا) دو ہی وارث مرتے وقت چھوڑے تھے، جگت سنگھ مان سنگھ کی زندگی ہی میں دنیا سے کوچ کرگیا، اب یہ ممکن ہے کہ کلیان سنگھ جو بہت ہی کم مشہور ہوا، راجہ مان سنگھ کے دوسرے لڑکوں کی طرح ان کی زندگی میں چل بسا ہو اور یہ بالکل قطعی ہے، اس لئے کہ بھاؤ سنگھ کے بعد

وارثوں میں جگت سنگھ کے لڑکے کا نام نہیں آتا، جہانتک راجہ ٹوڈرمل کے لڑکے راجہ کلیان سنگھ کا تعلق ہے ہمیں قطعی معلوم ہے کہ وہ راجہ مان سنگھ کی موت کے بہت بعد تک زندہ رہا، راجہ مان سنگھ کا انتقال ۱۰۲۳ھ مطابق ۱۶۱۴ء میں ہوا،

جب ہم راجہ کلیان کے حالات تزک اور اس کے ساتھ اکبرنامہ میں پڑھتے ہیں تو اُن کے متعلق کوئی اشتباہ باقی نہیں رہتا، اکبرنامہ کے بیان کے مطابق کلیان داس ولد راجہ ٹوڈرمل کو اکبر کے انچاسویں سال جلوس میں یک ہزاری اور پانچ سو گھوڑوں کا منصب عطا ہوا، تزک سے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۶۱۱ء میں راجہ کلیان سنگھ کے منصب میں پانچسو ذات اور تین گھوڑوں کا اضافہ ہوا، جس نے اُن کے مجموعی منصب کو یکہزار پانچ سو ذات، اور آٹھ سو گھوڑوں تک پہنچادیا،

ابوالفضل نے سب سے پہلے کماؤں کے راجہ رودرا چند کی اطاعت کے سلسلہ میں ذکر کیا ہے بریلی کا کلکٹر متھرا داس اس راجہ سے ملا اور اُس نے اُس کو ترغیب دی کہ وہ اس کے ساتھ چل کر اکبر کو نذر عقیدت پیش کرے، راجہ رودرا چند کو اس کھتری کی ضمانت پر حاضر ہونے میں تامل ہوا، لیکن ساتھ ساتھ اُس نے دربار میں حاضر ہونے کا وعدہ کیا، اگر راجہ ٹوڈرمل اسکی ضمانت لے لیں، اپنے بجائے ٹوڈرمل نے اپنے لڑکے کلیان داس کو بھیجدیا تاکہ کماؤں کے راجہ کو اطمینان ہو جائے، راجہ کلیان پر بھروسہ کرکے لاہور چلا گیا، اور ۱۵۸۸ء کے سرما میں اکبر کے دربار میں حاضر ہو گیا،

کلیان کا ذکر دوسری بار اکبر کے چھیالیسویں سال جلوس (۱۶۰۱-۲ء) میں ہوتا ہے، ابوالفضل نے لکھا ہے آٹھ بہمن کو شہنشاہ کو علم ہوا کہ چند بد طینت سرکشوں نے خراج وصول کرنا نہیں چھوڑا ہے بادشاہ نے چند معتبر اور سمجھدار آدمیوں کو اپنی حکومت میں روک تھام کے لئے مقرر کیا، ان میں ایک کلیان داس بھی تھا، اور گجرات کی راہیں اس کے سپرد ہوئیں،

اکبر کے انچاسویں سال جلوس میں اس کا نام ان امرار کی فہرست میں دسواں تھا، جن کے منصب میں اضافہ ہوا تھا، اکبرنامہ کا بیان ہے کہ کلیان داس ولد راجہ ٹوڈرمل کو ایک ہزار ذات اور پانچسو گھوڑوں کا منصب عطا ہوا، اور قلعہ کالنجر سپرد ہوا،

جہانگیر کے عہد میں راجہ کلیان بنگال بھیجا گیا جہاں سے اس نے بادشاہ کو تحائف بھیجے، جو ۸ محرم بروز دوشنبہ (غالباً ۲۳ مارچ ۱۶۱۱ء) کو بادشاہ تک پہنچے، اس کا اثر یہ ہوا کہ راجہ کلیان کے منصب میں پانچ سو ذات اور تین سو گھوڑوں کا اضافہ ہوا جس نے اُس کا منصب ایکہزار پانچسو اور آٹھ سو گھوڑوں تک پہنچا دیا،

۲۴ مئی ۱۶۱۱ء کو ایک حکمنامہ صادر ہوا جس سے ہاشم خاں صوبہ دار اڑیسہ کو کاشمیر تبدیل کر دیا گیا، ہاشم خاں اپنی نئی جگہ پر فوراً روانہ نہیں ہوا، غالباً اکتوبر کا مہینہ تھا کہ اسلام خاں کی سفارش "یکے از لائق خاں زادان" پر کلیان کے منصب میں دو سو ذات اور گھوڑوں کا اضافہ ہوا، ایک شاہی جھنڈا، ایک علم، ایک شاہی نقارہ، اور صوبہ اڑیسہ کی صوبہ داری عطا ہوئی، اس صوبہ پر ۱۶۱۱ء سے لیکر ۱۶۱۷ء تک اُس نے حکومت کی، راجہ کیشو داس مارو نے خوردا (جو کہ اڑیسہ اور گولکنڈہ کی سرحد پر واقع تھا) کے والی پرشوتم دیوا کو سخت شکست دی، اور اُس کو مجبور کرکے بہت ہی ذلت آمیز شرائطِ صلح اس سے منوائیں، لیکن بہت جلد اس صلحنامہ کے پرزے اُڑ گئے، راجہ کلیان نے کیشو داس مارو کے ساتھ خوردا پر حملہ کر دیا، اس نے پرشوتم دیوا کی ریاست کو غارت کر دیا، اور اس کو مجبور کر دیا کہ مارو کے شرائطِ صلح کو پھر تسلیم کرے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس کو نہ صرف اپنا مشہور ہاتھی شیشا ناگا دربار میں اور تین لاکھ روپیہ خراج شاہی خزانہ میں داخل کرنا پڑا بلکہ اپنی لڑکی کو بھی شاہی حرم میں بھیجنا پڑا،

بعد میں راجہ کلیان کے خلاف کچھ نامناسب شکایتیں پہنچیں، جس کی وجہ سے وہ ۱۶۱۷ء

میں واپس بلالیا گیا، اُس نے دربار میں حاضر ہونے میں دیر کی، اس سے اس کے دشمنوں کو موقع مل گیا اور اُنھوں نے بادشاہ کا دماغ اس کے خلاف بھر دیا، آخر ش اگست کے آخر میں جب اُس نے حاضری کی درخواست کی تو وہ اور اُس کا لڑکا آصف خاں کی حراست میں لے لئے گئے، اور آصف خاں کو حکم ہوا کہ مقدمہ کی تحقیقات کریں، ایک ہفتہ کے بعد اٹھارہ ہاتھی جو راجہ اڑیسہ سے لایا تھا اُن میں سے سولہ شاہی فیل خانہ میں داخل ہو گیے اور دو اس کو پیش کئے گئے، جب ایک ہفتہ اور گذر گیا، اور آصف خاں نے اپنی تحقیقات پیش کی کہ کلیان بے گناہ ہے، تب بادشاہ کے دربار میں حاضر ہونے کی اسکو اجازت ملی، اس موقع پر راجہ نے ایک سو مہر، ہزار روپیہ، موتیوں کا ہار جس میں اسی موتی اور دو لعل تھے، اس کے علاوہ ایک مالا جس میں ایک لعل اور دو موتی تھے، اور ایک سونے کے گھوڑے کی مورت جو جواہرات سے لپی ہوئی تھی، پیش کی، بادشاہ نے نہ صرف ایک خلعت اور ایک گھوڑا عطا کیا، بلکہ مہابت خاں کے دو سپہ سالاروں میں ایک اس کو بھی مقرر کیا، دوسرا ارشد خاں تھا، مہابت خاں اس وقت کابل کا صوبہ دار بنا کر بھیجا گیا تھا، اور بنگش کو سر کرنے کے لئے مقرر ہوا تھا، کلیان کے متعلق اس سے زیادہ کچھ نہیں معلوم ہے۔

علی محمد خاں نے اپنی کتاب مراۃ احمدی میں ایک تیسرے لڑکے کا ذکر کیا ہے، اُس نے لکھا ہے کہ گوپی ناتھ ولد راجہ ٹوڈر مل سورت کے قریب کڑہی کے شہر میں امن قائم کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا، وہ اپنے اور دوسرے امرار جیسے راجہ سورج کے دستوں کے ساتھ مالوہ کے راستہ سے وہاں پہنچا اور ملک کے اس حصہ میں بدامنی کا خاتمہ کر دیا، اس سے زیادہ اُس کے متعلق بھی کچھ معلوم نہیں ہے،

ا - ع

اخبارِ علمیہ

علی گڈھ سے عربی میں پہلا پی ایچ ڈی

مسلم یونیورسٹی علی گڈھ نے عربی میں پی ایچ ڈی کی پہلی ڈگری سید محمد یوسف صاحب کو عطا کی ہے، یوسف صاحب دو سال سے علامہ عبدالعزیز المیمنی کے تحت ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے، اور اسی یونیورسٹی کے فرسٹ کلاس فرسٹ ام اے ہیں،

سید یوسف صاحب کے مقالہ کا موضوع "المھلب بن ابی صفرۃ" ہے، اور ٹائپ کے تین سو صفحات پر مشتمل ہے، المھلب اپنے وقت کا نامور ترین فوجی قائد تھا، جس نے تیرہ سال کی مسلسل جنگ کے بعد ۷۸ھ میں خوارج کے سب سے زیادہ مفرط فرقہ ازارقہ پر فیصلہ کن فتح حاصل کی، یہ مشہور فتح اور اس کے علاوہ میدانِ کارزار میں مہلب کے دیگر کارنامے تاریخی روایات میں محفوظ ہیں، لیکن ابھی تک المھلب کے صحیح مقام کا تعین نہیں کیا گیا، مورخین نے ہنوز اس بات کی کوشش نہیں کی کہ المھلب کے کارناموں کی اہمیت کا اندازہ لگائیں اور اس کے مکمل نظام جنگ اور تدبیر حرب کے مخصوص طریقوں کا مطالعہ کریں، اس مقالہ میں یہی کوشش کی گئی ہے کہ المھلب کے فوجی کارناموں کو اُن کے مناسب تاریخی ماحول اور وقتی حالات کے پس منظر میں پیش کیا جائے، اور یہ اندازہ لگایا جائے کہ عربوں کے فنِ حرب کی ترقی میں المھلب کا کیا حصہ ہے،

اسلامی تاریخ کے اصلی اور قدیم ماخذوں میں کافی مواد ملتا ہے، جس سے المھلب کی عسکری زندگی

کی مکمل داستان بنائی جاسکتی ہے، اور اس کی قیادت اور تدبیر جنگ کی امتیازی خصوصیات کا تنقیدی مطالعہ کیا جاسکتا ہے لیکن خالص تاریخی ماخذ المہلب کی زندگی کے دوسرے پہلوؤں پر روشنی ڈالنے سے قاصر ہیں، المہلب کے کارنامے صرف میدانِ کارزار تک محدود نہیں، اس کے ذاتی خصائل بالخصوص جود و سخا اتنی ہی شہرت رکھتے ہیں جتنی کہ اس کی فتوحات، اس کی نفاستِ طبع اور ادبی ذوق پر اس کے مقولے اور اس کی تحریریں گواہ ہیں، (جو بطور ضمیمہ مقالہ کے آخر میں شامل ہیں) اسی طرح اسکا شاعرانہ ذوق اور شاعر نوازی کا تذکرہ ایک علٰحدہ باب چاہتا ہے، ان سب امور کیلئے ادبی کتابوں اور معاصر شعراء کے دیوانوں کی ورق گردانی کرنی پڑتی ہے، اس مقالہ کی یہی سب سے بڑی خصوصیت ہے کہ اس میں تاریخی ماخذوں کے علاوہ ادبی مصادر سے پوری پوری مدد لی گئی ہے، اور جہاں کہیں بھی نثر میں خواہ نظم میں، المہلب کا حوالہ پایا جاتا ہے، اس کا تحقیقی مطالعہ کیا گیا ہے،

جہاں تک فنِ حرب کا تعلق ہے المہلب کا طرۂ امتیاز اس کی مطاولتہ اور مراوغہ کی پالیسی ہے، وہ جلد فیصل ہو جانے والی لڑائیوں کے بجائے طویل جنگ کو ترجیح دیتا تھا، صبر آزما معاصروں کے ذریعہ دشمن کی اقتصادی طاقت کو فنا کرنا اور مکائد و حیل سے مخالف جماعت میں تشتت و انتشار پیدا کرنا اس کا سب سے کارگر حربہ تھا، یہ طریقۂ جنگ اس زمانہ کے لئے ندرت رکھتا تھا، یہانتک کہ بہت سے لوگ اس کے سمجھنے سے بھی قاصر تھے، ازارقہ کے خلاف تیرہ سال کی مسلسل جنگ اس لحاظ سے غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے، اس جنگ میں المہلب کی کامیابی اس کے معاصرین کی ناکامی کے مقابلہ میں اور زیادہ نمایاں نظر آتی ہے اور اس کا مخصوص طریقۂ جنگ صاف واضح ہو جاتا ہے،

المہلب کی زندگی اس لحاظ سے بھی دلچسپ ہے کہ وہ پہلا عرب جنرل تھا، جس نے ۴۴ھ میں شمال مغرب سے ہندوستان پر حملہ کیا، المہلب کا ذکر رواۃ حدیث میں بھی ہے،

سید یوسف صاحب کے مقالہ کے تین ممتحنین تھے، جن کی رپورٹ سے اقتباسات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں :۔

۱۔ ڈاکٹر ڈی ایم ڈانلڈسن (ہنری مارٹن اسکول آف اسلامک اسٹڈیز)

" یہ مقالہ اہم ترین عربی ماخذوں سے ریسرچ کا ایک نہایت مکمل نمونہ ہے، یہ قابلِ تحسین صحت وصفائی کے ساتھ تیار کیا گیا ہے، یہ حد درجہ دلچسپ ہے، اس لئے کہ اس کا اندازِ بیان راست وصریح اور پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے "

۲۔ ڈاکٹر عظیم الدین احمد ام، اے، پی، ایچ ڈی (پٹنہ)

" مسٹر یوسف نے اس مقالہ کے ہیرو المہلب کو ہر ممکن نقطۂ نظر سے پیش کیا ہے، اور ساتھ ہی ایک ایسا پس منظر بھی فراہم کیا ہے، جس سے ہیرو کی تصویر اور زیادہ موثر اور فطرت کے مطابق نظر آتی ہے، اُنھوں نے بکھرے ہوئے مواد کو جمع کرنے اور اس کو ایک مکمل، دلچسپ اور پڑھنے کے قابل تصنیف کی صورت میں ڈھالنے کے لئے بڑی محنت اٹھائی ہے، اور جو مواد بھی اُن کو ملا اس کو بڑی ہنرمندی اور تنقیدی نظر سے جانچا ہے، جہاں کہیں اُنھوں نے مانے ہوئے علمار سے اختلاف کیا ہے، وہاں اپنے اختلاف کے وجوہ بیان کئے ہیں، جو اکثر صورتوں میں واجب التسلیم ہیں، اپنے بیان کو حدِ امکان تک صحیح اور مکمل بنانے کے لئے اُنھوں نے ایسی کتابوں کی بھی ورق گردانی کی ہے جن کا تاریخ سے کوئی تعلق نہیں، مثلاً عربی شعرار کے کلام کے مجموعے، مسٹر یوسف نے اسلامی تاریخ کے ایک قدیم، تاریک اور پُرفتن دور کے وقائع کو اس فن کے پیشرو حضرات کی بہ نسبت بہتر ترتیب کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے، اور بڑی حد تک اپنی کوشش میں کامیاب بھی ہوئے ہیں "

۳۔ مولانا عبدالعزیز المیمنی صدر ادارہ عربی مسلم یونیورسٹی :۔

" رسالہ میں مہلب کو محض ایک شریف عرب یا ایک آزمودہ کار جنرل اور قائدِ اکبر کی حیثیت

ہی میں پیش نہیں کیا گیا، بلکہ یہ اس کے جملہ مجلسی خصائص طبعی مکارم اور خداداد جواہر کا ایک ہمہ گیر خاکہ سامنے لا رکھتا ہے، جس میں تہلب کے دربار میں اس عہد کے نامی شاعر اور قبائلی وفود آتے ہیں اور اپنی منہ مانگی مرادیں پاکر پلٹ جاتے ہیں، یہ اور اسی قسم کی اور خوبیاں ہیں، جو اسلامی قائدین کے سوانح نگار بہت کم دکھاتے ہیں، جس سے غیروں کو اُن کی زندگی محض قتل و غارت کے مناظر کا مجموعہ نظر آتی ہے "

" سید یوسف صاحب نے مختلف دواوین شعرا و مجامع ادبیہ سے اس عہد کی تاریخ کے علمی ادبی اور تاریخی ریزے چن چن کر اُن کو تاریخی حقائق کی صف میں لا کھڑا کیا ہے، اور اس طرح موجودہ تاریخ کے بیانات کے تسلسل میں ان کو جہاں جہاں خلا نظر آیا اس کو اپنے من گھڑت سے نہیں بلکہ اپنی عرق ریزی اور ریزہ چینی سے نہایت سلیقہ کے ساتھ پُر کیا ہے "

" میں یونیورسٹی کو مبارکباد دیتا ہوں کہ اسکی چار دیواری میں علمی مواد کی کمی کے باوجود ایسا رسالہ تیار کیا گیا جو ہندوستانی بلکہ بیرونی یونیورسٹیوں کی تاریخ میں بھی مخصوص امتیاز کا حامل ہی،

زمین دوز شہر

لندن کا ایک محلہ جو گولہ باری سے تباہ ہو گیا تھا، اب اس میں ایک زمین دوز شہر ایک سو بیس فٹ کی گہرائی میں آباد کیا جا رہا ہے، جس میں ۳۵ ہزار آدمیوں کے رہنے کی گنجائش ہوگی، اور وہ گولوں اور گلا گھونٹنے والی گیس سے محفوظ رہیں گے، یہ شہر ان لوگوں کی حفاظت کے لئے مخصوص ہوگا، جن کی حفاظت خود سلطنت کی حفاظت خیال کیجاتی ہے، کیونکہ یہ لوگ یا تو خود اہمیت رکھتے ہیں یا اون کے کارنامے اہم ہیں، اس شہر میں دوکانیں، رسٹورن اور شفاخانے وغیرہ سب ہونگے، اور کئی ملین ٹن اینٹ اور پتھر اس نئے شہر کی تعمیر کے لئے زمین کے اندر سے نکالے گئے ہیں،

ادبیات

مقدمِ ماہِ صیام

از جناب یحیٰی اعظمی

صد شکر کہ رحمت کا مہینہ نظر آیا
مومن کے لئے وجہِ سکینہ نظر آیا

وہ ماہ ہوا جس میں درِ فیضِ ازل باز
انوارِ الٰہی کا خزینہ نظر آیا

بڑھتے ہوئے طوفانِ ضلالت میں جہاں کو
عرفان و ہدایت کا سفینہ نظر آیا

ظلمت کدۂ دہر کی تاریک فضا میں
ہر سمت تجلی کا قرینہ نظر آیا

خود چشمِ کواکب کا اشارہ ہے کہ یہ ماہ
ایام کے خاتم کا نگینہ نظر آیا

اذکار سے پُر نور عبادات سے معمور
ہر بندۂ اللہ کا سینہ نظر آیا

راتیں ہوئیں تسبیح و تراویح سے آباد
وہ ذوقِ عباداتِ شبینہ نظر آیا

ہے چشمِ تصور میں "قمِ اللیل" کا منظر
نظارۂ سرکارِ مدینہ نظر آیا

توحید کے میخانے ہیں یا صحنِ مساجد
عابد کے کفِ دست میں مینا نظر آیا

وارفتگیٔ شوق میں سجدوں پہ ہیں سجدے
پُر کیف عجب دورِ شبینہ نظر آیا

ہر سمت ہے پھیلی ہوئی مہتاب تجلی
ہر گوشہ تماشا گہِ سینا نظر آیا

حق یہ ہے کہ اس ماہ کا ہر لمحہ قدس
بامِ فلکِ قدس کا زینہ نظر آیا

صدقے میں ملی جس کے ہمیں دولتِ کونین
مژدہ کہ وہ پُر نور مہینہ نظر آیا

سجدہ گہِ افلاک

از جناب روش صدیقی

اتنا تو نہ ہونا تھا اے وحشتِ دل بیباک
میرا بھی گریباں چاک انکا بھی گریباں چاک

ہر پردۂ سازاس سے ہی شعلہ بہ پیراہن
خاموشیٔ الفت ہے وہ نغمۂ آتشناک

اک بربطِ بے نغمہ اک ساغرِ بے بادہ
جو دل نہیں بشکستہ جو آنکھ نہیں نمناک

معمورۂ امکاں میں جو کچھ ہے محبت ہے
کونین کی قیمت کیا ایثار خس و خاشاک

جو پائے محبت نے کھائی تھی جہاں ٹھوکر
وہ نقشِ قدم اب تک ہی سجدہ گہِ افلاک

خاکِ رہِ الفت ہے اک سرمۂ بینائش
اس خاک سے کرتے ہیں انجم بھی نگاہیں پاک

دیکھو تو روش بڑھکر کیا حضرتِ زاہد ہیں
یہ کون سبو لیکر بیٹھا ہے بزیرِ تاک

غزل

از جناب حسرت ترمذی بی اے ال ال بی

خضر سے راہ محبت میں مجھے کام نہ تھا
میں وہ آزاد ہوں جو بندۂ اوہام نہ تھا

انقلاب اور بھی تھے عشق میں حسرت کے سوا
کیا غم عشق کا ظالم کوئی انجام نہ تھا

دیدۂ جلوہ نگر کو ترے جلووں کیلئے
حرم و دیر و کلیسا سے کوئی کام نہ تھا

ہائے وہ درد جو دل سے نہ گیا جیتے جی
آہ وہ دل جسے اک لمحے کو آرام نہ تھا

انتہا یہ ہے کہ ہمکو نہ رہی اپنی خبر
ابتدا وہ تھی کہ اندیشۂ انجام نہ تھا

ہمکو وہ پاسِ وفا تھا کہ ترے غم کے سوا
عشق میں کوئی شریکِ دلِ ناکام نہ تھا

حسن کو اہلِ ہوس نے کیا رسوا کیا کیا
جلوۂ طور تماشائے سرِ بام نہ تھا

تمکو رسوائی حسرت تھی گوارا کیسے
عشق بدنام سے کیا حُسن بھی بدنام نہ تھا

مطبوعاتِ جدیدہ

سلطان محمود غزنوی، از جناب محمد حبیب صاحب بی اے (آکسن) پروفیسر تاریخ مسلم یونیورسٹی، ناشر ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد، حجم ۱۲۸ صفحے تقطیع چھوٹی، لکھائی چھپائی ٹائپ میں،

سلطان محمود غزنوی، اسلامی تاریخ میں دورِ شہنشاہیت کا بانی سمجھا گیا ہے، "سلطان" کا لقب پہلی مرتبہ اُسی نے اختیار کیا، پروفیسر محمد حبیب اسکی سیرت، کردار، اور کارناموں کے متعلق اپنے چند خاص نظریات رکھتے تھے، جن کو مدت ہوئی وہ اپنے مختلف مضامین میں پیش کر چکے تھے، اور اسی زمانہ میں ان خیالات پر مخالف و موافق مضامین نکل چکے تھے، پھر عرصہ ہوا اُنھوں نے انہی نظریات کی روشنی میں انگریزی زبان میں محمود پر ایک مستقل کتاب لکھی، اور اس پر بھی بعض اہلِ علم کی طرف سے مفصل تنقید اسی زمانہ میں شائع ہو چکی ہے، اب جناب سید جمیل حسین صاحب ایم، اے (حیدر آباد سول سروس) نے اس کتاب کو سلیس اردو زبان میں منتقل کیا ہے، جو ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کی طرف سے شائع ہوئی ہے، یہ کتاب چار بابوں میں تقسیم ہے، پہلے باب میں دسویں صدی عیسوی کی اسلامی دنیا پر نظر ڈالی ہے، جس میں حکومتوں کی سیاسی تقسیم، عالمِ اسلامی پر خلفاء کے ذہنی اقتدار، چھوٹی خاندانی حکومتیں، ان کی خانہ جنگیاں، اور خلفا سے اُن کے تعلقات، مسلمانوں کی مذہبی جماعتیں اور اُن کے اختلافات، اور مسلمانوں کے درمیان نسلی تفوق کے رجحانات کو تفصیل سے دکھایا ہے، دوسرا باب سلطان محمود کے عہدِ حکومت پر ہے، جس میں غزنوی سلطنت کی بناؤ تاسیس دکھا کر مشرقی و مغربی ملکوں پر محمود کے حملوں اور فتوحات کو یکے بعد دیگرے سلسلہ وار

بیان کیا ہے، اس سلسلہ میں ہندوستان پر محمود کے حملوں کا ذکر خاص طور پر آیا ہے، تیسرا باب محمود کے کارناموں کی نوعیت و اہمیت پر ہے، اس میں مصنف نے محمود کے متعلق اپنے ذاتی رجحانات و نظریات کو خاص طور پر بیان کیا ہے، اور اسی ضمن میں محمود کے دور کی تمدنی و علمی ترقیوں کا ذکر آیا ہے، مصنف کا خیال ہے کہ محمود ایران کی ادبی نشاۃ جدیدہ کا بانی ہے، اس کے عہد میں مذہبی سرگرمی تقریباً ناپید اور ایک باجبروت شاہنشاہی کی ہوس پیدا ہو چکی تھی، اس نئی روح سے ایک نئی تہذیب کے ارتقا میں مدد ملی، اور رزم و بزم دونوں میں نفاست و خوشنمائی کا ماحول پیدا ہوا، محمود ایران کی ادبی نشاۃ جدیدہ کا ایک عظیم الشان مربی بنا، علم و ادب کی سرپرستی کی، اور اس کی ترقی کے مواقع پیدا کئے، اس کے بعد اس کے حملوں اور فتوحات کے متعلق دکھایا ہے کہ اس کا مطمح نظر سراسر دنیاوی اور ایرانی تھا، اس نے اپنی سپہ گری کے جوہر سے دنیا کو حیرت میں ڈالنے والی فتوحات حاصل کیں، ہندوستان پر اس کے حملے حکومت قائم کرنے یا اسلام کی اشاعت کرنے کی غرض کے بجائے صرف تحصیل زر کے لئے تھے، غزنوی فوج مجاہدین پر مشتمل نہ تھی جو مذہب کی خاطر جہاد کے لئے آمادہ ہوئی ہو، بلکہ وہ ماہرین فن کی ایک تربیت یافتہ تنخواہ دار فوج تھی، جو ہندو اور مسلمان دونوں سے یکساں لڑنے کی عادی تھی، اس لئے محمود کے ہاتھوں ہندوستان کے مندروں کی بربادی خالص دنیاوی اغراض کے تحت عمل میں آئی، چوتھے باب میں غزنوی سلطنت کے زوال اور خاتمہ کو دکھایا گیا ہے، کہ محمود اپنی فتوحات سے جو کچھ حاصل کر سکا، اس کو قائم رکھنے کی صلاحیت نہ رکھتا تھا، اس کے آنکھیں بند کرتے ہی ناخلف مسعود کے ہاتھوں غزنوی شاہنشاہیت کا خاتمہ ہو گیا اور وہ ایک چھوٹی سی سلطنت بن کر رہ گئی، جس کو ابتدا ً سلجوقیوں نے برباد کیا، پھر چند صفحوں میں سلجوقیوں کے عروج دزوال کی طرف اشارہ کرنے کے بعد دکھایا ہے کہ بارہویں صدی کے وسط میں غزنوی سلطنت و سلجوقی شہنشاہیت دونوں کا خاتمہ ہو گیا، اور ان کی جگہ غور اور خوارزم کی حکومتوں نے لے لی اور

اسی پر اس کتاب کا خاتمہ کیا گیا ہے، سلطان محمود کے متعلق پروفیسر محمد حبیب کے مختلف تاریخی نظریات ورجحانات میں سے اگر بعض محلِ نظر ہیں تو بعض قرینِ صحت بھی ہیں، لیکن مصنف نے کہیں کہیں محمود کی ذات وکردار کے متعلق جو ناملائم، درشت، تلخ اور ایک غیر جانبدار مورخ کی شان سے فروتر لب ولہجہ اختیار کیا ہے، ہم اس کو اُن خوش عقیدہ مسلمان مورخین کے خوشگوار لب ولہجہ کا ردعمل قرار دے سکتے ہیں، جنھوں نے محمود کو سراپا راہِ خدا کے مقدس مجاہد اور صحابۂ کرام کے نقشِ قدم کے مخلص متبع کے لباس میں پیش کیا ہے، اس لئے اب مستقبل کا کوئی مورخ ہی اس افراط وتفریط کے درمیان کوئی راہ صواب پا سکتا ہے،

فتح مبین، مرتبہ جناب حاجی محمد موسیٰ خاں صاحب رئیس دتاولی، علی گڈھ، حجم ۲۹۳ صفحے، تقطیع ۲۲×۱۸/۸، لکھائی چھپائی اچھی، قیمت درج نہیں، پتہ دارالریاست دتاولی ضلع علی گڈھ،

مصنف نے تحریکِ خلافت کے زمانہ میں "اسلامی خلافت کا کارنامہ" کے نام سے ایک تصنیف شائع کی تھی، مصنف کے نزدیک خلافت سے مراد مذاہبِ عالم کی دعوتیں ہیں، جو اپنے اپنے وقتوں میں کرۂ ارض پر تہذیب وتمدن کی بانی رہیں، اور اُن کے مصلحانِ تہذیب اصطلاح میں نبی یا رسول کہے گئے، اسی لحاظ سے اسلامی حکومت سے مراد اسلام کا وہ "عظیم الشان ادارہ" ہے جس نے دنیا میں تہذیب وتمدن کی کبھی نہ بجھنے والی شمع روشن کی، اور جس کی مکمل عملی تصویر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک میں ملتی ہے، اسی مناسبت سے مصنف نے پہلی جلدوں میں آنحضرت صلعم کی سیرت پاک کے مختلف پہلو پیش کئے، اور زیر نظر حصہ میں جس کو "فتح مبین" سے موسوم کیا ہے، سوانح پاک کے بقیہ حصے درج کئے، اس جلد میں صلح حدیبیہ سے وصالِ نبویؐ تک کے حالات درج ہیں، اور مختلف ابواب میں سیرت پاک سے ہویدا ہونے والے مختلف تمدنی، تہذیبی واخلاقی آثار کو اپنے تبصروں کے ساتھ روشن کرکے دکھایا ہے، اس کا مطالعہ مسلمانوں کے لئے سودمند ہوگا،

عہد نبوی کا نظام تعلیم از جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب استاذ جامعہ عثمانیہ،

حجم ۲۰ صفحے، تقطیع ۲۲×۲۶، لکھائی چھپائی اچھی، قیمت ۸؍ ناشر ادارۂ ترقی تعلیم اسلامی، حیدر آباد دکن،

جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب، جامعہ عثمانیہ میں قانون بین الممالک کے استاذ ہیں، اور ہندوستان کے اُن چند ذی علم میں سے ہیں، جن کی طرف وسعتِ نظر، صحتِ تخیل، فکرِ صحیح اور ذوقِ تحقیق و جستجو کے لحاظ سے نگاہ اُٹھتی ہے، موصوف کی نظر عہد نبوی کے بین الاقوامی تعلقات پر خاص طور سے ہے، اور "وثائق نبویہ"، پر ایک ضخیم تصنیف شائع کرا چکے ہیں، وہ وقتاً فوقتاً مختلف عنوانوں سے ہند و بیرونِ ہند کے ممتاز رسائل میں اپنے نتائجِ فکر پیش کرتے اور معلومات میں اضافہ اور اہلِ علم سے خراجِ تحسین وصول کرتے رہے ہیں، معارف کے ناظرین بھی موصوف کے وقیع مقالات سے فائدہ اُٹھاتے رہے ہیں، زیر نظر مقالہ" عہد نبوی کا نظامِ تعلیم" بھی پہلی مرتبہ معارف ہی میں شائع ہوا تھا، اور ناظرین معارف کو جیسا کہ معلوم ہے، اس میں عہد نبوی کے نظامِ تعلیم پر تفصیل سے نگاہ ڈالی گئی ہے، اب اس کو خاص اہتمام سے ہاتھ کے بنے ہوئے کاغذ پر حیدر آباد کی علمی مجلس" ادارۂ ترقی تعلیم اسلامی" کی طرف سے رسالہ کی صورت میں شائع کیا گیا ہے، اہلِ علم اپنے ذوق کی تسکین کے لئے اس کو رسالہ کی اس شکل میں بھی منگا کر اپنے پاس رکھ سکتے ہیں،

عربی حبشی تعلقات، از جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب استاذ جامعہ عثمانیہ،

حجم ۲۴ صفحے، تقطیع ۲۲×۲۶، لکھائی چھپائی اچھی، قیمت ۸؍ ناشر ادارہ ترقی تعلیم اسلامی، حیدر آباد دکن،

یہ رسالہ بھی جناب ڈاکٹر حمید اللہ صاحب موصوف کا ایک مقالہ ہے، اور جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے اس میں عربی حبشی تعلقات پر نظر ڈالی گئی ہے، اور آخر میں ایک نو دریافت شدہ

نامۂ نبوی بنام نجاشی کو ضمیمہ کے طور پر منسلک کیا گیا ہے، جو ابھی جنوری ۱۹۴۰ئہ میں لندن کے رسالہ جے، آر، اے، ایس میں شائع ہوا تھا، اس نامۂ مبارک کا عکس بھی شائع کیا گیا ہے، یہ رسالہ بھی دبیز دستی کاغذ پر چھاپا گیا ہے،

دیوان جوشش مرتبہ قاضی عبد الودود صاحب تقطیع چھوٹی ضخامت مع مقدمہ ۳۰۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت عہ پتہ انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی:۔

محمد روشن جوشش عظیم آبادی میر اور مرزا کے دور کے صاحب دیوان اساتذہ میں تھے، لیکن ان کے کلام کو وہ شہرت نہ حاصل ہوئی جس کے وہ مستحق تھے، تذکروں میں بھی ان کے حالات بہت کم اور بہت مختصر ملتے ہیں، ان کا دیوان مدت ہوئی شائع ہوا تھا، لیکن اس میں صحت وغیرہ کا اہتمام نہ تھا، اب اردو زبان کے ممتاز خدمت گذار جناب قاضی عبد الودود صاحب بیرسٹر پٹنہ نے قلمی اور مطبوعہ نسخوں کی مدد سے بڑی محنت اور قابلیت سے یہ دیوان اڈٹ کیا ہے، دیوان کے شروع میں مرتب کے قلم سے ایک مبسوط مقدمہ ہے، جس میں مختلف تذکروں سے جوشش کے حالات نقل کرنے کے بعد خود مرتب نے بھی حالات لکھے ہیں، اور جوشش کے کلام پر نہایت مبسوط اور ناقدانہ تبصرہ کیا ہے، دیوان کی تصحیح اور کلام کے ہر جہتی تبصرے بلکہ تجزیہ و تحلیل میں صحت اور تبصرہ نگاری کا پورا حق ادا کیا گیا ہے، لیکن اختصار پسندی اور رمز و اشارات کی کثرت کی وجہ سے مقدمہ کا بڑا حصہ چیستاں بن گیا ہے، جس کو سمجھنے کے لئے بڑی دقت اٹھانی پڑتی ہے، اگر مرتب نے رمز و کنایات کے بجائے تحریر میں تھوڑی سی فیاضی سے کام لیا ہوتا، تو ناظرین دماغی الجھن اور زحمت دونوں سے بچ جاتے ہر شخص کو اتنی فرصت کہاں کہ وہ ہر ہر سطر بلکہ ہر ہر لفظ کے حوالے الٹ کر دیکھتا پھرے،

بت تراش، از جناب اشتیاق حسین قریشی، ناشر مکتبہ جامعہ دہلی، حجم ۴۴ صفحے،

تقطیع چھوٹی، لکھائی چھپائی اچھی، قیمت ۴؍

یہ ایک مختصر ڈراما ہے، جس میں ایک بت تراش کے تیار کئے ہوئے مرد و عورت کے دو مجسموں کے ذریعہ سے تمثیل کے طور پر ان میں جان ڈال کر اس سوال کو حل کیا گیا ہے کہ خالقِ کائنات تعالیٰ نے صرف اچھے رجحانات اور خیر ہی خیر کو کیوں نہ پیدا کیا، تمثیل اپنے رنگ میں دلچسپ ہی،

تاریخ کی تعلیم، مصنفہ ڈبلیو، ایم رابرٹن، ایم اے پرنسپل کرسچین ہائی اسکول کھرڑ، ضلع انبالہ، مترجمہ مسٹر ایس ایس عیسیٰ بی اے، ہائی اسکول کھرڑ، ضلع انبالہ، حجم ۵۶ صفحے تقطیع چھوٹی، خط باریک قیمت ۳؍ مصنف سے طلب کریں،

اس رسالہ میں ابتدائی مدرسوں میں چھوٹے بچوں کو فن تاریخ پڑھانے کے طریقے بتائے گئے ہیں، جس میں چند ابواب میں تاریخ پڑھانے کے مقاصد، معلّم کے اوصاف، پڑھانے کے طریقے اور اچھے سبق کے خصوصیات وغیرہ سمجھائے گئے ہیں، معلّمین کے لئے رسالہ کا مطالعہ مفید ہو سکتا ہے،

بچوں کا تحفہ، از جناب محمد شفیع الدین صاحب نیر، حجم ۸۰ صفحے، تقطیع چھوٹی، کاغذ بہتر، لکھائی چھپائی، اور سرورق بچوں کے مناسب، قیمت ۸؍ مصنف سے موڈرن ہائی اسکول نئی دہلی کے پتہ سے طلب کریں،

یہ بچوں کی دلچسپی کے لئے نظموں کا ایک گلدستہ تیار کیا گیا ہے، زبان آسان، عام فہم اور خیالات سادہ ہیں، نظمیں ایسے عنوانوں اور چیزوں پر لکھی گئی ہیں، جو بچوں کے گرد و پیش اور عموماً علم میں رہتی ہیں، بچے ان نظموں کو دلچسپی اور شوق سے پڑھیں گے،

دیس کی لیلا، از جناب میاں عبدالمجید صاحب بھٹی قیمت ۴؍ پتہ ہونہار بک ڈپو، ریلوے روڈ لاہور

یہ بھی بچوں کے لئے گیتوں کا ایک مجموعہ ہندی آمیز زبان میں تیار کیا گیا ہی نظموں کا موضوع حب وطن ہی بڑی عمر کے بچے جو ہندی زبان بھی کچھ سیکھ لیں، وہ اس سے زیادہ فائدہ اُٹھا سکتے ہیں، " ر"،

جلد ۵۰ ماہ شوال المکرم سنہ ۱۳۶۱ھ مطابق ماہ نومبر سنہ ۱۹۴۲ء عدد ۵

مضامین

شذرات

اس ماہ میں یوپی اور بہار کے دو ممتاز شاعرون اور ادیبون کی وفات کی اطلاع ملی، ان صفحات میں ان مرحومون کا ذکر اس لئے ہوتا ہے کہ ہماری آیندہ نسلوں کو اپنے پچھلوں کے نامِ نیک کی خبر رہے، اسلامی تاریخ کا ایک بڑا اہم کارنامہ وفیات یعنی ہزاروں لاکھوں بزرگون فاضلون، ادیبوں، اور ممتاز لوگوں کی وفات کی تاریخ کا تعین ہے، تاریخ کی اس صنف پر بہت سی کتابیں مدون ہوئین کیا عجب ہو کہ شذرات کا یہ حصہ ایک دن اس عہد کے وفیات کے اوراق بنجائیں،

وصل بلگرامی مرحوم و مغفور کے جاننے والوں اور ملنے والوں کو یہ سنکر بڑا قلق ہوگا کہ ۲۰ر رمضان المبارک ۱۳۶۱ھ کو رات کے وقت وہ ہمیشہ کے لئے ان سے جدا ہو گئے، مرحوم بڑے ملنسار متواضع، پُرمحبت، دوستون کے فداکار، اور وقت پر ہر ایک کے کام آنے والے تھے، وہ گو ہمیشہ سے دیندار اور پابند وضع لوگون میں تھے، جوانی میں حضرت مولانا رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ محدث گنگوہی سے ملتے تھے، اور اب ادھر دس بارہ برس سے حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی (متعنا اللہ تعالی بفیوضہ و برکاتہ) سے ان کی ارادت کا تعلق تھا، اور اب وہ زیادہ تر حضرت مولانا کی خدمت میں تھانہ بھون ہی میں خانقاہِ امدادیہ کے ایک حجرہ میں مقیم رہتے تھے، وہیں اسی حجرہ میں چند روز کے بخار میں اچانک وفات پائی، شیخ نے اپنے مرید کی نماز جنازہ پڑھائی، اور وہیں کے قبرستان میں تدفین ہوئی،

خاکسار سے مرحوم کے تعلقات بہت پرانے تھے، ۱۹۰۶ء میں میری تعلیم ختم ہوئی، اور وہ اس عمر میں تھے کہ عالمگیر کے نام ایک رسالہ نکال رہے تھے، ان سے بلگرام ہی کی مردم خیز زمین پر اسی زمانہ میں ملاقات ہوئی تھی، اس وقت وہ جوان شاعر اور ادیب تھے، اردو فارسی، قدرے عربی اور انگریزی جانتے تھے، پھر ان کو جب وہ ادھیڑ ہو چکے تھے، مولوی سبحان اللہ صاحب مرحوم رئیس گورکھپور کی سرپرستی میں گورکھپور میں دیکھا، اس کے بعد انھوں نے لکھنؤ پہنچ کر مرقع نام رسالہ جاری کیا جو چند سال جیتا رہا، اب آخر میں وہ زاہد گوشہ نشین ہو کر نظر آئے، اور اسی پر ان کے کارنامۂ حیات کا خاتمہ ہو گیا، اللہ تعالیٰ اس خلق و محبت کے مجسمہ کو اپنی محبت سے نوازے،

بہار میں نئی تعلیم بنگال کے قرب بلکہ ملحقہ صوبہ ہونے کی وجہ سے بہت پہلے پھیلی، وہاں کے مسلمان شرفاء کے جو نونہال ان میں سب سے زیادہ پھلے اور پھولے ان میں سید علی امام، حسن امام اور مظہر الحق وغیرہ کے نام ان کے بعض سیاسی اور قومی کارناموں کی وجہ سے بہت نمایاں ہیں، ان ہی کے معاصرین میں ایک نام مسٹر نصیر بیرسٹر کا ہے، پٹنہ کے قریب شرفاء کا ایک مشہور قصبہ نگرنہسہ ہے، وہ وہیں کے انصاری خاندان کے چشم و چراغ تھے، خاندان میں عربی و فارسی علوم کا چرچا تھا، ان کے دادا شاہ عبد العزیز صاحب دہلوی یا حضرت شاہ عبد الغنی صاحب مجددی کے شاگرد تھے، اور ان نفوس قدسیہ کے برکات کا خاصہ اثر اس مغربی تعلیم یافتہ کے ذہن و خیال پر تھا، افسوس کہ ستمبر ۱۹۴۲ء کے آخر میں اس دور کی یہ یادگار شخصیت بھی مٹ گئی،

۱۸۹۵ء میں جب خاکسار پہلی دفعہ دیہات سے نکل کر شہر (پٹنہ) میں آیا تو سب سے پہلے ان ہی کی کوٹھی پر جو مرادپور کی سڑک کے شمالی رخ پر تھی اس تعلق سے قیام ہوا تھا کہ میرے چھوٹے چچا مرحوم اس زمانہ

میں ان ہی کے ساتھ رہتے تھے، عمر میں پہلا اتفاق تھا، اس لئے ان کی ہر چیز مجھے عجیب معلوم ہوئی تھی، بہت گویا، بہت ہنس مکھ، ہر وقت خوش و بشاش، شعر و سخن کے دلدادہ علمی صحبتوں کے شائق، بزرگوں کا ادب، دین کا پاس، اور مذہب کا جوش، کوٹ پتلون اور ہیٹ کے اس پتلے میں عجیب رنگین کیفیت پیدا کر دیتا تھا،

سنہ ۱۹۰۰ء میں ندوۃ العلماء کا ساتواں سالانہ جلسہ پٹنہ عظیم آباد میں تھا، جو قدیم تعلیم کے ساتھ جدید تعلیم کا بھی مرکز تھا، اجلاس میں علمائے کرام اور مشائخ عظام کے پہلو بہ پہلو جسٹس مولوی سید شرف الدین مرحوم کی سرکردگی میں ان نوجوان بیرسٹروں کا جھرمٹ بھی تھا، اور شاید یہ پہلا دن تھا جب مقدس شملے اور ہیٹ یکجا نظر آئے تھے، اسی اثنا میں جوش و حمیت کا یہ پتلا پورے انگریزی ڈریس میں اسٹیج پر آیا، اور وہ دلدوز تقریر کی کہ میری ان آنکھوں نے بڑے بڑے مقدس علماء اور مشائخ کو دہاڑیں مار مار کر روتے دیکھا، مقرر کے جوش کا یہ عالم تھا کہ اس نے اپنا قیمتی کوٹ، گھڑی، انگوٹھی سب نذر کر دی، جن لوگوں نے اس منظر کو دیکھا تھا وہ سماں آج تک نہیں بھولے ہیں،

یا تو میں نے ان کو ان انگریزی کپڑوں اور انگریزی شکل و صورت میں دیکھا یا پھر ابھی دس پندرہ برس ہوئے ریش سپید، مخملی ٹوپی اور اچکن اور کرتے میں دیکھا اور سنا کہ اب یہ عالم ہے کہ تسبیح و سجادہ سے سروکار ہے، مرحوم کی دوسری شادی نیورہ میں ہوئی تھی، چند سال ہوئے کہ وہاں اس سے بھی بڑھکر محو استغراق پایا، مجھ سے عزیزانہ برتاؤ تھا، جوانی میں میلاد کا پُرشوق رسالہ لکھا تھا، اور پیری میں شاعری پر ایک اردو مثنوی لکھی جو خاکسار کے مقدمہ کے ساتھ مطبع معارف میں چھپی تھی،

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کو اپنی مغفرت سے سرفراز کرے، انکے پوری حالات نقوش سلیمانی کے آخر میں انکی مثنوی کے ضمیمہ میں لکھ دیئے گئے ہیں،

مقالات

قرآن اور علاجِ خوف[1]

از

ڈاکٹر میر ولی الدین ایم اے پی ایچ ڈی (لندن) بیرسٹرایٹ لا استاذ فلسفہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

"اس مختصر مقالہ مین مین نے ایک خونخوار جذبہ سے نجات کے چند نفسیاتی اصول پر روشنی ڈالی ہو جو اول سے آخر تک قرآن کریم سے ماخوذ ہین، خوف سے میری مراد ماسوائے اللہ کا خوف ہے، مین خشیۃ اللہ کو کوئی قابلِ علاج چیز نہین سمجھتا، معاذ اللہ یہ تو مین مقصود ہے، اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ العُلَمَاءُ کے اصول کو مین نے اختصار کے ساتھ پیش کیا ہو اور تفصیلات کو ترک کر دیا ہے"

دوروزہ عمر پر زخوف و خطر است — از غصہ غذائے خلق خونِ جگر است
آسودہ دلی ز بعد مردن ہم نیست — زیرا کہ خطرہ دران طرف بیشتر است
(ظہیر فاریابی)

انسان کی دوروزہ زندگی خوف و خطر سے بھری نظر آتی ہو اسکے قلب پر اس خونخوار جذبہ کا پورا تسلط دکھائی دیتا ہو جب وہ بستر سے اٹھتا ہے تو لرزان و ترسان اٹھتا ہو اور تمام دن کے غم و غصہ کے بعد جب وہ پھر بستر کی طرف لوٹتا ہے، تو بھی خائف و ہراسان ہوتا ہو! وہ ڈرتا کس چیز سے ہو؟ کسی کو تو بیماری کا خوف ہو کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ بیمار ہو جائے اور دنیوی کامیابی کی ساری توقعات مٹی مین مل جائین جب کسی عزیز یا دوست کی بیماری کی خبر سن لیتا ہے

---

[1] یہ مقالہ موتمر علوم اسلامیہ جامعہ عثمانیہ مین پڑھا گیا،

تو بیچین و پریشان ہوجاتا ہے، ڈرتا ہے کہ کہیں مر نہ جائے، کسی کو خوف ہے کہ وہ ساری دولت کھو کر فقر و فاقہ میں مبتلا نہ ہوجائے، ضعف و ذلت کا شکار نہ ہوجائے، کسی کو اپنی ملازمت کی طرف سے خطرہ ہے، وہ حالات کو تشفی بخش نہیں پاتا، ڈرتا ہے کہ کہیں بہت جلد اس کو بے روزگاروں کی صفوں میں شریک ہونا نہ پڑے، ٹکڑوں کو محتاج نہ ہوجائے، رزق کا دروازہ بند نہ ہوجائے، کوئی اپنی ذمہ داریوں سے گھبرا رہا ہے، یہ ناقابلِ برداشت نظر آ رہی ہیں، اور وہ محسوس کر رہا ہے کہ اس کی قوتیں زائل ہو رہی ہیں، اس کا دل بیٹھا جا رہا ہے، اور وہ اپنے بلند مقام سے گر رہا ہے، کوئی ہے کہ اپنے ہم جنسوں سے ملنے سے گھبرا رہا ہے، وہ ان سے گفتگو نہیں کر سکتا، خوف سے اس کی زبان سوکھی جا رہی ہے، اور پسینوں میں ڈوب رہا ہے، کوئی خوف زدہ ہے لیکن نہیں جانتا کہ کس چیز سے خوف زدہ ہے، اس کو اپنا مستقبل تاریک نظر آ رہا ہے، خطرہ کا وہ تعین نہیں کر سکتا، لیکن خوف کی لہریں اس کے قلب میں اٹھ رہی ہیں، اور وہ بزدلی کی موت مر رہا ہے، الغرض خوف کا جذبہ عالمگیر ہے، ہر شخص اس کا شکار ہے، کون ہے جس کو فکر نہیں، غم نہیں، خوف نہیں، شیخ عماد الدین فضل اللہ نے جو بات غم کے متعلق کہی ہے، وہ خوف کے متعلق بھی صحیح معلوم ہوتی ہے، اور نفسیاتی طور پر غم نتیجہ ہے خوف کا:

غم را ز من و مرا گریز از غم نیست   یارانِ قدیم را شکست از ہم نیست
غم خو بمن کرد و من خوے بغم!   ہمچون من و غم دو یار در عالم نیست

کیا خوف سے نجات بھی ممکن ہے؟ کیا اس ظالم جذبہ کی مرد افگن قوت کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے، اور اس پر فتح حاصل کی جا سکتی ہے؟ کیا زندگی کے چند روز طمانیتِ خاطر اور بے دلی کے ساتھ بسر کئے جا سکتے ہیں؟ علمائے نفسیات نے اس کا کیا علاج تجویز کیا ہے؟ حکمانے کائنات کی کنہ و حقیقت پر غور کرنے کے بعد کیا اس کو خوفناک اور بے درد و بے رحم قوتوں کا نتیجہ قرار دیا ہے؟ کیا کائنات انسان کے لئے ایک صلیب کے مانند ہے، جس پر بالآخر اس کو جان دینا ہے، خواہ پامردی اور ہمت کے ساتھ، یا نامردی اور بزدلی کے ساتھ لرزاں و ترساں؟ قرآن کریم خوف سے کس حد تک نجات دیتا ہے؟

لاتخافوھم وخافون ان کنتم مؤمنین (پ ۴ ع ۹)

کے کیا معنی ہین؟ کیا کوئی مخلوق و مرہوب شے حقیقت مین نافع و ضار ہوسکتی ہے، ؟ اگر نہین تو پھر خوف کیون؟ کیا یہ وہم کا نتیجہ نہین، باطل علم کی پیداوار نہین؟ کیا اس سے نجاتِ علم کی تصحیح سو ہوسکتی ہے، اختصار کے ساتھ بعض انہی اعتبارات پر یہان بحث کرنی مقصود ہے،

قرآنِ کریم کی تعلیم کی رو سے خوف سو نجات اور ان زنجیرون سے رہائی جن سے خوف نے ہماری گردنین باندھ رکھی ہین، دو طریقون سے ہوسکتی ہے، ایک طریقہ ذہنی ہے، اور دوسرا خارجی پہلا طریقہ علم کی تصحیح پر مشتمل ہی، اور دوسرا علم صحیح کے استعمال پر،

(۱) **علم کی تصحیح**:- خوف سے رستگاری حاصل کرنے کے لئے تمھین سب سے پہلے اپنے مابعد الطبیعیاتی مسلمات کا جائزہ لینا چاہیئے، مذہب کی زبان مین "یہ عقائد" کہلاتے ہین، ان کو عقل سے ثابت کرنے کی فلسفہ مین کوشش کیجاتی ہے، اور مذہب مین ان پر محض "ایمان" لایا جاتا ہی اور ورأ طورِ عقل سمجھا جاتا ہے لیکن یہ خلافِ تجربہ اور خلافِ وجدان نہین ہوتے، یہ مذہبی زندگی کے وہبی جذباتی اور حسی میلانات کی گہرائیون مین اپنی جڑین جمائے ہوئے ہوتے ہین، تجربہ ان کی تائید کرتا ہے، وجدان ان کو اپنے ذوق کے مطابق پاتا ہے، عقل ان کی تردید نہین کرسکتی،

ایسا پہلا عقیدہ جس کو مان لینے کے بعد خوف سے قطعًا رہائی مل جاتی ہے، حق تعالیٰ کا رحیم اور حکیم ہونا ہے، فلسفیانہ الفاظ مین یون سمجھو کہ کائنات تمھاری دشمن نہین دوست ہے، تم روحانی کائنات مین زندگی بسر کر رہے ہو، روحانی قوانین کی تم پر حکمرانی ہے یہ قوانین کورانہ نہین، ان کی ایک غایت اور مقصد ہے، اگر تم ان کی نوعیت کو سمجھ کر ان کے ساتھ توافق پیدا کروگے تو تم ان کو اپنا رفیقِ کار پاؤگے اور نتیجہ طمانیت اور تسکینِ قلبی ہوگا، ! اگر تم نادانی اور جہل سے ان کی خلاف ورزی کروگے، تو نقصان تمھارا ہی ہوگا، خوف و غم مین مبتلا ہوگے، حزن و یاس سے نجات نہین ملے گی، اور اس کا باعث خود

تمہارا جہل ہوگا، اور جہل سے پیدا شدہ غلط عمل، یقین و ایمان کی شاہانہ قوت سے قطعی طور پر مان لو کہ دنیا اچھی چیز ہے، کیونکہ اس کا مبدأ خیر ہے، یہ مبدأ حق تعالیٰ ہیں، جو حکیم بھی ہیں اور رحیم بھی! حق تعالیٰ خالقِ کائنات ہیں، جان کر کائنات کو پیدا کیا ہے، وہ جو کچھ کرتے ہیں، حق ہی بجا ہے، سراسر حکمت سے مملو ہے، باطل کا وہاں کوئی شائبہ نہیں، مَاصنع اللّٰہُ فہوخیر، ع

زنیکو ہر چہ صادر گشت نیکو است!

جب تمہارا یہ عقیدہ راسخ ہو جائے گا تو جہتِ غیر تم پر مبرہن ہو جائیگی، خیر کا جلوہ تمہیں ہر طرف نظر آنے لگے گا، کمالات پر تمہاری نظر جائیگی، دل میں اور نظر میں، بصر میں اور بصیرت میں حق جلوہ افروز ہوگا، یعنی تمہاری طبیعت اور تمہاری فطرت بدل جائیگی، وہ عیب جو اور عیب بین نظر باقی نہ رہے گی، وہ ذہنیت باقی نہیں رہے گی، جو ہر جگہ نقص کی تلاش کرتی ہے، اور اس پر اعتراض کرتی ہے، مستقبل کو خوف کی نگاہ سے دیکھتی ہے، اور واقعات کے وقوع کے پہلے ہی اُن پر شر ہونے کا حکم لگاتی ہے، اور وہی بھوتوں سے لرزتی اور کانپتی ہے!

ایمان کی آنکھ سے دیکھو اور یقین کرنے والے قلب کی باتوں پر غور کرو کہ حق تعالیٰ رحیم ہیں کانَ بالمؤمنین رحیما ان کا قول ہے، وہ مومن پر رحیم ہیں، وہ اس کے دوست ہیں، مددگار ہیں، مولیٰ ہیں نصیر ہیں، واللّٰہُ ولی الذین آمنوا (پ ۳ ع ۲) جب حق تعالیٰ مومن کے ولی ہیں، اس پر رحیم ہیں، تو پھر اس کو کس چیز سے خوف ہو سکتا ہے، ؟ حق تعالیٰ کو اپنا ولی جان کر وہ کس چیز سے ڈر سکتا ہے؟ وہ تو حق تعالیٰ کے زیر پرورش ہو جاتا ہے، اور حق تعالیٰ اس کے ساتھ بشانِ رحمت پیش آتے ہیں، اس کے تمام معاملات کے کفیل ہوتے ہیں، وکیل ہوتے ہیں، اجب یہ ادراک مومن کے قلب میں قوی ہو جاتا ہے، تو اب وہ بہ یک جست خوف و حزن سے آزاد ہو جاتا ہے، اور لاخوفٌ علیھم ولا ھم یحزنون کا مصداق بن جاتا ہے!

خوف کے وقت حق تعالیٰ کے رحیم و حکیم ہونے پر غور کرو، مضطر قلب کو، پریشان دماغ کو، معطل حواس کو کچھ دیر کے لئے اس نقطہ پر مرکوز کرو، یہی وہ نقطہ ہے جو انوار کا منبع ہے، قوتوں کا مرکز ہے، توانائیوں کا مبدء ہے، اسی پر نظر جما کر تم خوف سے نجات حاصل کروگے، تمہارا ضعف دور ہوگا، حزن رفع ہوگا، سکون حاصل ہوگا، سرور حاصل ہوگا، طمانیت و تسکین قلبی نصیب ہوگی،

جب حق تعالیٰ حکیم و رحیم ہیں اور وہی جہاندار ہیں، تو ظاہر ہے کہ ع

جہاندار داند جہان داشتن

اب مجھے کسی تجربہ سے خوف زدہ ہونے کی کیا ضرورت ہے، ع

ہرچہ آن خسرو کند شیرین بود!

ہر واقعہ کی تخلیق اس ہمہ خیر قوت سے ہو رہی ہے، جو حکیم مطلق بھی ہے، اور رحیم و کریم مطلق بھی!؟ اب زندگی کا کوئی واقعہ میرے لئے مضر نہیں ہوسکتا، وہ بحیثیت مجموعی میرے لئے مفید ہے، خیر برتر کے حصول کا ذریعہ ہے، یہ میرا جہل ہے کہ باوجود حق تعالیٰ کو رحیم اور ولی مان کر پھر یہ خیال کرتا ہوں کہ وہ مجھے نقصان پہونچانا چاہتے ہیں، درپے آزار ہیں، اجب تھوڑے سے غور و فکر کے بعد میری سمجھ میں یہ بات آگئی، کہ حق تعالیٰ رحیم ہیں اور میرے حال کے علیم، تو جمعیت تامہ مجھے نصیب ہوتی ہے، اور خوف بالکل رفع ہوجاتا ہے، !

دوسرا اصول جس کے مان لینے کے بعد خوف قطعی طور پر دور ہوجاتا ہے، حق تعالیٰ کی معیت کا عقیدہ ہے، حق تعالیٰ ہمارے ساتھ ہیں، جہاں کہیں ہم ہوں، وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ، (پ ۲۷، ع ۱) جب مجھے اس امر کا تحقق ہوجاتا ہے کہ حق تعالیٰ ہمیشہ میرے ساتھ ہیں، مجھ سے بہت قریب ہیں، "اقرب" ہیں، میری حفاظت فرما رہے ہیں، ان کی معیت کی وجہ سے میں تمام شر و گزند سے محفوظ ہوں، جہاں بھی ہوں محفوظ ہوں، ان کے حفظ و امان میں ہوں، تو پھر خوف میرے قلب سے بالکل دور ہوجاتا ہے، اور سرور و اطمینان، بلکہ ایک ذوق و مستی پیدا ہوجاتی ہے،!

در ہجر تو بودہ اندوہ و آزارم　　از وصل تو رفت ہستی و پندارم!

شادی آمد و نصیبِ جانم شد　　اکنون جان و تن خویش را بر آرادم (حبت)

جب بھی خوف کے حالات پیدا ہوں، واقعات خطرناک نظر آئیں، غم کے بادل قلب پر چھا ئیگیں تو ہمیں اس امر کا احساس کرنا چاہئے، کہ حق تعالیٰ ہمارے ساتھ ہیں، وہ رحیم ہیں، قادر مطلق ہیں، ان کی معیت کی وجہ سے مجھے علوے تمکین حاصل ہے" انتم الاعلون واللہ معکم کا مصداق ہوں، ان کو رکھ کر مجھے کس چیز سے نقصان پہونچ سکتا ہے، ان کی معیت کی وجہ سے میں ہر شئے پر غالب ہوں، ہر شئے سے بلند ہوں، ان کو رکھ کر مجھے کسی شئے کی نہ خواہش ہے، اور نہ اس کے نہ ملنے کا غم، جب مجھے کسی چیز کی خواہش ہی نہ ہو تو پھر شکستِ خواہش کا بھی احتمال نہیں، اور اس کے نتیجہ غم و خوف سے بھی آزاد ہوں!

لیکن غم و مصیبت و خوف کی حالت میں حق تعالیٰ کی معیت کا احساس اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب ہم راحت اور آسودگی، فراغت و اطمینان کی حالت میں بھی حق تعالیٰ کی یافت و شہود سے غافل نہ رہے ہوں، ان کی یاد سے ذہول نہ رہا ہو، اور کسی عارف کے یہ الفاظ ہمارے پیش نظر رہے ہوں:

تشنۂ او میر گر تو زندہ　　خاکِ آن در باش گر تو بندۂ

ذرۂ دردِ خدا در دل ترا　　بہتر از ہر دو جہاں حاصل ترا

جب ہمارے دل میں حق تعالیٰ کا درد ہو، محبت ہو، ان کی معبودیت و ربوبیت کا اقرار ہو، ذلت کا اظہار ان ہی کے سامنے ہو، ذل و افتقار کی نسبت ان ہی کے ساتھ وابستہ ہو تو پھر خوف اور پریشانی کے وقت ہمیں ان کی معیت کا شدید احساس ہوتا ہے، ہم محسوس کرتے ہیں، کہ وہ ہمارے ساتھ ہی تو ہیں، مونس ہیں، غمخوار ہیں، نصیر ہیں، وکیل ہیں، اس طرح ہمارے قلب کی حفاظت ہو جاتی ہے، سکینت و طمانیت پیدا ہوتی ہے، اور خارجی حالات میں بھی خوشگوار تغیر پیدا ہو جاتا ہے، اور ہم تمام مصائب سے محفوظ ہو جاتے ہیں، اور حزن سے خوف سے رہائی مل جاتی ہے،!

اگر تم خوف سے بالکلیۃ رہائی کے خواہان ہو، اس کی بیخ و بنیاد کو صحن دل سے اکھاڑ کر پھینک دینا چاہتے ہو، "جمعیت حقیقیۃ" کے حصول کے خواہشمند ہو، تو خود شناس بنو، عرفان نفس حاصل کرو، اپنی حقیقت سے آگاہ ہو جاؤ، اس عرفان کا آلہ محض عقل نظری نہین، اس کے لئے اس عقل کی ضرورت ہے جو بقولِ اقبال "ادب خوردۂ دل" ہے، عقلِ نظری (قیاساتِ عقلِ یونانی) تمھین خود شناسی مین زیادہ مدد نہین دیسکتی، یہ زیادہ تر اوہام باطل کا نقشہ تمھاری نگاہون کے سامنے پیش کرتی، اور پھر اسکو بگاڑتی رہتی ہے، یہی اس کا محبوب مشغلہ ہے، یہ تمھین لذتِ حضور سے محروم رکھتی ہے، کیونکہ خود اسکی تقدیر مین حضور نہین"؛

انجامِ خرد ہے بے حضوری ہے فلسفہ زندگی سے دوری!

(اقبال)

تمھین اس جگہ اقبال کی نصیحت پر عمل کرنا چاہئے، جو "پیر روم" کی ہدایت کے مطابق تم سو کہ رہی ہین

عقل بہم رسان کہ ادب خوردۂ دل است

یہ عقل تمھین اس وقت حاصل ہو گی، جب شیخ بو علی سینا کی تحقیقات سے صرف نظر کر کے "سخن محمدی" سے دل بستگی پیدا کرو:

دل در سخنِ محمدی بند اے پورِ علی ز بو علی چند

(حکیم خاقانی در تحفۃ العراقین)

اب تمھین اس عقل کے ذریعہ جو نورِ وحی کی ہدایت و رہبری مین قدم اٹھا رہی ہو، اپنی ذات کی معرفت حاصل کرنی چاہئے، اس معرفت کے حصول کے بعد تم کو اپنی "عبدیت" کا علم ہو جائے گا، کہ تم ذات و ماہیت کے لحاظ سے معلوم ہو، خارجاً مخلوق ہو، غیر ذاتِ حق ہو، حق تعالیٰ تمھارے ظاہر و باطن، اول و آخر ہین، تم کو محیط ہین، تمھارے ساتھ ہین، تم سے قریب و اقرب ہین، تم حق تعالیٰ ہی کے

وجود سے موجود ہو، ان ہی کی حیات سے زندہ ہو، ان ہی کے علم سے جانتے ہو، ان ہی کی قدرت وارادے سے قدرت وارادہ کا استعمال کرتے ہو، وجود اور تمام صفاتِ وجودیہ تمھارے پاس امانت ہیں، یہ تمھارے لئے اصالۃً نہیں امانۃً ہیں، تم فقیر ہو اور امین، امانت کا استعمال جب کائنات کے مقابلہ میں کرتے ہو، تو خلیفۃ اللہ کہلاتے ہو، اور جب امانت کا استعمال حق تعالیٰ کے مقابلہ میں کرتے ہو، تو ولی اللہ کہلاتے ہو، یہی چار اعتبارات ہیں عبداللہ کے، فقر، امانت، خلافت، ولایت، عبداللہ کے پاس اللہ ہیں، ان کی ہویت وانیت ہے، صفات وافعال ہیں، ملک وحکومت ہیں، عبداللہ کا قیام ذات اللہ میں ہوتا ہے، ذات اللہ میں خوف کا کیا اعتبار ہو سکتا ہے، وہ تو سرورِ محض ہے، اس لئے عبد بھی اللہ کی جہت سے اپنے اندر ناقابل بیان سرور محسوس کرتا ہے، طمانیتِ محض و ذوقِ خالص کا مخزن بن جاتا ہے، کیا خوب کہا ہے کسی عارف تام المعرفت نے ؎

چون بدانستی کہ ظلِ کیستی فارغی گر مُردی وگر زیستی
قطرۂ نوری سراپا نور باش بگذر از غم دائماً مسرور باش (رومی)

انسان اپنی اس حقیقی جہت کو فراموش کرکے خوف وحزن میں مبتلا ہوتا ہے، یا پھر خوف وحزن اس کے قلب پر محیط اس لئے ہیں، کہ وہ سرے سے اپنی حقیقت سے آگاہ ہی نہیں، اس کے ہر درد وغم، ہر خوف وہراس کا علاج خود اس کے ہاتھ میں ہے، اور وہ اس سے جاہل! اس سے زیادہ محرومی کیا ہو سکتی ؟!

یک سبد پُر نان ترا فرقِ سر تو ہمی جوئی لب نان دربدر!
تا بزانوے میانِ قعرِ آب وز عطش وز جوع گشتستی خراب (رومی)

(۲) علم صحیح کا استعمال: جب تم کو اپنی حقیقت کا عرفان حاصل ہو گیا، جب تم نے یہ جان لیا کہ حق تعالیٰ مومن کے ساتھ ہیں، اس سے قریب اور اقرب ہیں، اس کے ظاہر و باطن ہیں، جب تم کو یہ یقین ہو گیا

کہ حق تعالیٰ مومن کے ولی ہین، مولیٰ و نصیر ہین، اس پر رحیم ہین، تو اب خوف کے وقت اپنے ایمان کی قوت سے کام لو، جرأت کے ساتھ کہو کہ کائنات کی کوئی چیز تم کو خوف زدہ نہین کر سکتی، اپنے خوف زدہ نفس کو مخاطب کرکے کہو، :

اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ وَیُخَوِّفُوْنَکَ	کیا اللہ اپنے بندے کے لئے کافی نہین؟
بِالَّذِیْنَ مِنْ دُوْنِہٖ	کیا تجھ کو یہ لوگ اُن سے ڈراتے ہین جو
(پ ۲۴ ع ۱)	خدا کے ماسوا ہین، ؟ (ڈرمت)
اِنَّمَا ذٰلِکُمُ الشَّیْطَانُ یُخَوِّفُ اَوْلِیَآءَہٗ	یہ جو ہے سو شیطان ہے، کہ اپنے دوستون
فَلَا تَخَافُوْھُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ کُنْتُمْ	سے ڈراتا ہے، سو تم اُن سے مت ڈرنا اور
مُؤْمِنِیْنَ، (پ ۴ ع ۹)	اور مجھ ہی سے ڈرنا، اگر تم مومن ہو،

ہمین اپنے تحت الشعور نفس کے ساتھ بچّون کا سا برتاؤ کرنا چاہئے، دیکھو بچہ اندھیری رات مین جاگ پڑتا ہے، اور ڈر کر رونے لگتا ہے، تم اس سے کہتے ہو "ڈرومت یہان کوئی چیز ایسی نہین جس سے تم کو ڈر ہو" خوف کی چیزین صرف تمھارے خیال مین ہین، کمرے مین نہین" اس طرح خوف کی نفی کرنے کے بعد تمھین ان چیزون کا اثبات کرنا چاہئے، جو سچ ہین، مثلاً تم کہوگے" مین تمھارے ساتھ ہون، تمھارے بازو ہی مین تو ہون، کیا مجال کہ کوئی چیز تم کو چھو سکے" اس طرح اطمینان دلانے کے بعد کہ تم پاس ہی ہو، اور اس کو تمھاری قوت پر یہ یقین ہونے کی وجہ سے کہ تم اس کی حفاظت کرنے کے قابل ہو، بچہ پھر بے فکری کی نیند سو رہتا ہے، !

یہی طریقہ تم کو اپنے تحت شعوری نفس کے ساتھ استعمال کرنا چاہئے، پہلے خوف کے اسباب کی نفی کرنی چاہئے، جرأت و ہمت کے ساتھ اس کو یقین دلانا چاہئے، کہ ساری دنیا مین خدا کے سوا تمھین کوئی چیز ڈرا نہین سکتی، تم جانتے ہو کہ یہ شیخی نہین، واقعہ ہے، حقیقت کے عین مطابق ہے، مومن جس پر حق تعالیٰ

رحیم ہین جس کے ساتھ وہ ہین جس کی نصرت کا وہ اپنے اوپر حق سمجھتے ہین، حقاً علینا نصر المومنین جس کو وہ ستر ماؤن سے زیادہ شفیق اور مہربان ہین، ایسا مومن کائنات مین سوائے حق تعالیٰ کے کس چیز سے ڈر سکتا ہے، اور ڈر کر مومن رہ کیسے سکتا ہے؟ دیکھو ساری اشیا مخلوق ہین، مربوب ہین، محکوم ہین مملوک ہین، جب تک خالق و حاکم و مالک رب نہ چاہے، یہ ہمین نقصان کیسے پہونچا سکتی ہین؟ حکم اللہ ہی کا چلتا ہے، الحکم للہ متصرف فی الامور حق تعالیٰ ہی ہین، ان ہی کے قبضۂ قدرت مین تمام جاندارون کی پیشانی کے بال ہین، مامن دابۃ الا ھو آخذ بناصیتھا، ڈرنا ہمین ان ہی کے جلال سے چاہئے، نافع وہ ہین، اور ضار وہ، معزوہ ہین، اور مذل وہ، اور سارا عالم فقیر اور محتاج، نہ نفع کی قوت رکھتا ہے، نہ ضرر کی، اسی لئے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

وَلَوْ جَهَدَ الْعِبَادُ اَنْ يَنْفَعُوْكَ بِشَيْئٍ لَمْ يَقْضِهِ اللّٰهُ لَكَ لَمْ يَقْدِرُوْا عَلَيْهِ

وَلَوْ جَهَدَ الْعِبَادُ اَنْ يَضُرُّوْكَ بِشَيْئٍ لَمْ يَقْضِهِ اللّٰهُ عَلَيْكَ لَمْ يَقْدِرُوْا[۱]

"اگر سب بندے مل کر کوشش کرین کہ تجھے اس چیز سے نفع پہنچائین، جو اللہ نے تیرے لئے مقدر نہین کی تو وہ ایسا کرنے کی قدرت نہ پائین گے، اور اگر سب بندے مل کر تجھے کسی چیز سے ضرر پہنچانے کی کوشش کرین جو اللہ نے تیرے لئے مقدر نہین کی، تو وہ اس پر قدرت نہ پائین گے"

اس صداقت پر پورا یقین رکھ کر اپنے نفس سے کہو کہ تجھے قطعاً کسی چیز سے ڈرنا نہین چاہئے! اور زندگی کا یہ عجیب قانون ہے کہ جون ہی خوف قلب سے دور ہوا، اب دنیا کی کوئی چیز ہمین گزند نہین پہنچا سکتی، حضرت دانیال کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انھین شیرون کے غار مین ڈال دیا گیا لیکن

---

[۱] یہ اس حدیث کا ایک حصہ ہی، جو حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہی، اور جس کو حضرت غوث الاعظم شیخ عبد القادر جیلانی فتوح الغیب مقالہ ۴۲ مین پیش فرماتے ہین اور تاکید کرتے ہین کہ ہر مومن کو چاہئے کہ اس حدیث کی اپنی دل مین تکرار کرتا رہی تاکہ دنیا و آخرت مین تمام آفات سے محفوظ رہے، اور اللہ کی رحمت سے دونون جہان مین عزت پائے"

شیرون نے انھین چھوا تک نہین، اسکی نفسیاتی توجیہ یہی ہوسکتی ہے، کہ حضرت دانیال کا حق تعالیٰ پر اتنا اعتماد تھا کہ خوف ان کے سینہ مین مطلق نہ تھا، اور اسی وجہ سے شیر انھین چھو نہ سکے، یہ تو ہم سبھی جانتے ہین کہ کتا جو خوف زدہ شخص پر حملہ کر دیتا ہے، اس شخص کے قریب بھی نہین آتا، جو بالکل بے خوف ہوتا ہے، یہ جو سنیاسی جنگلون مین جا بیٹھتے ہین، جہان ہر قسم کے موذی اور درندہ جانور بھی موجود ہوتے ہین کیسے محفوظ رہتے ہین،؟ ان کی بے خوفی ان کے لئے سب سے بڑی حفاظت کا کام دیتی ہے، ا جو شخص حق تعالیٰ کو محافظ سمجھتا ہے، وہ بے خوف ہوتا ہے، کامل بے خوفی نتیجہ ہے ایمان راسخ کا!

نفی کے بعد اثبات یعنی نفس کو یہ یقین دلانے کے بعد کہ خوف کی کوئی وجہ نہین، اب ہمین حق تعالیٰ کی معیت، احاطت، قرب و اقربیت کا ادراک کرنا چاہئے، جس طرح کہ چھوٹے بچے کو ہم نے اپنی موجودگی کا یقین دلایا تھا، اسی طرح نفس کو حق تعالیٰ کے حضور و معیت کا یقین دلانا ضروری ہے، جب وہ یہ محسوس کرنے لگتا ہے، کہ اس کا قیام حق تعالیٰ کی ذات مین ہے، وہ حق تعالیٰ کے نور مین منکشف ہے، اس کے داہنے بائین اوپر نیچے آگے پیچھے حق تعالیٰ کا نور ہے، وہ نور کے قلعہ مین محصون ہے، محفوظ ہے، تو پھر خوف کا سایہ اس کے قلب سے اُٹھ جاتا ہے، (ظلمت نور کی موجودگی مین کیسے ٹھہر سکتی ہے؟) سرور و طمانیت حقیقی کا نفوذ اس کی رگ وپے مین مس ہونے لگتا ہے، وہ قطرۂ نور بن جاتا ہے، سراپا نور ہو جاتا ہے، اور مسرت دائمی سے ہمکنار ہو جاتا ہے!

اس مقصود کے حصول کے لئے تمھین بعض ازلی و ابدی صداقتون کا دہرانا بڑی مدد دے گا، جب خوف وہراس کی لہرین تمھارے قلب مین قیامت خیزی کر رہی ہون، اور دل بیٹھا جا رہا ہو، اور تمھاری نظر مین دنیا تاریک ہو رہی ہو، تو تمھین بیٹھ جانا چاہئے، اور آہستہ سے لیکن استقلال و ثابت قدمی کے ساتھ معیت حق کا ادراک کرتے ہوئے ان صداقت بھرے الفاظ کی تکرار کرنی چاہئے:

حَسْبِیَ اللّٰہُ نِعْمَ الْوَکِیْلُ وَ نِعْمَ الْمَوْلٰی مجھے اللہ کافی ہے، اور وہ کیا خوب کارساز ہے،

وَنِعْمَ النَّصِيْرُ" کیا خوب مولیٰ ہے، اور کیا خوب مددگار ہے"

ان کی تکرار سے ہماری بصیرت کی آنکھیں کھلتی ہیں، ہمیں حق تعالیٰ کی کفایت کا یقین ہوتا ہے، اور اسی یقین کی وجہ سے ہمیں خوف سے نجات ملتی ہے، آزادی نصیب ہوتی ہے،

جامع ترمذی میں ہے کہ جب حضور انور صلعم کو کوئی مشکل پیش آتی، فکر کا بار قلبِ انور پر ہوتا تو حق تعالیٰ سے مخاطب ہو کر فرماتے،

یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ بِرَحْمَتِكَ اَسْتَغِیْثُ

درد بھرے دل سے "الغیاث" کی یہ پکار نکلی، کہ حیّ القیوم کی رحمت نے قلب کو سنبھالا دیا، اور اسکی حفاظت کے سامان فراہم کر دیئے،!

یاد رکھو کہ خوف طاری ہوتا ہے خوف پیدا کرنے والے خیال کو قبول کر لینے کی وجہ سے، اس خیال کا مقابلہ ذہن کی اس سطح پر ۔۔ کرنا ممکن ہے جس سطح پر خوف کی موجیں اٹھ رہی ہیں، کوشش اس بات کی کرنی چاہئے کہ قلب اس سطح سے بلند ہو جائے، اور بالاتر سطح پر قدم جمائے، دیکھو سمندر کا طوفان اسی وقت فنا کا باعث ہوتا ہے، جب ہم اس کی تباہ کن موجوں میں گھر جاتے ہیں، لیکن اگر ہم کسی بلند پہاڑی پر چڑھ جائیں، تو پھر ان بلاخیز موجوں کے شور و شور سے ہمیں نجات مل جاتی ہے، کیونکہ اب ہم ان کے پنجے سے باہر ہیں! بالکل اسی طرح جب ہم خوف کی حالت میں حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں تو ہمارا قلب خوف کی سطح سے بلند ہو جاتا ہے، اور اس مقام پر پہونچ جاتا ہے، جہاں سکون ہی سکون ہے، شانتی ہی شانتی، سکھ ہی سکھ،!

یاد رکھو قرآن کریم کی تعلیم کی رو سے ہمارے سارے دردوں کی دوا حق تعالیٰ ہیں، خوف و حزن کا علاج حق تعالیٰ کی محبت ہے، غیر اللہ سے بیزاری ہے، درد و الم خوف و ہراس کے وقت اپنے رُخ کو حق تعالیٰ کی طرف اخلاص کے ساتھ پھیر دو اور عجز کے ساتھ ان کے قدموں پر پڑ جاؤ،

اور پھر تمھارا کام بن نہ جائے تو شکایت کرنا،

در حضرتِ ما دوستی یکدلہ کن
هر چیز کہ غیر ماست آنرا یلہ کن
یک صبح باخلاص بیا بر درِ من،!
گر کار تو بر نیاید آنگہ گلہ کن،!

(ابوسعید مهنه)

الفاروق

حضرت فاروق اعظم کی لائف اور طرزِ حکومت، صحابہ رض کے فتوحات، عراق و شام، مصر و ایران کے فتح کے واقعات، حضرت عمر رض کی سیاست، اخلاق، زہد، عدل اور اسلام کی عملی تعلیم کا شاندار منظر یہ کتاب مولانا شبلی کی بہترین تصنیف سمجھی جاتی ہے، مطبع معارف نے نہایت اہتمام سے اس کا نیا اڈیشن تیار کرایا ہے، جس کے ساتھ دنیاے اسلام کا رنگین نقشہ بھی شامل ہے، طباعت و کاغذ نہایت عمدہ، ضخامت ۳۱۲ صفحے، قیمت ستے،

المامون

خلیفہ مامون الرشید عباسی کے عہدِ سلطنت کے حالات، مولانا شبلی مرحوم کی یہ پہلی تصنیف ہے، جس مین ممدوح نے تاریخِ اسلام کے پرفخر عہد کے سیاسی، علمی، مذہبی اخلاقی، تمدنی حالات قلمبند کئے ہین، جن سے دولت عباسیہ کے عروج و کمال کے زمانہ کا مرقع آنکھون کے سامنے پھر جاتا ہے، دارالمصنفین نے خاص اہتمام سے چھپوایا ہے، قیمت عہ، ضخامت ۲۴۴ صفحے،

منیجر دارالمصنفین

حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ

جناب عبدالرزاق صاحب قریشی

(۲)

شہادت | جب مرزا صاحب کا سن ۸۰ سے تجاوز کر گیا، تو اکثر ذکرِ رحلت اور دعاے خیرِ خاتمہ فرمایا کرتے تھے[1] اور وظائف و عبادات میں بھی اضافہ ہو گیا، اکثر عزیزوں اور دوستوں کو خطوں میں بھی لکھتے چنانچہ ملا عبدالرزاق کو لکھتے ہیں:

"وقت رحلت نزدیک رسیدہ، عمر از ہشتاد تجاوز نمودہ و توقع ملاقات نماندہ کہ مارا طاقتِ سیر و سفر نماندہ، (مکتوب پنجاہ و دیکم)

صاحبزادہ مرید حسین کو لکھتے ہیں:

"ملاقاتہا موقوف بمقدر است و عمر آخر، اگر در زندگی میسر نہ شد، انشاء اللہ تعالیٰ بشرط ایمان در بہشت برخوردہاے خاطر خواہ خواہم کرد" (مکتوب سی و ہشتم)

میر محمد مبین کے نام لکھتے ہیں، کہ

"از خبر جانگداز میر سلمان صاحب چہ نویسم کہ بر من گذشت، بیت،

یار رفت و ما چو نقشِ پا بخاک افتادہ ایم ... سایہ می گردید کاش این نارسا افتادگی

---

[1] معمولات مظہریہ صلہ"

الحمد للہ ما ہم بر سر راہیم ...... بہر حال ہمہ مصیبتہا میگذرد و ما ہم خواہیم گذشت نفسے کہ در یادِ خدا گذرد غنیمت است۔" (مکتوب پنجاہ و پنجم)

ایک اور مکتوب میں یوں رقمطراز ہیں:

"والد بزرگوار شما کہ جامع ہزاران مناقب بودند، از انتقالِ خود ازین عالم داغے بپا گذاشتند...... ما و ایشان بعلاقہ ہم عمری در وقتِ قدوم باین خاکدان بتقدیم و تاخیر چند قدم ہمسفر بودیم، حالا وقت رجوع بوطنِ اصلیست نیز بفاصلہ چند نفس ہم قافلیم

امروز گر از رفتہ عزیزان خبرے نیست فرداست درین بزم ز ما ہم اثرے نیست"

(مکتوب پنجاہ و ششم)

صاحبِ معمولاتِ مظہریہ کا بیان ہے کہ مرزا صاحب اکثر فرمایا کرتے تھے، کہ مجھے تعجب ہوتا ہے کہ لوگ موت سے کیوں ڈرتے ہیں، حالانکہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ "روح را مجرد از انقطاعِ قالب شرف التقاء از خدا و رسول میسر شود۔"[۱]

مرزا صاحب کو ان ارواحِ طیبات سے ملنے کا بہت شوق تھا[۲]

حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکر صدیق، حضرت امام حسن، حضرت جنید بغدادی، حضرت خواجہ بہاء الدین محمد نقشبندی اور حضرت مجدد رضی اللہ تعالیٰ عنہم،

صاحبِ معمولات لکھتے ہیں، کہ مرزا صاحب کو غایت درجہ اشتیاق تھا، کہ ان کو شرفِ شہادت حاصل ہو، لیکن پھر بڑی حسرت سے فرماتے کہ ایامِ جوانی میں جب شہادت حاصل کرنے کا موقع تھا، تو میں حاصل ہی نہ کرسکا، اب بڑھاپے میں یہ عزت کہاں نصیب ہو سکتی ہے، مگر پھر خود ہی فرماتے کہ خدا سے مایوس نہ ہونا چاہیئے، چنانچہ زمانہ نے دیکھ لیا کہ خدانے ان کو مایوس نہیں کیا،

۱؎ معمولاتِ مظہریہ ص ۱۳۶ ۲؎ ایضاً صفحہ ۱۳۸

محرم کا مہینہ تھا، مرزا صاحب اپنے مکان پر چند مریدوں کے ساتھ بیٹھے تھے، کہ وہان سے ایک تعزیہ نکلا، مرزا صاحب نے اپنے مریدون کو مخاطب کرکے کہا، کہ یہ کیا بیہودہ حرکت ہے، بارہ سو برس جس مقدمہ کو ہو چکے ہون ہر سال اسے تازہ کرنا کیا بدعت ہی، اور لکڑیون کو سلام و تسلیم کرنا عقل کی خفت ہے، یہ گفتگو بجنسہٖ وہ لوگ جو کہ علم اور شدون کے ساتھ تھے، انھون نے سنی اور تعصب کے ساتھ امام باڑون مین اور محلون مین دو تین شب اس کی گفتگو رہی[۱]،

غرض، محرم الحرام ۱۱۹۵ھ شب چہارشنبہ کا ذکر ہے، کہ تھوڑی رات گذری تھی کہ کچھ لوگ مکان پر آئے، اور دروازہ پر دستک دی، خادم نے جاکر عرض کیا، کہ کچھ لوگ زیارت کیلئے آئے ہین، مرزا صاحب یہ سنکر مسکرائے، اور فرمایا کہ بلالو، ان مین سے تین آدمی اندر آئے، ان مین ایک ایرانی نژاد مغل تھا، مرزا صاحب اپنی خواب گاہ سے نکلکر آئے، اور ان لوگون کے پاس کھڑے ہوگئے، مغل نے پوچھا "آپ ہی مرزا جانجانان ہین؟" انھون نے جواب دیا، "ہان" اور اس کے دونون ساتھیون نے بھی تائید کی، اس پر اس مغل نے مرزا صاحب پر طپنچہ کا وار کیا، اور تینون فرار ہوگئے، گولی بائین جانب دل کے پاس لگی[۲]، مرزا صاحب نے باوجودیکہ ایسا زخم کاری کھایا لیکن استقلال طبیعت سے پھر اپنے تئین کوٹھے کے اوپر پہونچایا[۳]"

جس طرح مرزا صاحب کی تمنا تھی، کہ انھین شرف شہادت نصیب ہو، اسی طرح اب زخم لگنے کے بعد دل مین یہ آرزو پیدا ہوئی کہ جس طرح ان کے جد بزرگوار حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے زخم لگنے کے تیسرے دن وفات پائی تھی، ان کی وفات بھی تین دن بعد ہو[۴] اور خدا نے ان کی یہ خواہش بھی پوری کردی،

مرزا صاحب عالم اضطراب و بے قراری مین لوٹتے تھے، اور اپنے ہی یہ اشعار پڑھتے تھے:

---

[۱] گلشن ہند ص ۲۱۶ [۲] مقامات مظہری ص ۱۶ [۳] گلشن ہند ص ۲۱۶ [۴] معمولات مظہریہ ص ۱۴۰،

بنا کردند خوش رسمے بخون و خاک غلطیدن | خدا رحمت کند این عاشقانِ پاک طینت را
سیلِ خون از سینۂ گرمم روان کرد عشق | نازم اعجازش کہ طوفان از تنورم آوردہ است
زخمِ دل مظہر مبادا بہ شود آگاہ باش | کاین جراحت یادگار ناوکِ مژگانِ اوست
جائے رحمت لے ہجومِ آہ و ای سیلابِ اشک | یادگار از من ہمین مشتِ غبارے ماندہ است
شگافِ و انہا بشک نشانِ سجدہ می باشد | دلِ مجروح میدانم کہ راہی با خدا دارد

مصحفی نے اس شعر کا بھی اضافہ کیا ہے،

چہ خوش بر وے دلِ تنگِ مادرے واکرد | خدا دراز کند عمرِ زخم کاریِ ما

کہتے ہیں کہ بادشاہ (شاہ عالم) نے مرزا صاحب کے پاس کہلا بھیجا کہ ہم نے مفسدوں کی تلاش کروائی لیکن کچھ پتہ نہیں چلتا، آپ کچھ سُراغ بتائیں تاکہ ان کو تلاش کرکے قرار واقعی سزا دیجائے، مرزا صاحب نے جواب میں کہلا بھیجا کہ "فقرا تو شہید راہِ خدا ہیں، مرے ہوؤں کو مارنے کا قصاص کیسا، اور اگر اتفاق سے ملزم ہاتھ آجائیں، تو انھیں میرے پاس بھیجدیا جائے تاکہ دستورِ طریقت کے مطابق ان سے بدلہ لیا جائے[1] (یعنی ان کو معاف کر دیا جائے)

اسی طرح ذوالفقار الدولہ نواب نجف خان نے معالجہ کے لئے جراحانِ فرنگ (ڈاکٹر؟) کو خدمتِ اقدس میں بھیجا، مرزا صاحب نے کہلا بھیجا، کہ اگر زندگی باقی ہے، تو مسلمان جراحوں کے ہاتھ سے شفا ہو جائیگی، اور اگر وقت پورا ہو چکا ہے، تو ان کافروں کا احسان مرتے وقت کیوں اٹھاؤں[2]

غرض زخم لگنے کے تیسرے روز، ۱۰ محرم الحرام ۱۱۹۵ھ جمعہ کے دن، شام کے وقت، اس پیکرِ اخلاق و گنجینۂ صفات نے اس دنیائے فانی کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا، اور حضرت بی بی صاحبہ کی حویلی میں جو متصل چتلی گور ہے، دفن ہوئے، لوحِ مزار پر خود مرزا صاحب ہی کا یہ شعر کندہ ہے

---

[1] معمولاتِ مظہریہ صفحہ ۱۳۰ [2] ایضاً صفحہ ۱۳۱،

بلوحِ تربتِ من یافتند از غیب تحریرے کہ این مقتول را جز بیگناہی نیست تقصیرے

سال وفات | بعض تذکرہ نویسون نے مرزا صاحب کا سال وفات ۱۱۹۴؁ھ اور بعضون نے ۱۱۹۲؁ھ لکھا ہے، مرزا صاحب نے ۱۱۹۵؁ھ کے بالکل شروع مین (یعنی نئے سال کے صرف دس دن گذرنے پائے تھے کہ) وفات پائی، اس لئے ۱۱۹۴؁ھ تو قرینِ قیاس ہو سکتا ہے لیکن ۱۱۹۲؁ھ تو بالکل ہی غلط ہے، ۱۱۹۴؁ھ تک کے تمام تذکرون مین مرزا صاحب کا ذکر بحیثیت ہمعصر شاعر آتا ہے، یہ تذکرے چونکہ ان کے ہمعصرون کے لکھے ہوئے ہین، اس لئے بہ نسبت بعد کے تذکرہ نگارون کے زیادہ قابلِ اعتبار اور مستند مانے جائین گے، اس کے علاوہ مرزا صاحب کی شہادت پر ان کے متعدد ہمعصرون، شاگردون اور مریدون نے تاریخین کہی تھین، ان تمام تاریخون سے ۱۱۹۴؁ھ نکلتا ہے یا ۱۱۹۵؁ھ مثال کے طور پر ہم دو ایک مشہور تاریخین نقل کرتے ہین،

تمام تاریخون مین قمرالدین منت کی تاریخ سب سے مشہور اور پسندیدہ ہے، اس تاریخ کا مادہ خاص الفاظ حدیث ہین،

(۱) ہست حدیثے از پیمبر صلی اللہ علیہ وسلم عاش حمیداً مات شہیداً سال وفاتِ مرزا مظہر

(۲) مظہر کا ہوا قاتل جو اک مرتدِ شوم اور ان کی ہوئی خبر شہادت کی عموم
تاریخِ وفات ان کی کہی با دوِ درد سودا نے کہ "ہائے جانجانان مظلوم"، (سودا)

(۳) قاضی ثناء اللہ پانی پتی مرزا صاحب کے ارشد مریدین کی حیثیت رکھتے ہین، انھون نے بھی دو تاریخین کہی ہین، ان مین سے ایک ہم یہان نقل کرتے ہین، اس کا مادہ وہی الفاظِ حدیث ہین جو منت نے اپنی تاریخ مین استعمال کئے ہین،

آن قبلۂ اربابِ تقی عاش حمیداً وان قدوۂ اصحابِ رضا مات شہیداً
مجموعۂ ہر دو صفت سالِ وفاتش مظہر رضی اللہ کان سعیداً

عاش حمیداً مات شہیداً

(۴) تاریخ وفات از مصحفی،

چو مجروح شد مظہر بیکس وکو ....

شب ہفتم ماہ عاشور بود آن | کہ از خون شدش سرزمین کربلائی
درآن زنگ ہم میچکید از بن او | زہر قطرۂ خون دل میرزائی
کسے از سلف ہم نہ بگذشتہ باشد | باین بے دماغی باین کبریائی
غرض در شب قتل شاہ شہیدان | کہ جست از قفس مرغ روحش ہائی
مریدانش در حلقۂ غم نشستند | زپیران برآمد خروش جدائی
برگش چنین موکشا دند حوران | شد از دیدۂ قدسیان روشنائی
چو بشنید این واقعہ مصحفی ہم | غمے خورد باوصف دیرآشنائی
فرورفت در فکر تاریخ سالش | کہ تا سامعان را کند غم زدائی

پس از ساعتے سر زجیب تامل
برآوردہ گفت "آہ مظہر کجائی"

مرزا صاحب کا قاتل | تمام تذکرے متفق اللفظ ہیں کہ مرزا صاحب کو ایک شیعہ نے شہید کیا، لیکن مولانا محمد حسین آزاد کی رائے اس معاملہ میں مختلف ہے، وہ فرماتے ہیں:

"قتل کا سبب دلی کے خاص و عام میں مشہور تھا کہ بموجب رسم کے ساتویں کو علم اٹھے تھے، یہ (مرزا صاحب) سرراہ اپنے بالاخانہ پر خاص خاص مریدین کو لئے بیٹھے تھے، جیسا کہ عوام جہلا کی عادت ہے شاید طرفین سے کچھ طعن و تعریض ہوئے ہوں، وہ کسی جاہل کو ناگوار ہوئے، ان میں کوئی سنگدل فولاد خان نام سخت جاہل تھا، اس نے یہ حرکت کی، لیکن حکیم قدرت اللہ قاسم اپنے تذکرہ

ہیں فرماتے ہیں کہ مرزا صاحب اپنے کلام میں اکثر اشعار حضرت علی کی مدح میں کہا کرتے تھے، اس پر بگڑ کر کسی سُنّی نے یہ حرکت کی[۱]

اس کے بعد مولانا آزاد حاشیہ میں لکھتے ہیں :-

"تعجب مشکل ہے، حکیم صاحب بھی ایک خوش اعتقاد سنت جماعت تھے، وہ کہتے ہیں کہ سُنّی نے مارا، لوگ کہتے ہیں شیعہ نے مارا"[۲]

مولانا آزاد کا تبحر علمی اور ان کی فارسی دانی مسلّم ہے، لیکن یہاں مولانا کو حکیم قدرت اللہ کی عبارت کے سمجھنے میں یقیناً غلط فہمی ہوئی، حکیم صاحب کی اصل عبارت یہ ہے:

ازانجا کہ مشرب صافی و مذہب اہلِ حق، حق بوے ارزانی داشتہ بود، ظالمے ناحق ناشناس، در ایام متبرکۂ عاشورہ بہ تعصب مذہب پئے حقیقت کار نابردہ کہ وے غریق حُب جناب ولایت مآب و حریق عشق حضرت امامت انتساب مرتضوی بود سلام اللہ علیہ وکرم اللہ وجہہ، چنانچہ بعضے اشعار آبدارش خاصۂ این بیت،

نکرد مظہرِ ما طاعتے ورفت بخاک نجات خود بتولّای بوتراب گذاشت

بر بے گناہیش گواہی دید، بے گناہ شہید ساختہ بحضور سراپا سرور شہداے کربلاے معلّیٰ علیہم السلام والرضوان رسانید"[۳]

مندرجۂ بالا عبارت سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ کسی نے یہ معلوم کئے بغیر کہ وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی محبت میں غرق ہیں، ان کو شہید کردیا، یہ تو کہیں نہیں ہے، کہ چونکہ وہ حضرت علیؓ کی مدح میں اشعار کہا کرتے تھے، اسلئے کسی سُنّی نے مارا،

دراصل مولانا کو یہاں کسی قدر غلط فہمی ہوئی، ورنہ تمام تذکرے خواہ وہ مرزا صاحب کے مریدان

---

[۱] آب حیات ص۱۳۱ (طبع دوازدہم) [۲] آب حیات فٹ نوٹ ص۱۳۱ [۳] مجموعہ نغز جلد دوم،

نے لکھے ہون یا غیرون نے سنیون نے لکھے ہون یا شیعون نے، بلا استثنا اس بات پر متفق ہین کہ مرزا صاحب کا قاتل ایک شیعہ تھا،

مولانا نعیم اللہ بہرائچی، مرزا صاحب کے ایک مرید لکھتے ہین کہ، محرم الحرام کو چند شیعون نے سینۂ مبارک پر گولی چلائی[1]

قدرت اللہ خان قاسم کا بیان آپ پڑھ چکے ہین، انکی بھی یہی شہادت ہے، قدرت اللہ قاسم مرزا صاحب کے ہمعصر تھے، اسلئے ان کا بیان عینی شاہد کے بیان کی وقعت رکھتا ہے،

مصحفی بھی مرزا صاحب کے زمانہ مین موجود تھے، اس لئے ان کا بیان بھی "عینی شاہد" کا بیان سمجھنا چاہئے، وہ لکھتے ہین :-

"در عہدِ شاہ عالم بادشاہ کہ بسبب بودن امیرالامراء ذوالفقار الدولہ بہادر در دہلی علوی اہل تشیع بیشتر بود و این بزرگ مقتدائے متعصبانِ اہل سنت و جماعت گفتہ می شد، شخصے از متعصبان اہل تشیع شب ہفتم محرم الحرام یک ہزار و صد و نود و پنج اورا بگولۂ طپانچہ مجروح ساخت[2]"

سمجھ مین نہین آتا کہ "مقتدائے متعصبان اہل سنت و جماعت" کو کوئی سُنّی کس طرح قتل کر سکتا ہے،

صاحب سفینۂ ہندی (بھگوانداس) بھی مرزا صاحب کے عہد مین موجود تھے، اور ان کی خدمت مین حاضر ہونے کا شرف ان کو حاصل تھا، ان کا بیان ہے کہ

"ہرچند کہ (مرزا صاحب) می گفت کہ مارا با مذہب کارے نیست کہ ما محمدیم اما در مذہب سُنت و جماعت غلو داشت[3]"

کیا مذہب سُنت و جماعت مین غلو رکھنے والے بزرگ کا قاتل کوئی سُنّی ہو سکتا ہے؟

اب اس کے بعد دو شیعہ حضرات کا بیان بھی سُن لینا چاہئے،

---

[1] معمولات مظہریہ صفحہ ۱۲۲ [2] عقد ثریا،

علی ابراہیم تذکرۂ گلزار ابراہیم مین لکھتے ہین :

"گویند بہ سبب تعصب مذہب منع تعزیۂ سید الشہدا علیہ السلام می نمود، بدین حمیت ز دست یکے از ساکنانِ دہلی سنہ یک ہزار و یک صد و نود و چہار ہجری کہ عمرش قریب صد بود مقتول شد"

علی لطف صاحب گلشنِ ہند کا بیان ہے :-

کہتے ہین کہ ہفتم روزِ عاشورہ کو لب بام یا اپنے گھر مین سرراہ بیٹھے تھے، اور کوئی سر وار روہیلوں کا بھی آیا تھا واسطے ان کی ملاقات کے، کہ ناگاہ گذر شدون کا ان کے زیر بام سے ہوا، اس روہیلے نے کھڑے ہو کر سینہ زنی بھی کی، اور موافقت سلام سے ہوا اور میرزا ے مذکور جس طرح بیٹھے تھے، اسی طرح بیٹھے رہے، بلکہ متبسم ہو کر فرمانے لگے، کہ بارہ سو برس جس مقدمہ کو ہو چکے ہون، ہر سال اسے تازہ کرنا کیا بدعت ہی، اور لکڑیون کو سلام و تسلیم کرنا نہایت عقل کی خفت ہے، یہ گفتگو بجنسہ وہ لوگ جو کہ علم اور شدون کے ساتھ تھے، اونھون نے سُنی اور تعصب کی مرزاے مذکور کے امام باڑون مین اور محفلون مین دو تین شب گفتگو رہی، آخر شب بشب شہادت کو کہ شب دہم عاشورہ سے ہے، کوئی شخص ان کے دروازہ پر آیا، اور ان کو باہر بلوایا، جب باہر آئے تو بے گفتگو ایک چوٹ طپنچے کی نذر کی، اور کام ان کا پورا کرکے راہ اپنے گھر کی لی، سِن بھی ان کا قریب سو برس کے تھا، ایسا زخم کاری کھایا، لیکن استقلالِ طبیعت سے پھر اپنے تئین کوٹھے کے اوپر پہونچایا، ۱۱۹۴ھ تھے، کہ اس روشن ساز مسائل صدیقی نے اور اس مصقلہ پرداز احکام فاروقی نے اس آئینۂ زنگ آلود دنیا سے منہ پھیر لیا، اور سفر خلفاے راشدین کے منازل طریقت پر کیا"

شہادت کی بالکل یہی وجہ کریم الدین نے بھی اپنے تذکرۂ شعرا مین میر عبد الحیٔ تابان کی زبانی لکھی ہی سمجھ مین نہین آتا کہ یہ روایت میر عبد الحیٔ تابان کی زبانی کس طرح بیان کیجا سکتی ہی،

اس لئے کہ تابان نے تو مرزا صاحب کی زندگی ہی مین وفات پائی، ان کا سال وفات بقول مولوی عبدالحق صاحب ۱۱۶۱ھ اور ۱۱۶۵ھ کے درمیان ہے[۵]

مرزا صاحب کی شہادت ایک سیاسی واقعہ ہے

مرزا صاحب کی شہادت دراصل ایک سیاسی حیثیت رکھتی ہے، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جب ہمایون شیر شاہ سے شکست کھا کر ایران بھاگا، اور پھر جب کچھ عرصہ بعد شاہ ایران کی مدد سے اُس نے اپنی کھوئی ہوئی سلطنت دوبارہ حاصل کی تو اس ملک مین ایرانیون کی آمد و رآمد کے ساتھ اقتدار بڑھنے لگا یہانتک کہ عہدِ جہانگیری مین تو تقریبًا تمام بڑے بڑے عہدون پر یہی فائز تھے، ایرانیون کے ہندوستان مین پھیل جانے کی وجہ سے ہندوستان مین بھی وہ مسئلہ پیدا ہوا، جس سے ہر اسلامی ملک مین فتنون کی ابتدا ہوئی، یعنی سنیت و شیعیت کا جھگڑا، عہدِ عالمگیر تک اس فتنے کے زہریلے اثرات سے ہندوستان محفوظ رہا، لیکن اورنگزیب کی وفات کے بعد چونکہ حکومت کی دیوارین کھوکھلی ہوگئی تھین، اس فتنے کے زہریلے اثرات ملک میں پھیلنے لگے، بہادر شاہ اول کی وفات کے بعد تو شیعون کا اقتدار یہان تک بڑھا، کہ دو بھائی سید عبد اللہ اور سید حسین سلطنت کے مالک کل بن گئے، اور "بادشاہ گر" کے خطاب سے مشہور ہوئے، فرخ سیر کے عہد مین جب ان کا زور اور ظلم و تعدی حد سے بڑھ گیا تو اس نے اُن پر نکتہ چینی شروع کردی، اور ان کے اقتدار کا خاتمہ کرنے کی ترکیبین سوچنے لگا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کوئی اقدام کرتا، ان بھائیون نے اس کا کام تمام کردیا، مرزا بیدل نے اس واقعۂ دلفگار کی نہایت عمدہ تاریخ کہی تھی،

دیدی کہ چہ با شاہ گرامی کردند | صد جور و جفا از رہ خامی کردند
تاریخ چو از خرد جستم فرمود | سادات بوے نمک حرامی کردند،

بالآخر محمد شاہ کے زمانہ مین ان بھائیون کا قلع قمع ہوگیا، لیکن افسوس کہ شاہ عالم کے زمانہ مین یہ فتنہ پھر جاگ اٹھا، شاہ عالم نے مسندِ وزارت پر نجف خان کو فائز کیا، نجف خان

---

[۵] مقدمہ دیوان تابان ص د

کا دہلی آنا تھا کہ پھر شیعیت نے زور پکڑا، اور سنیوں پر ہر قسم کے مظالم ڈھائے جانے لگے، چنانچہ مرزا صاحب ایک مکتوب مین فرماتے ہین :

"حال مردم این شہر از روزیکہ نجف خان آمدہ است از شاہ تا گدا تباہ است وذکر خلاص مجد الدولہ بر زبان خاص وعام است، خدائے تعالیٰ زود بظہور آرد۔"[۱]

یہ وہی نجف خان ہی جس نے شاہ عبد العزیز اور شاہ رفیع الدین کو اپنے قلمرو سے نکالدیا تھا، اور یہ دونوں بزرگ معہ زنانوں کے شاہدرہ تک پیدل آئے تھے،

یہی نجف خان ہی جس نے روہیلوں کی طاقت کو پامال کیا، اور ضابطہ خان کو مرہٹوں کی مدد سے شکست دی اور اسی شکست کا انتقام ضابطہ خان کے بیٹے غلام قادر روہیلہ نے شاہ عالم سے جس بُری طرح لیا، اس سے تاریخ کا کوئی طالب علم ناواقف نہ ہوگا،

نجف خان ایک کٹر شیعہ تھا اور مرزا صاحب بقول مصحفی "مقتدائے متعصبان اہل سنت جماعت" اور جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہین، مرزا صاحب کے مریدون مین روہیلوں کی اکثریت تھی، ہر گ وبار کے ساتھ جڑ کو ختم کر دینا نجف خان کے نقطۂ نگاہ سے یقیناً ضروری اور مفید تھا، بہرحال یہی نجف خان ہے، کہ "رفقائے او مرتکب این امر (قتل مرزا صاحب) شدہ بودند واو در اجرائے حد تغافل کرد۔"[۲]

خانگی زندگی اور متعلقین مرزا صاحب کی خانگی زندگی اور ان کے متعلقین کے حالات بہت کم معلوم ہین، صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ وہ ہمیشہ کرایہ کے مکان مین رہے، کھانا وقت کے وقت بازار سے منگوا لیا کرتے تھے، لباس کی سادگی یقینی ہے، اس لئے کہ وہ ہمیشہ صرف ایک ہی جوڑا کپڑا رکھتے تھے،

---

[۱] کلمات طیبات، مکتوب سی وچہارم [۲] مقامات مظہری

متعلقین کے بارے میں بھی بہت کم معلومات حاصل ہیں، خود مرزا صاحب نے تین مکتوبات میں اس طرف اشارہ کیا ہے لیکن وہ محض اشارہ ہی اشارہ ہے، ایک مکتوب میں لکھتے ہیں :

"فقیر مع متعلقان بعافیت است و بدعاے دوستان مشغول" (مکتوب پنجاہ و ششم)

ایک دوسرے مکتوب میں فرماتے ہیں :-

"...بعد دو ماہ بدہلی میروم کہ متعلقان درآنجا ہستند" (مکتوب پنجاہ وچہارم)

ایک اور مکتوب میں فرماتے ہیں :-

"......... آدم براے طلب متعلقان فرستادم، آنہا عذر مسموع نوشتند، ناچار بمراجعت دہلی اتفاق افتاد" (مکتوب چہلم)

مرزا جانؒ کے حالات کے سلسلہ میں ہم لکھ آئے ہیں، کہ جب انھوں نے فقیری لے لی تو سارا اثاثہ راہ خدا میں تقسیم کر دیا، صرف پچیس ہزار روپئے لڑکی کی شادی کے اخراجات کے لئے رکھ چھوڑے تھے، (اور بعد میں اس کو ایک دوست کی نذر کر دیا) اس سے پتہ چلتا ہے، کہ مرزا صاحب کی ایک بہن تھیں، اس کے علاوہ معمولاتِ مظہریہ میں ہم کو مندرجہ ذیل بیان ملتا ہے :-

"بوقت طفولیت فقیر و ہمشیرۂ فقیر از افراط محبت ہم عہد و ہم قسم بودیم کہ اول ہر کہ از ما ازین دار فنا درگذرد، دیگرے نیز بموافقت قدم زند، یعنی خود را ہلاک سازد، چون ہمشیرۂ فقیر را وقت آخر رسید یکبار بسوی من نگریست و بیاد آن وعدہ و بر تنہائی سفر آخرت بگریست، گفتم کہ بایفاے وعدۂ خود ثابت ام، از یک ضرب کتارکار تمام می شود لیکن درین صورت باہم اتفاق مشکل است کہ شما را بحکم النفساء شہید با قافلۂ شہدا، براہ جنت خواہند برد و مارا بموت حرام براہ دیگر، ناچار فقیر جا درخود را چو کفنی در برکرد و گفت بحکم موتوا قبل ان تموتوا، ظاہر خود را مردہ وا گردانیدہ، رفاقت شما بجان و دل بجا آوردم کہ مقصود از زندگی تحصیل حظوظ

نفسانی است، آنرا فدائے راہ دوستی کردم[1]"

غالباً مرزا صاحب کی یہی بہن ہیں جن کے صاحبزادوں کی سفارش مرزا صاحب کسی سے ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"فقیر ہمشیرزادہ ہا دارم، ہر چند کمالاتے ندارند، خالی از آدمیت نیستند، اما باقتضائے زمانہ پریشان روزگار واقع شدہ اند خصوصاً یکے از آنہا بحالتِ اضطرار گرفتار است[2]"

مرزا صاحب نے کوئی اولاد چھوڑی یا نہیں، اس کے متعلق کوئی پتہ نہیں چلتا، ہاں اتنا یقینی ہے کہ انھوں نے شادی کی تھی، لیکن ان کی متاہلانہ زندگی کچھ زیادہ خوشگوار نہ تھی، اس لئے کہ ان کی بیوی کو جنون کا عارضہ ہو گیا تھا، خود مرزا صاحب نے اپنے وصیت نامہ میں، جو انھوں نے آخر عمر میں قاضی ثناء اللہ پانی پتی کے نام لکھا تھا، اس کا اظہار فرمایا ہے،

فرماتے ہیں:-

"......... پیش ازین چند منکوحۂ من از من درخواستہ بود کہ تدبیر امور اُخروی را برائے او واگذارم......... این مستورہ بنا بر عارضۂ سودا در طول عمر ناسازیہا بسیار با فقیر کردہ، چنانچہ مخفی از اعزہ نیست، امّا ازآن ہمہ عفو کردم[3]"

یہ عارضہ، جیسا کہ اوپر کی عبارت سے بھی ظاہر ہے، آخر آخر میں ہوا تھا، صاحبِ مقاماتِ مظہری کی اس عبارت سے بھی یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے،

"عفت پناہ عصمت دستگاہ زوجۂ شریعتِ حضرتِ ایشان طریقہ از آنحضرت گرفتہ بیمن صحبتِ مبارک بمرتبۂ حضور و آگاہی رسیدند و اجازت ارشاد نساء صالحہ یافتہ تاثیر گرم در دلہامی نمودند واقعات و مبشرات نیک میدیدند"

---

[1] معمولاتِ مظہریہ ص۱۳۵ [2] کلمات طیبات مکتوب شصتم [3] معمولاتِ مظہریہ ص۱۴۴

اخلاق و عادات | مرزا صاحب کا قد کشیدہ اور بلند تھا[51] اور خشخاشی داڑھی رکھتے تھے، لباس نہایت سادہ پہنتے تھے، عمامہ بطور سنت باندھتے تھے، اور قمیص پیش چاک پہنتے تھے[52]

مرزا صاحب باوجودیکہ درویش تھے، مزاج مین مرزائیت اور نفاست و نزاکت بہت تھی، خود بھی اپنی اس افتاد طبع کی طرف کلام مین کہین کہین اشارہ فرمایا ہے،

در جنون ہم میرزائی از مزاج ما نرفت | کز برائے خویش حمامے زگلخن داشتیم

بجائے سنگ طفلان پارہ ہای شیشہ باید زد | چو مظہر میرزا دیوانہ، نازک طبیعت را

در جائے سنگ شیشہ توان بر سرش زدن | طفلان دماغ مظہر دیوانہ نازکست

مظہر زما برید و دگر یاد ما نکرد | دیوانہ خوش نبود زوضع کرخت ما

افسوس ہو کہ مرحوم مولانا محمد حسین آزاد نے نازک مزاجی اور بد دماغی مین کوئی امتیاز نہین رکھا، انھون نے مرزا صاحب کی نفاست و مرزائیت کو بد دماغی سے تعبیر کیا، اور ان کے حالات خصوصاً اطوار و عادات کے بیان کرنے مین بقول مولنا عبدالحئی مرحوم صاحب گل رعنا "چٹکیان لی ہین،" اور "کہین واقعہ کی صورت ایسی بنائی ہو، جس مین بجائے مدح کے ذم کا پہلو نکلتا ہے" آزاد مرحوم نے مرزا صاحب کے عادات و اطوار سے متعلق جو چند حکایتین لکھی ہین ان کے جوابات مولانا عبدالحئی مرحوم نے گل رعنا مین دیدے ہین، اس لئے ہم ان کا اعادہ ضروری نہین سمجھتے

حقیقت یہ ہو کہ مرزا صاحب کو سنجیدگی و متانت قدرت کی طرف سے ودیعت ہوئی تھی، اور پھر نفاست و پاکیزگی اس پر مستزاد، ایسے شخص کی مجلس مین اگر آداب مجلس اپنے انتہائی عروج پر نہین ہون گے، تو اور کہان ہون گے، خود آزاد مرحوم کو بھی یہ تسلیم ہے کہ "جو شخص ان کی صحبت مین بیٹھتا تھا، ہوشیار ہو کر بیٹھتا تھا" لیکن اس سے اگر ہم یہ نتیجہ اخذ کرین، کہ مرزا صاحب بات بات

---

[51] معمولات مظہریہ صفحہ ۱۳۱، [52] تذکرۂ کریم الدین [53] معمولات مظہریہ صفحہ ۱۳۱،

پربگڑ جاتے تھے، اور ہمیشہ لوگوں کی نکتہ چینی کیا کرتے تھے، تو یقیناً یہ ہماری سمجھ کا قصور ہے، شاہ غلام علی[1] مرحوم کا شمار مرزا صاحب کے معتقد مریدوں میں ہوتا ہے، ان کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ مرزا صاحب نے اپنے ایک مرید سے کہا کہ تم اپنے بچوں کو یہاں کیوں نہیں لاتے، مرید نے گھر جاکر بچوں کو خوب سکھایا پڑھایا، اور سخت تاکید کی، کہ مرزا صاحب کے سامنے نہایت مؤدب ہو کر بیٹھیں، اور کسی قسم کی گستاخی نہ کریں، دوسرے دن وہ اپنے بچوں کو لیکر حاضر خدمت ہوئے، مرزا صاحب بچوں کو دیکھکر بہت خوش ہوئے، اور ان کے سن کے مطابق ان سے مذاق کرنے لگے، لیکن بچوں کو تو باپ نے سبق پڑھا دیا تھا، وہ نہایت متانت و سنجیدگی اور ادب و تہذیب سے بیٹھے رہے، بالآخر مرزا صاحب نے تنگ آکر اپنے مرید سے کہا "تم اپنے بچوں کو نہیں لائے؟" مرید نے جواب دیا، حضرت یہ کیا بچے ہیں" مرزا صاحب نے فرمایا "یہ بچے ہیں، ان کو بچہ کون کہہ سکتا ہے، یہ تو بوڑھے ہیں، ارے بچے تو وہ ہیں، کہ کوئی میرا رومال لے بھاگتا، کوئی ٹوپی سر سے اتار لیتا، کوئی کرتا پھاڑ لیتا، بھلا یہ بوڑھے بچے کیسے ہو سکتے ہیں؟[2]"

کیا ایک بد دماغ آدمی بچوں کی یہ نازبرداری کرنے کے لئے کبھی تیار ہو سکتا ہے؟

مرزا صاحب، حقیقت یہ ہے کہ بہت کریم الاخلاق تھے، ہر شخص سے تواضع اور خندہ پیشانی سے ملتے، مشائخ کرام سے ان کو بہت محبت تھی، بالخصوص حضرت مجدد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے، اکثر زیارتِ مزارات کو جاتے، اکثر فرمایا کرتے تھے، کہ مجھے جو کچھ ملا ہے، وہ میرے بزرگوں کی برکت ہے، ورنہ میرے اعمال ایسے کہاں جو قربِ الٰہی نصیب ہو، مقربان و مقبولانِ خدا سے محبت رکھنا قبولِ خدا کا بہترین ذریعہ ہے،[3]

ان کا عقیدہ اہلِ سنت و جماعت کا تھا، اکثر شیعے ان کے فیض صحبت سے سنی ہو گئے، چنانچہ

---

[1] سر سید مرحوم کی والدہ اور بڑے بھائی ان کے مرید تھے [2] قصص الاکابر [3] مقاماتِ مظہری ص ۳۵

وہ "سُنّی تراش" کے لقب سے مشہور تھے[۵۱]

مرزا صاحب کو طہارت و پاکیزگی کا بہت خیال رہتا، نماز ہمیشہ تازہ وضو سے اور مستحب اوقات مین ادا کرتے تھے، اور صلوٰۃ جماعت کا بہت خیال رکھتے تھے، اپنے مریدون اور دوستون کو بھی یہی مشورہ دیتے، اور جس کو اس کے خلاف پاتے اس سے ناراضگی کا اظہار کرتے[۵۲] لوگون کو تاکید فرماتے کہ اسلامی طریقہ سے سلام کرو، ہاتھ اٹھانے اور سر جھکانے کو منع فرماتے[۵۳]

حُسن پسندی اور نفاست مرزا صاحب مین بہت تھی، اور بچپن ہی سے تھی، چنانچہ شیر خوارگی کے زمانہ مین بھی حُسن کی طرف اس قدر میلان تھا، کہ کسی بدصورت کی گود مین کبھی نہ جاتے، لیکن کوئی خوبصورت اگر ہاتھ بڑھاتا، تو ہمک کر اس کی گود مین چلے جاتے، صاحب مقاماتِ مظہری کا بیان ہے کہ مرزا صاحب خود فرماتے تھے کہ

"مرا یاد است طفل شش ماہہ در آغوش مرضعہ بودم از نے جمیلہ مرا در کنار گرفت، جلوۂ جمالش اوّل مرا از جا برد و خاطر را با و وابستگی پیدا شد، دلم بے دیدار او قرار نمی گرفت، در فراقش گریہ می کردم بچبالہ بودم کہ آوازۂ عاشقی من بر زبانہا افتاد و در مردم مشہور گشت کہ این پسر مزاجِ عاشقانہ دارد"

مرزا صاحب بہت خلوت پسند تھے[۵۴] خلوت پسندی دنیاوی جاہ و منزلت سے نفرت کی پہلی منزل ہی، چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ مرزا صاحب کو جاہ و ثروت سے کبھی کوئی دلچسپی پیدا نہین ہوئی، خود فرماتے ہین :-

اگرچہ حُسن پرستست پارسائی جو شست | نکرد میل بدنیاے قحبہ مظہر ما

عمر بھر کرایہ کے مکان مین رہے، اپنا ذاتی مکان کبھی نہ بنوایا، فرمایا کرتے، کہ "براے گذاشتن

---

۵۱ معمولات مظہریہ ص ۱۳۱ ۵۲ ایضاً ص ۱۳۰ ۵۳ مقامات مظہری ص ۳۵ ۵۴ معمولات مظہریہ ص ۱۳۵

خانہ خویش یا بیگانہ براہ راست[۱] کھانا ہمیشہ بازار سے منگوا کر کھاتے، ہمیشہ صرف ایک جوڑا کپڑا رکھتے، نذر و نیاز کے لئے ایسی کڑی شرطیں لگا رکھی تھیں، کہ مشکل سے پوری ہو سکتی تھیں، وہ شرطیں یہ تھیں[۱]:

(۱) پیش کرنے والا نجیب و شریف ہو، (۲) دنیا داروں سے میل جول نہ رکھتا ہو،

(۳) صالح و پرہیزگار ہو، (۴) حرام و حلال میں تمیز کر سکتا ہو،

(۵) ایسے ملک سے تازہ وارد نہ ہو جہاں لوٹ مار ہوتی ہو (۶) اخلاص و عقیدت سے پیش کرتا ہو،

مرزا صاحب بیماروں کی عیادت کو ضرور جاتے، ہر شخص کو ہمیشہ نیکی سے یاد فرماتے، صحابۂ کرام و اولیاے عظام کے نام بغیر تعظیم و تکریم کے زبان پر کبھی نہ لاتے، کبھی کسی کی غیبت نہ کرتے، اور نہ غیبت کرنے والوں کو اچھی نگاہ سے دیکھتے، جو ان کے عیوب اُن پر ظاہر کرتا، اُس سے ناراض نہ ہوتے بلکہ اس کا شکریہ ادا کرتے، ہمیشہ نرمی سے بات کرتے، کسی پر اعتراض نہ کرتے، بہت سخی و فیاض تھے[۳]،

مرزا صاحب کی کتاب اخلاق کا سب سے نمایاں اور امتیازی باب ان کی پیروی سنت رسول انام ہے، چنانچہ وہ خود فرمایا کرتے تھے، کہ میں نے اپنے اوقات و اعمال کو سنت نبوی کے طریقہ پر تقسیم کیا ہے، اور اسی پر عمل کرتا ہوں، اگر تم میں سے کوئی میرا کوئی کام خلاف شرع دیکھے، تو مجھے متنبہ کر دے[۴]، اور یہ بات ان میں بچپن ہی سے پائی جاتی تھی، چنانچہ ایک دن اپنے والد ماجد کے ساتھ ان کے مرشد (شاہ عبد الرحمن قادری) کی خدمت میں گئے، شاہ صاحب فکر و سماع کی حالت میں تھے عصر و مغرب کی نماز قضا ہو گئی، مرزا صاحب نے اسی وقت دل میں عہد کر لیا کہ اگر والد ان سے بیعت کیلئے کہیں گے تو نہ کروں گا[۵]، اوپر جو ہم نے مرزا صاحب کے عادات و اطوار لکھے ہیں ان پر آپ غور کریں، تو ان میں سنت نبوی کی پیروی سراسر آپ کو نظر آئے گی، ہر شخص کو نیکی سے یاد کرنا، ہر شخص سے مہربانی و شفقت

۱؎ معمولات مظہریہ ص ۷۲ ۲؎ ایضاً ص ۱۲ ۳؎ ایضاً ص ۱۳ ۴؎ مقامات مظہری ص ۳۵ ۵؎ معمولات مظہریہ ص ۲

اور تواضع اور خندہ پیشانی سے ملنا، نرمی سے گفتگو کرنا غیبت و بدگوئی سے پرہیز کرنا کبھی اپنا ذاتی مکان نہ بنوانا، ہمیشہ صرف ایک جوڑا کپڑا رکھنا، غایت پاکیزگی طہارت یہ تمام اعمال، سنتِ نبوی کی پیروی نہین تو اور کیا ہے؟ غرض مرزا صاحب کا ہر کام سُنّتِ نبوی کے مطابق ہوتا تھا، اور یہی ایک مسلمان کا بہترین حاصلِ زندگی ہے،

بعض مکاتیب مین بھی سُنّت نبوی کے اتباع پر زور دیا ہے، ایک مکتوب مین فرماتے ہین:

"کاری غیر از ترویج شریعت و طریقت از زندگی مقصود نیست ...... ما و شما را برا اتباع سُنّت نبویہ علیہ الصلوٰۃ والتحیۃ استقامت روزی کند"۔ (مکتوب پنجاہم)

قاضی ثناء اللہ پانی پتی کو لکھتے ہین:۔

"درین ایام بر خاطر نسق اتباع سُنّت بسیار مستولی است"۔ (مکتوب ہفتاد و نہم)

مرزا صاحب کی کتاب اخلاق کا دوسرا درخشان باب ان کا توکل و استغنا ہے، یہان ہم چند واقعات درج کرتے ہین، جن سے ان کے توکّل و استغنا اور دنیا سے بے تعلقی کا اندازہ ہو سکتا ہے،

ایک مرتبہ محمد شاہ نے اپنے وزیر قمرالدین خان کی زبانی کہلا بھیجا، کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو حکومت بخشی ہے، آپ کا جو کچھ جی چاہے، بطور ہدیہ قبول فرمائیے، مرزا صاحب نے جواب دیا، کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے قل متاع الدنیا قلیل جب کل دنیا قلیل ہے، اور تم کو اس قلیل کا ساتوان حصہ ملا ہے، تو تمہارے پاس ہے ہی کیا، جس کے لئے فقیر کا سر جھکے گا،[1]

ایک امیر نے حویلی، خانقاہ اور فقرا کے لئے وجہ معاش خدمت مین پیش کی، قبول نہین فرمایا،[2]

ایک روز سخت سردیون کے دن مین ایک پرانی چادر کاندھے پر ڈالے ہوئے تھے نواب خان

[1] مقامات مظہری ص ۳۴ [2] ایضاً ص ۳۴

فیروز جنگ حاضر مجلس تھے، یہ دیکھ کر آنکھیں پُرنم ہوگئیں، اپنے ایک مصاحب کو مخاطب کرکے کہا "یہ ہماری بدبختی کی دلیل ہے، کہ وہ بزرگ جن کی خدمت مین ہم کو ارادت وبندگی حاصل ہے، ہمارا تحفہ قبول نہین فرماتے" حضرت میرزا نے فرمایا "مین نے عہد کیا ہے، کہ مالدارون کا تحفہ قبول نہین کرونگا، اب کہ میری زندگی کا آفتاب قریب غروب ہے، اپنے اس عہد کو کیسے توڑ سکتا ہون"[۱]

ایک مرتبہ نظام الملک تیس ہزار روپئے نقد بطور نیاز لائے، مرزا صاحب نے قبول نہین فرمایا، نظام الملک نے کہا "اسے لیکر راہِ خدا مین حاجتمندون کو تقسیم کردیجئے" فرمایا "مجھے اس کا سلیقہ نہین، یہان سے تقسیم کرنا شروع کردو، گھر پہونچتے پہونچتے ساری رقم ختم ہوجائیگی"[۲]

ایک مرتبہ ایک افغان سردار نے تین سو اشرفیان بھیجین، قبول نہ کیا[۳]

مرزا صاحب، صرف یہی نہین کہ امیرون کے تحائف وہدایا لینے سے انکار فرماتے، بلکہ جہانتک ممکن ہوتا، ان لوگون سے ملنے مین بھی احتراز فرماتے، اس کے اشارات ان کے خطوط مین بھی ملتے ہین، چنانچہ ایک مکتوب مین فرماتے ہین :

"ذونہی خان را کہ ارادہ ملاقاتِ فقیر داشت منع کردم کہ نیاید وحافظ رحمت خان کہ پیش فقیر حاضر شدہ بود صحبت او با فقیر نادرست افتاد" (مکتوب پنجاہ وچہارم)

نواب خانخانان خلف نواب قمرالدین وزیر کو اس طرح ڈانٹ بتاتے ہین:

"امرائے این جہان را باید کہ با سلاطین آن جہان یعنی فقرا باادب باشند، خصوصاً در اوقات استمداد واستعانت کہ دلِ فقرا ملتفت گردد، درچنین اوقات بے پروائی کردن وتحریر مطالب بعہدۂ بے ادبان گذاشتن ضرر دارد، اگر حُسن ظنّے درمیان است، ادب واجب است واگر نسبت رجوع وانابت چہ ضرور است، باندیشہ ہمین اختلاط ورسم مراسلات ترک نمودہ ایم

---

[۱] مقاماتِ مظہری ص۳۴ [۲] ایضاً ص۳۴ [۳] ایضاً ص۳۴،

وو عا گفتہ ایم" (مکتوب شصت ویکم)

لیکن مرزا صاحب غریبون سے بہت محبت سے ملتے تھے، احمد علی سندیلوی (صاحب تذکرۂ مخزن الغرائب) مرزا صاحب کے ہمعصر تھے، ان کا بیان ہے کہ

"با غربا بسیار بتواضع پیش می آمد، فقیر راقم مسو د ہ د و سہ دفعہ بخدمتش رسیدہ، ہنوز لذت صحبتش از دل نرفتہ"[1]

مرزا صاحب اپنے مریدون اور دوستون کو بھی ہمیشہ توکل و استغنار کی تاکید فرماتے، اور اہل دنیا سے ضرورت سے زیادہ میل جول بڑھانے پر ناراضگی کا اظہار فرماتے[2]

اگر کوئی مرید یا کوئی غریب شخص ہدیہ پیش کرتا تو قبول فرما لیتے، لیکن امرار کے تحائف قبول کرنے سے سخت احتراز فرماتے، اس بنا پر کہ امرار دوسرون کا مال غصب کرتے ہین[3] چنانچہ ایک مرتبہ ایک امیر نے کچھ آم اُن کی خدمت مین ہدیۃً بھیجے، مرزا صاحب نے حسب معمول قبول کرنے سے انکار کر دیا، بہت الحاح و منت کیا تو اس نے پھر بھیجا، انھون نے اس مین سے صرف دو آم لے لئے اور باقی واپس کر دیئے، اسی وقت ایک باغبان دوڑا ہوا آیا، کہ فلان امیر نے جبرًا میرے باغ مین سے آم توڑے، اور حضور کو ہدیۃً بھیجے، مرزا صاحب بہت مکدر ہوئے[4]

مرزا صاحب، اہل فضل و کمال کی حسب مراتب تعظیم و تکریم کرتے لیکن کسی بے دین کی تعظیم مین خواہ وہ امیر ہو یا غریب کھڑے نہ ہوتے[5]

---

[1] مخزن الغرائب نسخہ دار المصنفین [2] مقامات مظہری صفحہ ۳۶ [3] ایضاً صفحہ ۳۴ [4] ایضاً صفحہ ۳۵ [5] ایضاً صفحہ ۳۵

فہم انسانی

ڈیوڈ ہیوم کی مشہور کتاب "ہیومن اسٹینڈنگ" کا ترجمہ اور اس کے مختصر حالات کے ساتھ اس کے خیالات فلسفہ پر بحث و تبصرہ، حجم ۲۲۰ صفحے قیمت عہ "مینجر"

مثنوی محبّت نامہ سوز و گداز

ملّا نوعی خبوشانی

از

نواب صدر یار جنگ بہادر مولینا حبیب الرحمن خان شروانی

"مولوی سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب رفیق دار المصنفین کا جو مسلسل مضمون "مغل بادشاہوں اور شاہزادون کا علمی ذوق" کے عنوان سے نکل رہا ہے، اوس کے اکتوبر نمبر مین ملا نوعی خبوشانی کی مثنوی سوز و گداز کا ذکر آگیا تھا، کتبخانہ حبیب گنج کے خزانہ مین حسن اتفاق سے اسکا ایک نسخہ موجود ہے، صاحب کتبخانہ نے چند ماہ ہوئے کہ اس مثنوی پر یہ تبصرہ لکھکر عنایت فرمایا تھا، مگر بعض وجوہ سے اسکی اشاعت مین غیر معمولی تاخیر ہوگئی جس کا افسوس ہے، "س"

اکتوبر ۱۹۴۱ء کے معارف مین مرزا دانیال شاہزادہ کے تربیت یافتون کے ذکر مین ملا نوعی خبوشانی اور اُن کی مثنوی سوز و گداز کا ذکر آگیا ہے، اس مثنوی کا ایک نسخہ نادر میرے یہان ہے، معلوم ہوتا ہے کہ کسی نکتہ سنج شائق نے لکھوایا تھا، کاغذ، خط، نقاشی و طلاکاری سب ملکر بیک زبان شوق اور نکتہ سنجی کی شہادت دے رہی ہین،

اسی جلد میں اور ہوبہو اسی تیاری کا ایک اور نسخہ ملا وحشی کی نایاب مثنوی شیرین فرہاد کا بھی ہے، فرق صرف اتنا ہے، کہ مثنوی سوز و گداز کے عنوان مین زرین تاج ہے، شیرین خسرو اس سے عاری ہے، تقطیع ۵ × ۴، ا نچہ ہے، جیبی ہے، معلوم ہوتا ہے، کسی دلدادۂ سخن کے دل سے

یہ نسخہ روح افزا لگا رہتا تھا خط جلی استادانہ، کاغذ وصلی، مائل بہ سنہری، بکثرت زرافشاں عنوان طلاکاری مینائی لاجوردی، دو پہلے صفحے طلاکار بین السطور جدول طلائی ولاجوردی تمام نسخہ بے عیب وصاف ہے، افسوس ہے کہ کاتب کا نام اور تاریخ درج نہیں مجموعی شہادت یہ ہو کہ مؤلف کے زمانہ کے قریب کا لکھا ہوا ہے، تعداد اشعار پانسوچوراسی ۵۸۴ ہے،

کلام پر رائے — نوعی نے اس کا نام ایک عنوان مین محبت نامہ سوز وگداز لکھا ہے، اسم بامسمی ہی کلام بہت گرم، بلکہ اول سے آخر تک آتش فشان ہے، اسی کے ساتھ بیان مین نزاکت ہے، واقعہ کی تصویر مصورانہ نکتہ سنجی سے کھینچا ہے، گرمی بیان پر شاہزادہ داراشکوہ کا یہ شعر صادق آتا ہے،

تنم بسوخت دلم سوخت استخوانم سوخت تمام سوختم و شوقِ سوختن باقی است

خوبی و گرمیِ کلام متقاضی ہے کہ معارف کے قدرشناس اوس کے لطف سے بہرہ اندوز ہون، انتخاب حاضر ہے،

نوعی کا حال مزید سنہ وفات کی تصحیح — معارف مین نوعی خبوشانی کا سنہ وفات ۱۰۰۹ھ درج ہوا ہے، جو صحیح نہین، صحیح بموجب بیان ریاض الشعراء و خزانہ عامرہ وغیرہ سنہ ۱۰۱۹ھ ہی، میر آزاد نے حسبِ عادت تاریخ عبارت مین لکھی ہے،" فی سنۃ الف و تسع عشرہ"

ریاض الشعراء مین ہے،" درسنہ یک ہزار و نوزدہ در برہان پور برحمتِ الٰہی پیوستہ"

تذکرۂ خزانہ عامرہ مین ہے، کہ شاہزادہ دانیال کی وفات کے بعد نوعی خانخانان کی بارگاہ مین باریاب اور اسکی قدردانیون سے کامیاب ہوا، قصیدے اور ساقی نامہ اوس کی مدح مین لکھا، گرانمایہ صلے حاصل کئے، ذخیرۃ الخوانین کی یہ روایت نقل کی ہے" یک بار خان خانان ملا نوعی را بزر سنجید"

دیوان — دیوان نوعی کے دو نسخے قلمی میرے یہان ہین، دونون اقسام کلام قصائد و غزل و

مثنوی و رباعی سے معمور ہیں، خوشخط و کامل ہیں، دونوں میں مثنوی سوز و گداز ہے، ایک نسخہ میں ایک اور مثنوی بھی ہے، یہ مثنوی ساقی نامہ ہے جو خانخانان کی مدح میں لکھا گیا تھا، خزانۂ عامرہ میں اس کا ذکر ہے، بہت شگفتہ و مستانہ کلام ہے، ایک موقع پر لکھا ہے،

شرابے کہ خون در بدن گل کند ... بتن موچو منقار بلبل کند

بمن دہ کہ مست و گل افشان روم ... رہ مدحت خان خانان روم

ایک دیوان پر تاریخ تحریر درج نہیں، دوسرے پر ۱۰۶۸ھ مقام برہانپور تحریر ہے، اس طرح یہ دیوان نوعی کی وفات کے انچاس [۴۹] برس بعد لکھا گیا ہے،

انتخاب مثنوی سوز و گداز ملا نوعی خبوشانی

حمد

الٰہی خندہ ام را نا لگی دہ، ... سرشکم را جگر پر کا لگی دہ،

نفس را جلوۂ آہ جگر بخش ... نظر را سوے خود راہ سفر بخش

دلم را عندلیب آوازہ گردان ... گل باغم بآتش تازہ گردان

مۓ شوقم دہ از پیمانۂ عشق ... کہ جوشد بر لبم پروانۂ عشق

بآتش آب دہ تیغ زبانم ... کہ جز حمدت نروید از بیانم

زنخل اینم دہ خامۂ حمد ... کہ آرایم بنامت نامۂ حمد

بپا اندازِ حمدت کار جنبد ست ... زبان تا دل پرند انداز پرند ست

ولے پاے کہ بر گل ناز دارد ... کجا پرواے پا انداز دارد

من و حمدت زبان را خاک بر سر ... ادب را درع طاقت چاک در بر

نعت

محمد صیقلِ مرآتِ بینش نظر پیماے چشمِ آفرینش

شفاعت سنجِ جرمِ آبادِ ہستی قناعت گنجِ ملکِ تنگدستی

فلک گلدستۂ طرفِ کلاہش ملک پروانۂ شمعِ نگاہش

ز شہرستانِ رحمت بے نصیبم غریبم یا رسول اللہ غریبم

تو بیکس دوست من ہمسایہ دشمن نیابی تا کسے بیکس تر از من

ز رحمت زار خویشم دہ گیاہے بہشتی کن گیا ہم از نگاہے

مناجات

خدا و ندا دلم افسردن آموخت نفس وز دیدہ از دل مردن آموخت

بناخن گر بکاوی آہن و سنگ ہر جا شعلۂ بینی بر آورنگ

غرامت بین کہ این ناکس دل من نہ کوہ طور شد نے سنگ و آہن

من و این دل کہ گمنامِ زبان باد چنین دلہا نصیبِ دشمنان باد

ز خونِ این چنین دل خاک تر بہ چنین دل طعمۂ زاغ و زغن بہ

بجاے این دلِ افسردہ پیکر دلِ پروانہ ام دہ یا سمندر

دلے ریشے از آن اجزای جان ریش دلے کز نامِ او گردو زبان ریش

دلے ہمسایۂ فریاد بلبل دلے صید گل و صبیا و بلبل

دلے سر تا قدم چون شعلہ روشن کشیدہ کسوتِ فانوس بر تن

ز شوقے کن سرم را سجدہ فرسا کہ شوق از سرندانم سجدہ از پا

شہادت را شرابِ ہوشِ من کن محبت را گلِ آغوشِ من کن

سرے دہ زادۂ خمخانہ رطور، کز و مستی و ہشیاری بود دور
کہ ہرگہ سایہ اش بر ساغر افتد تو گوئی آتش اندر مجمر افتد
شبِ تاریک و در سر دیدہ اعمی کرامت کن چراغانِ تجلی،
ز نورِ حدِ تمم خاطر برا فروز بطورِ روتیم راہے بیاموز
دلم را عافیت اندیشگی دہ نہادم را شریعت پیشگی دہ،
عروجے دہ بمعراجِ قبولم رہے بنما بدرگاہِ رسولم

سبب تالیف کتاب شہزادہ دانیال نے بلایا،

قضا فرمان شہنشاہِ جوان بخت فلک خرگاہ ماہِ آسمان تخت
چراغ افروز مسند گاہِ اقبال گلِ خورشید نو شہزادہ دنیال

بلا کر کہا:-

حدیث بلبل و پروانہ تا چند ہوس در خواب این افسانہ تا چند
کہن شد قصۂ فرہاد و شیرین چو عیشِ رفتہ، و تقویم پارین
بجز نامے ز لیلیٰ بر زبان نیست بجز حرفے ز مجنون در میان نیست
یکے بر طرفِ آتشخانہ بگذر، بر آئینِ بت و بت خانہ بنگر،
عجب تر آنکہ بعد از مرگ مردان زنان بر شیوۂ آتش نوردان
ز آتش، دامنِ ہمت نپیچند جوانمردانہ در آتش نشینند،
رخ از جامِ سمندر بر فروزند، ز بہر مردۂ خود را بسوزند،
تعجب نیست کز دعوائے صادق بسوزد در غمِ معشوق، عاشق،
نوائے این عجب شاید بعیوق کہ سوزد بہرِ عاشق زندہ معشوق

ہمین باشد ہمین معراجِ ہمت
نثارِ جان تاراجِ محبت

کسے نوعےنمی آساید از عشق
ازین ہا ہر چہ گوئی آید از عشق

ایا پروانۂ بلبل ترنم
جگر خون غنچۂ آتش تبسم

ہمی خواہم باندک روزگارے
برانگیزانی از آتش بہارے

حدیثِ شمع کلکت برفروزد
کہ ہر کس بشنود جانش بسوزد

بحرفِ تازۂ خرم کنی گوش
کہ تاریخِ کہن گردد فراموش

نوعی نے یہ حکم سنکر مثنوی لکھی،

لعابِ شعلہ بر کاغذ تنیدم
گہر در رشتۂ آتش کشیدم

بستی آن رہ نا رفتہ رفتم
رہ یک سالہ در یک ہفتہ رفتم

چون این غم نامۂ سوزان حکایت
نفس بگداخت در کام روایت

رقم زد خامۂ معجز طرازش،
محبت نامۂ سوز و گدازش

برات روانہ ہوئی نوشہ کا عالم،

بہ پیشِ گل فگندہ از مہ نقابے
بمہتابے نہفتہ آفتابے،

زگل آغوش زین رشکِ چمن شد
زنکہت بارگی بادِ ختن شد

نظر بتخانہ گردیدہ دل برہمن
شکیبائی عنان و شوق توسن

قدم بر آرزو می سود و می رفت
نگاہش بر قفاے بود و می رفت

عالم مسرت عام،

جہان سرشارِ شوقِ شادیِ او
عروسی خانۂ دل آبادیِ او

خروشِ نامے و بانگِ شادیانہ
فگندہ حلقہ در گوشِ زمانہ

چراغان کردہ بام و در گلستان
گلستانے ز فانوسش خیابان

بجان شہرے تماشا مست شادی
فلک گلدستہ در دست شادی

چھتے مین برات داخل ہوتی ہے،

رسیدند از قضا در تنگنا سے
چو دہلیز عدم تاریک جاے

برونے چون درونِ دخمہ تاریک
رہے چون نقبِ موران تنگ و تاریک

بہر سویش بلند ایوان و قصرے
کہ بودے سایہ اش بر طاقِ کسریٰ

ز بس طوفان برد شبنم فشاندہ
درستی در گل و خشتش نماندہ

شکست اندر شکست آن بام و دیوار
تبارِ عنکبوتش بستہ معمار

ہوا مزدورِ پشتی بانیِ او
نفس معذور در ویرانیِ او

خروشِ صور چون از جای جنبید
بنایش چون بنائے قبر لرزید

ز بس زلزال کوسِ آتشین دم
بنایش چون مقوی ریخت از ہم

چون از ہم ریخت آن فرسودہ پیکر
نہان شد زیر ہر خشتیش صد سر

چنان با خاک خشتش تخم سرکشت
کہ خشت از سر ندانستے سر از خشت

شکست آن دخمہ چون بر فرقِ داماد
تو گفتی آسمان بر خاک افتاد

خروش از چرخِ نیلی پوش بر خاست
ز ہر دل صد قیامت جوش بر خاست

نواے مطربان شد نوحہ آہنگ
شکستے گریہ ناخن در دلِ سنگ

شد از نیرنگ چرخِ سند روسی
عروسی ماتم و ماتم عروسی

چو در شہر این صداے ناخوش افتاد
ہمی گفتی کہ در شہر آتش افتاد

نوشہ کی ارتھی چلی،

روانش در عماری جاے دادند | عماری راچو گل بر سر نہادند
ہمان با کوس و نای و مطرب و نے | ہمی رفت و جہانے ہمرہ وے
عروس شعلہ شد جانانہ او | شد آتش گہ عروسی خانۂ او

حادثہ کی عروس کو خبر ہوئی،

چو آن خواب پریشان دید دختر | چو گل بر باد حسرت داد معجر،
ز عشرت خانہ سرمستانہ برجست | خسک بر پاے و آتش برکف دست
برہنہ پا و سر چون شعلہ مفتون | ہمی گفتے کہ لیلےٰ گشت مجنون
ز مستیہاے شوق جانسپاری | شدہ پروانۂ شمع عماری
ز شوق سوختن در آتش دوست | نمی گنجید ہمچون شعلہ در پوست
چو نخل شعلہ می نالید و می رفت | بر آتش سینہ می مالید و می رفت

مخلوق کی پریشانی اور سمجھانا

جہانے خانہ سوز آہ و افسوس | کہ جوید شیوۂ پروانہ طاؤس
حکیم و فیلسوف و پیر و دانا | فسون آموز آن دل ناشکیبا
کہ شوقش زان تمنا فرد سازند | بجانش مہر آتش سرد سازند
برہمن ملتان بت پرستار | ہدایت مرشد ناقوس و زنار
ز ہر سو نغمہ سنج صد نویدش | تسلی دہ ز صد بیم و امیدش

لڑکی کا جواب

ولے او مست آتش آشنائے | زبان نشناس کا فرماجرائے
بگفت ایت بنع من گراید | سجود او دگر از من نیاید

کسے را اختیارِ جانِ کس نیست / نہ خود جانِ من است این زان کس نیست

چرا تا زندہ ام شرمندہ باشم / کہ سوز و دلبر و من زندہ باشم

سمجھانے والے چپ ہوگئے،

چو از ہر مکر و حیلت باز رستند / زبان بستند و در ماتم نشستند

اکبر بادشاہ کو خبر ہوئی،

چمن پیرائے این آتش ہوا باغ / نمک سود این چنین سانِ گلِ داغ

کہ چون این قصہ در عالم سمر شد / شہِ کار آزمایان را خبر شد

طلب کرد آن بتِ کافر لقب را / بکوثر بار داد آن تشنہ لب را

بفرمانِ شہ آمد آتش آلود / چو سرکش شعلۂ پیچیدہ در دود

قدے چون شعلہ از تعظیم خم داد / زمین سجدہ را فیضِ ارم داد

شہ از لطفش بپائے تخت بنشاند / جواہر ہائے لب بر فرقش افشاند

کشیدش از نوازش دست بر سر / سر او تخت و دستِ شاہ افسر

تسلی دادش از مسکین نوازی / بشیرین بذلہائے لعب و بازی

بفرزندئ خود داد اختصاصش / بعصمت گاہِ خلوت کرد خاصش

ز ہر جنبش از مہ تا بماہی، / کرامت کرد غیر از بادشاہی

لڑکی پر شاہی فہمایش کا کچھ اثر نہ ہوا،

ولیکن آن زنِ مردانہ ہمت / شکر لب طوطئ پروانہ ہمت

ز صد عالم تمنی بر تمنی / نمی شد جز بجان دادن تسلی

لبش جز گوہرِ آتش نمی سفت / بغیر از سوختن حرفے نمی گفت

بادشاہ نے مجبوراً اجازت دی، انتظام کیا گیا،

چو عاجز شد شہ از دلجوئی او | عنان برتاخت ز آتش خوی او
اجازت گونہ دادش نہ از دل | ز شادی برپرید آن مرغ بسمل
بآخر آن سپہر دانشش داد | قرار چارہ بر بیچارگی داد
اشارت کرد با پور جوان بخت | کہ اے چشم و چراغِ افسر و تخت
برایں شعلہ را تا کانِ آتش | در افگن آتشے در جانِ آتش
بدلجوئیش چون شیر و شکر شو | چو خورشیدش بآتش راہبر شو
اگر نرمی پذیر دیا ورش باش | و گرنہ ہمچو آتش بر سرش باش
بخرمن عود و صندل بر فروزان | بر سمِ دخت رایانش بسوزان
گل بخت و بہارستانِ اقبال | مرادِ انس و جان شہزادۂ دنیال
بحکمِ شاہ فرمانِ تماشا | روان شد ہمرہِ آن شکیبا
جہانے کردہ وقف از ہر کنارہ | متاعِ جان تباراجِ نظارہ
شہش در ہر نظر داوے پیامے | بہر گامے رداکردیش کامے
تمامے رہ بر وافسانہ می خواندا | دلش میداد و رخش آہستہ می راند
ولے او از ہر دو عالم بے خبر بود | بجانش شوقِ آتش کارگر بود
بشہ گفتہ مرا بدنام کردی | بافسون روزِ عیشم شام کردی
ز صبرم رنجہ خواہد گشت یارم | بخواہد مرد آتش ز انتظارم
بآخر شہ چو از گفتن فرو ماند | گلاب یاس بر سوزِ دل افشاند
اجازت داد کآتش برفروزند | در آتش ہر دو را باہم بسوزند

اطاعت پیشگانِ شاہزادہ ‌ ‌ ‌ بخدمت نقدِ جان برکف نہادہ

چو از شہ نغمۂ رخصت شنیدند ‌ ‌ ‌ بسوے خیمہ چون آتش دویدند

زبس چیدند برہم صندل وعود ‌ ‌ ‌ جہان پُر شد ز دودِ عنبرآلود

کم از مژگان بہم سودن زمانے ‌ ‌ ‌ مہیا شد سمندر آشیانے

نخست آن کشتہ را در وے نہادند ‌ ‌ ‌ بخور آسا بمجمر جاے دادند

چو دودش با دماغِ دختر آمیخت ‌ ‌ ‌ شدش جان عطسہ و برخاکِ رہ ریخت

سپند آسا بوجد افتاد و برخاست ‌ ‌ ‌ بشکرِ شہ زبان چون شعلہ پیراست

ز بعد شہ وداعِ یک بیک کرد ‌ ‌ ‌ دو چشمِ حاضران کانِ نمک کرد

ہمی رفت و بتحریکِ زبانی ‌ ‌ ‌ ز غم می سوخت بے آتش جہانی

لب از پان سُرخ و چشم از سرمہ خونریز ‌ ‌ ‌ چو یاقوتے شد اندر آتشِ تیز

چنان مستانہ بر آتش نظر کرد ‌ ‌ ‌ کہ از بد مستیش آتش حذر کرد

چنان از شوقِ دل بیتاب گردید ‌ ‌ ‌ کہ از گرمیش آتش آب گردید

چو موج انگن شد آن طوفانِ خونریز ‌ ‌ ‌ در آمد در میانِ آتشِ تیز

در آتش ہمچو صرصر پاے کوبان ‌ ‌ ‌ غبار از خویش و دود از شعلہ روبان

محیطش گشت آتش با صد افسوس ‌ ‌ ‌ تنِ او شمع و آتش گشت فانوس

زخونِ دل بر آتش روغن افشاند ‌ ‌ ‌ سپندِ اشک دامن دامن افشاند

ز آتش وعدہ گاہِ یار پرسید ‌ ‌ ‌ سُراغِ جلوۂ دلدار پرسید

خبر داد آتش از رازِ درونش ‌ ‌ ‌ بکوثر گشت آتش رہنمونش

چو آگہ شد ہم از رہ بر سرش تاخت ‌ ‌ ‌ نقابش را ببوس از رو برانداخت

سرش و رید بر زانو نہادش ، لبش بوسید و رو بر رو نہادش

کشیدش تنگ تر از جان در آغوش ، چو جانان یافت کرد از جان فراموش

بنوعے امتزاجِ آن دو تن شد ، کہ جانِ این تنِ آن را کفن شد

شاہزادہ پر اثر رقت اور مکرر فرمایش

چو نقشِ حالِ او شہزادہ برخواند ، گلاب از گلبنِ مژگان برافشاند

دمے چون ابرِ رحمت زار بگریست ، کہ ما را شرم باد از تہمتِ زیست

زغم مست از شراب گریہ مدہوش ، در آتش راند مرکب چو سیاوش

بگفت اے شیر دل معشوق صادق ، ہمین باشد عروجِ عشقِ عاشق

بہ تحسین روے مردان بر زمین ست ، ہزاران آفرین بر آفرین ست

تسلی شو کہ کارِ خویش کردی ، بہ دعوی زانچہ گفتی بیش کردی

کنون شہرے زتیمارت خراب ست ، گر از آتش برون آئی صواب ست

لڑکی نے سن کر جواب دیا ،

ہمین آواز شاہ آمد بگوشش ، باستقبالِ آن برخاست ہوشش

ز حرف سوز ناکِ لب بخون شست ، کہ دل تبخالہ گشت و از لبش رست

کہ اے کاملِ عیارِ عشق سنجان ، مرنجانم مرنجانم مرنجان

پس از عمرے نصیبم شد وصالے ، وصالے بے وفا تر از خیالے

درم وصلم زمانِ واپسین است ، بعمر خویشم آسایش ہمین است

رخش نادیدہ عمری ز اشتیاقش ، تمنا کردہ بودم در فراقش ،

کنون کش یافتم بے رنج اغیار ، رہا کردن ز ہے ننگ و زہے عار

بمردن دستش از دامن ندارم — دلم دارد وفا گر من ندارم
اگر راهِ وفاداری بپویم — بمحشر چون جوابِ عشق گویم
هوس از عشقِ من شرمنده بهتر — بمرگِ من محبت زنده بهتر
لبش با شاه در گفت و شنود بود — ولے هر ذره اش آتش درو بود
چنان طوفانِ آتش رُخ برافروخت — که حرفش درمیانِ گوش و لب سوخت
دلش مشغولِ رازِ خود فروشی — زد آتش بر لبش مهرِ خموشی
کشید آتش ز شوقش در بغل تنگ — چو مخمورے که در ساغر زند چنگ
ملاحت پیکرش درهم نوردید — چو مستی در کبابِ شور پیچید
تنِ صافیش چون شد شعله آلود — تنِ او شعله گشت و شعله شد دود
رخش از تابِ آتش تازه گلشن — برو هر شاخِ سنبل نخلِ ایمن
هزارش سوز و آتش در رگ و پوست — ولے مغزِ دلش آغشتهٔ دوست
وجودش چون خمِ مے جوش در جوش — زبانش چون لبِ پیمانه خاموش
در آتش چون سمندر غوطه ور شد — همه ذراتِ او آتش شرر شد
ز استیلاے آتش سر نه پیچید — ازین پهلو بآن پهلو نگردید
سراسر سوخت ذراتِ وجودش — که از دل بر زبان نگذشت دودش
همان در نعتِ عشق و ذکرِ آن گل — زبانش طوطی و دل بود بلبل
بگاهِ سوختن از هر کناره — روان شد تیرِ بارانِ نظاره
دو بار افراشت از آغوشِ هوشش — سرِ خود چون حباب از دودِ آتش
چو خورشیدِ قیامت آتشین روے — هزاران شعلهٔ ژولیده در موے

بہر سو کرد خندان لب نگاہے نگاہِ گرم تر از برقِ آہے
دو بار از قعرِ آتش سر بر آورد حبابش غوطہ ہم بر سر آورد
ز گرمی گشت آتش بر تنِ خشک شد او خاکستر و خاکسترش مشک
کفِ خاکسترِ آن پیکرِ نور مصفا تر نمود از مغز کافور
مجرد شد چو روح از تن پرستی با آتش پاک شد از جرم ہستی
ز جرمِ آب و گل شد صاف بے غش بیالود از حریرِ نورش آتش
ز ہر آلایشے خود را بری کرد لباسِ عمرش آتش گازری کرد
مبرا زین حیاتِ رائگان شد پذیرائے حیاتِ جاودان شد
بیک جان دادن از صد دل در دست بری شد از خود و با دوست پیوست
ہر آنکس را کہ سوزِ عشق دل سوخت جوانمردی از ین زن باید آموخت
بفتوائے سخی ہمت نوردان تمامِ زن بہست از نیم مردان
زنے جان در ہوائے مردہ باخت چو طوفانِ محبت آتش افراخت
ترا نو عی زمردی شرم بادا وزین دون ہمتی آزرم بادا
کہ نتوانی قدم بر جان فشردن ز شوقِ زندۂ جاوید مردن
دریغ این لافِ عشق و نامِ مردی حرام این دعوی احرام مردی

لغاتِ جدیدہ

عربی زبان کے اخبارات، رسائل اور تصنیفات اور بول چال مین ہزارون نئے الفاظ پیدا ہو گئے ہین جن کے بغیر آج کل کی عربی زبان کا سمجھنا دشوار ہے، مصنف نے اس کتاب مین اس قسم کے چار ہزار جدید عربی الفاظ کا لغت لکھا ہی، قیمت:: عہر

"منیجر"

اردو اخبارات کا ارتقاء

از

جناب سید ابو عاصم صاحب ایم اے ایل ایل بی علیگ

(۲)

دوسرا دور ۱۸۵۶ء تا ۱۸۵۷ء | ۱۸۵۶ء میں ڈلہوزی ہندوستان سے رخصت ہوا، اور کیننگ گورنر جنرل ہوا، لیکن ڈلہوزی ہندوستانیون کے مجبور اور مایوس دلون پر ایسا تیل چھڑک گیا تھا، جو ایک معمولی سی چنگاری سے بھڑک اٹھا، ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ایک معاشرتی ردعمل تھا، اور اس کو اسی روشنی مین سمجھنا چاہئے، اس مین نہ کسی غیر ملک کا ہاتھ تھا اور نہ یہ غریب بہادر شاہ کی سازش کا نتیجہ تھا، بلکہ ہندوستان کی معاشرت کی تباہی، افلاس اور اسکی عظمت کے خاتمہ نے ہندوستانیون کی حالت اس ستم رسیدہ بلی کی سی بنادی تھی جو عاجز آکر شیر پر بھی حملہ کر بیٹھتی ہے، انگریزون کے حقارت آمیز برتاؤ نے انھین یہ محسوس کرنے پر مجبور کر دیا کہ یہ بدیسی ان کے کلچر کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہین، اس پر مستزاد یہ ہوگیا، کہ اودھ کے نواب کو معزول کرکے کلکتہ بھیج دیا گیا، اور بہادر شاہ کا خطاب اور پنشن تک چھیننے کے مشورہ ہونے لگے، یہ صحیح ہے، کہ دلی اور اودھ کی بادشاہت چھین گئی تھی، لیکن دلون پر اب بھی انہی کی حکومت تھی، بادشاہ تمدنی اور معاشرتی زندگی کا مرکز تھا، اور راجا اور پرجا مین ایک رشتہ تھا، ۱۸۵۲ء مین گورنر جنرل نے بادشاہ کے وکیل کو معمولی آدمی سمجھ کر ملنے سے انکار کر دیا، [1]

اس سے عوام کے دلون پر کچھ کم دھکا نہین لگا ہوگا، پھر انگریزون کی بدعہدی، خود غرضی اور بدنیتی نے ان کو بالکل بے نقاب کر دیا تھا، اور لوگ اُن سے متنفر ہوگئے تھے، دیسی اور بدیسی کش مکش کی یہ بڑی زبردست ٹکر تھی، جو بالکل فطری تھی، اور آخر مئی ۱۸۵۷ء کو دل کا غبار آتش فشان بنکر پھوٹ نکلا، اس طوفان نے جہان تمام نظام درہم برہم کر دیئے، وہان صحافت کی دنیا بھی غارت کر دی، اگر ایک طرف عوام بے دست و پا ہوگئے، تو دوسری طرف زبان بھی بند کر دی گئی، ۱۳ جون ۱۸۵۷ء مین وہ ایکٹ پاس ہوا جس نے صحافت کا گلا گھونٹ دیا، اور تمام پریس اور کتابون کی اشاعت پر پابندیان عائد کر دین[۱]، اس دار وگیر مین صحافت کا سانس لینا ناممکن تھا، اسی لئے قریب قریب سب اخبارات بند ہوگئے،

ملکہ کے پیغام امن اور سر سید اور دوسری لیڈرون کی کوشش سے جب اطمینان نصیب ہوا تو اخبارون نے دوبارہ جنم لیا، اور ہر جگہ سے اخبارات نکلنے لگے، ۱۸۵۸ء مین مشہور اودھ اخبار نکلا جس نے دنیاے صحافت کو ایک نئی زندگی بخشی، منشی نولکشور جو پنجاب کے مشہور اخبار کوہ نور مین کام کر چکے تھے، وہی اس کے روح روان تھے[۲]، ۱۸۷۷ء مین یہ روزانہ ہوگیا، اور اب تک زندہ ہے، یہ اپنے صوبہ کا سب سے پہلا روزانہ اخبار ہے، ایک زمانہ مین ادبی حیثیت سے اسکی خاص اہمیت تھی، رتن ناتھ سرشار کی معرکۃ الآرا تصنیف فسانۂ آزاد پہلے اسی کے چشمۂ فیض کے ذریعہ شائع ہوئی، اسکی ایک بڑی خصوصیت ہمیشہ یہ رہی، کہ اس کے دامن سے پڑھے لکھے، اور قابل اصحاب وابستہ رہے، مثلاً مولوی غلام شبیش تلمیذ غالب، مولانا سید امجد علی اشہری، پنڈت رتن ناتھ سرشار، منشی نوبت راے نظر، مرزا حیرت دہلوی، حضرت جالب دہلوی، مرزا احمد عسکری، ماسٹر پیارے لال شاکر[۳]، گوتاسی اپنے چودھوین خطبہ ۱۸۶۲ء مین اس اخبار کے متعلق لکھتا ہے، لکھنو کا اودھ اخبار

---

[۱] رسالہ اردو ۱۹۳۵ء کیفی ص ۵۲ Proceedings Indian Historical Records Commission Vol. ...

ہفتہ وار چھوٹی تقطیع پر ۲۴ صفحون کا ہوتا ہے، اسکی ادارت شیو پرشاد کرتے ہین، وہ ہر موضوع پر لکھنے کی صلاحیت رکھتے ہین، اس مین خبرون کے علاوہ ادبی مضامین بھی ہوتے ہین بعض مضامین دیوناگری رسم خط مین ہین، اس کے مضمون نگارون مین ایک انگریز پامر بھی ہے، جس نے اردو مین اچھی صلاحیت پیدا کر لی ہے" سولھوین خطبہ ۱۸۶۶ء مین اودھ اخبار پچھلے سال سے نہایت کامیابی سے نکل رہا ہے، اسکی ہر اشاعت پچھلی اشاعت سے بہتر نظر آتی ہے، شروع شروع مین اس مین صرف چار صفحے ہوا کرتے تھے، اور وہ بھی چھوٹی تقطیع پر، لیکن بعد مین چھ ہوئے، پھر سولہ اب اڑتالیس صفحات پر مشتمل ہوتا ہے، پہلے کے مقابلہ مین اس کی تقطیع بھی بڑی ہو گئی ہے، میرے خیال مین اس سے زیادہ صحیح اخبار ہندوستان مین اور کوئی نہین اس سے اندازہ ہو گا کہ اخبار بینی کا شوق ہندوستان مین کس قدر بڑھ رہا ہے، اخبار اب تعلیم یافتہ ہندوستانیون کی ضروریات زندگی مین شامل ہو گیا ہے"

۱۸۶۷ء کے خطبہ مین مزید اظہار خیال کیا ہے" اردو کے سب اخبارون مین اودھ اخبار بہترین خیال کیا جاتا ہے .... مضامین اعلیٰ پایہ کے ہین، جن کا مقابلہ ہمارے اخبارون کے مضامین سے کیا جا سکتا ہے"۔ خبرون کا حصہ اتنا بہتر نہ تھا، وہ زیادہ تر انگریزی اخبارون کا شرمندۂ احسان تھا، مصنف تاریخ ادب اردو کا خیال ہے:" شروع مین جب منشی صاحب موصوف کے زمانہ مین یہ اخبار نکلتا تھا، تو یہ زیادہ تر ان خبرون کا مجموعہ ہوتا تھا جو انگریزی اخبارون کے تارون یا نوٹون سے ترجمہ کرکے چھاپی جاتی تھین، اسکی کوئی معینہ پالیسی بھی نہ تھی، سوائے اس کے کہ سیاسی شور وشر کے ہمیشہ یہ خلاف تھا، پہلے ہفتہ وار تھا، بعد مین روزانہ ہو گیا، اس کا اسٹاف اور ساز وسامان اعلیٰ قسم کا تھا۔

شمس الاخبار مدراس سے نکلتا تھا، اودھ اخبار کا ہمعصر تھا، یہ کوئی مشہور اخبار نہ تھا، اسکی خصوصیت صرف یہ تھی، کہ یہ مسلمانون کا اخبار اور ان کا نقیب اور انہی کے لئے مخصوص تھا [۱]، اس کے بعد لاہور

---

[۱] خطبات گارسان دتاسی،

سے اخبار عام پنڈت مکند رام کی ادارت مین نکلا، یہ کافی مشہور اخبار تھا، اسکی خصوصیت یہ تھی، کہ خاص خاص خبرین چھاپتا تھا، اور بہت سستا تھا، اسکی زبان اخباری تھی، جس مین کوئی ادبی لطافت نہ تھی، اس کی ارزانی نے اخبار بینی کا عام شوق پیدا کر دیا تھا، پہلے یہ ہفتہ وار تھا، بعد مین سہ روزہ، پھر دو روزہ ہوگیا تھا، اس کے معاون ایک پنشن یافتہ سرکاری عہدہ دار تھے، پچھ دنون سرکار بھی اس کی سرپرست رہی، اور اس کی کاپی تمام اسکولون مین جاتی تھی، لیکن بعد مین یہ سرپرستی ختم ہوگئی، اس کے اڈیٹر پنڈت مکند رام تجربہ کار شخص تھے، کوہ نور مین کام کر چکے تھے، ۱۸۶۵ء مین میرٹھ سے اخبار عالم محمد وجاہت کی ادارت مین نکلنے لگا، اسکی ایک قابلِ ذکر خصوصیت یہ تھی، کہ لوکل خبرین نظم مین شائع کرتا تھا، جیسے ؎

"سردی اب کی برس ہے اتنی شدید
کانپتا نکلے ہر سحر خورشید"

صوبہ پنجاب ۱۸۵۷ء کی شورش سے بے تعلق رہا، اس کی زندگی بدستور پُر امن رہی، اس لئے وہان کی ادبی اشاعت مین بھی خلل نہین پڑا، کوہ نور بدستور جاری رہا، پنجاب کی طرح یہ بھی انگریزون کا وفادار تھا، انکی فتح کی خبرین بڑی مسرت کے ساتھ لکھتا تھا،

سورت مین جہان سے اردو کا کوئی اخبار کبھی شائع نہین ہوا تھا، اور جہان قدیم طرز کے فارسی اخبار کے سوا اور کوئی اخبار نہ تھا، ہمئی ۱۸۶۰ء سے ایک اردو ہفتہ وار اخبار منظور الاخبار جاری ہوا، اس کے ایڈیٹر کا نام محمد منظور تھا، اس کے سرورق پر اخبار کی تعریف مین ایک شعر تھا، اور الحمد کی آیت سے اس کا افتتاح ہوتا تھا، اس کے بعد ہندوستان کے مختلف صوبون اور مشرقی ممالک کی خبرین ہوتی تھین، یورپ کے علوم و فنون پر تبصرہ بھی اس کا ایک خاص جزو تھا، اسکی زبان نہایت فصیح تھی، اکثر مضامین کا خاتمہ اشعار پر ہوتا تھا، اس مین کہاوتین، متفرق اشیاء، مرثیے

غزلین، وغیرہ بھی شائع ہوتی تھین، اکثر نمبرون کے ساتھ ان کے ضمیمے بھی رہتے تھے،

ایس ڈبلو فیلن، مدرسۂ اجمیر کے نگران کار اور ضلع کے انسپکٹر مدارس تھے، انھون نے لیتھو کا ایک مطبع قائم اور ایک اردو اخبار خیر خواہ خلق جاری کیا، اس علاقہ مین یہ اردو کا پہلا اخبار تھا، سوہن لال اور راجودھیا پرشاد اس کے اڈیٹر تھے، دونون کو اردو زبان پر پوری قدرت تھی، ان کی اردو تحریرون مین سادگی اور لطف بیان کے ساتھ ہندوستانی اور انگریزی کا ایک خوشگوار امتزاج ملتا ہے، غالبًا یہ اخبار ۱۸۶۰ء سے پہلے جاری ہوا، دتاسی نے فروری ۱۸۶۱ء مین اس کا ذکر کیا ہے، اس مین ایک تو روزمرہ کی خبرین ہوتی تھین، اور اس کے علاوہ مختلف عنوانات پر مضامین بھی ہوتے تھے، اس کی آزادی اور بے باکی حکومت کی نگاہ مین برابر کھٹکتی تھی، بغاوت کے بعد سے ہندوستان مین پریس کی آزادی سلب ہوچکی تھی، ایسی حالت مین اس کا پنپنا مشکل تھا، چنانچہ حکومت نے اس اخبار کی اشاعت ممنوع قرار دیدی،

حکیم جواہر لال نے جو متعدد کتابون کے مصنف اور مترجم تھے، آگرہ سے اخبار محب رعایا نکالا، سنہ اجرا معلوم نہ ہوسکا، لیکن دتاسی نے اپنے گیارہوین خطبہ دسمبر ۱۸۶۱ء مین اس کا ذکر کیا ہے، یہ پرجاہت اور پیپل فرنیڈس (Peoples Friends) کا ہندوستانی ایڈیشن تھا، اس کو صحیح معنون مین آگرہ کے گزٹ اخبار النواح کا قائم مقام سمجھنا چاہئے، وہ بھی حکیم صاحب ہی نکالتے تھے، دونون کا مقصد یہ تھا، کہ مضامین کے ذریعہ اخلاقی اصول پھیلائے اور عام کئے جائین، اور مختلف ملکون کی صحیح اور مستند خبرین درج کیجائین، بے بنیاد افواہین اور سنی سنائی باتین پر اعتماد نہ کیا جائے

وکٹوریہ گزٹ ایک انگریز سہارنپور سے نکالتا تھا، اور اسکی زبان نہایت صاف اور دھلی ہوئی تھی، کلکتہ سے ۱۸۶۲ء مین جام جہان نما نکلا، اسی نام کا ایک اخبار میرٹھ سے نکلا تھا کلکتہ کا ٹائپ مین چھپتا تھا، اور میرٹھ کا لیتھو مین، اسی سال بمبئی سے کشف الاخبار

نکلا، مولنا مارہروی نے اس کا سن اجرا ۱۸۵۳ء لکھا ہے، معلوم نہین ان کا ماخذ کیا ہے، پنجاب گورنمنٹ کی ابتدائی تعلیم کی رپورٹ مین ایک اخبار کا ذکر ہے جو پنجاب کے علاقہ مین بہت مقبول تھا، ۱۸۶۲ء کی سکاری رپورٹ کے مطابق ۱۸۵۹ء تک صوبہ شمالی اور مغربی مین اردو کے تیئیس اخبارات تھے، جن مین ہفتہ وار کثرت سے تھے، دتاسی نے لکھا ہے "کلکتہ سے لیکر پشاور تک شمالی ہند کے کسی بڑے شہر مین چلے جائیے، ہر جگہ لیتھو پریس دکھائی دین گے"۔

دتاسی اپنے چودھوین خطبہ ۱۸۶۲ء مین ہندوستان کے اخبارات اور یہان کی اخبار بینی کے متعلق لکھتا ہے، "ہندوستان مین اخبار بینی کا چسکا بڑھتا جا رہا ہے، ان اخبارات مین بالعموم خبرون کے علاوہ عام معلومات بڑھانے کے لئے مضامین بھی ہوتے ہین، کبھی کبھی ایجادات اور تہذیب و تمدن کی ترقی سے متعلق مضامین ہوتے ہین جنھین لوگ بڑی دلچسپی سے پڑھتے ہین"۔

نجم الاخبار میرٹھ سے نکلتا تھا، اس کے متعلق دتاسی کا خیال ہے، کہ "یہ صوبہ کے شمالی و مغربی حصہ کا بہترین اخبار ہے"، ۲۷ر فروری ۱۸۶۴ء کے ٹائمز مین لکھا ہے، کہ "ہندوستان کے گوشے گوشے سے اخبارات نکل رہے ہین، ان مین سے بیشتر اخبارات کی ادارت کے فرائض اچھے طریقہ سے ادا کئے جاتے ہین، بعض اخبارات کے مضامین دیکھنے سے پتہ چلتا ہے، کہ مضمون نگارون کی نظر وسیع ہے، اور وہ انگریزی ادبیات اور انگریزی فن صحافت سے واقفیت رکھتے ہین، حکومت ان اخبارون کی کوئی مدد نہین کرتی"۔

۱۸۶۵ء کے خطبہ سے معلوم ہوتا ہے، کہ پنجاب، بمبئی، افغانستان اور سندھ مین اردو اخبارات جاری تھے، اسی سال اخبار عالم نیا جاری ہوا، اس کے خریدارون کی تعداد بہت زیادہ تھی، اسکی ۵۲۰ کاپیان چھپتی تھین، مرزا وجاہت علی اس کے مدیر تھے، اس مین سولہ صفحات اور ہر صفحہ مین دو کالم ہوتے تھے"، راجپوتانہ سے بھی ایک اخبار "راجستان" نکلتا تھا، مدراس سے عمدۃ الاخبار

منظر الاخبار، صبحِ صادق، ریاض الاخبار نکلتے تھے، بنگلور سے قاسم الاخبار اور حیدر آباد سے مجمع البحرین نکلے[۱]، اس فہرست سے ثابت ہوتا ہے، کہ اردو ہندوستان کے گوشہ گوشہ مین اپنا گھر بنا چکی تھی، اور وہان سے اپنی آواز بلند کر رہی تھی،

یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان مین انگریزی تعلیم پھیلتی جا رہی تھی، ۱۸۶۴ء مین لکھنؤ مین کیننگ کالج قائم ہوا، اسی سال لاہور کا اورینٹل کالج وجود مین آیا، مدراس، بمبئی اور کلکتہ کی یونیورسٹیان پہلے ہی قائم ہو چکی تھین، ان یونیورسٹیون کے طریقۂ امتحان نے سارے تعلیمی نظام مین ایک انقلاب پیدا کر دیا[۲]، تمام کالج ان کی نقل کرنے لگے، اور نئے کالج کھلنے لگے، یہ وہ وقت تھا، جب دیسی طرزِ معاشرت نے سپر ڈال دی تھی، اور مغربی تمدن اور خیالات فاتحانہ انداز سے ذہن و دماغ پر مسلط ہو رہے تھے، انگریزی تعلیم ہی اس وقت حسن و قبح کا معیار سمجھی جانے لگی تھی، تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ کے درمیان صاف طور سے ایک خلیج بن رہی تھی، اسی تعلیم اور سرکاری ملازمتون نے عہدیون کے پیمانون کو چھوٹا دیا، اور غیر شعوری طور پر ہندو مسلمان الگ ہونے لگے، یہ انگریزی تعلیم ہی کا اثر تھا، کہ بہت سی معاشرتی اصلاحین سوچی جانے لگین، لڑکیون کی تعلیم، شادی کے مصارف اور کم سنی کی شادی کی مخالفت، عقدِ بیوگان کی ترویج اور سائنس کی نئی ایجادات ہمارے اخبارات کے موضوع بن گئے، اس ترقی کے ساتھ ہمارے اخبارون نے وایسرائے کی کونسل اور محل سے باہر نکل کر غریبون کی جھونپڑیون پر بھی نظر ڈالی، اور ان کی فلاح کی تدبیرین سوچنے لگے، اس دور کے آخر مین پریس اور ملک کی پریشانی دور ہونے لگی، اور اب وہ دبی زبان سے ملکی معاملات پر رائے زنی بھی کرنے لگے، وائسرائے اب امیر کبیر سے صرف وائسرائے رہ گئے، انگریزون کے لئے خالی صاحبان عالیشان باقی رہ گئے[۳]

---

[۱] خطبات گارسان دتاسی ص۵۲ Cultural History of India British period, yousafali.

تیسرا دور ۱۸۶۶ء تا ۱۸۷۷ء سرسید پہلے شخص تھے جنھون نے ۱۸۵۷ء کی پھڑکتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھا

اور اسکی روح کو سمجھا، ان کا رسالہ "اسباب بغاوت ہند" گو مسلمانون کی محبت مین جادۂ اعتدال سے آگے بڑھ گیا، لیکن اس مین کوئی شک نہین کہ اس بغاوت کی اصلی وجہ مغرب و مشرق کی بیگانگی تھی، سرسید کو یقین ہو گیا تھا کہ اس نئی قوت کا مقابلہ ناممکن ہے، وہ انگریز اور مغرب سے اس قدر مرعوب تھے کہ ہر چیز کو اسی کی روشنی مین دیکھتے تھے، دوسری طرف ان کو اسلام اور مسلمانون سے بھی بڑی محبت تھی، اس لئے مغرب کے مسلمات کو قانون قدرت سمجھکر اپنے عقائد کو اسی کسوٹی پر پرکھتے اور جانچتے تھے، اور یہ ثابت کرنا چاہتے تھے، کہ اسلام یورپ کے معیار پر پورا اترتا ہے، ان خیالات نے مسلمانون کے اندر جدید مذہبیت اور معاشرت کی بنیاد ڈالی، اس راہ مین مولوی چراغ علی ان کے دست راست تھے، یہ فریب مدتون تک چھایا رہا، اس کے توڑنے مین شبلی اور اودھ پنچ کا بہت بڑا ہاتھ ہے، سرسید یورپ کے اتنے مداح تھے، کہ ساری قوم کو یورپ کے قالب مین ڈھالدینا چاہتے تھے، مغرب کے فیوض و برکات کو ہندوستان مین پھیلانے کے لئے اونھون نے "سائنٹفک سوسائٹی" قائم کی، اس کارخانہ سے یورپ کے علوم ڈھل ڈھل کر چھپنے لگے، جو مفید کام اس انجمن نے کیا، وہ ہندوستان کی تاریخ مین یادگار رہے گا، اور اردو زبان وادب اس کے احسان سے کبھی سبکدوش نہ ہوگا،

۳۰ مارچ ۱۸۶۶ء سے انسٹیٹیوٹ گزٹ جاری ہوا، اس اخبار کے اجرا سے اردو صحافت نے تیسرے دور مین قدم رکھا، یہ وہ اخبار تھا جس کو سرسید کی مرکزیت کی وجہ سے کل ہند اخبار کہا جا سکتا ہے، اس کا اسٹاف اور دوسری ظاہری و معنوی خوبیان اس کو پچھلے دور سے ممتاز کرتی ہین، منشی چھکن لال جیسا انگریزی اخبارات سے ترجمہ کرنے والا، اور مولوی فیض الحسن اور بابو گنگا پرشاد جیسا مترجم کتب اسکو حاصل تھے، شروع مین یہ ہفتہ وار تھا، پھر ہفتہ مین دو بار نکلنے لگا، اس کے ابتدائی اڈیٹر محمد اسمٰعیل تھے، کل اخبار ٹائپ مین تھا[۱] مضمون کا شمار انگریزی کے مطابق

[۱] رسالہ اردو ۱۹۳۵ء (عبدالحق)

بائین طرف سے ہوتا تھا، اس کی پالیسی بھی متعین تھی، وہ سرکار کا اور رعایا کا دونون کا بہی خواہ تھا، رعایا کو نصیحت اور حکومت کی وفاداری کی تلقین اور حکومت سے رعایا کی دلجوئی کی التجا اور درخواست اس کی پالیسی تھی، اس کے سرورق پر یہ الفاظ تھے:۔ "آزادی چھاپے کی ہے، ایک بڑا فرض گورنمنٹ کا، اور ایک اصلی اور جبلی حق رعیت کا" اس اخبار کی تمام خوبیان سرسید ہی سے وابستہ تھین جیسے ہی ان کی توجہ اس سے ہٹی، اس کا انداز بھی بدل گیا، مولوی عبدالحق اس کی خوبیون کے ذکر کے بعد لکھتے ہین "یہ سب سچ ہے، لیکن اسی وقت تک جب تک کہ کالج اور دوسرے کامون کا ہجوم نہین ہوا تھا" آخر مین تو یہ "ماخوذ از پائنیر" ہو کے رہ گیا، لیکن جب کوئی خاص مسئلہ یا اہم معاملہ آجاتا تھا، تو سرسید خود بڑے پُرزور مضامین لکھتے تھے، عام اخبارون پر سوسائٹی کا بہت اچھا اثر پڑا، اور وہ سیاسی، معاشرتی اور تعلیمی مسائل پر سنجیدگی سے بحث کرنے لگے،

پنڈت کیفی نے اپنے مضمون مین اس دور کے بہت سے اخبارات کی لمبی فہرست دی ہے لیکن ان کے متعلق تفصیلی معلومات نہین ہین، جن سے اردو صحافت کے ارتقار کا پتہ چلایا جاسکے، اس لئے وہ اہم نہین،

۱۸۶۸ء۔۶۹ء سے اردو ہندی کا جھگڑا شروع ہوا، اس سے تمام اخبارون کو ایک موضوع ہاتھ آگیا، دونون طرف سے خوب خوب مضامین نکلتے تھے، یہ وہ وقت تھا جب اردو اخبارون کا بول بالا تھا، ہندی اخبار بہت کم تھے، سب سے دلچسپ بات یہ تھی کہ اردو کے خلاف جو کچھ لکھا جاتا وہ اسی زبان مین لکھا جاتا، اور مخالفین کی زیادہ تعداد اردو کے بہت اچھے لکھنے والون کی تھی، ہماری قومی زندگی مین پھوٹ اسی دن سے پڑی، یہ بھی یورپ کی تعلیم اور قومیت کے بھوت کا اثر تھا، ہندی اردو کے جھگڑے کی ابتدا یون ہوئی، کہ بنگال مین فارسی زبان کے بجائے دیسی زبان عدالت کی زبان تسلیم کر لی گئی، ان کی دیکھا دیکھی شمالی مغربی صوبہ کے ہندوؤن نے بھی

مطالبہ کیا، کہ یہان بھی عدالتون مین ہندی زبان مان لی جائے، اسکی حمایت مین بڑے بڑے مضامین لکھے گئے، جن کے متعلق دتاسی کی یہ راے سننے کے قابل ہے، ان کی مراد یہ ہے کہ بجائے مسلمانون کی زبان کے ہندوؤن کی زبان کو فروغ ہو" بابو سرور پرشاد نے دیوناگری رسم خط کی حمایت مین ایک مضمون لکھا تھا جس مین اردو رسم خط کے مقابلہ مین اسکی فضیلت ثابت کی تھی، دتاسی اس کے متعلق لکھتا ہے:

واقعہ یہ ہے کہ خود اردو مین ایسے بیشمار الفاظ ہین جنھین دیوناگری رسم خط مین نہین ادا کیا جاسکتا"، علی گڈھ کے اخبار نے دتاسی کے ساتھ اتفاق کرتے ہوئے لکھا، کہ "اس تحریک کی بنیاد نسل اور مذہبی اختلاف پر ہے" مظفر پور (بہار) کے وارث علی نے بھی علیگڈھ اخبار مورخہ ۱۹ اپریل مین ایک پُرجوش مضمون سپرد قلم کیا تھا، اور یہ ثابت کیا کہ اردو ہی دراصل اہل ہند کی عام زبان ہے"۔

۱۸۶۸ء مین صوبہ بہار مین بھی ایک "سائنٹفک سوسائٹی" قائم ہوئی، اس کا صدر مقام مظفر پور تھا، اس کے معتمد ایک فاضل مسلمان تھے، کچھ دنون میں اوس کے ممبرون کی تعداد ۳۱۸ ہو گئی، جس میں ۱۲۸ مسلمان، ۱۶۲ ہندو اور ۲۸ یورپین تھے، انجمن کی طرف سے ایک اخبار بھی جاری ہوا، جس کا نام اخبار الاخبار تھا، اس انجمن نے مغربی تعلیم کو پھیلانے مین بڑی مدد دی، اسکی تجویز تھی، کہ انجمن کی طرف سے مشرقی زبانون کی تعلیم کے لئے ایک کالج قائم کیا جائے، اور ساتھ ساتھ مغربی علوم کی اشاعت کا کام بھی انجام دیا جائے، مسلمان عوام کی اخلاقی و ذہنی زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش کی جائے اور اسباق کے ذریعہ تعلیم پھیلائی جائے، مغربی تصانیف کے ترجمہ کرنے کا بھی خیال تھا، مسٹر فنز ایڈورڈ ہنری ([illegible]) جو ایک جید عالم تھے، اس کے حامیون مین تھے، انجمن کی طرف سے ایک رسالہ بھی شائع ہوتا تھا، اس کا ارادہ تھا کہ غربا کے لئے زراعت اور صنعت و حرفت کا ایک کالج بھی کھولا جائے، اس کے پانچ مدرسون مین بلا امتیاز مذہب و ملت سب شریک ہوتے اس انجمن کا حال علی گڈہ اخبار مین ہمیشہ چھپتا تھا۔[۱]

[۱] خطبات گارسان دتاسی،

پٹنہ سے چشمۂ عالم نام ایک اخبار یکم جنوری ۱۸۵۰ء میں جاری ہوا، اس سے پہلے اس شہر میں کوئی اخبار نہ تھا، یہ ہفتہ میں دو دفعہ نکلتا تھا، تقطیع چھوٹی تھی، صفحوں میں دو کالم ہوتے تھے، دتاسی نے اپنے انیسویں خطبہ ۱۸۵۰ء میں لکھا ہے، کہ "اس اخبار کا ایک مضمون مجھے پسند آیا، جس کا موضوع بنی نوع انسان کے اتحاد سے متعلق تھا"

ہمارے پنجاب ۱۸۵۰ء کی اپریل سے شروع ہوا، خبروں کے ساتھ ساتھ اردو ہندی کی کتابوں پر تبصرے بھی ہوتے تھے، نامہ نگاروں کے صرف وہ خطوط چھاپے جاتے تھے، جو اپنے اندر کچھ دلچسپی رکھتے تھے، میرٹھ کے اخبار کو اس کے نام اور انشاء پر اعتراض تھا، کیونکہ اس کی زبان پر انگریزی اثر بہت غالب تھا،

دلی سے ایک ہفتہ وار اخبار خیر المواعظ جاری ہوا، اسمیں آٹھ صفحے ہوتے تھے، یہ اخبار اسلام کی حمایت واشاعت اور مسیحیت کی تردید میں نکلا تھا، ایک مسیحی اخبار شمس الاخبار لکھنؤ سے نکلا، اس کے مضامین دلچسپ ہوتے تھے، اس کی غرض عیسائی مذہب کی اشاعت تھی،

ہندی کا ایک اخبار جگت سماچار جاری ہوا، یہ اصل میں اردو سے ہندی میں ترجمہ ہوتا تھا، اس کے متعلق دتاسی لکھتا ہے "چاہے کوئی کچھ کہے، لیکن یہ مسلم ہے، کہ اردو زبان دوسری زبانوں کے مقابلہ میں زیادہ مستعمل ہے، اس کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے، کہ اس اخبار میں یہ بات بھی وضاحت سے بیان کر دی گئی ہے، کہ اس کی زبان عام فہم ہے، اگرچہ ناگری رسم خط میں ہے"

اس دور کی ایک خصوصیت یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ اکثر اردو اخباروں کے ہندی ایڈیشن اور ہندی اخباروں کے اردو ایڈیشن نکلا کرتے تھے، پنجاب سے اخبار انجمن پنجاب نکلا، اس کے متعلق دتاسی کا خیال ہے کہ یہ وہی اخبار ہے جو کبھی "ہمارے پنجاب" کے نام سے جاری ہوا تھا، کیونکہ اس اخبار کے سرورق پر ہما کی خیالی تصویر تھی، یہ اخبار پنجاب سے مختلف تھا، یہ انجمن پنجاب کا اخبار تھا،

جس کے صدر مسٹر لیبل گریفن اور معتمد بابو روبن چندر رائے تھے، انہی دونون کی نگرانی مین یہ اخبار شائع ہوتا تھا، حکومت بھی اسکی سرپرست تھی، اور اسکی دوسو کاپیان خریدتی تھی، اس اخبار مین تصویرین بھی ہوتی تھین، جس نے اسکی قدر و قیمت بڑھادی تھی، یہ تصویرین عموماً تاریخی اشخاص اور تاریخی مقامات کی ہوتی تھین، مثلاً ایک مرتبہ نصیرالدین شاہ ایران اور بوشہر کے پل کے ایک منظر کی تصویر شائع ہوئی تھی، اس کے اڈیٹر نظام الدین تھے، الہ آباد سے ایک اخبار نور الابصار جاری ہوا، اس کے متعلق مسٹر کمسن کی رائے ہے کہ یہ شمالی مغربی صوبہ کا بہترین اخبار تھا، میرٹھ سے اردو لارپورٹ مہینہ مین دوبار شائع ہوتا تھا، یہی گنج حکام کے نام سے ماہانہ بھی نکلا کرتا تھا، مسٹر ہالرائڈ ناظم تعلیمات پنجاب کی سرپرستی، اور منشی پیارے لال کی ادارت مین ایک اخبار اتالیق پنجاب سے نکلا اس مین تاریخ، جغرافیہ اور سائنس پر نہایت مفید مضامین ہوتے تھے،

تہذیب الاخلاق ایک رسالہ تھا، اس کا ذکر بہت ضروری ہے، کیونکہ اس کا اثر زبان اور خیالات پر گہرا پڑا، اور اردو ادب اور صحافت دونون اپنی صلاحیت کے مطابق اس سے مستفید ہوئے، اس کا سب سے بڑا کارنامہ جدید تعلیم کی اشاعت ہے،

مذکورۂ بالا وہ مشہور اور اہم اخبارات ہین جو اودھ پنچ کے قبل اردو صحافت مین ممتاز حیثیت کے مالک تھے، اور ملک کے دل و دماغ پر اتنا اثر رکھتے تھے، اس کے بعد ۱۸۷۷ء مین اودھ پنچ نے اردو مین ظریفانہ صحافت کا شگوفہ چھوڑا، جس پر ہم بعد مین تفصیل سے نظر ڈالین گے،

اس دور مین اردو صحافت کی حکومت ہندوستان کے چپہ چپہ پر قائم ہو چکی تھی، اور ان کی سطح بھی پہلے سے بلند ہوگئی تھی، وہ ہندوستان کے باہر کی دنیا سے بھی واقفیت رکھتے تھے، ڈماسی اور یورپ کے علم سے اکثر اخبارات واقف تھے، اسکی سالانہ تقریظین قدر کی نگاہون سے دیکھی اور ترجمہ کی جاتی تھین، ۱۸۷۱ء کے خطبہ کا ترجمہ اخبار الاخبار مظفر پور (بہار) اور اخبار انجمن پنجاب مین کیا گیا تھا

اور دتاسی کی تصویر بھی دونون مین شائع ہوئی تھی، وہ انجمن پنجاب کا اعزازی رکن بھی تھا، یہ تمام اخبارات ملکی معاملات مین گہری دلچسپی لیتے تھے، اردو ہندی کا جھگڑا بدستور جاری تھا، جس مین سب شریک تھے، ملک مین مسلمانون کی تعلیم کا خیال اہمیت حاصل کرتا جا رہا تھا، اور ایک مشرقی جامعہ کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس کیجا رہی تھی، سرسید اس وقت کی تعلیم کے خلاف تھے، اور سید عبداللہ ان کے ہمنوا تھے، سرسید نے موجودہ تعلیم کے خلاف "موجودہ تعلیم پر اعتراضات" کے نام سے ایک رسالہ بھی شائع کیا تھا، جس کا جواب بابو شیو پرشاد نے "اعتراضات پر اعتراضات" کے نام سے دیا، بابو شیو پرشاد اردو کی اچھی صلاحیت رکھتے تھے، ان کے اختلاف کی وہی نوعیت تھی، جو اردو ہندی کے مسئلہ مین عام ہندوؤن کی تھی، جس کا ثبوت ان کے ان الفاظ سے ملتا ہے، کہ "آٹھ صدی تک مسلمانون کی حکومت کے مظالم برداشت کرچکے ہین" مظفرپور کی سائینٹفک سوسائٹی کے اخبار الاخبار مین سید امداد علی نے ایک مضمون مین یہ ثابت کیا تھا، کہ روزمرہ کی زبان مین تعلیم دینے سے تعلیم مین سہولت ہوگی، اور ہندوستانیون کو دیسی تعلیم سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملے گا،

اس وقت اردو اخبارات ترقی کی راہ پر تیز تیز قدم بڑھا رہے تھے، ان مین روزانہ کم اور ہفتہ وار زیادہ تھے، انھین کچھ آزادی بھی حاصل ہوگئی تھی، خصوصاً وہ اخبار جو سرکار کی سرپرستی مین نہ تھے، "جب ضرورت سمجھتے تھے، تو انگریزی حکومت پر تنقید بھی کرتے تھے، اور پریس کی قوت ایک حقیقت ہوتی جاتی تھی" [۱] دتاسی اپنے ۷۰ء کے خطبہ مین لکھتا ہے، "ادبی کتابون کے بعد اخبارون کو خاص اہمیت حاصل ہے جنھین دن بدن ترقی ہو رہی ہے، وہ سیاسی، علمی، ادبی اخبار جن کی نسبت مین پہلے ذکر کرچکا ہون بدستور جاری ہین"۔

---

[۱] خطبات گارسان دتاسی،

تلخیص و تبصرہ

ہالینڈ مین استشراق

المستمع العربی لندن مئی اور جون ۴۲ء کے نمبرون مین پروفیسر وانڈنبرگ کے قلم سے "ہالینڈ مین استشراق" کے عنوان سے ایک مفید مقالہ نکلا ہے، اسکی تلخیص درج کیجاتی ہے،

آج یورپ کے قریب قریب تمام بڑے بڑے ملکون مین عربی اور مشرقی زبانون سے دلچسپی پیدا ہوگئی ہے، یونیورسٹیون مین عربی کی چیر قائم ہین، اور یہان کے مستشرقین کسی نہ کسی حیثیت سے عربی کی خدمت انجام دی ہے، لیکن اس کی ابتدا، مغرب کے ایک چھوٹے خطہ یعنی ہالینڈ سے ہوئی سب سے اول یہین کے علما، نے عربی ترکی اور فارسی زبانون خصوصاً عربی اور اوس کے علوم کی طرف توجہ کی، اور اسکی بڑی گرانقدر خدمات انجام دین، ۱۵۷۵ء مین لیڈن یونیورسٹی قائم ہوئی، اور بہت جلد یورپ مین الٰہیات اور پروٹسٹنٹ مذہب کی تعلیم کا مرکز بن گئی، ۱۵۹۰ء مین پروفیسر اسکالیگر (Scaliger) فقہ اللغۃ کے چیر مین مقرر ہوئے،

اس زمانہ مین یورپ مین تجارت کا سب سے زیادہ مذاق اہل ہالینڈ مین تھا، اس سلسلہ مین انھین بحر متوسط کی ساحلی اسلامی حکومتون سے واسطہ پڑتا تھا، اس تجارتی کاروبار کے سلسلہ مین انھین عربی کے ترجمان اوراس کی تعلیم کی ضرورت محسوس ہوئی، انھون نے تجارتی مراسلت کے لئے پروفیسر اسکالیگر کی طرف رجوع کیا، یہ عربی زبان بہت اچھی جانتے تھے، اور یورپ مین اس نام

مین عربی لغت اور قواعد کی کتابین ناپید تھین، اس لئے پروفیسر مذکور کو بڑی زحمت پیش آتی تھی، انھون نے اپنے ایک ہونہار اور لائق شاگرد اربینیس (Erpenius) کو عربی اور بعض دوسری مشرقی زبانون کے سیکھنے پر آمادہ کیا، اس نے پیرس جاکر ایک مصری سے عربی زبان اور وآنا مین فارسی ترکی اور حبشی زبانین سیکھین، اور جامعہ لیڈن مین مشرقی زبانون کا استاد مقرر ہوا، چند دنون کے بعد اس نے مشرقی زبانون کی کتابون کی اشاعت کے لئے ایک چھوٹا سا مطبع قائم کیا، اور سنہ ۱۶۱۳ء مین عربی قواعد کی ایک کتاب شائع کی جو مدتون یورپ مین عربی تعلیم کا ذریعہ رہی، سنہ ۱۸۴۴ء مین فرانسیسی زبان مین اس کا ترجمہ ہوا، اربینیس کے ایک لائق شاگرد جولیس (Golius) نے بڑی محنت اور ذوق و شوق سے مشرقی زبانون کی تعلیم حاصل کی، دو مرتبہ مراکش اور ایشیائے کوچک کا سفر کیا، اور یہان سات برس قیام کرکے عربی اور ترکی مین کمال حاصل کیا، اور واپسی مین جامعہ لیڈن کے لئے نادر مخطوطات کا تحفہ لے گیا، جولیس پورا طالب علم تھا، مشرقی زبانون کے علاوہ ریاضیات کا بھی استاد تھا، ساٹھ سال سے زیادہ کی عمر مین چینی زبان سیکھنے کی طرف توجہ کی، اس کو عربی فارسی اور ترکی سے بڑا شغف تھا، سب سے پہلے اسی نے عربی لاطینی لغت لکھا جو کئی صدیون تک یورپ مین مستشرقین کا مرجع رہا، پروفیسر فریٹاگ (Freytag) کے مشہور عربی لاطینی لغت کی تالیف کے بعد علمائے نے ادھر توجہ کی، یہ لغت بالکل عربی لغات کے نمونے پر لکھا گیا تھا، لاطینی مین عربی لغات کی تشریح تھی، گو یہ کوئی بڑا جامع لغت نہ تھا، لیکن اپنے زمانہ کے اعتبار سے غنیمت تھا،

پروفیسر جولیس کی توجہ اور دلچسپی سے یورپ مین لیڈن یونیورسٹی مشرقی زبانون کی تعلیم کا مرکز بن گئی، اس کے نامور شاگرد وارنر (Levinus Warner) نے قسطنطنیہ کا سفر کرکے عربی زبان سیکھی، اور ترکون کی معاشرت اور ان کے اوضاع و اطوار کا مطالعہ کیا، اس کی نادر وقت

نے اسے وطن واپس ہونے کی مہلت نہ دی لیکن اُس نے عربی فارسی اور ترکی کی بہت سی نادر قلمی کتابین جامعہ لیڈن کے لئے تحفۃً بھیجین جنھون نے "عطیۂ وارنر" کے نام سے یورپ مین اتنی شہرت حاصل کی، کہ شائقین دور دور سے اُسے دیکھنے کے لئے لیڈن آتے تھے،

اس دور کے نامور مستشرقین مین ایک پروفیسر ایڈرین ریلینڈ (Adrian Reland) استاذ جامعہ اٹرشٹ (Utrecht) ہین، یہ ہالینڈ کے سب سے بڑے فاضل مستشرق تھے فلسطین کا جغرافیہ اور اسلامی تعلیم کا ہون پر ان کی تصانیف ان کے علمی کمال کا ثبوت ہین، ان کا نمایان اور ممتاز وصف ان کی بے تعصبی اور انصاف پسندی ہے، ان کے پیشرو مستشرقین سخت متعصب تھے، اور انکی تصانیف اسلام کے خلاف اندھے تعصب سے خالی نہ ہوتی تھین، جن کا مقصد اسلام اور اسکی تعلیمات کو سمجھنا نہین، بلکہ محض مسیحیت کی مدافعت اور اسلام پر اعتراض کرنا تھا، پروفیسر ریلینڈ کی روش اس سے بالکل مختلف تھی، ان کا مقصد انصاف اور بے تعصبی کے ساتھ اسلام کی تعلیم کا مطالعہ اور اس کو اصلی اور صحیح ماخذون سے لیکر اصلی شکل مین پیش کرنا تھا، وہ علانیہ کہتے تھے، کہ مین راسخ العقیدہ مسیحی ہون، لیکن میرا مذہب دوسرے مذاہب پر طعن و طنز کا سبب نہین بن سکتا، ان کا مقولہ تھا کہ ہم سب انسان ہین جن سے غلطی کا ہوجانا بعید نہین، خصوصًا مذہبی معاملات مین ہم حدِ اعتدال سے بڑھ جاتے ہین، اور اپنے جذبات کے ماتحت فیصلہ کر دیتے ہین،

ریلینڈ کے عہد کے بعد لیڈن یونیورسٹی مین ایک ہی گھر کے تین افراد البرٹ شلٹنس (Albert Schultens) اسکا لڑکا جان جیمز (John James) اور اس کا پوتا ایکے بادیگرے شعبۂ عربی کے صدر مقرر ہوئے، اور ستر سال تک یہ عہدہ اس گھرانے مین رہا، ان مین جیمز اپنے عہد کا سب سے بڑا مستشرق تھا، اور البرٹ پہلا شخص ہے، جس نے عربی زبان کے ذریعہ عبرانی کو سمجھنے کی کوشش کی، گو اس کا یہ نظریہ غلط تھا، لیکن اسکی بنیاد صحیح تھی، اتنا مسلّم ہو کہ توراۃ کی

اصل زبان عبرانی کے بہت سے الفاظ ایسے ہین جن کے صحیح معنی مرور زمانہ نے بھلا دئیے ہیں، یہی وجہ ہے کہ توراۃ کے مختلف زبانوں کے ترجمون مین ایک ہی عبرانی لفظ کے مختلف بلکہ متضاد ترجمے ہو گئے ہین، البرٹ کا نظریہ یہ تھا کہ قدیم عبرانی الفاظ کے معنی کو ان کے مقابل عربی الفاظ کے ذریعہ سمجھا جا سکتا ہی، اس کے ثبوت مین اسکے پاس دلائل اور مثالین بھی تھین، لیکن یہ بڑا متعصب تھا، اس لئے عربی زبان کے مطالعہ مین اس نے کوئی اچھا اثر نہین چھوڑا، اوس کے بعد ہالینڈ مین استشراق کی رفتار سست پڑ گئی،

گذشتہ صدی کے اواخر مین پھر اسکی تجدید ہوئی، اور ایسی ہوئی کہ اس میدان میں اسکا قدم پچھلے دور سے بہت آگے بڑھ گیا، اور ایسے نامور اور صاحب کمال مستشرق پیدا ہوئے جن کے کارنامون کے سامنے گذشتہ مستشرقین کے کارنامے ماند پڑ گئے، ان مین ڈوزی (Dozy) ڈی گیج (De Goeje) اور اسنوک ہرگرونج (Snouck Hurgronje) زیادہ ممتاز ہین، ان کا کارنامہ یہ ہے، کہ انھون نے مشرقی علوم کے مطالعہ کو طعن و تعصب سے پاک کرکے خالص علمی مقصد بنا دیا، ان کے علمی کارنامون نے مشرقیات مین ہالینڈ کا علمی پایہ بہت اونچا کر دیا، بلکہ یہانتک کہا جا سکتا ہی، کہ اس مین یورپ کا کوئی ملک ہالینڈ کی ہمسری نہین کر سکتا، ان علماء نے علم کی پیام رسانی کا پورا حق ادا کیا، اور آنے والی نسلون کے لئے ایک دائمی عظمت میراث مین چھوڑ گئے،

ڈوزی ۱۸۲۰ء مین پیدا ہوا، اور ۱۸۸۳ء مین وفات پائی، اس مین مختلف زبانون کے سیکھنے کی فطری صلاحیت تھی، ادب اور عہد وسطیٰ کی تاریخ سے اُسے خاص دلچسپی تھی، فنون لطیفہ سے بھی ذوق رکھتا تھا، اسکی خوش قسمتی سے اُس کو لیڈن یونیورسٹی مین ویرس (Weyers) جیسا کامل استاد مل گیا جس نے اپنے تلامذہ کے لئے علمی تحقیق کا ایک قابل تقلید طریقہ ایجاد کیا،

اور ڈوزی کو عربی زبان کے مطالعہ مین الفاظ اور معنی کے ساتھ ان کے اشتقاق کی طرف زیادہ توجہ کرنیکی ہدایت کی، اس طریقۂ تحقیق کا نتیجہ وہ عربی اور فرانسیسی لغت ہی جو عربی زبان کا خزانہ تصور کیا جاتا ہے، ڈوزی نے اپنے علمی مساعی اور محنت کا نصف حصہ اس بے مثل لغت کی تالیف و تحقیق مین صرف کیا، اسکی اہم تاریخی تصانیف مین فرانسیسی زبان مین اسکی قابلِ قدر کتاب "اسپین مین مسلمانون کی تاریخ" ہے،

ڈی گیج ۱۸۳۶ء مین پیدا ہوا، اور ۱۹۰۹ء مین وفات پائی، یہ ڈوزی کے ارشد تلامذہ مین تھا، مہارتِ فن، غیر معمولی ذہانت اور جدت طرازی اس کا نمایان وصف ہے، آج عربی زبان کے طالب علمون کے لئے جو کتابین ناگزیر سمجھی جاتی ہین، ڈی گیج کے زمانہ مین ان کا نام و نشان نہ تھا، اور نہ مشرقی کتابین یورپ تک پہنچی تھین جن سے تشنگانِ علم اپنی پیاس بجھاتے، عربی کتابون کے بیشتر قلمی اور نادر الوجود نسخے مشرق و مغرب کے کتب خانون کی ردی کے انبار مین گم تھے، ان گنجہائے گرانمایہ کو گوشۂ گمنامی سے نکالنے مین ڈی گیج کی کوششون کو بڑا دخل ہے، اور یہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہی کہ گذشتہ نصف صدی کے اندر یورپ مین جتنی نایاب کتابین شائع ہوئی ہین، ان مین سے اکثرون کی اشاعت مین کسی نہ کسی حیثیت سے ڈی گیج کی امداد ضرور شامل ہے، اس نے عربی تصنیفات کو بہترین تصحیح و ترتیب، تحشیہ اور فہرستون کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کیا، اس کے بعد کے ان تمام مستشرقین نے جنھون نے عربی کتابین شائع کین، اس کے طریقہ کی تقلید کی اور اوس مین وہ سب اس کے احسان مند ہین، ڈی گیج نے سب سے اوّل یعقوبی کے جغرافیہ کا وہ حصہ جو مغرب (شمالی افریقہ اور اندلس وغیرہ) سے متعلق ہے شائع کیا،

اس کا سب سے بڑا کارنامہ جس نے اس کے نام کو زندۂ جاوید بنا دیا، ابوجعفر طبری کی مشہور تاریخ "تاریخ الامم والملوک" کی اشاعت ہے، ان خدمات کے ساتھ مختلف اسلامی موضوعون پر مقالات کا

سلسلہ بھی جاری رہا، انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے نوین اور گیارہوین حصے مین متعدد مقالات اس کے قلم کے ہین، یہ عجیب بات ہے، کہ مشرقیات مین اس شغف و انہماک کے باوجود ان دونون فاضلون کو مشرق دیکھنے کا کبھی موقع نہ ملا، بلکہ جولیس کے علاوہ اس دور کے کسی ہالینڈی مستشرق کو اسلامی دنیا سے تعلق پیدا کرنے کا اتفاق نہین ہوا،

اسنوک ہرگرونج بھی ڈوزی کا شاگرد رشید اور اپنے عہد کا صاحبِ کمال فاضل، مشہور عالم سیّاح اور نامور سیاست دان تھا، اوس نے البتہ اسلامی ملکون کی سیاحت کی، اسکی پیدا کردہ روح سے یورپ مین اسلامیات کے مطالعہ کے ذوق کو بڑی ترقی ہوئی، وہ ۱۸۴۷ئہ مین پیدا ہوا، اور ۱۹۳۶ئہ مین وفات پائی، الٰہیات اور مشرقی زبانون کی تحصیل کے بعد جزیرۃ العرب کی سیاحت کی اور مکہ کے نام سے اس سیاحت کا سفرنامہ شائع کیا، ۱۸۸۹ئہ سے لیکر ۱۹۰۱ئہ تک جاوا مین جہان مسلمانون کے امور کے متعلق حکومتِ ہالینڈ کا مشیر تھا، اسلامیات اور جاوا مین اسلام اور مسلمانون کے تعلقات پر مطالعہ اور تلاش و تحقیق مین مشغول رہا، ۱۹۰۶ئہ مین لیڈن یونیورسٹی مین شعبۂ عربی کا صدر مقرر ہوا، اوس کو مشرق خاص طور سے مسلمانون کے ساتھ بڑا تعلقِ خاطر تھا، برسوں اسلامی تعلیمات پر غور و فکر، مسلمانون کے ساتھ روابط و تعلقات اور اُن سے تبادلۂ خیالات کے بعد اس مغربی مقولہ کے برخلاف کہ "مشرق مشرق ہے، اور مغرب مغرب اور یہ دونون کبھی نہین مل سکتے" اس کو یقین کامل تھا کہ اسلام اور جدید یورپ مین ربط و اتحاد ممکن ہے، اور یہ دور دونون مین الفت و محبّت کے رشتہ کو مضبوط کرنے اور ایک دوسرے کو بہتر طریقہ سے سمجھنے کیلئے سب سے زیادہ موزون و مناسب ہے،

"م"

چینی مسلمان

ایک دردمند صاحبِ قلم چینی مسلمان نے چین کے مسلمانون کے مذہبی، اخلاقی، تمدّنی، سیاسی، اقتصادی اور تعلیمی حالات ہندوستانی زبان مین لکھے ہین، ضخامت ۲۴۲ صفحے، قیمت:- عہر

"منیجر"

اخبار علمیہ

چینی حکومت اور وہان کے مسلمان

چینیون کے دل مین مدتون سے آرزو تھی کہ وہ دوسرے اسلامی ممالک سے خوشگوار تعلقات پیدا کرکے دوبارہ رشتۂ اخوت مین منسلک ہو جائین، چنانچہ حال ہی مین اسلامی چینی وفاق کے نمایندے عثمان وو نے شاہی مسجد لاہور مین بعد نماز جمعہ ایک تقریر کی، اور چین کے مسلمانون کی جانب سے ہندی مسلمانون کو ہدیۂ تہنیت پیش کیا، اور یہ بھی بتایا کہ چین کے مسلمان دوسرے غیر مذہب والون سے بالکل شیر و شکر ہو کر رہتے ہین،

اس وفاق کے صدر جنرل عمر بائی زنی .... ہین، تیرہ صدی کی مدت مین چین مین مسلمانون کی تعداد پانچ کروڑ تک پہونچ چکی ہے، چین مین ۴۰۰۰۰ مسجدین ہین، پندرہ سال ہوے انھون نے کلام پاک کا چینی ترجمہ شروع کیا تھا، اب تک اس کے تین ایڈیشن نکل چکے ہین، حکومت چین نے چالیس مسلم طلبہ کو جامعہ ازہر مین تعلیم کے لئے مصر بھیجا تھا، جن مین سے پندرہ تعلیم ختم کرکے واپس آچکے ہین، بہت سے چینی طلبہ ترکی اور ایران بھی بھیجے گئے ہین، عنقریب کچھ لڑکے ہندوستان بھی آئین گے،

طیارون کی اصلاح و ترقی

موجودہ جنگ کے متعلق کہا جاتا ہی کہ وہ فضائی جنگ ہی، اس لئے امریکہ، روس اور برطانیہ زیادہ

سے زیادہ جہاز بنانے کی کوشش کر رہے ہین، لندن مین آئے دن ایسے ہوائی جہاز بن رہے ہین جو بہت تیز رفتار اور جملہ سامانِ جنگ سے مسلح ہوتے ہین، ان طیارون مین سب سے بڑی دقت یہ ہی کہ وہ بغیر زمین پر رینگے، فضا مین بلند نہین ہوسکتے، اور مشین کی آواز بہت تیز ہوتی ہے، لیکن حال مین ایک جرمن نے ایسا ہوائی جہاز بنایا ہے، جس مین ایک بٹن لگا ہوا ہے جس کے دباتے ہی ہوائی جہاز پرندون کی طرح ایک جگہ اتر سکتا ہے، اور دوسرا بٹن دباتے ہی ہوا مین پرواز شروع کر دیتا ہے، لیکن اس مین ایک بڑا نقص یہ ہے کہ اس کے بٹن اکثر خراب بھی ہو جاتے ہین، اس لئے اب تک جنگ مین استعمال نہ ہوسکا، امریکہ کا ایک سائنس دان بھی اس گر سے واقف ہوگیا ہے، امید ہے کہ وہ اس خرابی کی اصلاح مین کامیاب ہوگا، کیونکہ اس کے مقابلہ کا جرمنی مین کوئی سائنسدان نہین،

جامعۂ استنبول

جمہوریۂ ترکیہ سے پہلے استنبول مین صرف مذہبی مدارس تھے، جن مین حدیث، فقہ، اور دوسرے دینی علوم کی تعلیم ہوتی تھی، لیکن اب وہان جدید طرز کی یونیورسٹی قائم ہوگئی ہے، امید ہی کہ اس کے ذریعہ اہل استنبول کافی ترقی کرین گے، اس کے نصاب مین طب، ادویہ سازی، قانون، سائنس اقتصادیات اور ادب وغیرہ نئے فنون شامل ہین، یہ جامعہ شہر کے وسط بایزیت (Bezaze) کے قریب واقع ہے، اس سے ملا ہوا ایک باغ ہے جس کے سامنے حسین ترین مناظر ہین، طلبہ کی تعداد ۵۰۰ تک پہونچ چکی ہے، اس لئے اب عمارت کی توسیع ہونے والی ہے،

روس مین مسجدین

روس مین اس وقت ۱۲۱۳ مساجد ہین، ان کی بڑی تعداد مشکیریا (Bashkiria) کے

شہر یوفا (Ufa) مین ہے، وہان کے سب سے بڑے موجودہ امام عبد الرحمن ہین، ان کی مستقل سکونت یوفا ہی مین ہی، ان مساجد مین ۲۰۵۲ ملا، ۲۰۲ شیوخ اور ۸۲۰۵ موذن روسی حکومت کی طرف سے مقرر ہین، یہ مسجدین مختلف فرقون، سنی، شیعہ اور اسمٰعیلیون کی ہین،

قطب شمالی مین نشرگاہ

قطب شمالی وجنوبی مین سال بھر برف پڑتی رہتی ہے، جس طرف نگاہ اٹھتی ہے، برف ہی برف نظر آتی ہے، وہان اسکیمو کے سوا کوئی آبادی نہین، موجودہ جنگ مین پٹرول کمیاب ہو رہا ہے اسلئے ہر ملک کی یہ خواہش ہی کہ وہ کم سے کم تیل مین اپنا کام چلائے، ماسکو سے امریکہ کا قریب ترین راستہ قطب شمالی ہوکر ہے، اس لئے اہل روس نے اس برف سے ڈھکے ہوے ملک مین نشرگاہ اور ہوائی اڈہ قائم کرکے دنیا کو محوحیرت کر دیا ہی،

فیتہ پر قرآن

ایک ایرانی سیاح جو حال ہی مین لکھنؤ آیا تھا، اس کے پاس ایک کلام مجید تھا، جو ساڑھے سات گز لمبے اور ڈھائی انچ چوڑے کپڑے پر لکھا ہوا تھا خیال ہے کہ یہ نسخہ ۸۰۰ سال پہلے کا لکھا ہوا ہے، یہ فن خطاطی کا بہترین نمونہ اور غالباً چھ سال سے کم مدت مین نہ لکھا گیا ہوگا،

ایک نیا نباتاتی تجربہ

امریکہ کے ایک سائینسدان پروفیسر آرتھر نکلسن کا خیال ہی کہ اگر پانی مین تین چار بار ایک خاص کیمیاوی طریقہ سی برقی لہر دوڑائی جائے اور اس سے درخت سینچے جائین تو وہ زیادہ پھل دینگے اور پھول کی شادابی بڑھ جائے گی، علی گڈہ کے ایک طالب علم جنھون نے نباتات مین ایم اے کیا ہے، انھون نے ذاتی تجربہ کے بعد پروفیسر موصوف کے خیال کو صحیح پایا،

ادبیات

زمزمۂ عرفان

از پروفیسر سلیم فارانی ایم اے، ایم او ال، گورنمنٹ کالج ہشیار پور

جذبِ دل معمار ہے تقدیر کی تعمیر کا
معجزہ دکھلا ذرہ ہنگامۂ تدبیر کا

انقلاب انگیز ہو نادان ! تراہر اک نفس
محورِ اعظم تو ہی ہے عالمِ تقدیر کا

جو تجھے کہتے ہیں فانی، جانتے شاید نہیں
ایک پہلو اور بھی ہے اس تری تصویر کا

جان نثاری کھیل ہے مردِ مجاہد کے لئے
حوصلہ ہے پست اس کے روبرو شمشیر کا

ناشناسائی ہیں جب انسان کے ہیں عالم مطیع
کیجئے اندازہ پھر عرفان کی تاثیر کا

ذرہ ذرہ میں جہان اندر جہان پاتا ہوں میں
پھر بھی اسکی معرفت میں خوف ہے تقصیر کا

ہیبتِ جلوہ گری نے عقل پر ڈالے ہیں بند
حیرتِ نظارہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

کون کہہ سکتا ہے کیا ہو گر اٹھے اس سے نقاب
اس قدر چرچا ہے جس کے نور کی تنویر کا

میں نے فارانی طفولیت میں جو دیکھا تھا خواب
وقت آپہنچا ہے اب اس خواب کی تعبیر کا

غزل

از جناب امجد علی صاحب نجح فیض آبادی

زبان پہ لائیے کیا شکوہ ہر کسی کے لئے
یہ دل بنا ہے ازل سے شکستگی کے لئے

اب اس خلوص کی تو مجھکو داد دیکہ نہ دے
زمانے بھر سے ہون ناخوش تری خوشی کیلئے

کہان مین اور کہان یہ دیارِ بے گانہ
بہانہ چاہئے کچھ مرگِ بیکسی کے لیئے

غضب ہو کھا گیا تو بھی شکست ظلمت سے
ضیا مین عرش سے لا شامِ زندگی کیلئے

اب اس ادائے تبسم سے تو دریغ نہ کر
تمام عمر میں رویا ہون اس ہنسی کیلئے

نہین کہ اُن مین "جمالِ کرم" نہین یعنی
وہ مہربان بھی ہین لیکن کسی کسی کیلئے

عطا ہو، ذوقِ محبت کے ساتھ عمر ابد
یہ زندگی تو بہت کم ہے عاشقی کیلئے

نفس نفس مین بناتا ہون اک جہانِ امید
یہ اہتمام ہے دو دن کی زندگی کیلئے

اسی جہانِ خس و خاک کو بنا لے ارم
بہشت اُوتر کے نہ آئی کبھی کسی کیلئے

وہ حُسن دلکش و رعنا سہی مگر امجد
نہ دوستی کے لئے ہے، نہ دشمنی کیلئے

تحذیر از مجالستِ جاہلان

از جناب حکیم الشعرا سید احمد حسین صاحب امجد حیدرآبادی

قطعہ

جاہل انسان کے سایے مین نہ جاؤ
تم ابو جہل کو بھائی نہ بناؤ

وہ تو تم کو بھی تبہ کر دے گا
کوئلہ، جامہ سیہ کر دیگا

لوگ سمجھین گے کہ تم جاہل ہو
کیونکہ جاہل کی طرف مائل ہو

دوست جاہل کا ہو جاہل کا مثیل
قیل الجنس الی الجنس یمیل

صحبت نیک سے جاہل فطرت
جاہلیت کو نہیں کھو سکتی

آگ ہی راکھ بنے تو بن جائے
راکھ تو آگ ہو نہین سکتی

مطبوعات جدیدہ

حزب امام ولی اللہ دہلوی کی اجمالی تاریخ کا مقدمہ
از مولینا عبید اللہ صاحب سندھی، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۲۱۶ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد عہ/

پتہ اردو بک اسٹال لاہور،

مولانا عبید اللہ صاحب سندھی نے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے فلسفہ، علوم اور ان کے تجدیدی اور اصلاحی کارناموں کا بہت گہرا مطالعہ کیا ہی، اور اپنی ذہانت سے اس مین بہت سی لطائف و نکات پیدا کئے ہین، اس موضوع پر وہ ایک مستقل کتاب لکھنے کا ارادہ رکھتے ہین یہ مختصر کتاب گویا اسکی تمہید ہی، اس مین مولنا نے شاہ ولی اللہ صاحب رح سے لیکر شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب رح تک، اس سلسلہ کے تمام بزرگون کو موجودہ اصطلاح مین ایک انقلابی اور ان کے تجدیدی اور اصلاحی کارنامون کو ایک طے شدہ اور منظم سیاسی پروگرام کے تحت مین انقلابی تحریک کی شکل مین پیش کیا ہی اس مین شبہہ نہین کہ حضرت شاہ صاحب مجتہدانہ دماغ اور بلند فکر و نظر رکھتے تھے، اور ہندوستان کے علما رمین وہ پہلے بزرگ ہین جن کی نظر ہندوستان مین اسلامی حکومت اور یہان کے مسلمانون کے زوال کے سیاسی اسباب تک پہنچی، اور ان کی کتابون مین جابجا سیاسی اور اقتصادی مسائل بھی ملتے ہین، اور ان کے بعد اس سلسلے کے بزرگون نے مسلمانون کے مروجہ عقائد و اعمال کی اصلاح کے ساتھ سیاسی حیثیت سی بھی ان کی تجدید کی کوشش کی لیکن اس کو ٹھیک مغرب کے موجودہ سیاسی افکار و خیالات اور بین الاقوامی انقلابی تحریکون پر منطبق کرنا نہ صرف خلافِ واقعہ بلکہ خود ان بزرگون

کی توہین ہے، کتاب کا بڑا حصہ مصنف کے ذاتی مفروضات و قیاسات پر مشتمل ہے، جس کی کوئی حقیقت نہین، اور اگر کہین کوئی کمزور بنیاد مل بھی گئی ہے، تو مولانا کے تخیل نے اس پر پوری عمارت بنا کر کھڑی کردی ہو، اس کتاب کا طرزِ استدلال ان یورپین مصنفین کی طرح ہے جو ایک لفظ سے پوری داستان تصنیف کرلیتے ہین، مولانا کے تخیل مین جو کمی رہ گئی تھی، وہ ان کے متن کے شارح مولانا نور الحق نے پوری کردی ہے مولانا کو سیاست مین اتنا غلو ہے، کہ انھون نے حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اصلاحی کارنامون اور اکبر جیسے ملحد کی گمراہیون کو ایک ترازو مین رکھ دیا ہے، چنانچہ فرماتے ہین، "ہماری راے مین جو کام اکبر نے شروع کیا تھا، وہ اساسًا صحیح تھا، اور عملًا غلطیان اس لئے ہوئین، کہ اس عظیم الشان کام کو چلانے کے لئے اسے آدمی میسر نہین آئے، ہمارا خیال ہے کہ وہ ضرورتین خداے تعالیٰ نے شاہ ولی اللہ کے ذریعہ سے پوری کردین" یعنی جس گمراہی کا آغاز اکبر نے کیا تھا، گویا اسکی تکمیل شاہ ولی اللہ نے کی اناللہِ وَانّا الیہِ رَاجعُون مصنف کا علم و نظر مسلّم ہے، ان کے حسنِ نیّت مین بھی شبہ نہین، لیکن مغربی ملکون خصوصًا سویٹ روس کے قیام کے اثر سے ان پر ایک خاص قسم کی سیاست اتنی چھا گئی ہے، کہ اس مین دینی مصالح گم ہوگئے ہین تاہم چونکہ ایک ممتاز دماغ کے قلم کی تحریر ہے، اس لئے اس مین غور و فکر کے لائق بہت سے نکتے بھی ملجاتے ہین، اور اسی حیثیت سے اسکو پڑھنا چاہئے،

غالب مؤلفہ جناب غلام رسول صاحب مہر تقطیع بڑی، ضخامت ۴۸۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت معلوم نہین، پتہ شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہوری دروازہ لاہور،

جناب غلام رسول صاحب مہر کی قابلِ قدر تالیف غالب کے پہلے اڈیشن پر دسمبر ۳۶ء کے معارف مین مفصل ریویو ہوچکا ہے، اور وہ صاحبِ ذوق طبقہ مین اتنی شہرت اور مقبولیت حاصل کرچکی ہے کہ اس کے لئے کسی مزید تعارف کی ضرورت نہین، غالب پر اردو مین جتنی کتابین لکھی گئی ہین، یہ کتاب ان سب مین ممتاز درجہ رکھتی ہے، اس مین خود غالب کی تحریرون اور کلام سے ان کی مفصل سوانحعمری

مرتب کی گئی ہے، یہ خصوصیت اس کے سوا اور کسی کتاب مین نہین، اس اعتبار سے اسکی حیثیت تزک کی ہوگئی ہی، سات آٹھ سال کے بعد اس کا دوسرا اڈیشن نکلا ہے، اس مین لائق مؤلف نے بہت سے نئے اور مفید اضافے کئے ہین، اور کتاب کی ضخامت ایک سو صفون سے زیادہ بڑھ گئی ہے، اصحاب ذوق کو ضرور اس کا مطالعہ کرنا چاہئے،

متاعِ اقبال از جناب ابوظفر عبد الواحد صاحب ایم اے لکچرار سٹی کالج حیدرآباد دکن، تقطیع بڑی ضخامت ۱۰۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت ۸ ؍ پتہ:- مکتبہ ابراہیمیہ مکتبہ امداد باہمی سٹی کالج حیدرآباد دکن،

مولف نے اس کتاب مین اقبال کی شاعری کے بنیادی پہلوؤن کو اختصار کے ساتھ اس طرح پیش کیا ہی جس سے ان کی تعلیمات کے سمجھنے مین رہنمائی ہوتی ہے، کتاب مین تین مضامین ہین، پہلے مضمون مین جن پر آشوب حالات مین اردو شاعری نے جنم لیا اور جس ماحول مین اقبال کی شاعری کا نشو و نما ہوا، اس کے جو اثرات اردو اور اقبال کی شاعری پر پڑے اوس کو دکھایا گیا ہے، دوسرے مین اقبال کی شاعری کے ابتدائی رنگ اور پھر عہد بعہد کے تغیرات اور اس کے اثرات ونتائج پر روشنی ڈالی گئی ہے، تیسرے مین اقبال کی بنیادی تعلیمات کو پیش کیا گیا ہے، اس سے کلام اقبال کی شاعری کے مختلف دورون کے تغیرات، اسکے طبعی اسباب ونتائج اور اسکی پوری تاریخ سامنے آجاتی ہے، اور اس پر جو اعتراضات کئے جاتے ہین، اس کا جواب بھی ملجاتا ہے، کلام اقبال پر جو مختصر کتابین لکھی گئی ہین، ان مین افادہ کے لحاظ سے یہ کتاب بہت اچھی ہی،

ہمارا ہندوستان مترجمہ جناب مرزا عصمت اللہ بیگ صاحب، تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۰۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت ۱۲ ؍ پتہ:- ہمفری ملفرڈ پبلشر آکسفورڈ یونیورسٹی پریس بمبئی کلکتہ مدراس،

ہندوستان قدرت کی فیاضیون سے مالا مال ہے، زمین کی زرخیزی، پیداوار، معدنیات صنعت و حرفت کیلئے مواد خام کسی چیز کی کمی نہین، جو اجناس ساری دنیا مین پائی جاتی ہین وہ قریب قریب سب کی سب تنہا ہندوستان مین موجود ہین، لیکن اجنبی حکومت کی بے توجہی اور ہندوستان کی عام جہالت و افلاس کی وجہ سے اس بے کران دولت سے ہندوستان کو بہت کم فائدہ پہنچا اس کے مقابلہ مین وہ ملک جو پیداوار کے لحاظ سے ہندوستان کے مقابلہ مین کوئی حیثیت نہین رکھتے محض اپنے ذرائع کی وجہ سے اپنی کم دولت سے ہندوستان سے کہین زیادہ فائدہ اٹھاتے ہین مسٹر مینو مسانی نے اس موضوع پر انگریزی مین یہ مفید اور پر از معلومات کتاب لکھی تھی جس مین ہندوستان کی طبعی دولت اور دوسرے ملکون کی دولت کا موازنہ کرکے ان کے مقابلہ مین اپنی دولت سے ہندوستان کی محرومی اسکے اسباب اور اس سے فائدہ اٹھانے کی صورتین بتائی گئی ہین، کاشتکارون اور مزدورون کی اصلاح اور ان کی ترقی کے وسائل کو خاص طور سے پیش نظر رکھا گیا ہے، اس سلسلہ مین ہندوستان کی موجودہ صنعتی اور اقتصادی حالت اور آیندہ ترقی کے متعلق بھی بہت سی مفید باتین آگئی ہین، کتاب بہت مفید ہے، لائق مترجم نے ترجمہ ایسا کیا ہے کہ کتاب ترجمہ نہین بلکہ تصنیف معلوم ہوتی ہے،

فاسزم مترجمہ کامریڈ باری تقطیع چھوٹی ضخامت ۶۲ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ۶؎

پتہ:۔ مکتبہ اردو لاہور،

یہ مختصر رسالہ ایک برطانوی اہل قلم پروفیسر ہیرلڈ لاسکی کی تصنیف ہے، اس مین انھون نے دکھایا ہے، کہ ہٹلر کا مقصد ابتدا سے یورپ بلکہ دنیا پر وحشیانہ تسلط و اقتدار تھا، لیکن شروع مین اس نے فاسزم کے چہرہ پر ایسا پردہ ڈالے رکھا اور اس کا طرز عمل کچھ ایسا مبہم تھا، کہ یورپ کی جمہوری حکومتون سرمایہ دارون، اشتراکیون، مختلف سیاسی طبقون نے اپنا حامی سمجھکر اس کی بے عنوانیون سے صرف چشم پوشی، بلکہ اسکی حمایت کی، اور ہٹلر نے جرمنی کے جنگ کے بعد کے پیدا شدہ حالات سے فائدہ اٹھا کر

اور جرمن قوم کو شاندار مستقبل کا یقین دلاکر اپنا اقتدار قائم کرلیا، اور ملک کو فوجی بنانے کے بعد کھل کر میدان مین آگیا، اس وقت سب کی آنکھین کھلین لیکن اب ہٹلر کی قوت اتنی مضبوط ہوچکی تھی کہ اسکا مقابلہ آسان نہ تھا، اس نازک وقت مین صرف برطانیہ دنیا کی آزادی اور موجودہ تہذیب کو اس وحشت و بربریت سے بچا سکتی ہے، لیکن اس کو صرف زبان سے نہین، بلکہ اپنے محکوم ملکون کے ساتھ عملاً حریت نوازی کا ثبوت دینا چاہئے، یہ کتاب غالباً روس پر جرمنی کے حملہ سے پہلے لکھی گئی ہے، اب ان حالات مین بہت کچھ تبدیلی ہوگئی ہے،

واردات از پنڈت ونا تریہ کیفی دہلوی تقطیع بڑی ضخامت ۵۱۲ صفحے کاغذ کتابت و

طباعت بہتر، قیمت مجلد ے، میسرز رام لال سوری اینڈ سنز انارکلی لاہور،

مذکورۂ بالا کتاب پنڈت ونا تریہ کیفی دہلوی کے کلام کا مجموعہ ہی، اردو شاعری اور اردو زبان مین پنڈت جی کا پایہ مسلم ہی، ان کی مشق سخن پر نصف صدی سی زیادہ گذر چکی ہی، جس کی مثالین شعرا مین کم نکلین گی، پنڈت جی ان شعرا مین ہین جنھون نے قدامت کے باوجود اردو شاعری کی تنگ دامانی کا احساس کیا اور اسکو تغزل کے قدیم تنگ کوچہ سی نکال کر ایک وسیع شاہراہ پر لانے کی کوشش کی جس کا ثبوت ان کا یہ کلیات ہی، چنانچہ اس ضخیم مجموعہ مین مختلف کیفیات و واردات و اقعات و خیالات اور سیاسی و قومی ادبی اور دوسری مختلف موضوعون پر ڈیڑھ سو نظمین ہین، ان مین غزلونکا حصہ بہت کم ہی، مصنف کا رجحان واقعات و حقائق کیجانب زیادہ ہی، چنانچہ غزلون مین بھی عموماً تخیل اور تغزل کی رنگینیون کی بجائے واقعیت زیادہ نمایان ہی، اسلئے اس مجموعہ مین تغزل سی ذوق رکھنے والونکی دلچسپی کا سامان بہت کم ہی، لیکن اور اصناف سخن کے نمونے بکثرت ہین اور ابتدائی مشق سی لیکر ابتک کا کلام شامل ہی، اسمین ہمواری اور یکسانیت کا ہونا دشوار ہی، اسلئے کہنہ مشقی کیساتھ نو مشقی کے نمونے بھی موجود ہین بعض بعض نظمیں پنڈت جی کی استادی کا کامل نمونہ ہین کلام کی ترتیب و ذکے اعتبار سے گیگئی ہین اس سی شاعری کے تدریجی ارتقا اور تغیرات کا اندازہ ہوجاتا ہی، پنڈت جی ان باقیات مین ہین جن سی ہندو مسلمانون کی قدیم یکجہتی اور مشترکہ تہذیب کی یاد تازہ ہی، جس کی جھلک ان کے کلام مین بھی جابجا نظر آتی ہی، "م"

"جلد ۵۰" ماہ ذی قعدہ ۱۳۶۱ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۴۲ء "عدد ۶"

مضامین

شذرات

پنجاب کے نامور عالم و وکیل و مجاہد سیاسیات مولانا عبد القادر صاحب قصوری کی وفات کی خبر سے بڑا صدمہ ہوا، قصور ضلع لاہور اُن کا وطن تھا اور وہیں وکالت کرتے تھے، اور اچھے نامور وکیل تھے، عربی کے عالم، دینیات کے فاضل اور انگریزی سے واقف تھے، مولانا ابو الکلام کے الہلال والی تحریک سے اُن کو ایسی دلچسپی تھی کہ اس کے لئے انھوں نے بہت کچھ نثار کیا، اپنے ایک صاحبزادہ کو ایک طرف عالم بنایا اور دوسری طرف کیمبرج کا گریجوایٹ، اسی طرح اپنے دوسرے بیٹے کو بھی عربی و انگریزی کی تعلیم دلائی، اور دونوں کو مع اپنی زندگی کے بہت سے سرمایہ کے دعوت و تبلیغِ اسلام کے کاموں کی نذر کر دیا، جس کا سلسلہ ایک زمانہ میں بمبئی سے لے کر مدراس تک جال کی طرح پھیلا تھا، خلافت کی تحریک میں کامیاب وکالت کو خیر باد کہہ کر قومی و سیاسی تحریکوں میں شامل ہو گئے اور اخیر تک اپنے عہد پر قائم رہے



مرحوم مسلکاً اہل حدیث تھے، نہایت دیندار، متواضع، ملنسار، پابند وضع، علامہ ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم کی تصانیف کے بڑے شائق تھے، اور ان ہی کی تحقیقات پر ان کا عمل تھا، خلافت، حجاز اور کانگریس میں بیش از بیش حصہ لیا، اور اس عمر میں بھی جو غالباً اسی کے قریب ہو گی وہ اپنے جذبات کے لحاظ سے ایسے ہی جوان تھے، ادھر سیاسیات کی عملی تحریکوں سے کنارہ کش تھے،

مرحوم کو خاکسار سے گوناگوں تعلقاتِ قلبی تھے، قومیات میں ہمیشہ ساتھ رہا، خیالات میں بہت کچھ ہم آہنگی تھی، سب سے اخیر بات یہ کہ حجاز کے وفدِ خلافت میں جو ۱۹۲۴ء میں جدہ تک جا سکا تھا، وہ ساتھ تھے، گو وفد کی صدارت برائے نام میرے نام تھی، اگر اُن کے مشورہ کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھا

جاتا تھا، جدہ کے نہایت پُرخطر موقعوں پر جب جان کا خطرہ بھی تھا وہ برابر ہمت بڑھاتے رہتے تھے، مکلا سوڈان جدہ اور قاہرہ میں ہر جگہ وہ ساتھ تھے، افسوس کہ اس وفد کے تین ممبروں میں دو مولانا عبدالماجد بدایونی اور مولانا عبدالقادر قصوری چل بسے، اب صرف ایک باقی ہے معلوم نہیں وہ بھی کَے دن کے لیے،

سر محمد یعقوب کی ناگہانی وفات کا سانحہ اخباروں میں آچکا ہے، مرحوم مراد آباد کے رہنے والے تھے، ان کے والد ماجد مولوی محمد اسمٰعیل صاحب وکیل شاہجہان پور نہایت نیک و متین و دیندار بزرگ تھے، ندوۃ العلماء کے رکن تھے اور ۱۹۱۰ء کی تبلیغی تحریک میں مولانا شبلی مرحوم کے ساتھ تھے، سر محمد یعقوب نے گو انگریزی تعلیم پائی تھی مگر مذہبی ذوق ورثہ میں پایا تھا اور بڑے خوش قسمت تھے، مراد آباد کی کامیاب وکالت سے لیکر کونسل کی صدارت تک اور پھر سرکار نظام کے مشیرِ اصلاحات کے رتبہ تک انھوں نے جو ترقی کی وہ سراسر اُن کی خوش قسمتی کا نتیجہ تھی، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اُس عالم میں بھی خوش قسمت بنائے، وہ بہت خوش خلق، متواضع، متحمل اور حاجتمندوں اور ضرورتمندوں کی امداد میں کشادہ دست تھے، غفر لہ اللہ تعالیٰ

اردو زبان کے مشہور پرانے رسالہ زمانہ کے اڈیٹر دیا نرائن نگم نے اسی مہینہ وفات پائی، کالج سے نکلنے کیساتھ انھوں نے بریلی میں زمانہ کو جو اردو کا ایک معمولی رسالہ تھا اپنی ادارت میں لیا اور اُسکو کانپور لائے، اور اس کو اس حد تک چمکایا کہ اردو کے اچھے رسالوں میں گنا جانے لگا، بلکہ اس وقت وُہ اردو کا سب سے پرانا رسالہ ہے، پریم چند آنجہانی کو وہی سب سے پہلے اسٹیج پر لائے، ان کے علاوہ اور بہت سے اچھے لکھنے والے اور کہنے والے ہندو اور مسلمان نوجوانوں نے اُن کے سایۂ قلم میں تربیت پائی، اور کہنا چاہئے کہ زمانہ صرف ان ہی کے بدولت ہندو و مسلمان اہلِ قلم کا سنگم اب تک رہا، اور اس کو دیکھ کر تسکین ہوتی تھی کہ ہندو مسلمانوں کی پرانی تہذیب کے شیدائی ہندو ابھی تک زندہ ہیں،

مدت سے جسے دورِ زماں میٹ رہا ہے

امید کہ زمانہ آیندہ بھی اپنے بانی کی یادگار میں اسکی بنائی ہوئی روش پر چلتا رہیگا تاکہ اس اختلاف آباد

ہندوستان کی اس آزادی میں دیا نرائن کا یہ دیا جلتا رہے،

ہماری زبان کے مصنفوں میں اس وقت سب سے بوڑھے مصنف غالباً مولوی عبدالرزاق صاحب کانپوری ہیں، جو البرامکہ اور نظام الملک نام دو مشہور کتابوں کے مصنف ہیں، مولانا شبلی مرحوم نے فرمانروایانِ اسلام کا سلسلہ قائم کیا تھا، ان ہی کے ساتھ ان ہی کے زیرِ مشورہ مولوی عبدالرزاق صاحب نے وزرائے اسلام کا سلسلہ شروع کیا تھا، جسکی پہلی کڑی البرامکہ ہے، جو آج سے چالیس سال پہلے لکھی گئی تھی، اور اس وقت بہت دلچسپی سے پڑھی گئی تھی،

لیکن اب چالیس سال میں تحقیقات میں بہت کچھ اضافہ ہوگیا ہے، اور بہت سی نئی کتابیں بھی چھپ گئی ہیں اس لیے ضرورت تھی کہ مصنف اس پر نظرِ ثانی کریں، چنانچہ موصوف نے کئی سال کی محنت میں اس کو نظرِ ثانی کر کے چھپوایا ہے، اور ۳۰۰ نئے صفحے اور ۵ انئے باب بڑھائے ہیں، امید ہے کہ اہلِ شوق ہمارے سب سے بوڑھے مصنف کی اس سب سے پہلی کتاب کی پوری قدر کریں گے، غیر مجلد کی قیمت ؎ہ اور مجلد کی ؎ ہے، پتہ:- مولوی عبدالرزاق صاحب مہتمم صیغۂ تاریخ، بھوپال،

آجکل عریاں نویسی کا نام ادبِ لطیف، اور مزدوروں اور غریبوں کے مرثیہ کا نام نیا ادب رکھا گیا ہے، اور کہا جا رہا ہے کہ یہ نئے انقلاب کی بنیاد بنے گا، اس نئے ادب میں ہر پرانی چیز سے بے ادبی پہلا اصول ہے، اس بنا پر مذہب سے جو ان کا سب سے پرانا سرمایۂ روح ہے، بے ادبی ناگزیر ہے، چنانچہ ہندو نوجوانوں کی دیکھا دیکھی مسلمان نوجوانوں نے بھی تفریحِ طبع کی خاطر اس بے ادبی سے دل بہلانے کی طرح طرح کی صورتیں ایجاد کی ہیں کہیں ظرافت کہیں تمسخر کہیں شاعری کہیں سیاست اور کہیں معاشر کے مسائل میں بذلہ سنجی کی جاتی ہے، اور عموماً اس شغلہ میں بے روزگار اہلِ قلم مصروف ہیں، دلی کے ایک نئے ادب کے رسالہ میں ابھی اس بے ادبی کا نیا مظاہرہ کیا گیا ہے، یہ رسالہ اس دادا کے پوتے کی ادارت میں نکلتا ہے، جو مہدی مرحوم کے بقول مذہب کے بغیر لقمہ بھی نہیں توڑتے تھے"،

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا

پھر کیا مسلمان اس پر صرف افسوس کر کے رہ جائیں،

مقالات

مستشرق نولدیکی اور قرآن

از

مولوی محمد اویس صاحب ندوی نگرامی رفیق دار المصنفین

یہ پورا مضمون حضرت الاستاذ علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ کے افادات کا نتیجہ ہے، فارسٹر کے جغرافیہ کی طرف مخدومی جناب مولانا عبد الماجد صاحب مدظلہ نے رہنمائی فرمائی ہے"۔

"مستشرقین یورپ" جن کے فضل و کمال کا سکہ دلون پر بیٹھا ہوا، اور جن کی تلاش و تحقیق کا رعب دانون پر چھایا ہوا ہے، وہ اسلام کی عداوت مین کبھی ایسی عامیانہ اور جاہلانہ روش اختیار کرتے ہین جس پر سطحی معلومات والا انسان بھی ہنسے بغیر نہین رہ سکتا، چنانچہ مشہور جرمن محقق و مستشرق نولدیکی جس کے علمی افلاس کا یہ عالم ہے کہ وہ قرآن پاک کو (نعوذ باللہ) تصنیف محمدی بتلاتا ہے، انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا مین[1] قرآن مجید پر ریویو کرتے ہوئے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق لکھتا ہے، کہ عرب سے تو واقفیت تھی لیکن بیرونِ عرب کا جہان ذکر کرتے ہین، وہان ان کی بے خبری (لفظا کا اصلی ترجمہ جہالت ہے) کی پردہ دری ہو جاتی ہے، چنانچہ مصر کی زرخیزی کو جہان کہ بارش تقریباً نہین دیکھی جاتی ہے، وہ دریاے نیل کے سیلاب کے بجاے بارش پر منحصر رکھتے ہین،

واقعہ کی اصل صورت یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام جب قید خانہ مین تھے، تو مصر کے بادشاہ نے

---

[1] جلد ۱۵ صفحہ ۹۰۰ طبع یازدہم کیمبرج یونیورسٹی،

خواب دیکھا کہ سات موٹی گائیں ہیں، اور سات دبلی، دبلی گائیں موٹی کو نگل گئیں، اور سات شاداب بالیں ہیں اور سات خشک، خشک بالوں نے سبز کو کھالیا، شاہ مصر کے خواب کی حضرت یوسف علیہ السلام نے تعبیر دی جس کو قرآن پاک نے ان الفاظ سے بیان کیا ہے،

قَالَ تَزْرَعُونَ سَبْعَ سِنِيْنَ دَأَبًا فَمَا	آپ نے فرمایا کہ تم سات سال متواتر غلہ بونا
حَصَدْتُمْ فَذَرُوهُ فِي سُنْبُلِهِ إِلَّا	پھر جو فصل کاٹو، اس کو بالوں میں رہنے دینا،
قَلِيلًا مِمَّا تَأْكُلُونَ ثُمَّ يَأْتِي مِنْ	ہاں مگر تھوڑا سا جو تمھارے کام میں آئے،
بَعْدِ ذٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَأْكُلْنَ مَا	پھر اس کے بعد سات برس اور ایسے سخت
قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ إِلَّا قَلِيلًا مِمَّا تُحْصِنُونَ	آئیں گے، جو کہ اس ذخیرہ کو کھا جائیں گے،
ثُمَّ يَأْتِي مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ فِيهِ	جس کو تم نے ان برسوں کے واسطے جمع کیا
يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيهِ يَعْصِرُونَ،	ہے، مگر تھوڑا سا جو تم رکھ چھوڑو گے، پھر
(یوسف ۷)	اس کے بعد ایک برس ایسا آئے گا جس میں
	لوگوں کے لئے خوب بارش ہوگی، (یا فریاد رسی
	ہوگی) اور اس میں شیرہ بھی نچوڑیں گے،

اس تعبیر میں ایک لفظ (یغاث) ہے عموماً جس کا مفہوم یہ لیا گیا ہے کہ بارش ہوگی، جرمن مستشرق کے نزدیک مصر کے سلسلہ میں بارش کا ذکر نعوذ باللہ صاحب قرآن کی بے خبری کی دلیل ہے!

بسوخت عقل ز حیرت کہ این چہ بوالعجبی است!

بے خبر انسان کو خدائے علیم و خبیر کے کلام پر تنقید کی جرأت؟ ذیل کی سطروں میں اس تنقید کی اصل حقیقت آشکارا کی گئی ہے!

(۱) اس سلسلہ میں پہلی بات یہ ہے کہ (یغاث) کے معنی صرف پانی برسنے کے نہیں ہیں، مفسرین کی ایک

جماعت کہتی ہے کہ یہ غیث (بمعنی بارش) سے مشتق نہیں ہے، بلکہ اس کا مادہ غوث ہے جس کے معنی فریادرسی کے ہیں یعنی اس قحط کے بعد ایسا سال آئے گا جس میں لوگوں کی فریادرسی ہوگی، اور قحط دور ہوگا، اس قحط کے خاتمہ کا سبب بارش ہوگی یا نیل کا سیلاب؟ اس کا یہاں کوئی تذکرہ نہیں ہے!

روح المعانی میں ہے،[۵۱]

ای یصیبھم غیث ای مطر کما قال	یعنی ان کو پانی پہونچے گا، جیسا کہ ابن
ابن عباس ومجاہد والجمہور	عباس، مجاہد اور جمہور نے کہا ہے، اس
فھو من غاث اللامی الیائی، و	وقت اس کا مادہ غیث ہوگا، اور کہا
قیل ھو من الغوث ای الفرج	گیا ہے، کہ اس کا مادہ غوث ہے یعنی
یقال اغاثنا اللہ تعالیٰ اذا امدنا	فریادرسی اور مصیبت کا دور کرنا کہا
برفع المکارہ حین اظلنا فھو	جاتا ہے، اغاثنا اللہ، جب کہ خدا ہماری
رباعی وادی،	مصیبتوں کو دور کرے،

بیضاوی میں ہے،[۵۲]

یمطرون فیہ من الغیث	بارش ہوگی، جب کہ مادہ غیث ہو، اور اگر
او یغاثون من القحط من	مادہ غوث ہو، تو اس کے معنی یہ ہوں گے،
الغوث،	کہ قحط ان سے دور کیا جائیگا، انکی فریادرسی ہوگی،

ثعالبی کی جواہر الحسان فی تفسیر القرآن میں ہے،[۵۳]

جائز ان یکون من الغیث وھو	جائز ہے کہ غیث سے ہو، جیسا کہ ابن عباس رض
قول ابن عباس وجمہور المفسرین	اور جمہور مفسرین کا قول ہے یعنی بارش ہوگی،

---

۵۱ روح المعانی ج ۱۲ ص ۲۲۹ ۵۲ بیضاوی جلد اول ص ۳۹۹ ۵۳ جواہر الحسان ج ۲ ص ۲۳۱،

اسے یعطرون وجائز ان یکون اور جائز ہے کہ غوث سے ہو، جس کے معنی

من اغاثهم الله اذا فرج عنهم فریاد رسی کے ہیں، یعنی اُن کی مشکل دور

ومنه الغوث وهو الفرج، کی جائے گی،

(۲) اور اگر عام مفسرین کے مسلک کے مطابق بارش ہی کے معنی لئے جائیں، تو بھی فاضل مستشرق کا یہ دعویٰ کہ مصر میں بارش بالکل نہیں ہوتی ہے، غلط ہے، بارش کم سہی لیکن اس کا مطلقاً انکار خلافِ واقعہ ہے،

یعقوبی کتاب البلدان میں کہتا ہے، کہ مصر میں سواحل پر کسی قدر بارش ہوتی ہے[1]

الحضارۃ المصریہ[2] میں ہو کہ یہ کہنا ہرگز صحیح نہیں ہی، کہ وادی نیل بارش سے محروم ہی،

ای مارسڈن وٹی آسفورڈ اسمتھ کے جغرافیۂ عالم میں ہی[3]

"بارش یہان بہت ہی کم یعنی قاہرہ میں ایک انچ سالانہ اور اسکندریہ میں جو سمندر سے متصل واقع ہے، ۱۰۱۸ انچ سالانہ سے زیادہ نہیں ہوتی"۔

(۳) مصر کے وہ مقامات جہان فراعنۂ مصر کا قیام تھا، ان کا بارانی ہونا تو بہرحال ثابت ہی چنانچہ مصر کے سواحل اور قاہرہ جو ساحلِ دریائے نیل پر چودہ میل مربع رقبہ میں آباد ہے، وہان بارش کا ہونا معلوم ہو چکا ہی، تاریخ سے معلوم ہوتا ہے، کہ فراعنۂ مصر کا قیام قاہرہ سے قریب ہی منف اور عین شمس میں رہا کرتا تھا، ابو الفداء کی تقویم البلدان میں ہے، کہ عین شمس کو مدینۂ فرعون کہا جاتا ہے، اور یہ قاہرہ سے نصف مرحلہ پر واقع ہے[4]

یاقوت نے معجم البلدان میں منف کو فرعون کا شہر تبلایا ہے، اور یہان کے آثار قدیمہ کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ یہیں حضرت یوسف علیہ السلام کا مکان تھا، یہیں فرعون کا قیام بھی رہا کرتا تھا، اور یہیں

---

[1] کتاب البلدان ص ۳۴۰ [2] الحضارۃ المصریہ ص ۸ [3] جغرافیۂ عالم ج ۲ ص ۱۶۳، حیدرآباد،

[4] تقویم البلدان ص ۱۱۸،

فرعون کا عین شمس تھا، اور اس وقت فسطاط کا جو محل وقوع ہے، وہ عین شمس اور منف کے درمیان ہے[1]

اصل یہ ہو کہ عین شمس ایک ہیکل تھا، لوگ اسکی زیارت کو آتے تھے، پھر یہان آبادی قائم ہوگئی، اور رفتہ رفتہ اس آبادی نے شہر کی حیثیت اختیار کرلی، ورنہ یہ منف سے الگ نہین ہی[2]

خطط مقریزی مین ہو کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے حضرت یعقوب علیہ السلام اور پورے خاندان جس مین ۷۳ مرد اور عورتین شامل تھین، فرما اور عین شمس کے درمیان ٹھہرایا تھا، اور یہان کی زمین بہت شاداب ہے[3]

اب بھی عین شمس قاہرہ کے مضافات مین موجود ہے مسلمان اس کو عون اور یورپی لوگ ہیلوپولس کے نام سے یاد کرتے ہین، اب یہان بڑے بڑے مکانات اور شاندار ہوٹل ہین، قاضی ولی محمد صاحب اپنے سفرنامۂ مصر ۱۹۲۴ء مین لکھتے ہین :-

> کہتے ہیں کہ اس جگہ کو حضرت موسیٰؑ کی اقامت گاہ کا شرف حاصل ہوا تھا، اور فرعون کا محل بھی یہیں کہین تھا، اور یہین عزیز مصر کے بنگلہ مین زلیخا رہتی تھی، اس جگہ کوئی ہیکل شمسی تھا، جہان آفتاب پرستی ہوتی تھی،[4]

ان تفصیلات سے معلوم یہ ہوا کہ فراعنۂ مصر قاہرہ کے قریب ہی آباد تھے، اور وہان بارش ہوتی تھی، اس لئے حضرت یوسف علیہ السلام کی تعبیر خواب مین اگر بارش کا ذکر تسلیم کیا جائے تو یہ کوئی خلاف واقعہ بات نہین ہے،

(۴) محقق مستشرق نے مصر کی زرخیزی کو دریائے نیل پر منحصر رکھا ہے، لیکن اس پر غور نہین کیا کہ خود دریائے نیل کا پانی بھی بارش ہی کے پانی کا نتیجہ ہے،

یعقوبی کا بیان ہے کہ مصر اور اس کے دیہاتون کا کام نیل سے چلتا ہے، اور نیل کے پانی مین

---

[1] معجم البلدان ج ۶ صفحہ ۱۸۱ [2] ایضاً [3] مقریزی ج ا صفحہ ۳۱ [4] ایضاً ج ا صفحہ ۳۹ [5] سفرنامۂ مصر صفحہ ۱۱۴ ،

بارش کے اس پانی سے زیادتی ہوتی ہے، جو گرمی مین برستا ہے،!

الحضارۃ المصریہ مین ہے:

"اب یہ بات بالکل واضح ہوچکی ہے، کہ نیل کا فیضان اس بارش کا نتیجہ ہے جو مارچ مین وسطِ افریقہ مین ہوتی ہے، جہان کہ دریاے نیل کا منبع ہے، اور وہان سے مصر کی طرف یہ پانی سرسبزی اور شادابی لیکر آتا ہے"۔[۱]

عہدِ حاضر کے مشہور عالم علامہ سید رشید رضا مرحوم جن کی پوری زندگی تقریباً مصر ہی مین گذری، وہ اپنی تفسیر[۲] مین فرماتے ہین، کہ مصر کو بارش کے پانی سے مستثنیٰ نہین کیا جاسکتا ہے، کہا جاتا ہے کہ مصر کی زندگی بارش سے نہین بلکہ نیل کے پانی سے ہے، حالانکہ خود نیل کا پانی بارش ہی کا ممنون ہے نیل کا فیضان اور اسکی کمی درحقیقت ان مقامات کی بارش پر منحصر ہے، جہان سے نیل مین پانی آتا ہے، اس ضمن مین علامہ مرحوم نے قرآن پاک کی یہ آیت نقل فرمائی ہے،

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِى الْاَرْضِ، (زمر ۲)	اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی برسایا، پھر اسکو زمین کے سوتون مین داخل کردیتا ہی،

اس کے بعد فرمایا کہ وہ چھوٹے دریا جو نیل کے "ینابیع" ہین، وہ بارش ہی کے پانی سے ہین،

یہان فرعون کا وہ مقولہ بھی پیش نظر رکھنا چاہئے جس کو قرآن پاک نے نقل فرمایا ہے،

اَلَيْسَ لِىْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِىْ (زخرف - ۵)	اے میری قوم کیا مصر کی سلطنت میری نہین ہی اور یہ نہرین میری پائین مین بہ رہی ہین،

اس سلسلہ مین قرآن پاک کی ایک دوسری آیت بھی قابلِ توجہ ہی،

قرآن مجید مین اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی نشانیون مین سے ایک نشانی یہ بھی بتائی ہے کہ ہم

---

[۱] الحضارۃ المصریہ ص۵۲ جلد ۲ ص۲۵

اُن مقامات پر پانی پہنچاتے ہین، جہان بارش نہین ہوتی ہے، یا اگر ہوتی ہے، تو اس قدر کم، کہ اس سے پورا نفع نہین اٹھایا جاسکتا ہے، فرمایا:۔

اَوَلَمۡ یَرَوۡا اَنَّا نَسُوۡقُ الۡمَآءَ اِلَی الۡاَرۡضِ	کیا انھون نے اس بات پر نظر نہین کی کہ ہم
الۡجُرُزِ فَنُخۡرِجُ بِہٖ زَرۡعًا تَاۡکُلُ مِنۡہُ	خشک افتادہ زمین کی طرف پانی پہنچاتے ہین،
اَنۡعَامُہُمۡ وَ اَنۡفُسُہُمۡ اَفَلَا یُبۡصِرُوۡنَ	پھراس کے ذریعہ سے کھیتی پیدا کرتے ہین، جس سے
(سجدہ ۳)	انکے مواشی اور وہ خود بھی کھاتے ہین تو کیا؟

مفسر ابن جریر نے حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے "ارض جرز" کے یہ معنی نقل کئے ہین،

قَالَ الجُرُزُ الَّتِی لَا تُمطَرُ اِلَّا مَطَرًا	جرز وہ ہے، جہان ناکافی بارش ہوتی ہو
لَا یُغنِی عَنہَا شَیئًا اِلَّا مَا یَاتِیہَا	سوا اس کے کہ جو پانی سیلاب سے
مِنَ السُّیُولِ[1]	پہونچ جائے،

حافظ سیوطی حسن المحاضرہ[2] مین کہتے ہین، کہ ایک جماعت کے نزدیک ارض جرز سے مراد مصر کی سرزمین ہے، حافظ ابن کثیر اپنی تفسیر[3] مین فرماتے ہین، کہ مفسرین عموماً "ارض جرز" کے لئے مثال مین مصر کا نام پیش کر دیتے ہین، لیکن اس کا یہ مطلب نہین ہے، کہ اس سے مراد محض "مصر" ہے، بلکہ ارض جرز مین سے مصر بھی ہے، "مصر کا "ارض جرز" مین ہونا قطعی ہے، وہان کی زمین کی حالت یہ ہے، کہ اگر بارش حسب ضرورت ہو تو مکانات منہدم ہو جائین، اس لئے اللہ تعالیٰ وہان بارش کے بجائے اس پانی کو لیجاتے ہین، جو بلاد حبشہ مین برستا ہے،!

اسی مفہوم کو شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ نے اپنے رسالہ عرشیہ[4] اور منہاج السنہ مین بیان کیا ہے[5]

---

[1] تفسیر ابن جریر ج ۱۵ ص ۶۶ [2] ج ۱ ص ۲ [3] جلد ۳ ص ۴۶۴ [4] ص ۱۳، [5] جلد ۲ صلاا

منہاج السنۃ میں ابن تیمیہ کے الفاظ یہ ہیں :-

فالارض الجرزلا مطرها یکفیها کارض	ارض جرز میں اتنا پانی نہیں برستا ہے، جو اس
مصر لو امطرت مطر المعتاد لم	کے لئے کافی ہو جیسے مصر کی زمین، کہ اگر
یکفہا فانہا ارض ابلیز وان امطرت	معمولی بارش ہو تو وہ اس کو کافی نہیں
مطر کثیراً مثل مطر شھر (آذار)	اس لئے کہ مصر کی زمین کیچڑ والی ہے، اور
خربت المساکن فکان من حکمۃ	اگر زیادہ پانی برسے (مثلاً جتنی بارش کہ
الباری و رحمتہ ان امطر ارضا	مارچ میں ہوتی ہے) تو مکانات برباد جائیں
بعیدۃ ثم ساق ذالک الماء	پس خدا کی حکمت اور رحمت ہے، کہ ایک
الی ارض مصر فھذہ	دور مقام پر پانی برساتا ہے، پھر اس پانی
الآیۃ یستدل بہا علی علم	کو مصر لیجاتا ہے، اس آیت سے خدا کے علم،
الخالق و قدرتہ و مشیئتہ	اس کی قدرت، اس کی مشیت اور اس
و حکمتہ،	کی حکمت پر استدلال کیا جاسکتا ہے!

کس قدر دلچسپ بات ہو کہ جو چیز نولدیکی کے نزدیک نعوذ باللہ صاحبِ قرآن کی بے خبری پر دلالت کرتی ہے، شیخ الاسلام ابن تیمیہ اسی سے خدا کے علم، اسکی قدرت، مشیت اور اسکی حکمت پر استدلال کرتے ہیں،

یہ امر بھی خاص طور سے لائق توجہ ہے، کہ یہ قحط مصر ہی میں نہ تھا، بلکہ اس کے اثرات دور دور تک تھے، برادران یوسف علیہ السلام کا غلہ کے لئے مصر آنا خود قرآن میں مذکور ہے، تورات میں بھی انکا کنعان سے مصر تک غلہ کے لئے آنا مصرح موجود ہے[1] نہ صرف کنعان بلکہ اور بہت سی ملکوں کے لوگ غلہ

---

[1] پیدایش باب ۴۴،

کے لئے مصر آتے تھے،[1]

عرب کے جنوب علاقہ یمن تک اس کے اثرات تاریخ سے ثابت ہین، چنانچہ ریورنڈ فارسٹر کی انگریزی "تاریخی جغرافیہ عرب" مین ابن ہشام کے حوالہ سے درج ہے، کہ ملک یمن مین سیلاب کے اثر سے ایک قبر کھل گئی، جس مین ایک عورت کی لاش نظر آئی، اس کے گلے مین موتیون کے سات گلوبند، ہاتھون اور پیرون مین بازوبند کڑے اور سات سات چھلے بھی تھے، ہر ہر انگلی مین نگینہ کی بیش قیمت انگوٹھی تھی، اور سرہانے زر و مال سے لبریز ایک صندوقچہ تھا، قبر مین ایک کتبہ بھی ملا جس مین پہلے فقرہ کے بعد پانچ اشعار درج ہین، اسکی نقل حسب ذیل ہے،

باسمك اللّٰهم اله حمير	تیرے نام سے اے خدا، اے خدائے حمیر،
(۱) انا تاجه بنت ذی شفر بعثت مائرنا الی یوسف فابطأ علینا فبعثت لاذتی،	مین تاجہ بنت ذی شفر ہون، مین نے اپنے شاہی داروغہ کو یوسف کے پاس بھیجا، پھر جب واپسی مین دیر ہوئی تو مین نے اپنی خواص کو بھیجا،
(۲) بمد من ورق لتأتینی بمد من طحین فلم تجده فبعثت بمد من ذهب	چاندی کی ایک مقدار دیکر کہ اس کے عوض مین آٹے کی ایک مقدار لائے، پھر جب وہ نہ مل سکا تو پھر مین نے سونا دے کر بھیجا،
(۳) فلم تجده فبعثت بمد من بحری فلم تجده فامرت به فطحن	جب اس سے بھی نہ مل سکا تو پھر مین نے موتی بھیجے، اور جب اس سے بھی نہ مل سکا، تو مین نے ان موتیون کو پسوا ڈالا،
(۴) فلم انتفع به فاقتفلت	وہ کسی کام نہ آسکے سواب مین یہان فن

[1] پیدائش باب ۴۱، ۵۲ ج ۲ ص ۱۰۳

فمن سمع فليرحمني	ہوتی ہون، جو کوئی میری خبر پائے، اوسے چاہئے کہ میرے اوپر ترس کھائے،
وآية امرأة لبست حليًا من حليتي	اور اگر کوئی عورت میرے ان زیورون
(۵) فلا ماتت الا ميتتي ،	پر طمع کرے اور انھین پہننا چاہے تو اوس کو میری ہی جیسی موت نصیب ہو،

اس کتبہ سے معلوم ہوا کہ یمن تک اس قحط کے اثرات یقینی تھے، توراۃ تو صراحۃً اسکی عالمگیری کی قائل ہے،

(۵۳) اور سات برس ارزانی کے جو زمین مصر مین تھے، آخر ہوئے، اور گرانی کے سات برس جیسا کہ یوسف نے کہا تھا، آنے شروع ہوئے، (۵۴) اور سب زمین مین گرانی ہوئی، پر ہنوز مصر کی ساری زمین مین روٹی تھی، (۵۵) پر جب ساری زمین مصر بھوک سے ہلاک ہونے لگی، تو خلق روٹی کے لئے فرعون کے آگے چلائی، فرعون نے سب مصریون کو کہا کہ یوسف کنے جاؤ، وہ جو تمھین کہے سو کرو، (۵۶) اور تمام روے زمین پر کال تھا، اور یوسف نے ذخیرے کے کھتے کھول کے مصریون کے ہاتھ بیچے اور مصر کی زمین کال بہت بڑھا، (۵۷) اور ساری ملک مصر مین یوسف کنے مول لینے آئے، کیونکہ سب ملکون مین سخت کال تھا۔[۵]

ان حوالہ جات سے بیرونِ مصر قحط کے اثرات کا جب ثبوت موجود ہے، تو مسئلہ اور واضح ہو جاتا ہے اسلئے کہ اگر مصر کو بارش سے محروم تسلیم بھی کر لیا جائے تو سارا عالم تو بارش سے محروم نہ تھا، اور قرآن پاک مین (یغاث) کے ساتھ (الناس لوگ) کا لفظ ہے، صرف اہلِ مصر کی تخصیص نہین ہے، !

(۷) اس موقع پر نفس آیت پر بھی ایک نظر ڈالنا چاہئے، اور قرآن پر تنقید کے بجائے اس کے

---

[۵] پیدایش باب ۴۱،

اعجاز و بلاغت اور اسکی صداقت کا اعتراف کرنا چاہئے،

توراۃ کی منقولہ بالا آیات سے معلوم ہو چکا ہے، کہ جب سارے عالم مین لوگ بھوک سے پریشان تھے،

اس وقت مصر مین خوشحالی تھی، آیت یہ ہی:-

"اور سب زمین مین گرانی ہوئی، پر ہنوز مصر کی ساری زمین مین روٹی تھی"۔

یہ خوشحالی درحقیقت حضرت یوسف علیہ السلام کی تعبیر خواب کے طفیل مین تھی جس مین آپ نے

ارشاد فرمایا تھا،

تزرعون سبع سنین دأباً فما حصدتم	تم سات سال متواتر غلہ بونا پھر جو فصل
فذروہ فی سنبلہ الا قلیلاً مما	کاٹو اس کو بالون مین رہنے دینا، مگر تھوڑا سا
تأکلون (یوسف ۶)	جو تمھارے کھانے میں آئے،

حضرت یوسف علیہ السلام کی اس تنبیہ کے باعث اہل مصر کو کسی قدر غلہ مل گیا تھا اور دوسرے ملکون والے چونکہ بالکل بےخبر تھے، اس لئے وہ کوئی انتظام نہ کر سکے،

اب قابل غور امر یہ ہے، کہ اس پوری آیت مین (یغاث - فریاد رسی ہوگی۔ یا بارش ہوگی) اور یعصرون شیرہ نچوڑین گے) کے سوا جتنے صیغے ہین، وہ سب حاضر کے ہین، (تزرعون، تم غلہ بونا، حصدتم، تم فصل کاٹو، تاکلون، تم کھاؤ، تحصنون، تم جمع کروگے) گویا ان مخاطب صیغون کا تعلق صرف اہل مصر سے ہے، اور اسی لئے وہ نسبتہً نفع مین رہے، اور ان کے بعد جو صیغے ہین، یعنی (یغاث) اور (یعصرون) وہ غائب کے صیغے ہین،

یہ التفات[1] بے سبب نہین ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بارش یا فریاد رسی کا تعلق چونکہ دوسرے

---

[1] التفات علم معانی و بیان کی ایک اصطلاح ہے، جس کا مفہوم یہ ہی، کہ ایک ہی ضمن کی گفتگو میں صیغون اور طرز خطاب کا تغیر و تبدل، مثلاً ابھی گفتگو میں حاضر کے صیغے استعمال ہو رہے تھے، یکایک غائب یا متکلم کے

ملکون سے بھی تھا، اس لئے یہان غائب کے صیغے استعمال کئے گئے، تاکہ مفہوم میں عموم پیدا ہو، اور نولدیکی جیسے محققین کو یہ شبہہ نہ پیدا ہو، کہ مصر کی زمین تو بارانی نہین ہے، اس لئے وہان بارش کیسے ہوسکتی ہے؟ اور کاشت نیز غلہ کے جمع کرنے کا تعلق چونکہ صرف اہلِ مصر سے تھا، اسی لئے وہان خطاب کے صیغے استعمال کئے گئے، (واللہ اعلم بالصواب)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۱۴) صیغے استعمال ہونے لگے، ابھی ماضی کا استعمال تھا کہ مضارع کا استعمال ہونے لگا، وغیرذالک یہ علم بلاغت کا ایک اہم شعبہ ہے، اور قرآن پاک کے التفات مین بے انتہا نکات ہین، جو علمِ بلاغت سے دلچسپی رکھنے والون پر پوشیدہ نہین ہین،

علومِ حدیث پر ہندوستان کی عربی تالیفات

از

جناب زبید احمد صاحب لکچرار عربی الہ آباد یونیورسٹی

مین نے ادارۂ معارف اسلامیہ کے دوسرے اجلاس مین ہندوستان کی عربی تصانیف و تالیف متعلقہ علومِ قرآنیہ پر مضمون پڑھا تھا، جو اس اجلاس کی روداد مین شائع ہوچکا ہے، اس مضمون کی تمہید مین مین نے عرض کیا تھا کہ ہندوستان مین سندھ، ملتان اور بلوچستان کو چھوڑ کر کہین اور مسلم عربون نے یا کسی عربی بولنے والی قوم نے حکومت نہین کی، البتہ فارسی بولنے والی قومون نے یہان آٹھ نو سو برس تک حکومت کی، اس لئے یہان کی عربی تصانیف وتالیف فارسی تصنیفون کے مقابلہ مین فطرۃً کم ہین اس کے علاوہ ہندوستان کے پیداکردہ سرمایہ مین بدیع الخیالی اور اُپج کم پائی جاتی ہے جس کی ذمہ داری ہندوستان پر عائد نہین ہوتی، اس کی وجہ یہ ہو کہ جس زمانہ مین عربی تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع ہوا، یہ وہ زمانہ تھا جس کے کچھ ہی بعد بلادِ اسلامیہ کی عام علمی جد و جہد کا عہدِ زرین ختم ہوگیا، اور بہت سے علومِ عربیہ پختگی وارتقا کی اُس حد کو پہونچ گئے، جس سے آگے مزید ترقی نہین ہوسکتی تھی، اس مضمون مین جملہ علومِ اسلامیہ مین سے ہمین صرف علمِ حدیث سے سروکار ہے، پانچوین صدی ہجری تک تمام علمِ حدیث پورے طور پر مدوّن ہوچکا تھا اور احادیث کے سب مجموعے مرتب ہوچکے تھے، اس کے بعد جو کام باقی رہ گیا وہ یہ تھا کہ ان مجموعات کی شرحین لکھی جائین اور ان کی مرویہ حدیثون کی صحت و عدم صحت پر روایۃً و درایۃً بحث کیجائے، نیز یہ کہ ان کو مختلف طریقون سے مرتب کیا جائے اور ان کے نجوم و اشاریات ترتیب دیے جائین

اس کام مین ہندوستان کے مسلمانون نے بھی اپنی بضاعت اور اپنے ماحول کے مطابق حصہ لیا، اُن کی جغرافی وسیاسی دشواریون اور دقتون کو دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے، کہ وہ اس خدمت سے کما ینبغی عہدہ برآ ہوئے

علم حدیث کی بابت سب سے بڑی دقت ہندوستان کو یہ تھی، کہ چونکہ وہ عرب سے بہت دور ہے، اس لئے حدیث کے بے شمار راویون مین تدوین کتب حدیث کے زمانہ تک چند ہندوستانی نام پائے جاتے ہین، یہ عرب ایران اور خراسان وغیرہ ممالک کی خوش قسمتی تھی، کہ وہان صحاح ستہ و مسانید عشرہ کی تدوین ہوئی، ان چند راویون مین سے جن کا تعلق ہندوستان سے رہا ہے، ایک تو ابوحفص بن ربیع ہین جن کا شمار تبع تابعین مین ہوتا ہے، آپ ہندوستان یعنی سندھ تشریف لائے، اور ۱۶۰ھ مین انتقال فرمایا، کہا جاتا ہو کہ اسلام مین سب سے پہلے آپ نے تصنیف کی، یہ تصنیف فنا ہو چکی ہے، خیال ہوتا ہے کہ وہ حدیث ہی پر ہو گی، اگر یہ روایت صحیح ہے، تو آپ کی تصنیف ہندوستان کی پہلی تصنیف ہے، دوسرا نام ابو معشر سندی کا ہے، جو سندھ سے عرب جا کر ام موسیٰ کے مولیٰ ہو گئے تھے، یہ بھی رواۃ ثقہ مین سے ہین، ان کے علاوہ چند نام اور ملتے ہین، اور بس،

مولانا المحترم جناب سید سلیمان صاحب ندوی نے "ہند مین علم حدیث" پر مقالات کا ایک سلسلہ لکھا جو معارف کی کئی اشاعتون مین شائع ہوا، اس سلسلے مین جناب ممدوح نے حضرت ابوحفص رحمۃ اللہ علیہ سے لیکر موجودہ زمانہ تک کے ہندوستانی محدثین کا تذکرہ بسط کے ساتھ فرمایا ہے، مگر آپ نے اُن کی تصانیف و تالیف کا ذکر نہین کیا، اس مضمون مین محدثین ہند کی قلمی خدمات کا خاکہ قارئین کرام کی خدمت مین پیش کرتا ہون،

راقم الحروف نے عہد غزنوی سے لیکر ۱۸۵۷ء کے غدر تک کے پہلے پینتالیس چھیالیس مصنفین و مولفین کے اسمائے گرامی جمع کئے ہین، جنھون نے عربی زبان مین علم حدیث کے متعلق کوئی نہ کوئی کتاب تصنیف یا تالیف کی ہے، اس فہرست سے نواب صدیق حسن خان اور مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی وغیرہ

اور اُن کے معاصرین خارج ہین، ان مصنفین کی ستر تصانیف ایسی ہین، جن مین سے کچھ تو چھپ چکی ہین، اور بقیہ ہاتھ کی لکھی ہوئی مختلف کتب خانون مین موجود ہین، ان ستر کتابون مین سے بائیس کتابین خاص طور پر قابلِ ذکر ہین، ان بائیس کتابون مین سے

(۱) چھ کتابین تو صحاح ستہ اور دیگر کتبِ حدیث کی شروح و حواشی ہین (۲) تین تالیفات ایسی ہین جن مین حدیث کے سابق مجموعون کو نئی ترتیب سے مرتب کیا گیا ہے (۳) ایک کتاب لغتِ حدیث پر ہے (۴) ایک کتاب اربعین یعنی رسالہ چہل حدیث ہے (۵) دو ایسے رسالے ہین جن مین ایک خاص جدید نقطۂ خیال سے حدیثون کو جمع کیا گیا ہے (۶) تین ایسی کتابین ہین جن مین خاص خاص مسائل و مباحث کے متعلق حدیثین جمع کی گئی ہین (۷) ایک تصنیف اپنی ایسی ہو جس مین اسرار حدیث کا انکشاف کیا گیا ہے، (۸) ایک تالیف اصولِ حدیث پر ہے (۹) دو رسالے اسماء الرجال کے متعلق ہین (۱۰) دو رسالے موضوع حدیثون پر ہین، کل ۲۲

پہلے ذیل کی کتابین یعنی چھ شروح اور حواشی

(۱) ان مین سے ایک لمعات التنقیح علی مشکوٰۃ المصابیح ہے، جو شیخ عبد الحق حقی محدث دہلوی کی تالیف اپنی ہے، محدث موصوف ہندوستان کے مشہور علماء محدثین مین سے ہین، آپ نے ۹۵۸ھ/۱۵۵۱ء مین ولادت پائی اور ۱۰۵۲ھ/۱۶۴۲ء مین رحلت فرمائی، آپ نے ہندوستان مین علمِ حدیث کی جو نمایان خدمت کی وہ محتاج بیان نہین، آپ کئی تصانیف کے مالک ہین، منجملہ اُن کے لمعات التنقیح ہے، آپ اس کتاب کے دیباچہ مین تحریر فرماتے ہین، کہ جب مین مشکوٰۃ شریف کی شرح فارسی مین لکھ رہا تھا، تو چند ایسے اہم علمی مسائل و نکات پیش آئے، کہ وہ فارسی زبان مین بیان نہین کئے جا سکتے تھے، اس لئے مین نے عربی مین شرح لکھنا شروع کی، فارسی شرح نامکمل رہی، اور عربی شرح تکمیل کو پہونچ گئی، اس شرح مین لغوی و نحوی دقائق، فقہی مسائل اور ایک ہی حدیث کے مختلف طرقِ روایات جا بجا بیان کئے گئے ہین، راویون کے اسماء و القاب صحت کیساتھ منضبط ہوئے ہین

شیخ موصوف نے جو خاص کام کیا ہو، وہ یہ ہے، کہ احادیث سے فقہ حنفی کی تطبیق نہایت کامیابی کیساتھ کرتے گئے ہین، تاآنکہ خود ہی فرماتے ہین، کہ اس شرح کو دیکھنے سے معلوم ہو جائے گا کہ امام الشافعی اصحاب الرائے میں سے ہین، اور ابو حنیفہ اصحاب ظواہر سے یہ مقدمہ بجائے خود ایک رسالہ ہے، جس مین حدیث کے اقسام کا ذکر کیا گیا ہو، اس مقدمہ کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے، کہ یہ مقدمہ مشکوٰۃ شریف کے تمام یا اکثر ہندوستانی ایڈیشنون کے شروع مین الحاق کر دیا گیا ہے،

(۲) دوسری قابل ذکر کتاب اس ذیل کی ابو الحسن سندی کا حاشیہ صحیح البخاری ہو، ابو الحسن سندی ٹھٹھہ مین پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم پانے کے بعد مدینہ منورہ کو ہجرت کر گئے، وہان آپنے محدث کی حیثیت سے بڑی شہرت حاصل کی، ۱۱۳۸ھ مین انتقال فرمایا، مصری مصنف مرادی نے اپنی سلک الدرر مین آپ کا اور آپ کی تصانیف کا ذکر کیا ہے، کشف الظنون مین بھی آپکا نام مذکور ہے، اس حاشیہ مین مشکل الفاظ اور مشکل عبارتون کی تشریح اور توضیح کے علاوہ عنوانات ابواب بخاری کی بھی صراحت و وضاحت پائی جاتی ہے،

(۳) تیسری تالیف شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی مسوی ہے جو موطاے امام مالک کی شرح ہے، شاہ صاحب کی ذات بابرکات محتاج تعارف نہین، آپ ہر حدیث کی نہایت عالمانہ تشریح و توضیح کرتے ہین، مختلف علمار کی تشریحین بیان فرماتے ہین، ہر باب مین شافعی وحنفی مذہب بتاتے ہین، اور حدیث کی تائید مین اگر کوئی آیت قرآنی ہوتی ہو تو اُسے بھی نقل کرتے ہین، شاہ صاحب نے موطا کی شرح فارسی زبان مین لکھی، مگر وہ ایسی جامع نہین،

(۴) چوتھی کتاب شرح تراجم ابواب البخاری ہے، جس کے مصنف بھی شاہ ولی اللہ صاحب ہین، اس کتاب مین شاہ صاحب نے ابواب بخاری کی تشریح و توضیح فرمائی ہے، شاہ صاحب نے شروع مین ابواب بخاری سمجھنے کے لئے چند اصول بیان کئے ہین، مثلاً وہ فرماتے ہین:

(۱) بعض اوقات امام بخاری ایسی حدیث مرفوع کو عنوان قرار دیتے ہین، جو خود اُن کی شرطون کے مطابق نہین ہوتی، مگر اس عنوان کے تحت مین ایسی حدیث بیان کرتے ہین، جو اُن کے شرائط کے مطابق ہوتی ہے،

(۲) بعض اوقات وہ ایسے مسئلہ کو باب قرار دیتے ہین، جو کسی نص سے مستخرج ہوتا ہے،

(۳) کبھی وہ علماے سابق کے مذہب کو باب قرار دیتے ہین، اور پھر وہ ایسی حدیثین روایت کرتے ہین جن سے اُن کے مذہب کی تائید ہوتی ہے،

(۴) کبھی وہ مسئلۂ مختلف فیہ کو باب قرار دیتے ہین، اور پھر تمام متضاد حدیثون کو روایت کرتے ہین تاکہ فقیہ اپنی راے کے مطابق نتیجہ نکال لے،

(۵) کبھی وہ کئی حدیثین ایک عنوان کے تحت مین بیان کرتے ہین، اور پھر وہ ایسی حدیث نقل کرتے ہین جو عنوان متعلقہ کا تتمہ ہوتی ہے، ایسی حدیث کو وہ لفظ "باب" سے بیان کرتے ہین، اس کے یہ معنی نہین ہوتے، کہ وہ ایک مختلف یا جداگانہ باب ہے، بلکہ اس موقع پر "باب" کا استعمال ایسا ہی ہے جیسا کہ متاخرین کی تصانیف و تالیفات مین تنبیہ یا فائدہ کی اصطلاح مستعمل ہوتی ہے،

(۶) بعض اوقات وہ لفظ "باب" قول المحدثین کے بجاے استعمال کرتے ہین، یعنی وہ لفظ باب استعمال کرتے ہین اور اس سے "قول المحدثین" مراد ہوتا ہے،

(۷) کبھی وہ مذہب بعض الناس کو یا ایسی حدیث کو جو اُن کے نزدیک معتبر نہیں، باب قرار دیتے ہین، اور پھر وہ صحیح حدیث بیان کرتے ہین، جس سے مذہب بعض الناس یا حدیث ضعیف کی تردید مقصود ہوتی ہے،

(۸) پانچوین کتاب از قسم شروح و حواشی محلّی ہے، جو موطا کی شرح ہے، اور سلام اللہ محدث رامپوری کی تصنیف ہے، یہ سلام اللہ دہلی کے مشہور محدث شیخ عبد الحق حقی کی اولاد مین سے ہین،

آپ نے ۱۲۹۰ھ /۱۸۷۲ء میں انتقال فرمایا،

اس شرح کے شروع مین ایک مقدمہ ہی جس مین اصطلاحات حدیث کا بیان ہی اور امام مالک کا تذکرہ اور موطار پر تنقید ہے، وجہ تالیف یہ بتاتے ہین، کہ زرقانی کی شرح موطا ہندوستان مین متداول نہین ہی، اور یہان کسی ہندوستانی نے اسکی شرح نہین لکھی، اس لئے مین نے اس شرح کا تہیہ کیا، معلوم ہوتا ہی کہ شاہ ولی اللہ کی مسوی جو تیس برس پہلے لکھی جا چکی تھی، محلّی کے مصنف کی نگاہ سے نہیں گذری تھی، محلّی مسوی سے زیادہ جامع ہے، مگر مسوی کی ترتیب محلّی کی ترتیب سے بہتر ہی،

(۶) چھٹی کتاب المواہب اللطیفہ ہے جو محمد عابد سندھی المتوفی ۱۲۵۷ھ /۱۸۴۱ء کی شرح ہے مسند امام ابوحنیفہ پر، محمد عابد سندھی سندھ مین پیدا ہوئے، بیرون ہند زبید مین جا کر تعلیم مکمل کی، پھر صنعا گئے، وہان کے وزیر نے اپنی لڑکی سے آپ کا نکاح کر دیا، پھر وہ امیر صنعا کی طرف سے مصر سفیر مقرر ہو کر گئے، کچھ مدت کے بعد سندھ واپس آئے، لیکن "دیار حبیب" کی کشش پھر مدینہ منورہ لے گئی، وہان آپ رئیس العلمار مقرر ہوئے، آپ نے کئی تصانیف چھوڑی ہین جن مین سے ایک یہ شرح ہے، مسند ابوحنیفہ کی کئی عالمون نے شرحین لکھی ہین، جن مین سے ملا علی قاری کی شرح مشہور ہے، ہمارے شارح نے سابقہ شروح سے فائدہ اٹھایا ہے، اور احادیث مسند کی تائید مین دیگر طرق کی حدیثون کو بھی بیان کیا ہے،

۲- دوسری ذیل کی یعنی ایسی تالیفین جنہین سابقہ مجموعات احادیث کو نئی ترتیب سے مرتب کیا گیا ہی

۱- ان مین ایک تو مشارق الانوار النبویہ من صحاح الاخبار المصطفویہ ہے جو حسن صغانی لاہوری کی تالیف ہے، آپ کے مورث اعلی صغان یا چغانیان (ماوراء النہر) کے رہنے والے تھے، آپ کے آخری بزرگ لاہور مین آکر متوطن ہوئے تھے ۵۷۷ھ /۱۸۱ء مین آپکی ولادت ہوئی اپنے والد ماجد سے جو فقیہ کامل اور محدث عامل تھے، تعلیم حاصل کی، پھر بغداد تشریف لے گئے، دو برس کے قیام کے بعد ۶۱۷ھ مین سلطان التمش دہلی کے دربار مین خلیفۂ عباسی کی طرف سے سفیر مقرر ہو کر آئے

سات برس قیام کرنے کے بعد پھر بغداد واپس گئے، اور پھر دوبارہ سفیر مقرر ہو کر آئے، سنہ ۶۵۰ھ ۱۲۵۲ء میں انتقال کیا، حسن صغانی محدث بھی تھے، اور ماہرِ لغت بھی، بلکہ ماہرِ لغت ہونے کی حیثیت سے آپ زیادہ مشہور ہیں، چنانچہ آپ کی عباب علم لغت پر بڑی اہم تصنیف خیال کیجاتی ہے، صغانی کی نسبت سے کئی عالم مشہور ہیں جن میں سے دو زیادہ اہم ہیں، ایک تو یہ اور دوسرے محمد بن اسحاق بن جعفر المتوفی سنہ ۲۷۰ھ سنہ ۸۸۳ء یہ بڑے بلند پایہ محدث تھے، محدثین اور اصحاب رجال ان کو ثقہ مانتے ہیں، ان سے امام مسلم اور امام ترمذی نے بھی روایت کی ہے، حدیث کے سلسلہ میں جہاں کہیں مجرد صغانی کا ذکر آتا ہے، وہاں یہ محمد بن اسحاق مراد ہوتے ہیں، اور لغت کے متعلق محض صغانی سے ہمارے صغانی مقصود ہوتے ہیں،

مشارق الانوار میں صحیحین کی احادیث کو ابتدائی الفاظ کے اعتبار سے مرتب کیا ہے، گویا یہ کتاب صحیحین کا انڈکس ہے، یہ کتاب بارہ ابواب پر مشتمل ہے، ہر باب میں کئی کئی فصلیں ہیں، چند باب کے عنوانات مثال کے طور پر بیان کئے جاتے ہیں،

باب اول، وہ احادیث جو اسم موصول وضمیر استفہامی "من" سے شروع ہوتی ہیں،

باب دوم، وہ احادیث جو "انّ" سے شروع ہوتی ہیں، اس باب میں دس فصلیں ہیں، یعنی بلحاظ مختلف ضمائر جن کے ساتھ انّ ملتی ہے، مثلاً انّہ، انّھم، انّکَ وغیرہ

باب سوم، وہ احادیث جو "لا" نفی سے شروع ہوتی ہیں، وغیرہ وغیرہ،

اس کتاب کی کئی شرحیں لکھی جا چکی ہیں،

۱۴- دوسری تالیف اس ذیل کی کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال ہے، جو علی متقی برہان پوری کی علمی کوششوں کا نتیجہ ہے، آپ سنہ ۸۸۵ھ ۱۴۸۰ء میں بمقام برہان پور پیدا ہوئے، تعلیم سے فراغت اور چشتیہ خاندان میں بیعت کے بعد حجاز تشریف لے گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی، آپ بڑے پایہ کے عالم باعمل اور محدثِ باکمال تھے، آپ کی کئی تصانیف ہیں،

سب سے پہلے ابو الحسن رزین بن معاویہ نے صحاح ستہ کو ایک جگہ جمع کرکے ابواب پر مرتب کیا، ان کے بعد ابن الاثیر جزری نے اس کتاب کی ازسرنو تدوین و تہذیب اور تصحیح و تبویب کرکے جامع الاصول نام رکھا، پھر سیوطی نے کتب ستہ اور مسانید عشرہ کو ایک کتاب میں جمع کرکے جمع الجوامع کے نام سے موسوم کیا، پھر اس ضخیم تالیف کی تلخیص بھی کی جو جامع صغیر کے نام سے مشہور ہے، اس مین صرف احادیث قولیہ شامل ہیں، ہندی محدث نے اپنی تالیف کنز العمال مین اسی جمع الجوامع کو فقہی ابواب پر ازسرنو مرتب کیا، سب سے پہلے آپ نے جامع الصغیر کی احادیث کو مرتب کیا، اور منہج العمال فی سنن الاقوال نام رکھا، پھر جمع الجوامع کی بقیہ احادیث قولیہ کو جمع کیا، اور اس کا نام اکمال منہج العمال رکھا، پھر دونون کو ایک جگہ جمع کرکے غایات العمال کے نام سے موسوم کیا، پھر جمع الجوامع کی احادیث فعلیہ کی تبویب و ترتیب کی، اور اس کا نام مستدرک الاقوال رکھا، پھر تینون تالیفون کو جمع کرکے کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال کے نام سے موسوم کیا، یہ کتاب حیدرآباد سے آٹھ جلدون مین شائع ہوئی ہے، کتاب کی فہرست بھی نہایت مفید اور باقاعدہ ہے، اس کتاب کی اہمیت محتاج بیان نہین، فاضل مصنف کے استاذ ابو الحسن بکری فرمایا کرتے تھے، کہ جلال الدین سیوطی نے جمع الجوامع تصنیف کرکے عالم اسلامی پر احسان کیا، اور علی متقی نے اسے فقہی ترتیب پر مدون کرکے سیوطی پر احسان کیا،

۳- تیسری کتاب از قسم مجموعات احادیث مسند امام اعظم ہے، جسے محمد عابد سندھی مقدم الذکر نے مرتب کیا ہے، امام اعظم سے پندرہ مسانید مروی ہین جن مین سے ایک بروایت صدر الدین موسیٰ حصکفی المتوفی ۶۵۰ھ ہے، محدث سندی نے اسی مسند کو فقہی ابواب پر مرتب کیا ہے،

(۱) یہ مجمع بحار الانوار فی غرائب التنزیل و لطائف الاخبار ہے جو مشہور گجراتی محدث شیخ محمد بن طاہر پٹنی کی تصنیف لطیف ہے، آپ	۴- تیسری کلمہ ذیل کی یعنی لغت حدیث کی ایک کتاب

گجرات کے رہنے والے اور قبیلۂ نوائت سے تعلق رکھتے تھے، ۹۱۴ھ مین پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم

ہندوستان مین حاصل کرکے حجاز تشریف لے گئے، اور وہان حضرت علی متقی رحمۃ اللہ علیہ کے حلقۂ تلمذ و ارادت مین داخل ہو گئے، پھر ہندوستان واپس تشریف لاکر بوہرون کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا، اور اسی کار نیک کے سرانجام دینے مین شربت شہادت نوش فرمایا، مجمع بحار الانوار کو تلمیذ رشید نے اپنے مرشد کامل علی متقی کے نام گرامی سے معنون کیا ہے، یہ کتاب چھپ چکی ہے، کافی بڑی تقطیع کے ۷۰۰ صفحات پر مشتمل ہے، یہ تصنیف قرآن وحدیث کا جامع لغت ہے، الفاظ کی ترتیب مادہ کے حروف پر ہے، ایک مادہ کے جس قدر حروف قرآن وحدیث مین آئے ہین، اُن سب کو ایک جگہ بیان کرتے ہین، اور جن احادیث مین وہ الفاظ آئے ہین، اُن کو بھی نقل کرتے ہین، اس سے پہلے غرائب قرآن وحدیث پر کئی کتابین لکھی جا چکی ہین، لیکن میری ناقص راے مین یہ سب سے بہتر و جامع تر ہے،

۴۔ چوتھی ذیل (رسالہ اربعین) کی ایک کتاب

ایک حدیث مین ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کہ جو شخص میرے امتیون کے لئے چالیس حدیثین جمع کریگا، قیامت کے دن اس کا حشر علماے دین مین ہوگا، اور مین اُسکی شفاعت کرونگا، اس سعادت کے حصول کے لئے بہت سے علماً نے چالیس حدیثون کے مجموعے لکھے، جو "چہل حدیث" یا "چہل رسالون" کے نام سے موسوم ہین، ہندوستانیون کے تالیف کردہ چہل رسالون مین شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا رسالہ خاص طور سے قابل ذکر ہے، اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس مین وہ صحیح احادیث ہین، جو جناب رسالت مآب صلعم روحی فداہ سے شاہ صاحب کے استاذ ابو طاہر مدنی تک اور انسے شاہ صاحب تک پہنچی ہین، شاہ صاحب سے لیکر آنحضرت صلعم تک جسقدر اسناد ہین وہ سب بیان کئے گئے ہین،

۵۔ ایسے دو رسالے جن مین ایک خاص جدید نقطۂ خیال سے حدیثون کو جمع کیا گیا ہے،

(۱) ان مین سے ایک الدر الثمین فی مبشرات النبی الامین ہے، اس کے مرتب و جامع بھی شاہ ولی اللہ صاحب ہین، یہ بھی مندرجۂ بالا رسالہ اربعین کی طرح چالیس حدیثوں کا مجموعہ ہے، اس مین وہ حدیثین ہین جو خواب مین براہ راست حضرت رسالت مآب صلعم کی زبان مبارک

سے سُنی گئین، ان حدیثون کو شاہ صاحب نے تین حصون مین منقسم کیا ہی، ایک وہ جنھیں خود شاہ صاحب نے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم سے سنا، دوسری وہ حدیثین جو اونھون نے ایک واسطہ سے سنین، تیسری وہ حدیثین جو شاہ صاحب کو ایک سے زیادہ واسطے سے پہنچین، چند حدیثین نمونہ کے طور پر ذیل مین درج ہین،

ایک حدیث ہی، شاہ صاحب فرماتے ہین کہ ایک مرتبہ جب مین کمبھے واقع گجرات کی مسجد مین مراقبہ کر رہا تھا، تو مین نے آنحضرت صلعم کی روح مبارک کو دیکھا، کہ مجھ پر ایک چادر ڈالدی جس سے تمام مذہبی اسرار ونکات مجھ پر منکشف ہوگئے،

دوسری حدیث ہی، شاہ صاحب فرماتے ہین، کہ مین نے خواب مین شیعہ فرقہ کی بابت دریافت کیا، تو فرمایا کہ وہ باطل ہی،

تیسری حدیث ہی، شاہ صاحب فرماتے ہین، کہ مین نے دریافت کیا کہ فقہ کے چارون مذہبون مین کونسا بہتر ہے، آپنے فرمایا کہ چارون برابر ہین،

دوسری قسم کی احادیث جو شاہ صاحب نے ایک یا دو واسطے سے سنین وہ ہین، جو اُن کے والد ماجد یا اُستاد شفیق نے اُن سے بیان کین،

ان حدیثون کی نوعیت مروی احادیث سے مختلف ہے، ان کو اس معنی مین تو حدیث کہا جا سکتا ہو کہ آنحضرت صلعم کی زبان مبارک سے سُنی گئین، مگر چونکہ وہ خواب مین مسموع ہوئی ہین، اس لئے وہ دوسرون کے لئے حجت نہین ہین

(۳) دوسری کتاب النوادر من الحدیث ہو یہ بھی شاہ صاحب ہی کی تصنیف انیق ہے اور دراتثمین سے مختلف ہی، یہ اس قسم کی کتاب نوادر ہے، جس طرح کہ ادب مین تاریخ مین یا دیگر علوم مین کتب نوادر ہوا کرتی ہین، شاہ صاحب نے اس رسالہ مین حدیث کے متعلق نادر وغریب باتین جمع کی ہین، مثال کے طور پر چند نمونے پیش ہین

۱- ایک حدیث مسند الجن ہے یعنی ایسی حدیث جسے جن نے رسول مقبول صلعم سے سنا، جن سے خداوند تعالیٰ نے سنا، اور خداوند تعالیٰ سے پھر رسول مقبول نے سنا، پوری حدیث مع اسناد یون ہے، عن النبی عن اللہ عن الجن عن النبی قل اوحی الیّ انہ استمع نفر من الجن فقالوا انا سمعنا قرآنا عجبا یهدی الی الرشد

یہان پہلے راوی جن نے قرآن رسول سے سنا، پس قرآن حدیث کا متن ہے، اور جن پہلا راوی دوسرا راوی خدا جس نے یہ قول جن، رسول پر اتارا، اور پھر اس روایت خدا کا ناقل خود رسول ہی لہذا اس کا سلسلۂ اسناد عن النبی عن اللہ عن الجن عن النبی ہوا،

۲- ایک حدیث المسلسل بالاولیہ ہے یعنی وہ حدیث جس کو ہر راوی نے مروی عنہ سے روایت کرتے ہوئے یہ الفاظ کہے کہ یہ "پہلی حدیث ہے، جو مین نے سنی" اور وہ یہ ہے، حدثنی السید عمر ھو اول حدیث سمعتہ منہ قال حدثنی[1] وھو اول حدیث سمعتہ …… قال الراحمون یرحمھم الرحمن تبارک وتعالیٰ ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء،

۳- الحدیث المسلسل بالفقہا یعنی ایسی حدیث جس کے تمام راوی فقیہ ہین،

۴- ایک وہ حدیث جس کے تمام راوی صوفی ہیں،

۵- ایک وہ حدیث جس کے تمام راویون کا نام احمد ہے،

۶- ایک وہ حدیث جس کے تمام راویون کے نام حرف عین سے شروع ہوتے ہین،

۷- تین ایسی تالیفین جن مین خاص خاص مباحث ومسائل کے متعلق حدیثین جمع کی گئی ہین

۱- ان مین سے ایک تلخیص البیان فی علامات مہدی آخر الزمان ہے، یہ شیخ علی متقی برہان پوری کی تالیف ہے، جن کا اوپر ذکر آچکا ہے، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، اس مین حضرت مہدی موعود کے متعلق حدیثین جمع کی گئی ہین، حافظ جلال الدین سیوطی نے اس موضوع پر ایک کتاب العرف الوردی لکھی تھی، ہمارے فاضل ہندی نے سیوطی کی اس تالیف

---

[1] یہان راوی کا نام میری یاد سے جاتا رہا ہے، منہ

کی ازسرنو تہذیب و تدوین کرکے دوسرا جامہ پہنا دیا ہے، کچھ نیا مواد بھی بڑھا یا ہے، یہ کتاب اس ماحول میں لکھی گئی تھی، جب ہندوستان میں محمد جونپوری مہدی موعود ہونے کا دعوی کرچکے تھے اور ہندوستان وعرب میں یہ مسئلہ معرکۃ الآرا بنا ہوا تھا، فاضل مولف مقدمۂ کتاب میں فرماتے ہیں، کہ محمد جونپوری یقیناً مہدی نہ تھے، وہ ایک خدارسیدہ بزرگ اور ولی ہوسکتے ہیں، مگر بعض اوقات ولی سے بھی غلطی ہوسکتی ہے، معصوم صرف پیغمبر ہوتے ہیں، یہ کتاب مندرجہ ذیل تیرہ فصلوں پر منقسم ہے (۱) معجزات حضرت مہدی (۲) آپ کا سلسلۂ نسب، (۳) شکل وصورت (۴) کن حالات میں آپ کا ظہور ہوگا (۵) علامات (۶) کس طرح اُن کی اطاعت وبیعت کیجائیگی (۷) ان کے انصار (۸) فتوحات (۹) حضرت عیسیٰؑ سے ملاقات (۱۰) مدتِ قیام (۱۱) موت (۱۲) اُن لوگوں کا ذکر جنھوں نے مہدی ہونے کا دعوی کیا (۱۳) علمائے مکہ ومدینہ کا فتوی،

(۲) اسی ذیل کی دوسری کتاب ماثبت بالسُنہ فی ایام السنہ ہو جو شیخ عبدالحق حقی محدث دہلوی کی تصنیف ہے، اس میں سال کے بارہ مہینوں کے بارے میں جو احادیث مروی ہیں، اُن کو ایک جگہ جمع کردیا گیا ہے، ماہِ محرم سے ابتدا ہوتی ہے، ماہ محرم خاصکر عاشورۂ محرم کے بارے میں جو صحیح حدیثیں مروی ہیں، ان کو نقل کیا ہے، اور محرم کے سلسلہ میں جو رسوم اور توہمات عام طور سے اُس زمانہ میں مروج تھے، ان کی تردید کی ہے، مثلاً یہ خیال کہ عاشورے کے روز سرمہ لگانے سے آنکھیں نہیں دکھتیں، یا عاشورے کے دن غسل کرنے والا کبھی بیمار نہیں ہوتا، لغو اور باطل ہے، اس کے بعد اُن تمام احادیث پر جو شہادت امام حسین علیہ السلام کے متعلق ہیں، تنقید و تبصرہ ہے، آخر میں حضرت امیر معاویہؓ اور حضرت زبیر بن عوامؓ کے باہمی تعلقات کا ذکر ہے۔ ماہ صفر کے ذیل میں اس خیال کی تردید کی گئی ہے، کہ صفر نامبارک مہینہ ہے، ربیع الثانی کی بحث میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا مختصر سا حال ہے،

اس کے بعد احادیثِ متعلقہ رجب پر تنقید ہے، اور لیلۃ الرغائب پر تبصرہ ہے، اسی طرح شعبان،

رمضان، شوال اور ذی الحجہ کے سلسلہ مین روزہ، تراویح، عید الفطر و عید اضحی اور حج کے متعلق احادیث بیان کی ہین،

۳- اس ذیل کی تیسری کتاب تحقیق الاشارہ الی تعمیم البشارہ ہے، یہ بھی حضرت شیخ عبد الحق کی تصنیف ہے، اس مین اُن تمام حدیثون کو جمع کیا ہے، جن مین کسی نہ کسی بزرگ کو جنت کی بشارت دیگئی ہی،

۷- اسرار حدیث پر ایک کتاب (۱) یہ شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف لطیف حجۃ اللہ البالغہ ہی، شاہ صاحب کا مقام نہ صرف علمای ہند کی صف اول مین ہی، بلکہ اپنے عہد کے تمام بلادِ اسلامیہ کے عربی مصنفین و مولفین مین نمایان حیثیت رکھتے ہین، نواب صدیق حسن مرحوم نے بالکل سچ کہا ہی کہ "اگر شاہ صاحب قدماء کے دور مین پیدا ہوتے تو امامِ وقت سمجھے جاتے" اب بھی وہ غزالی ہند مانے جاتے ہین،

آپ کی تصانیف بہت ہین، ان سب مین بہتر غالبًا حجۃ اللہ البالغہ ہی، اس کتابِ مستطاب مین شاہ صاحب نے جملہ احکام دین کی نہایت معقول و دلپذیر توجیہ فرمائی ہے، ان کی یہ کتاب امام غزالی کی شہرۂ آفاق احیاء العلوم سے بہتر سمجھی جاتی ہے،

آغازِ کتاب مین فرماتے ہین کہ "علومِ اسلامیہ کی بنیاد علم الحدیث پر ہے، اور علم حدیث کی کئی شاخین ہین، جن مین علم الاسرار یعنی وہ علم جو احادیث کے اسرار و دقائق واضح کرتا ہے، بہت اہم ہی، جس کو یہ علم حاصل ہی وہ حق و باطل مین پوری طور پر تمیز کرتا ہی، اور اس کا حال اُس شخص کی طرح نہین جسے طبیب سیب کھانے کو بتائے، اور وہ مشابہت کی بنا پر بجائے سیب کے حنظل کھالے"

آپ کا دعویٰ ہی کہ ہر مذہبی حکم معقول اور اصولِ افادیت پر مبنی ہے، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی فرماتے ہین، کہ جب کوئی حدیث صحیح و مستند ثابت ہو جائے تو اس کی تعمیل اس پر منحصر نہ ہونی چاہئے، کہ اسکی حکمت و مصلحت سمجھ مین آجائے، کیونکہ ہر حکم کی مصلحت و حکمت ہر شخص کے ذہن مین نہین آسکتی، لہذا بجائے اپنے دماغ پر اعتماد کرنے کے یہ زیادہ بہتر ہی کہ جناب رسالت مآب صلعم کے ارشاد پر اعتماد کیا جائے،

شاہ صاحب عالم مادی و عالم روحانی کے علاوہ ایک اور عالم کے قائل ہیں، جسے وہ عالم مثال کہتے ہیں، شاہ صاحب کا یہ عالم مثال افلاطون کے عالم مثل سے مختلف ہے، اس نظریہ کے مطابق ہر وہ چیز جو اس دنیا میں موجود ہے، عالم مثال میں بھی اپنا وجود رکھتی ہے، شاہ صاحب نے اس نظریہ کی تائید میں کئی حدیثوں کو پیش کیا ہے، اور ایسی حدیثوں کو جن کا مفہوم بظاہر سمجھ میں نہیں آتا، اس نظریہ کے ذریعہ سے سمجھایا ہے مثلاً ایک حدیث شریف ہے کہ بقرہ اور عمران کی سورتیں قیامت کے روز سحاب کی شکل میں ظاہر ہوں گی، ایک اور حدیث ہے کہ بروز جزا انسان کے اعمال سامنے آئیں گے، سب سے پہلے نمازیں سامنے آئیں گی، اور پھر زکوٰۃ اور روزے یکے بعد دیگرے، ایک اور حدیث ہے آنحضرت صلعم فرماتے ہیں کہ میں تمھارے گھروں میں فتنے برستے ہوئے دیکھتا ہوں، اس قسم کی کئی حدیثیں نقل کرنے کے بعد شاہ صاحب کہتے ہیں، کہ ان حدیثوں کی تعبیر کی تین صورتیں ہوسکتی ہیں، ایک تو یہ کہ ان کے لفظی معنی مراد لئے جائیں تب تو عالم مثال کا وجود ماننا پڑتا ہے، دوسری صورت یہ کہ یہ واقعات حقیقت میں یوں نہیں ہوتے، بلکہ اس طرح دکھلائی دیتے ہیں تیسری صورت یہ کہ ان کی تاویل کیجائے، اور ان کے مجازی معنی مراد لئے جائیں، شاہ صاحب آخری صورت خلاف حق سمجھتے ہیں، شاہ صاحب نے عالم مثال کو اس قدر وسعت دی ہے کہ رسول مقبول صلعم کے جبریل سے ملاقات کرنے یا فرشتوں کا قبر میں جاکر مردوں سے سوال وجواب کرنے وغیرہ کی قسم کے واقعات کو عالم مثال کے واقعات قرار دیا ہے، مولانا شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر شاہ صاحب کی اس تشریح و توضیح حدیث کو دیگر علما قبول کرلیں تو پھر مذہب اور فلسفہ میں بہت ہی کم فرق رہجاتا ہے،

لیکن اس ہیچ میرز و ہیچ مدان کو نہایت ادب کے ساتھ شاہ صاحب کے نظریۂ عالم مثال پر اعتراض ہے وہ یہ کہ شاہ صاحب کو بعض احادیث کے خلاف عقل مفہوم کی تشریح و توضیح کرنے کے لئے ایک ایسے عالم کا وجود ماننا پڑتا ہے جس کی ہمارے روزمرہ کے واقعات اور تجربات سے تائید نہیں ہوتی، دوسرے یہ کہ عالم مثال کا وجود ثابت کرنے کے لئے شاہ صاحب نے جو دلیل دی ہے، اس میں دور لازم آتا ہے، وہ عالم مثال

کے وجود کو مانتے ہین، اس لئے کہ بعض احادیث کے مضمون ایسے ہین، کہ عالم مثال کے نظریہ سے اُن کی تشریح و توضیح ہو سکتی ہی، اور ان خلاف عقل حدیثون کے مضمون یون صحیح ہین کہ عالم مادی و روحانی کے علاوہ ایک عالم مثال اور ہے، علاوہ برین مثال کے طور پر یہ حدیث کہ قیامت کے روز بقرا ور عمران کی سورتین ابر کی شکل مین نمودار ہون گی، عالم مثال کے نظریہ سے کیونکر سمجھائی جاسکتی ہے، میری راے ناقص مین ان حدیثون کے مجازی معنی مراد لینے مین کوئی قباحت نہین،

اس کتاب کے دو حصے ہین، پہلے حصہ مین اُن اصول عامہ کا بیان ہے کہ جن سے مذہبی اوامر و نواہی کی توجیہ کیجاسکتی ہے، اس حصہ مین سات مبحث ہین، ہر مبحث مین کئی کئی ابواب، دوسرے حصہ مین تمام مذہبی احکام کی حکمت و مصلحت بتائی گئی ہے،

۸- اصول حدیث پر ایک کتاب | (۱) الفیض النبوی فی اصول الحدیث وفہارس البخاری، محمد عارف سنبھلی، یہ کتاب ایک مقدمہ اور چار فصلوں پر مشتمل ہے، مقدمہ مین اصطلاحات حدیث کا بیان ہی، چار فصلون مین اصول حدیث سے بحث کی گئی ہی، آخر مین امام بخاری اور اُن کی تصنیف پر تنقید و تبصرہ ہے،

۹- اسماء الرجال پر دو رسالے | (۱) ان مین سے ایک دُرّ السحابہ فی بیان مواضع وفیات الصحابہ مؤلفہ حسن صغانی ہی، یہ ایک چھوٹا سا رسالہ ہی، اس مین تقریباً آٹھ سو صحابہ کے مقامات رحلت کا ذکر ہے، اسماے صحابہ حروف تہجی کی ترتیب سے درج ہین،

(۲) دوسرا رسالہ کتاب اسماء رجال مشکوٰۃ المصابیح ہی، شیخ عبد الحق حقی محدث دہلوی کی تالیف ہی، اس مین مشکوٰۃ شریف کی تمام احادیث کے راویون کا مختصر تذکرہ ہے، سب سے پہلے خلفاے راشدین کا تذکرہ ہی، پھر آل رسول کا، اس کے بعد دیگر صحابہ کا،

۱۰- دو رسالے احادیث موضوعہ پر | (۱) ان مین سے ایک حسن صغانی مقدم الذکر کا رسالہ فی الموضوعات من الحدیث ہے۔

(۲) دوسرا محمد طاہر پٹنی کا رسالہ تذکرۃ الموضوعات ہے، اس رسالہ کے شروع میں ایک مقدمہ ہے، اس میں آپ تنبیہا فرماتے ہیں، کہ اگر کوئی مصنف کسی حدیث کو موضوع بتائے تو جب تک دوسرے ذرائع سے اُس کی تصدیق و تائید نہ ہو جائے، اس حدیث کو موضوع نہ سمجھا جائے اس کے ثبوت میں فرماتے ہیں، کہ ابن جوزی کی کتاب موضوعات میں ضعیف حدیثوں کا کیا ذکر، بہت سی حسن حدیثیں موجود ہیں، آگے چل کر ان احادیث پر جن کو کسی نہ کسی عالم نے موضوع قرار دیا ہے، تنقید کی ہے، یہ ایک دلچسپ رسالہ ہے اور چھپ چکا ہے،

خطباتِ مدراس

مولانا سید سلیمان ندوی نے ۱۹۲۶ء میں مدراس میں سیرت نبوی کے مختلف پہلوؤں پر آٹھ خطبے دئیے تھے، جو نہایت مقبول ہوئے، اور مسلمانوں نے ان کو بیحد پسند کیا، یہ اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن ہے،

قیمت :- عہ، ضخامت ۱۹۷ صفحے

حیاتِ امام مالک

امام مالکؒ کی سوانح عمری، علم حدیث کی مختصر تاریخ، فقہ مدنی کی خصوصیت اور علم حدیث کی پہلی کتاب، موطاے امام مالکؒ پر تبصرہ، طبع سوم

قیمت، عدر، ضخامت :- ۱۰۶ صفحے،

ابن خلدون کے معاشی خیالات

از

جناب محمد عبد القادر صاحب بی ایس سی آنرز لندن لکچرار معاشیات، جامعہ عثمانیہ

(یہ مقالہ بزم دینیات جامعہ عثمانیہ کی موتمر اسلامیہ مین ۲۹ رشعبان ۱۳۶۱ھ کو پڑھا گیا)

پچھلے ڈیڑھ سو سال مین ابن خلدون[1] پر کافی تحقیقی کام ہوا ہے، اور یورپی زبانوں میں اسکے متعلق کئی کتابین اور مقالے لکھے گئے ہین، لیکن محققین نے اپنی توجہ زیادہ تر مصنف کے فلسفۂ تاریخ اور عمرانی نظریون کی طرف مبذول کی ہے، چند مستشرقین نے اس کے سیاسی خیالات پر بھی بحث کی ہے، جو چیز ہمارے لئے تعجب خیز ہے وہ یہ ہے، کہ انھون نے ابن خلدون کے معاشی خیالات پر بہت ہی کم روشنی ڈالی ہے، مین نے مقدمہ ابن خلدون مین جو مواد کہ بکھرا ہوا پایا جاتا ہے، اس سے استفادہ کرتے ہوے مصنف کے معاشی خیالات کو یہان ایک منظم پیرایہ مین پیش کرنیکی کوشش کی ہے،

ہماری حیرت کی انتہا نہین رہتی کہ اس مفکر نے بیشتر ایسے خیالات کا اظہار کیا ہے، جو کہ زمانۂ مابعد سے متعلق ہین، نیز اس نے اپنی کتاب مین نظری اور عملی معاشیات کے بہت سارے اہم حصّون پر روشنی ڈالی ہے، البتہ اس کے مباحث کی وہی ترتیب نہین ہے، جو کہ آج کل کی معاشی کتابون مین پائی جاتی ہے، ہمین اس سے بھی انکار نہین کہ اوس نے جن مسائل پر بحث کی ہے، وہ معاشیات کے جملہ موضوعات پر حاوی نہین ہین، اس مین کلام نہین کہ ہمارے مفکر نے زیادہ تر عروجون کی تاریخ کے مطالعہ

---

[1] ابن خلدون ۱۳۳۲-۱۴۰۶ء

سے اپنے نظریون کو اخذ کیا ہے، لیکن اس کے باوجود بھی اوس کے یہان بہت سی ایسی چیزین مل جاتی ہین جو کلیات کی حیثیت رکھتی ہین، ایک اور چیز جو ہماری توجہ کی محتاج ہے، وہ یہ ہو کہ ابن خلدون اگر ایک طرف قرونِ وسطیٰ کی مدرسیت سے محفوظ رہا، تو دوسری طرف اپنے پیشرؤن کی مذہبی تنگ نظریون سے آزاد رہا،

جدید تحقیق نے تاریخ کی معاشی تعبیر کے یوروپین بانیون پر کافی روشنی ڈالی ہے لیکن اس سلسلہ مین شاید بہت کم لوگ ابن خلدون کی اہمیت سے واقف ہین، اس کا اصل کمال یہ ہو کہ اس نے افلاطون اور ارسطو کے خیالات کو مانتے ہوئے "انسانی ترقی پر مادی ماحول کے اثرات" کو نظر انداز نہین کیا، ابن خلدون سماجی زندگی کی نفسی بنیادون کو تسلیم کرتا ہے، اور ارسطو کی مشہور کہاوت کو دہراتا ہے، کہ "انسان ایک سماجی حیوان ہے"[1] لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ اس امر پر بھی زور دیتا ہے، کہ سماجی زندگی کا آغاز دراصل معاشی احتیاجات کے احساس اور ان کی تکمیل کے سلسلہ مین ہوتا ہے،[2] یعنی روزمرہ کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے اجتماعی جدوجہد زیادہ مؤثر ہوتی ہے،

ابن خلدون سماج کی نفسی اور معاشی بنیادون کا محض ذکر کر دینے پر اکتفا نہین کرتا، سماجی ترقی پر مادی ماحول کے اثرات اس نے تفصیل کے ساتھ واضح کئے ہین، چنانچہ اوس نے یہ ظاہر کیا ہو، کہ تاریخ انسانی کی تشکیل مین آب و ہوا، غذا اور پیشون کا نمایان حصہ رہا ہے، طبعی اور ذہنی خصوصیات مین جو اختلافات پائے جاتے ہین، ان کی توجیہ آب و ہوا اور غذا کے اختلافات سے ہو سکتی ہے،[3] مرفہ الحالی اور افلاس کا اثر نہ صرف طبعی خصوصیات بلکہ ذہنی نشو و نما اور مذہبی نقطۂ نظر پر بھی پڑتا ہی، یہان فوراً ہمارا ذہن بوڈن (Bodin) مانٹسکیو (Montesquieu) اور بکل (Buckle) کے نظریون کی طرف جاتا ہے، جنھون نے اس قسم کے خیالات کو ظاہر کیا ہے، البتہ تاریخی شہادتون کی عدم

---

[1] مقدمہ تاریخ ابن خلدون مترجمہ مولوی عبدالرحمٰن صاحب حصہ اول ص ۵۵ [2] ایضاً ص ۵۵، ۵۹ [3] ایضاً ص ۱۱۵-۱۲۹

موجودگی مین ہم یقین کے ساتھ یہ نہین تبلا سکتے، کہ مذکورۂ بالا مفکرین نے ابن خلدون سے کس قدر اثرات قبول کئے ہین، لیکن ہمین اتنا تو تسلیم کرنا پڑتا ہی، کہ یہان اولیت کا شرف ابن خلدون کو ہی حاصل ہی[۵۱]

قومی خصوصیات کی توجیہ بھی پیشہ ورانہ اختلافات کے ذریعہ کیجا سکتی ہے[۵۲] کسی ملک کے ادارات کے خط و خال کا دار و مدار ایک بڑی حد تک اس ملک کے مروجہ پیشون پر ہوتا ہے، زرعی معیشت اور بدوی معیشت کے تحت جداگانہ سماجی نظام ہوا کرتے ہین[۵۳] اخلاقیات اور مذہب پر پیشہ ورانہ اختلافات کا گہرا اثر پڑتا ہی، تاجر کی ذہنیت اور اوس کے اخلاقی تصورات نتیجہ ہین اس کے پیشہ کا، بدوی جس کو ہر قدم پر حیات کی کشمکش اور زندگی کی کٹھن منزلون سے گذرنا پڑتا ہی، بمقابل شہریون کے جو آرام و آسائش کی زندگی بسر کیا کرتے ہین، زیادہ مذہبی ہوتے ہین،

انسانی تمدن مین معاشی عنصر کی اہمیت جتلانے کے بعد ابن خلدون نے ان متعدد مسائل پر روشنی ڈالی ہی جن سے ہمین روزی کمانے کے سلسلہ مین برابر واسطہ پڑتا رہتا ہے، انسان کی زندگی مین احتیاجات اور ان کی تکمیل کے طریقون کا مسئلہ نہایت ہی اہم ہے، یہان معاشی اشیا اور مفت اشیا کے درمیان فرق کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے، پھر اہمیت کے لحاظ سے معاشی اشیاء کے مختلف مدارج ہوتے ہین، مصنف نے ضروریات زندگی کے لئے "بسیط" اور تعیشات کے لئے "مرکب" کی اصطلاح استعمال کی ہے[۵۴] اس سلسلہ مین اس نے ہماری توجہ ایک اہم چیز کی طرف مبذول کرائی ہی یعنی جو ملک کہ معاشی لحاظ سے کم ترقی یافتہ ہین وہان لوگ زیادہ تر ضروریات زندگی کی پیدایش مین مصروف رہتے ہین، اس کے بعد تعیشات کی پیدایش کا مرحلہ آتا ہی، مباحث کے اس خاص حصہ کی حد تک مصنف کو ہم پروفیسر پاٹین (Professor Patten

---

[۵۱] ملاحظہ ہو میرا مضمون بعنوان "The social and Political ideas of the - Khaldun -" مطبوعہ انڈین جرنل آف پولٹکل سائنس، جلد ۲، شمارہ ۲ [۵۲] مقدمہ حصہ سوم صفحہ ۵۹، ۶۳

[۵۳] مقدمہ، حصہ اول ص ۶۹، ۱۰۰ [۵۴] ر حصہ سوم ص ۶۳، ۶۵

سے اپنے نظریون کو اخذ کیا ہے، لیکن اس کے باوجود ہمین اوس کے یہان بہت سی ایسی چیزین مل جاتی ہین جو کلیات کی حیثیت رکھتی ہین، ایک اور چیز جو ہماری توجہ کی محتاج ہے، وہ یہ ہو کہ ابن خلدون اگر ایک طرف قرونِ وسطیٰ کی مدرسیت سے محفوظ رہا، تو دوسری طرف اپنے پیشرؤن کی مذہبی تنگ نظریون سے آزاد رہا،

جدید تحقیق نے تاریخ کی معاشی تعبیر کے یورپین بانیون پر کافی روشنی ڈالی ہے، لیکن اس سلسلہ مین شاید بہت کم لوگ ابن خلدون کی اہمیت سے واقف ہین، اس کا اصل کمال یہ ہو کہ اس نے افلاطون اور ارسطو کے خیالات کو مانتے ہوئے "انسانی ترقی پر مادی ماحول کے اثرات" کو نظرانداز نہین کیا، ابن خلدون سماجی زندگی کی نفسی بنیادون کو تسلیم کرتا ہے، اور ارسطو کی مشہور کہاوت کو دہراتا ہے، کہ "انسان ایک سماجی حیوان ہے"[1] لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ اس امر پر بھی زور دیتا ہے، کہ سماجی زندگی کا آغاز دراصل معاشی احتیاجات کے احساس اور ان کی تکمیل کے سلسلہ مین ہوتا ہے[2]، یعنی روزمرہ کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے اجتماعی جدوجہد زیادہ مؤثر ہوتی ہے،

ابن خلدون سماج کی نفسی اور معاشی بنیادون کا محض ذکر کر دینے پر اکتفا نہین کرتا، سماجی ترقی پر مادی ماحول کے اثرات اس نے تفصیل کے ساتھ واضح کئے ہین، چنانچہ اوس نے یہ ظاہر کیا ہو، کہ تاریخ انسانی کی تشکیل مین آب و ہوا، غذا اور پیشون کا نمایان حصہ رہا ہے، طبعی اور ذہنی خصوصیات مین جو اختلافات پائے جاتے ہین، ان کی توجیہ آب و ہوا اور غذا کے اختلافات سے ہوسکتی ہے[3]، مرفہ الحالی اور افلاس کا اثر نہ صرف طبعی خصوصیات بلکہ ذہنی نشو و نما اور مذہبی نقطۂ نظر پر بھی پڑتا ہو، یہان فوراً ہمارا ذہن بوڈن (Bodin) مانٹسکیو (Montesquieu) اور بکل (Buckle) کے نظریون کی طرف جاتا ہے، جنھون نے اس قسم کے خیالات کو ظاہر کیا ہے، البتہ تاریخی شہادتون کی عدم

[1] مقدمہ تاریخ ابن خلدون ترجمہ مولوی عبدالرحمن صاحب حصہ اول صفحہ ۵ [2] ایضاً صفحہ ۵۹، ۶۰ [3] ایضاً صفحہ ۱۱۵-۱۲۹

موجودگی مین ہم یقین کے ساتھ یہ نہین تبلا سکتے کہ مذکورۂ بالا مفکرین نے ابن خلدون سے کس قدر اثرات قبول کئے ہین، لیکن ہمین اتنا تو تسلیم کرنا پڑتا ہی کہ یہان اولیت کا شرف ابن خلدون کو ہی حاصل ہی[۱]

قومی خصوصیات کی توجیہ بھی پیشہ ورانہ اختلافات کے ذریعہ کیجا سکتی ہے[۲] کسی ملک کے اداراتی خط وخال کا دارو مدار ایک بڑی حد تک اس ملک کے مروجہ پیشون پر ہوتا ہے، زرعی معیشت اور بدوی معیشت کے تحت جداگانہ سماجی نظام ہوا کرتے ہین[۳] اخلاقیات اور مذہب پر پیشہ ورانہ اختلافات کا گہرا اثر پڑتا ہی تاجر کی ذہنیت اور اوس کے اخلاقی تصورات نتیجہ ہین اس کے پیشہ کا، بدوی جس کو ہر قدم پر حیات کی کشمکش اور زندگی کی کٹھن منزلون سے گذرنا پڑتا ہی، بمقابل شہریون کے جو آرام و آسائش کی زندگی بسر کیا کرتے ہین، زیادہ مذہبی ہوتے ہین،

انسانی تمدن مین معاشی عنصر کی اہمیت جتلانے کے بعد ابن خلدون نے ان متعدد مسائل پر روشنی ڈالی ہی جن سے ہمین روزی کمانے کے سلسلہ مین برابر واسطہ پڑتا رہتا ہے، انسان کی زندگی مین احتیاجات اور ان کی تکمیل کے طریقون کا مسئلہ نہایت ہی اہم ہے، یہان معاشی اشیا اور مفت اشیا کے درمیان فرق کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے، پھر اہمیت کے لحاظ سے معاشی اشیا رکے مختلف مدارج ہوتے ہین، مصنف نے ضروریات زندگی کے لئے "بسیط" اور تعیشات کے لئے "مرکب" کی اصطلاح استعمال کی ہے[۴] اس سلسلہ مین اس نے ہماری توجہ ایک اہم چیز کی طرف مبذول کرائی ہی یعنی جو ملک کہ معاشی لحاظ سے کم ترقی یافتہ ہین وہان لوگ زیادہ تر ضروریاتِ زندگی کی پیدائش مین مصروف رہتے ہین، اس کے بعد متعیشات کی پیدائش کا مرحلہ آتا ہی، مباحث کے اس خاص حصہ کی حد تک مصنف کو ہم پروفیسر پاٹن (Professor Patten)

---

[۱] ملاحظہ ہو میرا مضمون بعنوان "The social and Political ideas of Ibn Khaldun" مطبوعہ انڈین جرنل آف پولٹیکل سائنس، جلد ۳، شمارہ ۲ [۲] مقدمہ حصہ سوم ص ۶۳

[۳] مقدمہ، حصہ اول ص ۹، ۱۷۶، ۱۰۰ [۴] رحصہ سوم ص ۶۳، ۶۵،

کا پیشرو قرار دے سکتے ہیں جس نے کہ "معیشتِ عسری" اور "معیشت یسری" میں فرق واضح کیا ہے، نیز ابن خلدون نے شکار، گلہ بانی، زراعت، صنعت وحرفت اور تجارت کو معاشی ارتقا کے مختلف مرحلے قرار دیئے ہیں،[۱]

پیدا آوری کے لحاظ سے ہر پیشہ کی اہمیت ضرور ہے لیکن شکار اور گلہ بانی سے قطع نظر جو کہ تمدن انسانی کے ابتدائی مرحلوں سے متعلق ہیں، زراعت بیحد اہم ہے کچھ تو اس وجہ سے کہ یہ ایک قدیم پیشہ ہے اور کچھ اس وجہ سے بھی کہ یہ زندگی کیلئے ناگزیر ہے، زراعت پر جو مباحث بیان کئے گئے ہیں، ان میں مصنف یونان کے معاشی تخیل سے متاثر نظر آتا ہے لیکن اس کی خوبی یہ ہے کہ زراعت کی اہمیت کو جتلانے کے جوش میں اس نے اس پیشہ کی حدبندیوں کو کبھی نظرانداز ہونے نہیں دیا ہے، یہ تسلیم کرتا ہے کہ زمین میں گھٹتی ہوئی زرخیزی کا عمل ہوتا رہتا ہے، اور اس کی تلافی کے لئے وقتاً فوقتاً مصنوعی طریقوں کے استعمال کی ضرورت لاحق ہوتی رہتی ہے،[۲]

ابن خلدون نے زمین پر بہت ہی مختصر بحث کی ہے لیکن محنت سے متعلق تفصیل سے کام لیا ہے اسے آبادی کی اہمیت کا احساس ہے، اور اس نے کثیر آبادی پر زور دیا ہے، اس حد تک اس کے خیالات افلاطون سے مختلف ہیں، اور تجارئین کے مماثل ہیں، بات یہ ہے کہ افلاطون نے حسبِ ضرورت مقررہ نقشوں کے تحت آبادی کا گھٹانا بڑھانا روا رکھا ہے، اور ابن خلدون خوشحالی اور اضافۂ آبادی میں تعلق قائم کرتا ہے، اور سلطنتوں کی ترقی یافتہ صورت میں جو حالات پائے جاتے ہیں، ان سے اپنے بیان کی وضاحت کرتا ہے،

شہروں کی ترقی وتنزل میں بھی آبادی کا خاص حصہ ہوتا ہے، شہروں کی بنیادیں نہ صرف معاشرتی اور سیاسی بلکہ معاشی اسباب پر بھی قائم ہیں، اس میں کلام نہیں کہ شہروں کے آغاز ونشو ونما

۱؎ مقدمہ حصہ سوم ص ۲۰۵ ۲؎ ،، حصہ سوم ص ۳؎ ،، ص ۲۵

اور تہذیب و تمدن کی ترقی مین ایک گونہ متعلق ہے، لیکن شہرون کی بنیاد دراصل محنت کے رسد اور اس پر قابو پانے سے متعلق ہے[۵۱] اسی طرح یہان معاشی اور سیاسی مسائل پیدا ہوجاتے ہین، قبل اس کے کہ محنت پر قابو حاصل کیا جائے سیاسی اقتدار کا ہونا ضروری ہے، لیکن اس سلسلہ مین مصنف نے بیگار کے رواج کی مخالفت کی ہے، اور اسے ایک ایسا بدترین ظلم قرار دیا ہے، جو کہ آبادی کی تباہی کا باعث بنتا ہے[۵۲] ان خیالات کا اظہار کرتے وقت اس کے ذہن مین غالباً یہ چیز موجود تھی، کہ دور قدیم اور قرون وسطیٰ مین شہرون کے بسانے مین بیگار کا خاصا استعمال ہوتا تھا،

پیدایش کی تنظیم کا مسئلہ بھی اسی قدر اہم ہے، جتنا کہ آبادی کا پیداوار کے نقطۂ نظر سے پیدایش کی تنظیم سے بہتر نتائج پیدا ہوتے ہین، افلاطون نے تقسیم عمل کی سادہ قسمون کی طرف ہماری توجہ مبذول کی تھی، لیکن ابن خلدون نے اوس کے پیچیدہ اقسام پر بحث کی ہے، مختلف پیشون کی خصوصیات اور پھر اوس کے بعد محنت کی تخصیص کے فوائد و نقصانات ظاہر کئے ہین، تخصیص یافتہ محنت کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ کام کرنے والے کی مہارت مین اضافہ ہوتا ہے، لیکن ہمیشہ ایک ہی عمل سے متعلق رہنے کی وجہ سے دوسری صنعتون مین کمال حاصل کرنا مشکل ہوجاتا ہے[۵۳] ابن خلدون نے یہ نقص جو ظاہر کیا ہے، اسے اسکے زمانہ کی روشنی مین جانچنا چاہئے، بات یہ ہے کہ مشین کی ترویج سے پہلے کے زمانہ مین ایک صنعت سے دوسری صنعت مین منتقلی اور فنی تعلیق (Technical Adaptatin) کا مسئلہ بہت ہی مشکل تھا، ابن خلدون نے تخصیص کی ایک دوسری شکل کو بھی ظاہر کیا ہے، یعنی جغرافیائی تقسیم عمل چند صنعتین خاص خاص شہرون سے وابستہ ہوتی ہین، اور انہی مقامات پر ایک عرصۂ دراز تک جاری رہنے کی وجہ سے وہین انکا استحکام ہوجاتا ہے[۵۴]

نظریۂ قدر کے متعلق جن خیالات کا اظہار ابن خلدون نے کیا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے، کہ اوس نے

---

۵۱ مقدمہ حصہ سوم ص ۱ ۵۲ رر حصہ دوم ص ۲۰۴، ۲۰۵ ۵۳ مقدمہ حصہ سوم ص ۷۹ ۵۴ رر حصہ سوم ص ۲۵

بہت سارے ایسے موضوعات پر بحث کی ہے جن کو زمانۂ ما بعد میں اہمیت حاصل ہوئی، اوس نے جو نظریۂ قدر پیش کیا ہے، اوس میں محنت کو مرکزی جگہ دی گئی ہے[۵۱] البتہ اس کے اور قرونِ وسطیٰ کے مفکرین کے نظریہ میں یہ فرق ہے، کہ موخر الذکر مفکرین نے اپنے مباحث میں مناسب قیمت یا واجبی قیمت (Just Price) کے تصور کو شامل کر لینے سے اصلی تنقیحات کو دھندلا بنا دیا ہے، اور پیچیدگیاں پیدا کر دی ہیں، لیکن ابن خلدون نے ان تمام امور سے اپنے آپ کو محفوظ رکھا ہے،

جہاں تک کہ قیمتوں کو متاثر کرنے والے اسباب کا تعلق ہے، ابن خلدون نے تین امور کی طرف ہماری توجہ مبذول کی ہے، پہلی چیز تو حکومت کی پالیسی ہے، مثلاً اشیا پر محصول اندازی کی وجہ سے قیمتوں میں اضافہ ہوتا ہے، اس سلسلہ میں مصنف نے بلدی محاصل کو بیش نظر رکھا ہے[۵۲] معاشرتی اسباب بھی قیمتوں کو متاثر کرتے ہیں، مثلاً شہری زمینوں اور مکانوں کی قیمتوں کا سماجی ترقی اور سماجی اسباب کی وجہ سے بڑھ جانا[۵۳] ایک اور اہم چیز جو ہے وہ یہ کہ قدرتی اسباب بھی زمین کی قیمت کو متاثر کرتے ہیں، زمین کی گھٹی ہوئی زرخیزی کی وجہ سے جو نقصان ہوتا ہے، اسکی تلافی کرنا یا زرخیزی کو برقرار رکھنے کے لئے مختلف مصنوعی طریقوں کو اختیار کرنا پڑتا ہے[۵۴] اس سے مصارف میں اضافہ ہوجاتا ہے، اور اس کے نتیجہ میں قیمتیں بھی متاثر ہوتی ہیں،

اضافۂ قیمت کے اسباب کے ساتھ ساتھ مصنف نے تخمین (Speculation) پر بھی بحث کی ہے، اشیاء جو ضروریاتِ زندگی کی حیثیت رکھتی ہیں، ان کا ذخیرہ اس نیت سے کرنا کہ کسی آیندہ زمانہ میں انھیں بڑھی ہوئی قیمت پر فروخت کیا جائے گا، ایک قسم کا استحصال ہے[۵۵] یعنی ضرورتمندوں کی حالت سے ناجائز فائدہ اٹھانا ہے، اس میں کلام نہیں کہ مصنف کی مخالفت کی حیثیت اخلاقی ہے، لیکن اس کے نزدیک اس مسئلہ کا اخلاقی سے کہیں زیادہ اہم معاشی پہلو ہے[۵۶] اس کا استدلال یہ ہے، کہ

---

۵۱ مقدمہ حصہ سوم ص ۲۴۳ ۵۲ ص ۲۵ ۵۳ ص ۲۵ ۵۴ ص ۲۵ ۵۵ ص ۶۰ ۵۶ ص ۶۲

تخمین کی وجہ سے قیمتون مین تغیرات پیدا ہوتے رہتے ہین، ایک غیر یقینی کیفیت رونما ہوتی ہے، اور اس سے کساد بازاری پیدا ہوتی ہے، تاجر، کاشتکار اور صارف تباہ ہوجاتے ہین، ان تمام نقصانات کے پیش نظر مصنف نے تغیر پذیر قیمتون پر ہموار قیمتون کو ترجیح دی ہے،

کساد بازاری کا ایک دوسرا اہم سبب قوتِ خرید کا ادنیٰ ہونا ہے، اعلیٰ محاصل کی وجہ سے باشندے اپنے روزمرہ مشاغل سے دست بردار ہونے پر مجبور ہوجاتے ہین، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ ملک کی پیداوار متاثر ہوتی ہے، اور باشندون کی قوتِ خرید مین کمی ہوجاتی ہے، حالات مین مزید پیچیدگیان پیدا ہوجاتی ہین، اگر اس کے ساتھ ساتھ سیاسی ناستواری بھی ہو تو سرمایہ کاری کی راہ مین رکاوٹین پیدا ہوجاتی ہین اور یہ معاشی ترقی کی راہ مین حائل ہوتی ہین، ایک اور وجہ جس کی بنا پر قوتِ خرید مین کمی ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ سرکاری ملازمین کو کم تنخواہین دی جاتی ہین، اور ان کے پاس صرف کرنے کے لئے بہت کم رہتا ہے[1]

جہان تک کہ نظریۂ زر کا تعلق ہے، ابن خلدون کے مباحث مختصر ہین، وہ ارسطو کے مانند یہ تسلیم کرتا ہے کہ زر ذریعۂ مبادلہ بھی ہے اور ذخیرۂ قدر بھی[2] اس سلسلہ مین مصنف یہ واضح کرتا ہے کہ سونے اور چاندی کو دنیا بھر مین جو استعمال کیا جاتا ہے، اس کا صرف ایک سبب ہوسکتا ہے یعنی ان دھاتون کی پائداری، ان کی اہمیت سے بھی یہ کیا حقہٗ واقف ہے، اور مصنف کا خیال ہے، کہ ساری معاشی جد وجہد کا مقصد انہی کو حاصل کرنا ہوتا ہے[3] اس بنا پر ہم مصنف کو تجارئین کا پیشرو کہہ سکتے ہین، چنانچہ قیمتی دھاتون کے متعلق دونون کے نقطۂ نظر مین مماثلت پائی جاتی ہے، ٹکسال کی تاریخ پر بھی تفصیل سے بحث کی گئی ہے، اور کھوٹے سکون کی پالیسی کے نقائص ظاہر کئے گئے ہین[4] کھوٹے سکون کی مذمت کی حد تک اس کے خیالات اس کے ہم عصر (Oresme) کے مماثل ہین، جس نے کہ زر کے معاملات مین بادشاہون کے حق مین مداخلت سے انکار کیا تھا، نیز عبد الملک کے اصلاحات مثلاً دار الضرب کا قائم کرنا، سکون کی مقدار اور ان کے اوزان پر

---

[1] مقدمہ حصۂ دوم ص ۲۰۰، ۲۰۱ [2] ” حصۂ سوم ص ۲۳ [3] ” حصۂ سوم ص ۲۷۴ [4] ” حصۂ دوم ص ۱۶۲۔۱۶۶

قابو رکھنا، اور پُرانے سکون کو واپس لے لینا، ان تمام چیزون کو بیان کیا گیا ہے،

حکومت کے معاشی فرائض پر مصنف نے جو بحث کی ہے، وہ بہت ہی اہم ہے، معاشی خوشحالی کے پیدا کرنے مین حکومت کی جو کچھ بھی اہمیت ہو سکتی ہے، اس سے ابن خلدون خوب واقف ہی، وہ اپنے ہم عصرون کی طرح حکومت کے مسلمہ فرائض مثلاً بیرونی مدافعت اور حدودِ مملکت مین جان اور مال کی حفاظت کو تسلیم کرتا ہے[۱] لیکن وہ اسی پر اکتفا نہین کرتا، بلکہ حکومت کے فرائض کے دائرہ کو اور بھی وسیع بنا دیتا ہی اُسکا کہنا ہے، کہ حکومت کو وہ تمام فرائض اپنے ذمہ لینے چاہئین جن سے ملک کی فلاح و بہبود حاصل ہو سکے، چنانچہ صنعتون کی ترقی مین حصہ لینا حکومت کے فرائض مین شامل ہے[۲] گو ابن خلدون نے اس مسئلہ سے متعلق کچھ زیادہ تفصیلات نہین دی ہین، لیکن اتنا وثوق سے کہا جا سکتا ہے، کہ حکومت کے فرائض کے بارہ مین اس کا نظریہ وہی نہین ہے جو کہ اوس کے ہمعصرون کا تھا' وہ تمام اثرات جنھون نے اوس کے نقطۂ نظر کی تشکیل مین حصہ لیا ہوگا، ان کو واضح کرنا مشکل ہے، بلا شک و شبہ مملکت کے متعلق ارسطو کے اخلاقی نظریہ اور اسلامی تصورات دونون کا اس پر اثر پڑا ہوگا،

حکومت کے معاشی فرائض مین سے محصول اندازی بہت ہی اہم ہی، چنانچہ اس کا بیان ہی، کہ دراصل حکومت کی بنیا دین فوج اور مالیات ہین، جب حکومت کی مالی حالت سقیم ہو جاتی ہے، تو مملکت کو بھی زوال ہونے لگتا ہی، اس نے محصول اندازی کو پیدا آوری کے نقطۂ نظر سے جانچنے کی کوشش کی ہی، ہلکا محصول معاشی جد وجہد مین مدد و معاون ثابت ہوتا ہی کیونکہ اسکی وجہ سے کاشتکارون کو مزید کاشت کی ترغیب ہوتی ہے[۳] لیکن بھاری محاصل اور نئے نئے محاصل مثلاً محصولِ فروخت محصول زائرین کی مخالفت کرتا ہی[۴] محاصل مین اضافہ ہو تو معاشی جد وجہد، بالخصوص زراعت پر برا اثر پڑتا ہی[۵] کاشت کی طرف لوگونکی توجہ کم ہو جاتی ہی، فاقہ کشی، بیماریان اور آبادی مین کمی اوسکے نتائج ہوتے ہین، باشندون کی قوتِ خرید مین کمی ہوتی ہی اور جس مقصد کیلئے محاصل مین اضافہ کیا گیا تھا، وہ پورا نہین ہوتا، یہان اس امر کا لحاظ رکھنا چاہئے کہ اوس نے اپنے

---

[۱] مقدمہ حصہ دوم، ص ۱۲۷ [۲] ،، حصہ سوم ص ۶۱ [۳] ،، حصہ دوم ص ۲۱۳، ۲۱۴ [۴] ،، حصہ دوم ص ۱۹۲ [۵] ،، ص ۱۹۰-۱۹۱

زمانہ کے حالات کے پیشِ نظران تمام خیالات کا اظہار کیا ہی، اسکے لئے یہ مشکل تھا کہ وہ ایسے اعلیٰ محاصل جو جدید زمانہ مین ملک کی گوناگون ترقیات کے سلسلہ مین عائد کئے جاتے ہین، اُن کو بھی پیشِ نظر رکھتا، اس کے پیشِ نظر جو واقعہ تھا وہ محض یہ تھا کہ مستبد و خود سر بادشاہ اپنے ذاتی ضروریات کی تکمیل کے لئے اعلیٰ محاصل عائد کیا کرتے تھے، لیکن قطع نظر اسکے کہ یہ خیالات تاریخی اہمیت رکھتے ہین، انکا مقابلہ محصول برداشت کرنے کی استطاعت (Taxable Capacity) کے جدید نظریہ سے ہوسکتا ہے،

اس کا خیال ہی کہ تجارتی کاروبار کا قائم کرنا حکومتی فرائض مین شامل نہین ہی[۵] اس نے ایسے طریقہ کی مخالفت کی ہی، رفاہی کاروبار پر حکومتی تسلط کا تصور اس کے ذہن مین نہین آسکتا تھا، جو چیز اس کے ذہن مین تھی وہ یہ تھی، کہ قرون وسطیٰ مین بادشاہ ذاتی تجارت کیا کرتے تھے، اور ذاتی نفع اندوزی سے استفادہ کرتے تھے، لہذا ابن خلدون کی مخالفت دو اسباب پر مبنی تھی، ایک تو دو غیر مساوی طاقت رکھنے والے فریق یعنی بادشاہ اور رعایا مین مقابلہ کا ہونا، دوسرا اس طریقہ سے باشندون کے خانگی اقدام اور آزادانہ جد و جہد پر برا اثر پڑنا، اور نتیجۃً ملک کی پیداوار کو متاثر کرنا،

ابن خلدون کے خیالات پر کوئی رائے قائم کرنے سے پہلے یہ امر ذہن نشین کرلینا چاہئے کہ اوس نے ان کا اظہار ایک ایسے زمانہ مین کیا تھا، جب کہ سارا یورپ جاگیری نظام، سیاسی نااستواری اور مدنیت کی زنجیرون مین جکڑا ہوا تھا، ابن خلدون نے اپنی آواز ان تمام قوتون کے خلاف بلند کی تھی، اس نے معاشی استحصال، سیاسی ظلم و ستم اور ذہنی غلامی کی مخالفت کی، اس نے سیاسی استواری اور معاشی ترقی کے مابین تعلق قائم کرنے کی کوشش کی، اس کا حال St. Thomas Aquinas سے بالکل مختلف تھا، جس نے کہ عیسوی اصولون اور ارسطو کے نظریون مین امتزاج پیدا کرنے کی کوشش کی تھی، ابن خلدون کے ساری معاشی تخیل مین کہین بھی ایک ایسا نظام قائم کرنے کی کوشش کا پتہ نہین چلتا جو کہ مذہب اور فلسفہ کی آمیزش پر مبنی ہو،

---

[۵] مقدمہ حصہ دوم صفحہ ۱۹۳،

افلاطون

از

جناب خواجہ عبدالحمید صاحب لکچرار فلسفہ گورنمنٹ کالج لاہور

(آل انڈیا ریڈیو لاہور کی اجازت سے)

یونانی زبان مین حکمت کے عاشق زار کو فلسفی کہتے تھے، فلسفی کے لئے اس کا فلسفہ دماغی تعیش کا ایک ذریعہ نہ تھا، بلکہ اس کی زندگی کا پورا پروگرام تھا، یونان کے ان لوگون کے لئے عوام کے طور طریقے، ان کا مذہب، ان کے اخلاق اور ان کے رسوم اپنے اندر کسی قسم کی کشش نہ رکھتے تھے، اپنے علم کی وجہ سے فلسفی عوام کے زمرے سے باہر نکل چکا تھا، اور اسکی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ زندگی کا ایسا پروگرام مرتب کرے، جس سے اس کے دل و دماغ دونون کو تسکین حاصل ہو، جب کسی یونانی فلسفی کے کارنامے کا جائزہ لینا منظور ہو تو اس حقیقت کو ہرگز نظرانداز نہ کرنا چاہئے،

اب سوال یہ ہے کہ افلاطون نے اس مقصد مین کہان تک کامیابی حاصل کی ہے، کیا اس کا فلسفہ اور اس کی تعلیم بالکل بے حقیقت اور گمراہ کن قیاس آرائی ہے، جیسا کہ بعض لوگون کا خیال ہے؟ یا یہ کہ افلاطونی تعلیم و فلسفہ انسانی دماغ کے بہترین شاہکارون مین سے ہے، جس مین بقول شخصے زندگی کے تمام مسائل پر نہایت سنجیدہ اور محققانہ بحث کی گئی ہے، اور نہایت ٹھوس اور مستقل سچائیان اخذ کی گئی ہین؟

افلاطون کی تعلیمات کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے اس کے ماحول اور اس کے زمانہ کے حالات کو ذرا دیکھنا چاہئے، اس کے استاذ سقراط کا زمانہ یونان اور بالخصوص ایتھنز کا سنہری زمانہ تھا، علم و فضل کے چرچے

تھے، عقلا کا ایک گروہ جو سفسطی کے نام سے مشہور تھا، خاص طور پر نئے معلومات اور نئے علوم کے پرچار میں معروف تھا، یہ لوگ بلا کے ذہین تھے، تقریر و تحریر، بحث و تکلم، قانون و رسمیات، غرض انسانیات کی تمام شاخون مین ان کو دسترس تھی، لیکن ان سفسطیون مین وہ خلوص و عشق نہ تھا، جو فلسفی کی خاص نشانی تھی، ان مین سے اکثر لوگ حد درجہ کے دنیادار تھے، اور سچائی سے زیادہ فیس کا ان کو لالچ تھا، ان لوگون کی وجہ سے ایتھنز مین ایک کہرام سا برپا ہو گیا، پرانی باتین، پرانی رسمین، پرانے اخلاق، پرانا طرز حکومت، پرانا مذہب، غرض ہر پرانی چیز چونکہ پرانی تھی، اس لئے ان چرب زبانون کے نزدیک غلط اور دھوکا تھی، ان کی تنقید مین صرف تخریب تھی، اوران کی تعلیم کے دو اہم اصول یونانی سوسائٹی اور سیاست کے لئے سخت خطرناک تھے،

ان کا پہلا اصول یہ تھا، کہ (۱) عدل ایک بے حقیقت شے ہے جسے عدل کہا جاتا ہے، وہ یا تو اس لئے تراشا گیا تھا، کہ طاقتور لوگ اپنی ہتھیائی ہوئی دولت کو کمزورون کے ہجوم سے بچا سکین اور یا عدل اور اوس کے قوانین اس لئے بنائے گئے تھے، کہ طاقتورون کی دستبرد سے کمزورون کو بچایا جائے، دونون حالتون مین عدل فطری چیز نہین ہے، بلکہ انسانی سوسائٹی کی اپنی اختراع ہے، یعنی عدل ایک ڈھکوسلا ہے، اور فطرت انسانی کے بالکل خلاف ہے،

(۲) پھر یہ سفسطی انفرادیت کے علم بردار تھے، اس سے پہلے یونان مین ریاست کو فطری اور خدائی دستور سمجھا جاتا تھا، لیکن سفسطی کہتا تھا کہ ریاست ایک بالکل غیر فطری چیز ہے، اور اس کا آغاز ایک سماجی معاہدہ کی صورت مین ہوا تھا، اس سماجی معاہدہ کا مقصد یہ تھا، کہ لوگ اپنے آپ کو ایک دوسرے کی دست برد سے بچا سکین، فرد کے لئے سب سے بہتر حالت یہ ہے، کہ وہ دوسرون پر خوب جبر کرے، اور خود ان کی دستبرد سے بچا رہے، یعنی خوب لوٹے لیکن خود نہ لٹے، سب سے بری حالت یہ ہے کہ وہ دوسرون کے ظلم کا تختۂ مشق بنا ہے اور خود اس مین اتنی قوت نہ ہو کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دے سکے، اس لئے فرد کو چار و ناچار سماجی معاہدہ

کے ذریعہ سے ایک گونہ عافیت حاصل کرنا پڑی، یہ ہو سیاسی عدل کی بنیاد،

سقراط اور افلاطون دونون ان اصولون کو غلط جانتے تھے، اور ان کی شکست کے بغیر حکمت و تمدن کی ترقی ناممکن سمجھتے تھے، مثلاً افلاطون نہایت آسانی سے ان اصولون کو یون رد کرتا ہے، اول تو یہ دعویٰ ہی غلط ہے، کہ فرد اور سماج مین تضاد ہے، فرد ہمیشہ ایک چھوٹی سی سوسائٹی یعنی کنبہ مین پیدا ہوتا ہو اور یہ کنبہ دوسرے کنبون سے منسلک ہوتا ہو کنبون کے ایسے مجموعون سے سماج بنتا ہے، فرد محض ایک ناممکن چیز ہے، پھر یہ سماجی معاہدہ جس کا سفسطی بار بار ذکر کرتا ہے، ہے کیا چیز؟ آزاد افراد نے معاہدہ کی ٹھانی کب، بات یہ ہو کہ ایسے آزاد انسانون کا آپس مین مل بیٹھنا جو ایک دوسرے سے بالکل وحشت رکھتے ہون، ناممکنات مین سے ہے، اس سے ثابت ہوا کہ سماجی معاہدہ کا تخیل ہی غلط ہے،

افلاطون نے ان سفسطی اصولون کو رد کرکے یہ نتیجہ نہین نکالا، کہ پرانے نظریے اور طور طریقے صحیح ثابت ہوئے، وہ اچھی طرح جانتا تھا، کہ یونانی سیاست و اخلاق کی عافیت اس مین ہی، کہ صحیح اصول دریافت کئے جائین، اور صحیح نصب العین عوام کے سامنے پیش کیا جائے، اگر ریاست کا کاروبار برے طریقے پر چلیگا تو فرد و قوم دونون تباہ ہون گے، عدل کے بغیر نہ ریاست کا وجود ممکن ہے، اور نہ اخلاق کا، اسی لئے یہ مسئلہ افلاطونی فلسفہ مین خاص اہمیت رکھتا ہے،

جب کنبون کے مجموعے سے ایک مختصر سا قبیلہ بن جاتا ہے، تو عمرانی زندگی بھی شروع ہو جاتی ہی، لیکن شروع شروع مین ہر شخص، ہر کنبے اور ہر قبیلے کے لئے صرف ایک کام ہوتا ہے، یعنی خوراک حاصل کرنا، رہائش کا انتظام اور بیوی بچون کی نگہداشت، وہ تقسیمِ کار جس کے بغیر تمدن ناممکن ہے، بعد مین آتی ہے، شروع مین تمامتر توجہ اپنی اور اپنے کنبے کی شکم پروری ہی پر صرف ہوتی ہے، افلاطون اس ادنیٰ درجہ کی سوسائٹی کو تمدن کا درجہ نہین دیتا، اسے وہ سورون کی جماعت کہتا ہے، تقسیمِ کار اس وقت ہوتی ہے، جب قبیلہ بڑھ کر ایک ملت کی شکل اختیار کرتا ہے، اس وقت دولت جمع ہونا شروع ہوتی ہے، اور چند ایسے

لوگون کی ضرورت محسوس ہوتی ہی، جو عوام کو طاقتور لیڈرون اور غیر اقوام کی دست برد سے بچا سکین، ملت کے افراد مختلف گروہون مین بٹ جاتے ہین، کوئی حاکم بنتا ہے کوئی رعیت، کوئی آقا، کوئی غلام، لیکن جلد ہی ایسی ریاستون مین عمرانی بیماریان ظاہر ہو جاتی ہین، اسکی وجہ یہ ہوتی ہی کہ ان ریاستون کے ارتقا مین کوئی خاص اصول کارگر نہین ہوتے،

اب یہ عمرانی بیماریان کیسے دور کیجائین؟ افلاطون ہمین ایک معیاری ریاست کا نقشہ تیار کرکے دیتا ہی، ریاست مین سب سے زیادہ تعداد ان لوگون کی ہوتی ہے، جو محض ضروریاتِ زندگی کو پیدا کرتے ہین، مثلاً پیشہ ور لوگ، کاریگر، کاشتکار، یہ لوگ نہ حکومت کے قابل ہوتے ہین، اور نہ جنگ کے، نہ ان سے دماغی کام ہو سکتا ہے، اور نہ اُن سے یہ توقع کی جا سکتی ہے، کہ وہ اپنی محنت کسی ایسے کام مین خوشی سے صرف کر دین گے، جس سے انھین کوئی ذاتی نفع حاصل نہ ہو، اگر ان لوگون مین کوئی ایسا شخص حسنِ اتفاق سے نکل بھی آئے، تو اُسے فوراً اس جماعت سے علٰحدہ کر لینا چاہئے، اس جماعت کے افراد کے لئے سب سے بڑی خوبی یہ ہے، کہ کھانے پینے مین، اٹھنے بیٹھنے مین غرض اپنے ہر کام مین اعتدال برتین،

عوام کو چھوڑ کر جو لوگ ریاست مین ہون گے، وہ دو درجون مین بٹ سکتے ہین، کچھ لوگ ایسے ہون گے جن مین ہمت و جرأت کا مادہ عوام سے بہت زیادہ ہوگا، مال و زر کی ان کو خواہش نہ ہوگی بلکہ وہ ناموس کے خواہشمند ہون گے، جرأت و ہمت ان کا خاصہ ہے، یہی لوگ ریاست کے جری سپاہی بنین گے، جو اُسے بیرونی اور اندرونی دشمنون سے بچائین گے، ان لوگون کی خاص خوبی شجاعت ہوگی،

کچھ لوگ ایسے بھی ہون گے جن مین اعتدالِ مزاج اور شجاعت کے علاوہ ایک اور خوبی عقل کی ہوگی، فہم و سنجیدگی ان کا خاصہ ہے، یہی لوگ ریاست کے صحیح پیشوا اور حاکم بن سکتے ہین، اور فلسفہ انہی پیشواؤن کا حق ہے،

جس ریاست مین عوام معتدل مزاج، سپاہی شجاع اور پیشوا عاقل ہون گے، وہ ریاست صحیح معنون مین بہترین ہوگی، اور جب تک ایسی ریاست سچ مچ کی دنیا مین بن نہ جائیگی، دنیا سے بدعملی و بداخلاقی ظلم و ستم بے انصافی اور افسردگی بھی دور نہ ہوگی، صرف اسی معیاری ریاست مین عدل ہوگا؛ (چنانچہ افلاطونی زبان مین سیاسی عدل سے مراد یہ ہے، کہ عوام مین اعتدال ہو، سپاہی شجاع ہون پیشوا عاقل ہون، اور ریاست کے یہ تینون طبقے اپنے اپنے کامون مین مصروف رہین،)

افلاطون کہتا ہے کہ فرد کو جلی حروف مین لکھو، تو اس کا نام ریاست ہے، ریاست کو چھوٹے حروف مین لکھو تو اس کا نام فرد ہے، اس لئے جیسے ریاست کی بہترین حالت عدل ہے، اسی طرح فرد کی بہترین حالت بھی عدل ہے، نفسِ انسانی کیا ہے؟ افلاطون کہتا ہے کہ پہلے وحشی جانورون کا ایک گروہ تصور کرو، ان پر ایک سردار شیر بٹھا دو، پھر اس شیر کے اوپر انسان کا سر جوڑ دو، یہ ہے، نفسِ انسانی، وحشی جانور کیا ہوئے؟ یہ ہین ہمارے نفسِ امّارہ کی بے لگام خواہشات، شیر سے مراد کیا ہے؟ جرأت و ہمت جو انسانی دل کا خاصہ ہے، انسان کا سر کس چیز کی دلیل ہے،؟ عقل کی جس سے انسان انسان بنتا ہے، جرأت کے شیر کی مدد سے نفسِ امارہ کی خواہشات کو رام کرو، اور شیر کی لگام عقلِ انسانی کے ہاتھ مین دو، یہ ہے عدل، بہترین انسان وہ ہے جو اپنی خواہشات کو حد اعتدال مین رکھے، صحیح معنون مین دلیر ہو، اور عقل کو اپنا رہبر بنائے' جو انسان اپنے نفس کی تعمیر اس طرح کرتا ہے، وہ مردِ عادل ہے' اگر فرد عقل کو اپنا رہبر بناتا ہے، تو وہ عادل ہے، اگر ریاست عقلا کو اپنا پیشوا بناتی ہے، تو وہ عادل ہے، گویا عقل کی پیشوائی دلیل ہے عدل کی،

افلاطون کا قول ہے کہ جب تک حکماء بادشاہ نہ ہون گے یا بادشاہ حکیم نہ بن جائین گے، انسانی ریاست کی بیماریان دور نہ ہون گی، اس قول پر نکتہ چینون نے بہت کچھ لے دے کی ہے، سرسری نظر سے دیکھا جائے، تو حکیم و فلسفی تو ایک خیالی دنیا کا پہلوان ہوتا ہے، ایسے شخص کے ہاتھ مین ریاست

کی لگام دیدینا دینا پرانتہائی ظلم ہے، فلسفی تو اپنے گھر کی گتھیان نہین سلجھا سکتا، وہ ریاست کے عقدے کیسے حل کرے گا، یہان ہمین دیکھنا چاہئے کہ افلاطون کی مراد فلسفی یا حکیم سے کیا ہے؟ اس کا اندازہ آپ اُس تعلیمی پروگرام سے کرسکین گے، جو اس نے ریاست کے پیشواؤن کے لئے مرتب کیا ہے،

افلاطونی تعلیم پیدائش سے شروع ہوتی ہے، اور موت کے ساتھ ہی ختم ہوتی ہے، لیکن اس تعلیمی پروگرام کو وہ تین بڑے حصون مین تقسیم کرتا ہے، پہلا حصہ پیدائش سے شروع ہو کر اکیس سال کی عمر مین ختم ہوتا ہے، دوسرا اکیسوین سال سے تیس سال تک اور تیسرا اس کے بعد،

پہلے بیس سالون مین موسیقی اور جسمانی ورزش کی تعلیم ہو گی، موسیقی سے قوتِ متخیلہ کی تربیت مراد ہے یعنی ایسی فنی تربیت جس سے بچہ کے دل مین حُسن کا صحیح خیال پیدا ہو جائے، یہان تک کہ وہ ہر کام، ہر چیز، ہر خیال اور ہر بات مین حُسن کا طالب بن جائے، گویا موسیقی سے روح کی تربیت منظور ہے، اسی طرح جسمانی ورزش سے جسم کی تربیت مراد ہے، اس عرصہ مین طلبہ کو علم و حکمت سے کوئی واقفیت نہ ہوگی، وہ صرف قیاس و گمان کے درجہ مین رہین گے، یعنی علم و جہل کے بین بین، جہل کے درجہ سے بچہ اب نکل چکا ہے، لیکن ابھی علم کی منزل سے دور ہے، اس منزل تک پہونچنے کے لئے پروگرام کا دوسرا دور ہے، جو بیسویں سال مین شروع ہوتا ہے،

بیس سال کی عمر کے بعد ایک کڑا امتحان ہونا چاہئے، اور صرف بہترین طلبہ کو اعلیٰ تعلیم کے لئے چننا چاہئے، چنے ہوئے نوجوانون کو دس سال تک سائنس کی تعلیم دیجائیگی، سائنس سے مراد تصورات اور قوانین کا علم ہے، مثلاً بوجھل چیزین زمین پر گرتی ہین سمندر مین مد وجزر ہوتا ہے چاند زمین کے گرد گھومتا ہے، یہ چند حوادث ہین جو بے جوڑ سے نظر آتے ہین، لیکن جب ہم کششِ ثقل کا خیال کرتے ہین تو یہ قانون ان مختلف حوادث کو ایک ہی لڑی مین پرو دیتا ہے، حوادث کے مطالعہ سے بنیادی تصورات اور قوانین تک پہنچنا یہ ہے افلاطون کے نزدیک سائنس کا کام، تیس سال کی عمر تک یہ تعلیم جاری رہے گی، اس تعلیم کے ساتھ

ساتھ یہ نوجوان ریاست مین کچھ عملی کام بھی کرتے رہین گے، اوران کی علمی اور عملی تربیت ساتھ ساتھ جاری رہیگی، اس کے بعد پھر ایک کڑا امتحان ہوگا، اس مین صرف بہترین نوجوان تعلیم کے آخری درجہ کے لئے چُنے جائین گے، یہ منتخب جوان بعد مین پیشوا بنین گے، جو لوگ اس دوسرے درجہ مین رہ جائین گے، وہ ریاست کے سپاہی بنین گے،

اب پانچ سال کے لئے یہ نوجوان پیشوا ریاست کی عملی خدمت سے ہٹ جائین گے، اور اس عرصہ مین انھین فلسفہ کی تعلیم دیجائے گی، فلسفہ سے افلاطون کی مراد خیر اعلیٰ کا علم ہے، اور خیر اعلیٰ سے مراد وہ بنیادی تصور اور وہ اعلیٰ حقیقت ہی، جو سائنس کی کنجی اور حوادث کی بھول بھلیان کا راز ہے، خیر اعلیٰ کے اس علم یعنی فلسفہ کے متعلق ابھی کچھ اور عرض کیا جائے گا، اس وقت صرف یہ بیان کرنا ہے، کہ پنتیس سال کی عمر مین یہ پیشوا پھر عملی دنیا مین آئین گے، اور پندرہ سال تک ریاست کی عملی خدمت اور بالخصوص جنگ کے کامون مین مصروف رہین گے، پچاس سال کی عمر مین تعلیم کا یہ تیسرا دور پورا ہوگا، اب یہ لوگ ریاست کے پیشوا اور حاکم ہون گے، اوران کے ذمہ صرف دو کام ہون گے، ریاست کا انتظام اور خیر اعلیٰ کی جستجو،

اس سلسلہ مین افلاطون ان پیشواؤن اور سپاہیون کے لئے ایک اشتراکی طریقۂ زندگی پیش کرتا ہی، پیشواؤن کے لئے دو چیزین حرام محض ہین، یعنی خانگی زندگی اور ذاتی جائداد، ان کی سب ضروریات زندگی مشترک ہون گی، وہ خاص خاص موسمون مین عارضی شادیان کرسکین گے، لیکن بچے پیدا ہوتے ہی ریاست کی نگرانی مین آجائین گے، تاکہ ان کے والدین انھین بعد مین پہچان نہ سکین، مرد اور عورت دونون پیشوا ہوسکتے ہین، اور تمام پیشوا مل کر ایک کنبہ بنین گے، افلاطون کا عقیدہ تھا، کہ جہان ریاست کے حکام کو ذاتی جائداد اور خانگی زندگی کی لو لگی، فوراً ہی ریاست کے انتظام مین خلل آیا،

الغرض پیشوا کی زندگی اشتراکی ہوگی، اس کے روزمرہ کے فرائض کیا ہون گے، ؟ وہ ریاست کے کامون کی نگرانی کرے گا، پیشواؤن اور سپاہیون کے اعلیٰ معیار زندگی کو گرنے نہ دیگا، نوجوانون کی تعلیم کا اہتمام کرے گا، تعلیمی اور فنی معاملات مین بدعتون کو روکے گا، پیشہ ور اور کاریگر جماعت مین افلاس

اور عیش پرستی کو روکے گا، اور خیر اعلیٰ کے متعلق اپنا علم بڑھاتا جائے گا، یہ خیر اعلیٰ کیا ہے؟ اوس کا علم کیا ہے؟ ایک مثال سے بات سمجھی جا سکتی ہے،

دنیا مین لاکھون کتابین ہین، ہر ایک کو ہم کتاب کا نام کیون دیتے ہین، صرف اس لئے کہ ان سب مین چند خاصیتین مشترک ہین، یہ خاصیتین کتاب کا تضمن کہلاتی ہین، اس تضمن کا تصور درحقیقت کتاب کی جان ہے، افلاطون کہتا ہے کہ ہر وہ کتاب جو ہم دنیا مین دیکھتے ہین نقل و مثال ہے اس ایک حقیقت کی جو "تصور کتاب" ہے، کتاب کا یہ تصور ہمارے خیال کی اختراع نہین ہے، بلکہ ایک ایسی دنیا مین موجود ہے، جو اس عالم رنگ و بو سے اعلیٰ و ارفع ہے، ہمارے حواس صرف ظاہر کی دنیا تک محدود ہین، عقل ظاہر کا پردہ چاک کر کے تصورات کی دنیا مین پہنچتی ہے، اور ہر چیز کی اصل کو پاتی ہے، حکمت اس تصوراتی دنیا کے تفکر کا نام ہے، تصورات کی دنیا مین بھی حقیقت کے درجے ہین، عقل ہمین بتاتی ہے، کہ سب سے اہم تصور وہ ہے، جسے خیر اعلیٰ کا نام دیا جاتا ہے اعتدال، شجاعت، عقل، عدل، سب نیکیان ہین، یعنی خیر اعلیٰ کی قسمین ہین، یہ خیر اعلیٰ ہر زندگی کا نصب العین ہر نیکی کا منبع، ہر اچھائی کا محرک اور ہر تصور کی جان ہے، خیر اعلیٰ تصورات کی دنیا کا خورشید ہے، اس کا ایک رُخ حُسن ہے، دوسرا حق، اور حسن و حق و خیر کا سرچشمہ خدا ہے،

افلاطونی ریاست کا حکیم پیشوا اس روحانی تصور مین مستغرق ہے، لیکن وہ راہب نہین ہے جو دنیا سے الگ ہو کر خدا کے دھیان مین مصروف ہے، وہ آزمودہ کار ہے، مرد میدان ہے، فکر و عمل کی دنیا کا دھنی ہے، خلق خدا کا پیشوا ہے، اور اسی کے ہاتھ مین ریاست کی باگ ڈور صرف اس لئے دی گئی ہے، کہ وہ بہترین خلائق ہے، اور اس کام کا اہل ہے، اسی لئے افلاطون کہتا ہے، کہ عمرانی زندگی کی بیماریان ہرگز دور نہ ہون گی، جب تک بادشاہ حکیم نہ ہو نگے یا حکیم بادشاہ نہ ہون گے،

اب آپ اندازہ لگا سکتے ہین، کہ افلاطون محض ایک گمراہ کن مفکر تھا، یا انسان کے بہترین محسنون مین اس کا شمار ہونا چاہئے، شاید آپ کے دل مین یہ خیال آئے کہ افلاطون کے یہ نظریے تو بہت دلکش ہین لیکن ہین وہ صرف نظریے ان کا عملی دنیا سے کیا کام؟ اس ضمن مین یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اس کی ایکاڈیمی مین نہ صرف پچاس سال تک سیاست واخلاق کے ان پیچیدہ مسائل پر غور وخوض ہوتا رہا، بلکہ اس نے کئی آزمودہ کار سیاست دان بھی پیدا کئے، جن کی خدمات یونان کی بعض ریاستون نے اُس سے مستعار لین،

ابن رشد

مشہور مسلمان اندلسی حکیم جو مسلمانون مین ارسطو کے فلسفہ کا بہترین شارح سمجھا جاتا ہے، اور جس کی تصنیفات مدتون تک یورپ کی یونیورسٹیون مین پڑھائی جاتی تھین، اس کے سوانح اور فلسفہ پر تبصرہ، اور اسی ضمن مین مسلمانون کے علم کلام وفلسفہ پر بھی ریویو اور یورپ مین اسلامی علوم کی اشاعت کی تاریخ اور فلسفہ جدیدہ وقدیمہ کا موازنہ بھی آگیا ہے، ابن رشد کے متعلق اتنا بڑا ذخیرۂ معلومات کسی مشرقی زبان مین کیا، مغربی زبان مین بھی نہین مل سکتا،

ضخامت ۴۰۹ صفحے، قیمت سے ر

فہم انسانی

ڈیوڈ ہیوم کی مشہور کتاب "ہیومن انڈرسٹینڈنگ" کا ترجمہ اور اس کے مختصر حالات کے ساتھ اس کے خیالات فلسفہ پر بحث وتبصرہ، حجم ۲۲۸ صفحے، قیمت عہ ر

"مینیجر"

تلخیص تبصرہ

مرنجان مرنج یا بھلا مانس

"مرنجان مرنج" کسے کہتے ہیں؟ وہ دوسرے لوگون سے کن باتون مین ممتاز ہوتا ہی؟ ایسے شخص کے متعلق آپ ذرا سوچین تو چند باتین فوراً ذہن مین آئین گی، مثلاً ایسا شخص خوش مزاج ہوتا ہے، ہنس مکھ ہوتا ہی، بات بات پر بگڑتا نہین، اگر آپ اُسے کوئی چبھتی ہوئی بات کہہ بھی دین تو وہ پی جاتا ہی، بحدِّ حتی المقدور کسی سے لڑائی جھگڑا مول نہین لیتا، اگر لڑائی جھگڑے سے بچنے کے لئے اُسے کوئی نقصان بھی اٹھانا پڑے تو وہ اُسے برداشت کرلیتا ہے، اُس کی خواہش ہوتی ہے، کہ زندگی کے دن خوش مزاجی اور خندہ پیشانی سے گذر جائین، اُس کی طبیعت کی افتاد "مرنجان مرنج" کی سی ہوتی ہے، اس لحاظ سے وہ کچھ کچھ اقبال کے قلندر سے ملتا ہے، جو غمِ زندگی کو سمِّ زندگی تصور کرتا ہی، اور حتی المقدور اس سمِّ غم سے بچتا ہی، مگر ہم اسے قلندر نہین کہہ سکتے، کیونکہ "قلندر" کا طریقۂ زندگی اپنے اندر ایک قسم کی جسارت رکھتا ہی اور ہمارا مرنجان مرنج دوست اس جسارت کے قابل ہی نہین، وہ جانتا ہی کہ دنیا داری کے دھندے ضروری ہین، اور ان کے بغیر چارہ نہین، وہ اپنے کام کاج سے، کاروبار سے، بیوی بچون کی نگہداشت سے گریز نہین کرتا، وہ یہ سب کچھ کرتا ہے، لیکن اُس کے دل مین یہ خیال بھی ہوتا ہی کہ اس دوڑ دھوپ کو اور کیون بڑھاؤن، مسافر گاڑی کے ڈبہ مین جہان ستر آدمیون کی جگہ ہی، وہان پورے ایک سو تین جمع ہین، ہمین کھڑا ہی رہنا پڑے گا، تو کیا یہ حماقت نہ ہوگی کہ

ایسی حالت مین ہم پڑوسیون سے جھگڑا مول لیکر اپنی کلفت کو اور بڑھائین ؟

پھر ہمارا مرنجان مرنج دوست بالعموم لوگون کی نیکیون کو دیکھتا ہی، ان کی برائیون سے چشم پوشی کرتا ہی، وہ دوسرون کے نقائص کی تلاش مین نہین رہتا، نہ وہ ہر بات پر شک کرتا ہے بعض لوگون کو دوسرون کی عیب جوئی کا مرض ہوتا ہے، اُن سے کوئی نیکی کیجئے، وہ یہی سمجھین گے، کہ اس مین بھی کوئی فریب چھپا ہی، ہمارا بھلا مانس اس قسم کی عیب جوئی کو برا جانتا ہی،

مرنجان مرنج انسان کی تین خوبیان ابھی بیان کی گئی ہین، وہ خوش مزاج ہے، لڑائی جھگڑون سے بچنے کے لئے نقصان بھی برداشت کرلیتا ہی، اور عیب جو اور بدبین نہین ہے، اب سوال یہ ہی کہ یہ تین خوبیان اوس نے سیکھی ہین، یا اس کی طبیعت کی افتاد ہی کچھ ایسی ہے، کیا اس کی بھلائی اخلاق کا آموختہ ہے، یا فطرت کا عطیہ ؟ کیا ہم کسی طریقۂ تعلیم و تربیت سے ہر بچہ کی طبیعت کو اس طرح ڈھال سکتے ہین، کہ وہ جوان ہوکر مرنجان مرنج ثابت ہو ؟ نفسیاتی نقطۂ نظر سے اس سوال کا جواب نفی مین ہوگا، تعلیم و تربیت سے بچہ کو خوش اخلاق بنایا جاسکتا ہے، خوش مزاج نہین، خوش مزاجی جو مرنجان مرنج شخص کی خاص نشانی ہے، فطری چیز ہے، جس کو اچھی تربیت چمکا سکتی ہے، لیکن پیدا نہین کرسکتی،

مُرنجان مرنج جنس انسان کی ایک مستقل نوع ہے، اور یہ کوئی غیر معمولی بات نہین ہی حیوانات کی ہر نوع مین افراد دو گروہون مین بٹ سکتے ہین، بعض فطرۃً اور نسبتۃً زیادہ لڑاکے اور پیش پیش رہنے والے ہوتے ہین، اور بعض شرمیلے ہوتے ہین، نسبتۃً حلیم الطبع اور اپنے ساتھیون کی سرداری کے ناقابل بھلے مانس یا مرنجان مرنج لوگ اس دوسری قسم کے انسان ہین، ان کی طبیعت انھین آگے بڑھنے نہین دیتی، اور چونکہ آگے بڑھنے کے لئے لڑائی جھگڑے کی ضرورت ہوتی ہے، وہ اس سے سخت متنفر ہوجاتے ہین، حتی کہ ایسے موقعون پر بھی لڑنے سے گریز کرتے ہین، جہان یہ عمل اخلاق کے

مین مطابق ہوتا ہے، جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا تھا، خوش مزاجی اور خوش اخلاقی مین فرق ہے، خوش مزاجی فطری خاصیت اور خوش اخلاقی کسبی صفت ہی،

اگر مرنجان مرنجی کا یہ تجزیہ صحیح ہی، تو ایک نتیجہ لازم آتا ہے کہ ایسے شخص کی خوش مزاجی اولاً خود اسکی اپنی تسکین کے لئے ہوتی ہے، نہ کہ دوسرون کی تسکین کے لئے، یہ صحیح ہے کہ اس کی خوش مزاجی سے دوسرون کو فائدہ پہونچتا ہے، لیکن یہ بھلا مانس اس لئے خوش مزاج نہین ہوتا، کہ اس سے دوسرون کی زندگی کے چند لمحے اچھے گذر جائین گے، اگر اس کے دل مین یہ خیال بھی موجود ہے، تو وہ بھلا مانس بھی ہے اور خوش اخلاق بھی، ہر بھلے مانس کے دل مین یہ خیال موجود نہین ہوتا کہ وہ خوش مزاج ہے، کیونکہ اس کی طبیعت کی افتاد ہی کچھ ایسی ہی،

زندگی کے کارزار مین مرنجان مرنج انسان کا کیا درجہ ہے ؟ کیا اسکی ہستی و نیستی برابر ہے ؟ کیا اس کی موجودگی انسانی فلاح کے لئے ضروری ہے، ؟ وہ نہ ہو تو اس کے دوستون اور آشناؤن کو کیا نقصان پہونچے گا ؟ ان سوالون کا جواب آپ آسانی سے دیکھتے ہین، صرف ایک لمحہ کیلئے دل مین سوچئے، اگر میرا مرنجان مرنج دوست زندہ نہ ہو تو مین کیا کرون گا، مین جب سخت پریشان ہوتا ہون تو اوس کے پاس جاتا ہون، اور گھنٹہ دو گھنٹے اس کے کان کھاتا ہون، وہ مسکراتا ہے، میری داستان سنتا ہے، دلاسا دیتا ہے، چائے پانی سے میرا رنج دور کرتا ہے، میرا غصہ ڈھنڈا کرتا ہے، اپنا کام چھوڑ کر بیٹھ جاتا ہے، مین نے کبھی سوچا تک نہین ہے کہ مین اوس کا وقت ضائع کر رہا ہون، وہ خندہ پیشانی سے میری سنتا ہے، دوسرے دوستون کی سنتا ہے، حتی المقدور ہمارے جھگڑے چکاتا ہے، اپنی تکلیف کا وہ بہت کم ذکر کرتا ہی، اگر شکایت بھی کرتا ہے، تو دبی زبان سے اور عذر خواہانہ انداز سے، دشمن کو بھی اس سے کبھی تکلیف نہین پہونچی، وہ مرنجان مرنج ہے، ہر کس و ناکس کا خیر خواہ ہے، بازار سے گذرتا ہے تو کسی کو

سلام کہتا ہے، اور کسی کو آداب عرض، کسی کی مزاج پرسی کرتا ہے، اور کسی سے اس کے گھر بار کی خیر خیریت دریافت کرتا ہے، کسی کو دعا دیتا ہے، کسی سے دعا لیتا ہے، کہین ہنستا ہے، کہین مسکراتا ہے، غرض اس طرح خندہ پیشانی سے یہ بھلا آدمی زندگی کے بازار سے گذر جاتا ہو، ایسے لوگ دنیا مین موجود نہ ہون تو زندگی دوبھر ہو جائے، اور حریفون مین مصالحت کرانے والا کوئی نہ ملے،

لیکن سچ یہ ہو کہ ایسے شخص کی قدر نہین ہوتی، ہر شخص اس سے فائدہ اٹھاتا ہے، لیکن اُسے نقصان پہنچاتا ہو، کوئی اوس کے کان کھا کر اور اس کا وقت ضائع کرکے اوسے نقصان پہنچاتا ہے، کوئی اس کی کم آزاری کو دیکھکر اوس کی تکلیف کے درپے ہے، کوئی اُسے منافق کہتا ہے، محض اس لئے کہ وہ ہر شخص سے مسکرا کر ملتا ہے، کوئی اوس کے صبر و تحمل کا ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے، اور کوئی اُسے احمق کہتا ہے، کیونکہ وہ دوسرون کے ہاتھون اپنا نقصان برداشت کرلیتا ہے،

شاید کارلائل نے تمام انسانون کو دو گروہون مین بانٹا تھا، کچھ بدمعاش ہین اور باقی احمق، بدمعاشون کی گذر احمقون پر ہوتی ہے، اب ہمارا بھلا مانس دوست بدمعاشون کی فہرست مین تو شامل ہو نہین سکتا، اس لئے لوگ اسے احمق تصور کرتے ہین، یہ بے انصافی ہے، اگر عقل انسان کو اس لئے دی گئی ہے، کہ وہ اپنی زندگی کے دن چین و سکون سے گذار دے تو ماننا پڑے گا، کہ مرنجان مرنج انسان سب سے زیادہ کامیاب حکیم ہے، کہ وہ امن و شانتی کا گر پا گیا ہے، ہان اگر زندگی کا مقصد چین و سکون سے کوئی زیادہ اچھی حالت ہے، تو ہمارے بھلے مانس کیلئے ضروری ہے، کہ اپنی خوش طبعی کو خوش اخلاقی کے اعلیٰ درجہ تک پہنچا دے لیکن ہر حال مین وہ بدمعاش سے بہتر ہے، بھلے مانس کی سادگی بدمعاش کے فریب کے جالون کو بالآخر کاٹ کھائیگی، اس لیے بھلے مانسون کو گھبرانا نہ چاہئے، جیت ان کی ہے،

بھلے مانس کی دو خوبیان ایسی ہین، کہ انھین کسی حد تک سیکھا جا سکتا ہے، خوش طبعی اشاعتی

اختیاری نہیں ہی لیکن صبر و تحمل یعنی دوسرون کی خاطر نقصان برداشت کرلینا، اور دوسرون کی عیب جوئی سے پرہیز کرنا، یہ دو صفتین سیکھی جاسکتی ہین، اوران کا سیکھنا ہر انسان کا فرض ہی، ان خوبیون کے بغیر دنیا کے کام چل نہیں سکتے، یہی وجہ ہی کہ انسان کے بہترین پیشواؤن نے ان پر بہت زور دیا ہی، ہمارا مرنجان مرنج دوست اس لحاظ سے خوش قسمت ہی، کیونکہ اس کی طبیعت پہلے ہی سے اس طرف مائل ہوتی ہے، اور جون جون اس کا تجربہ وسیع ہوتا جاتا ہے، اُسے اپنی ان خوبیون کی اہمیت اور قدر کا احساس بھی ہوتا جاتا ہے لیکن یہ احساس اُسے مغرور نہین بنا دیتا ہے، جانتا ہے کہ یہ فطرت کا عطیہ ہے، اور وہ اس عطیہ کے لئے فطرت کا شکر گذار ہے، (آل انڈیا ریڈیو لاہور کی اجازت سے)

خ، ع، ح

فنِ سیرت نگاری

حقیقی سیرت نگاری کا فن مصوری اور آئینہ سازی کے کمالات کا مجموعہ ہوتا ہی، سیرت نگار حسن، خوبی اور خصوصیات کا ایسا تحریری مرقع تیار کرنا چاہتا ہی، جو زندگی کی صحیح، مکمل اور جیتی جاگتی تصویر ہو، سیرت کو صاحبِ سیرت کا آئینہ اور مرقع ہونا چاہئے، فن سیرت نگاری عبارت ہی آئینہ کی عکس ریزی اور مصور کی قلم کاری سے، فنِ سیرت نگاری کی یہی حیثیت سیرت نگاری کو دشوار بنا دیتی ہے، اس لئے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تکمیلِ فن کیسے ہوسکتی ہے، کتاب کے چند اوراق مین زندگی کا ایک صحیح، نفیس، دلپذیر، دلچسپ مخصوص اور موثر مرقع کیونکر سمیٹا اور سمویا جاسکتا ہی، اور کیا اسکی تکمیل خوبی و خلوص کے ساتھ ممکن ہی، سوانح نگار صرف کسی ایک واحد دلچسپ پہلو کو پیش نہین کرتا، بلکہ کسی کی فطرت اور کیرکٹر کا مکمل مرقع پیش کرنا چاہتا ہے، دوسری دقت یہ ہوتی ہے کہ اُس کو اس کثیر مواد سے جو اوس کے سامنے موجود ہوتا ہے، بڑی خوبی اور احتیاط سے انتخاب کرنا پڑتا ہی، مثلاً کسی شخص کی مشغول زندگی کے سوانح کو پیش کرنے مین سوانح نگار کیلئے

ضروری ہی، کہ وہ اس شخص کے معاملات، اسکی ملاقاتون اور گفتگو کے بارے مین صحیح اور متوازن معلومات حاصل کرے، یہ بھی معلوم کرنا ضروری ہوگا، کہ کتنی شخصیتین اوس سے متاثر ہوئین یا اوس نے کتنون کو متاثر کیا، کتنے خطوط کیسے اور کیون اوس نے لکھے، کتنے اور کیسے خطوط اوس کے پاس آئے، ان ساری باتون کو پیش نظر رکھکر سوانح نگار کو اپنے تاثرات پیش کرنا اور انمین توازن قائم رکھنا نہایت ضروری ہے، اس کو صاحب سیرت کے صرف کامیابی اور کامرانی کے زمانہ کا مرقع نہین پیش کرنا پڑیگا، بلکہ توازن قائم رکھنے کے لئے یہ بھی بتانا ضروری ہوگا، کہ مصائب، رنج و غم و غصہ اور درماندگی سے وہ کس طرح متاثر ہوتا تھا،

ان تمام پہلوؤن کو کما حقہ پیش کرنا ممکن نہین، اصل یہ ہو کہ متوازن سوانح نگاری کا فن انتخاب و توازن کے کمال سے عبارت ہوتا ہی، اس لئے یہ فن تمام فنون لطیفہ سے کہین زیادہ اہم و بلند ہی، یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہی، کہ فن سوانح نگاری بمقابلہ دوسرے فنون لطیفہ کے ابھی اپنے ابتدائی مدارج سے گذر رہا ہی، اور بلا تامل اس کا اقرار کرنا پڑے گا، کہ سوانح نگار کی سب سے بڑی دشواری وہ جذبہ ہی جس سے انسانیت موت سے متاثر ہوتی ہے، کسی ایسے شخص کی اچانک موت جس کی زندگی مشغول، مستعد اور روشن تھی، متوسلین کے دماغ کو ایسا مختل اور پراگندہ کر دیتی ہی، کہ متوفی کے بارے مین ان کی رائے بالکل بدل جاتی ہے، مکان جس مین متوفی کی آواز اور اس کے قدم کی چاپ اب نہین سُنی جاتی، اوس کی پڑی ہوئی کتابین، گرا ہوا قلم، خالی کرسی، ان سب سے جذبۂ محبت کو سخت صدمہ پہنچتا ہے، اور اکثر و بیشتر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ متوفی کا کریکٹر فوراً تقدس اور وقار سے متصف نظر آنے لگتا ہے، اس کے بارے مین کسی احمقانہ یا مضحک بات کی یاد جذبۂ احترام کے منافی معلوم ہوتی ہے، اس کی زندگی اور خوش طبعی کی یاد سے دل مغموم ہو جاتا ہے، اس وقت سیرت نگار اپنا کام شروع کرتا ہی، اور جب اوس کا قلم سیرت نگاری شروع کرتا ہے، اور متوفی

کی لغزشون، کمزوریون، نقائص یا اسکی پُر سیاست حکمت عملی یا کیفیات ذہنی کی قلمی تصویرین تیار ہونے لگتی ہین، تو صاحب سیرت کے پرستارون مین سیرت نگار کے خلاف ناپسندیدگی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، جو بلاشبہہ سچا، خالص اور قابل عزت ہوتا ہی اور صرف اس خیال سے جوش مین آتا ہی کہ اون کے ہیرو کو غیر مناسب یا ناپسندیدہ یا غلط یا مضحکہ انگیز رنگ مین پیش کیا جارہا ہے، ایسے وقت مین سیرت نگاری کا کام اس وقت تک کے لئے فوراً بند کر دیا جائے، جب تک کہ متوفی کی یاد کے نقوش مدھم نہ ہوجائین، معمولاً سیرت نگاری کا کام جلد شروع اور جلد ختم کر دیا جاتا ہی، اور صاحب سیرت کے تمام پہلوؤن اور اس کی مخصوص اور نمایان خصوصیات کو ہلکا کرکے اوس کے باریک فرق و امتیاز کا خون اور توازن کا خاتمہ کر دیا جاتا ہے، سیرت نگاری کی سب سے ابتدائی اور سب سے سخت دشواری یہی ہی، سیرت نگار کو بطل پرستی کے اثر سے جذبات کی کشمکش سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے، حقیقت اور رومان کی یہ قدیم جنگ ہے اکثریت کو رومان سے شغف ہوتا ہی، اور وہ شخصیت کو بہترین شکل مین پیش کرنا قابل ستایش سمجھتی ہے، اس لئے فن سوانح نگاری صرف ایک پامال، بے روح جذبات سے لبریز اور صداقت سے خالی فن ہوکر رہ گیا ہے، جب تک لوگ یہ سبق نہ سیکھ لین، کہ جس شخص کی عظمت اوس کی سوانح نگاری کی مستحق ہی، اس کی عظمت اسکی بھی مستحق ہے کہ اوسکی زندگی کا نہایت صاف، صحیح اور سچا مرقع پیش کیا جائے، اس وقت تک فن سیرت نگاری کی حقیقی عظمت قائم نہین ہوسکتی، اس رومانی مرقع کو کون پسند کرسکتا ہے جو حقیقت سے یکسر خالی ہو، اگر زندگی کا مرقع تیار کرنا ہے تو اسکی تکمیل زندگی کے تمام نشیب و فراز، خوبی و کمزوری دانائی اور نادانی کے خطوط اور رنگون سے ہونی چاہئے، لیکن عام قاعدہ کے مطابق جذباتی مداحین اس کا کوئی لحاظ نہین کرتے، ان کو نہ صداقت کی پرواہ ہوتی ہے، اور نہ وہ توازن کا خیال رکھتے ہین، وہ صرف ایک دمکتا ہوا پُر شوکت مرقع تیار کرنا چاہتے ہین، اس کا یہ منشا نہین ہی کہ زندگی

کے ناہموار پہلوؤن کا مضحکہ انگیز مرقع پیش کیا جائے، ان پہلوؤن پر زیادہ زور دینے اور ان کو ضرورت سے زیادہ واضح کرنے کی ضرورت نہین، لیکن صداقت اور توازن کا قائم رکھنا ضروری ہے،

سیرت نگاری کی راہ مین ایک اور سنگِ گران حائل ہی جس کو ہٹانے کی ابتک کوئی کوشش نہین کی گئی ہی، وہ یہ کہ عموماً انہی لوگون کی سیرت اور سوانح لکھے جاتے ہین جن کے کارنامے اہم اور روشن ہین اور یہ فنونِ لطیفہ کے بالکل منافی ہے، بہت سے ایسے لوگ ہین، جو شخصیت کو کارنامہ پر قربان کر دیتے ہین، جس کام کو وہ اٹھاتے ہین، اس مین ساری قوت صرف کر دیتے ہین، اور بڑے کارنامے بھی وہ انجام دیتے ہین، اور اس مین اپنی زندگی کھو دیتے ہین، انکی بے مائگی انکی زندگی کو رنگ و بو سے ہمیشہ کے لئے محروم کر دیتی ہی، ایسی شخصیتین صرف خشک اور معمولی تاریخی تذکرہ کی مستحق سمجھی جاتی ہین ان کا تعلق بجاے سیرت کے تاریخ سے ہو جاتا ہی لیکن ان شخصیتون کے علاوہ بہت سی ایسی بلند ہستیان بھی ہین، جن سے کسی فنی کمال کا اظہار تو کسی میدان مین نہین ہوا لیکن ان ہستیون نے انسانی جذبات کو اُبھار کر متلاطم کر دیا، اور بے شمار لوگون کی زندگیون کو اپنی تپش سے گرما دیا، اُن کی باتون مین نرمی، ٹھنڈک اور حلاوت تھی، ان کی نگاہ مین ہزارون اشارے پوشیدہ تھے، انھون نے زندگی کو پُر لطف اور پر معنی بنا دیا، ان کی روشن اور پرکشش شخصیت مین دلیری تھی، لیکن شاید ہی کبھی ان ہستیون کے بارے مین کچھ بھی لکھا گیا ہو، اس کا سبب صرف یہ ہی کہ ان کی پُر تاثیر اور زود اثر گفتگو کا حوالہ کسی تحریر مین نہین ہے، کیونکہ ان کی ان نگاہون اور اشارون کو جن کی کشش کا بھولنا ممکن نہین الفاظ کے جامہ مین منتقل کرنا دشوار تھا، حقیقت یہ ہی کہ یہ ہستیان بہترین یاد کی مستحق ہین، کیونکہ انہی نے ہم کو زندگی کی نیکیون، اسکی اہمیت اور دلکشی سے روشناس کرایا،

سچے سیرت نگار کو صاحبِ سیرت کا بڑا گہرا مطالعہ کرنا چاہئے، سیرت نگار اس کو دیکھتا اور محسوس کرتا ہی، وہ اوس کے ظاہر و باطن سے واقف ہوتا ہے، سیرت نگار کو وہ پہلو قطعاً

نہین پیش کرنا چاہئے، جس کو محض وہ اپنے گمان مین جانتا اور دیکھتا ہے، بلکہ اس رُخ کو پیش کرنا چاہئے جس کو وہ حقیقۃً دیکھتا اور جانتا ہو، ایک مشہور مصوّر کا قول ہے، کہ پیشہ ور مصوّر اور صاحبِ ذوق مصوّرین جو اپنے ذوق کی خاطر مصوّری کرتا ہے، یہ فرق ہے کہ پہلا مصوّر اپنے ذہنی خاکہ کی مصوّری کرتا ہو، وہ ایک درخت، شکل یا چہرہ کو دیکھتا ہے، پھر اوس کے بارے مین استدلال اور اس کی توجیہ و تشریح کرتا ہے، لیکن آرٹسٹ بالکل بے ساختہ، بلا تامل کسی چیز کی کسی نہج سے پوری خوبی کے ساتھ مصوّری کرتا ہے، وہ استدلال اور توجیہ سے بالاتر ہوتا ہے، اوس کے لئے مصوّری کے لوازمات صرف صورت، مختلف رنگون اور فصل تک محدود ہوتے ہین، تصویر کی تشریح و توجیہ تو تصویر دیکھنے والون کا دماغ کرتا ہے، مصوّر کو تشریح اور توجیہ سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہین ہوتا،

سیرت نگار کی قوتِ مشاہدہ نہایت دقیق قوی عمیق اور دقت پسند ہونی چاہئے، اس کے لئے صبر، قوت اور تلاش و تحقیق کا ذوق ضروری ہے، اوس مین ایسی صداقت ہونی چاہئے کہ جذبات اور رومان کے مطالبات کی طرف مطلق کوئی توجہ نہ کرے، اوس کے لئے قابلِ احترام چیز کی بے حرمتی کرنا، ایسا ہی نامناسب ہے، جیسا ایک مصوّر کے لئے عریانی کی مصوری پر اصرار کرنا لیکن اس قسم کی بطل پرستی کا احترام نہین، جس کا تقاضا یہ ہو کہ کسی شخصیت کا ایسا مرقع پیش کیا جائے جو داغ دھبے سے بالکل پاک، نور ہی نور ہو،

سیرت نگاری مین اصل دقت توازن کی ہوتی ہے، جس مین بلند، اعلیٰ اور پرہیبت پہلوؤن کو دقیق، پرتلوّن اور ظریفانہ پہلوؤن سے متوازن کیا جاتا ہے زمین کے اندر اور آسمان کے اوپر (بعد موت روح و جسم کی طرف اشارہ ہے) جو اسرار مخفی ہین، وہ اگر بیان نہ کئے جا سکین تو اس طرح پیش کئے جائین، جس سے ان کا کچھ ہلکا سا تصور کیا جا سکے، عالی مرتبہ بلند پایہ شخصیتیں، ہمیشہ اُن ساری باتون کا پورا اظہار نہین کرتین، جن کو وہ جانتی اور محسوس کرتی ہین، ان کی خاموشی اکثر ان کی

تقریر وگفتگو سے زیادہ ہوتی ہے، سیرت نگار مین پاک اور روح پرور خاموشیون کی طرف اشارہ کرنے کی صلاحیت بھی ضرور ہونی چاہئے، کیونکہ بڑے لوگون کی شخصیت کا جنھون نے عملی کام کئے ہین ہم کو صرف خفیف پر تو نظر آتا ہی، ان کے بے شمار خفیف اشارے اور جلوے ہماری نگاہون سے اوجھل رہتے ہین، ہم بعض اشخاص سے ان کی خرابیون اور کمزوریون یا ان کے ساتھ بے جا حُسن ظن یا بدظنی یا ان کے عمدہ سلیقہ کی وجہ سے محبت و نفرت نہین کرتے، بلکہ ان کی ذات سے محبت و نفرت کرتے ہین، اس لئے بہترین سیرت نگار کو اپنے وجدانی سلیقہ سے یہ ضرور معلوم کرنا چاہئے، کہ صاحب سیرت کی سیرت کے اصلی اور بنیادی اجزا کیا ہین، اور اس کی محبت کی بنیاد جذبۂ شوق نہین، بلکہ صداقت پر ہونی چاہئے، وہی سوانح نگار حقیقی سوانح نگار اور خادم فن کہلانے کا مستحق ہے، جو صداقت اور ہنر کے ساتھ اپنا فرض انجام دیتا ہے، ایسا شخص اپنی صداقت سے دوسرون کو ایمان و یقین پر آمادہ کرسکتا ہے، اور انھین بتا سکتا ہے، کہ ایسی زندگی جو اس حُسن و خوبی کے ساتھ بسر کی گئی ہو، ناکامیون اور حرمان نصیبیون کے باوجود اس زندگی سے کہین زیادہ اعلیٰ وارفع اور دلکش ہے، جس کا صرف خیالی اور رومانی مرقع پیش کیا گیا ہو، "ن ص"

خطبات مدراس

مولانا سید سلیمان ندوی نے ۱۹۲۶ عیسوی مین سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مختلف پہلوؤن پر آٹھ خطبے دیئے تھے، جو نہایت مقبول ہوئے، اور مسلمانون نے ان کو بیحد پسند کیا، یہ اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن ہے،

ضخامت :- ۱۹۴ صفحے، قیمت :- عہ

"منیجر"

اخبار علمیہ

جامعۂ ازہر کی ہزار سالہ جوبلی

سنہ ہجری کے حساب سے مصر کی مشہور عربی یونیورسٹی جامعہ ازہر کی تاسیس کو ایک ہزار سال پورے ہو گئے، اس لئے ازہر والوں کو عرصہ سے اس کی ہزار سالہ جوبلی منانے کا خیال تھا، اور اس کیلئے تاریخ بھی مقرر ہو گئی تھی، جس کی صدارت شاہ فاروق کرنے والے تھے لیکن ان کی علالت کی بنا پر اسے پھر ملتوی کر دیا گیا، اس جامعہ کی بنیاد ۳۵۹ھ مطابق ۹۶۹ء میں پڑی تھی، اس کا بانی معز لدین اللہ فاطمی کا مشہور جنرل جوہر ہے، اس جامعہ سے ہر سال ۱۱۰۰۰ طلبہ فارغ ہو کر نکلتے ہیں، پہلے یہاں صرف قدیم اور دینی علوم کی تعلیم ہوتی تھی، اب ضرورت کے مطابق اس کے نصاب میں جغرافیہ، تاریخ اور ریاضی بھی داخل کر دیئے گئے ہیں، یہاں ترکی، افغانستان، عراق، فلسطین، شام، فارس، ہندوستان، جاوا، سماترا، حجاز، سوڈان، حبشہ، چین، غرض سارے دنیائے اسلام کے طلبہ حصول تعلیم کے لئے آتے ہیں، اس جامعہ کی سالانہ آمدنی ۵۰۰۰۰۰ پونڈ یعنی ۵۰۰۰۰۰ روپئے ہے، ملکی طلبہ سے کوئی فیس نہیں لیجاتی، یہاں کے موجودہ شیخ الازہر مصطفیٰ المراغی ہیں،

کویت اور مسقط کی ترقیاں

کویت اور مسقط عرب کی نہایت چھوٹی ریاستیں ہیں، لیکن اپنی ترقی کے لحاظ سے وہ عرب کی

بڑی حکومتوں سے کم نہین، کویت کی گذشتہ سال کی تعلیمی رپورٹ اور آیندہ تعلیمی بجٹ سے معلوم ہوتا ہے، کہ وہان کا تعلیمی شعبہ تعلیم کی اشاعت مین بڑی کوشش کر رہا ہی، اور جدید و قدیم دونون تعلیمون کی طرف پوری توجہ ہے، چنانچہ نئی تعلیم کے لئے جدید طرز کی دو بڑی عمارتین احمدیہ اور مشرقیہ بن گئی ہین، دیہاتون مین ابتدائی تعلیم کے مدارس کھولے جا رہے ہین، اعلیٰ تعلیم کے لئے طلبہ بیرونی ملکون مین بھی بھیجے جاتے ہین، غریب طلبہ کو ہر طرح کی مدد دیجاتی ہے، بچّون کی جسمانی تربیت کی ترغیب کے لئے روضۃ الاطفال کا قیام بھی پیش نظر ہے، تفسیر حدیث اور فقہ کی تعلیم اور مذہبی لکچرون کے لئے علٰحدہ ایک ادارہ قائم کیا گیا ہے،

مسقط کی ریاست مین بھی نمایان ترقی ہی، شہر مین بجلی کی روشنی جاری ہو گئی ہے، نئی عمارتون مین حسن و ترتیب کا خاص لحاظ رکھا جاتا ہے، شہر کی صفائی اور حفظانِ صحت کی طرف پوری توجہ ہی، تعلیم و تجارت روز افزون ترقی پر ہے، ڈاک کا انتظام ترقی یافتہ ملکون سے کم نہین، گھر گھر ریڈیو ہو گیا ہی، چشم بد دور ان ترقیون کے بعد انھین غیر مہذب کون کہہ سکتا ہی،

بعض علمی نوادر

اورنگ آباد کے ایک شائق علم جناب محمد گیسو دراز خان نے اپنے کتب خانہ مین نادر قلمی کتابون کا بڑا قابل قدر مجموعہ جمع کیا ہی، ان مین سے چند قلمی نسخون کا تذکرہ کیا جاتا ہے،

(۱) تعمیر بی بی مقبرہ، اورنگ آباد مین اورنگ زیب کے لڑکے نے تاج محل کا ایک نقش ثانی تعمیر کرانے کی کوشش کی تھی جس مین وہ پوری طرح کامیاب نہین ہوا، اسکی تعمیر سے متعلق چند قلمی کاغذات ہین جو نہ صرف تاریخی نقطۂ نگاہ سے اہم ہین، بلکہ مغلون کے زمانۂ عروج کے فن تعمیر کی ترقی

کے بارے مین بھی کافی معلومات بہم پہنچاتے ہین (۲) دیوان ولی دکنی، اس نسخہ مین بہت سی غزلین ایسی ہین، جو دوسرے قلمی نسخون مین نہین ہین، یہ نسخہ ۱۱۴۵ھ مین نقل کیا گیا تھا (۳) مثنوی میر حسن کا ایک نادر قلمی نسخہ ہے (۴) فن خطاطی کا البم، اس البم مین فن خطاطی کے سترہ اٹھارہ نمونے موجود ہین، (۵) مجموعہ عالمگیری، مؤلفہ امیر قوام الدین سنجی اس کتاب مین خواجہ معین الدین چشتی، شیخ نصیر الدین چراغ دہلی، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اور حضرت نظام الدین اولیاؒ کے متعلق کافی مواد موجود ہے،

دنیا کی سب سے بڑی لغت

چینی ایک ایسی لغت تیار کر رہے ہین، جو الفاظ کی کثرت معنی کی تشریح اور لکھائی چھپائی کے اعتبار سے دنیا کی سب سے زیادہ مکمل اور عظیم الشان لغت ہوگی، یہ لغت چھ ہزار مختلف چینی رسم الخط مین شائع ہوگی، اور اس کی چالیس جلدین ہون گی، اس کی تکمیل مین دس برس لگین گے پہلی جلد جس مین ۴۰۰ ، ۷ اوراق ہون گے، صرف ایک چینی لفظ "ی ژ" (ح) کے تمام مشتقات اور اس کے معنی پر محیط ہوگی، اس کے ساتھ ہی ساتھ ۱۱۰۰ مختلف قسم کے الفاظ اور محاورے بھی ہون گے، اس سے اس لغت کی وسعت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے،

ایک نو ایجاد گھڑی

حال ہی مین ایک یورپین فرم نے ایک ایسی گھڑی بنائی ہے، جس مین کوک دینے کی قطعی ضرورت نہین، اب تک جتنی گھڑیان بھی ہین، خواہ وہ کلائی کی ہون یا جیبی، دیوار کی ہون یا ٹائم کلاک، اس مین ۲۴ گھنٹے، ایک ہفتہ یا اٹھارہ دن یا مہینہ بھر مین چابی دینا ضروری تھا، لیکن اس نو ایجاد گھڑی مین جس کا نام اٹموس (Atmos) ہے، کوک دینے کی ضرورت نہین، بلکہ اس مین

موسم کے تغیرات، گرمی، سردی، برسات اور بہار کے اثرات اور ہوا کی ہلکی سی لہر کے اثر سے خود بخود کوک بھر جاتی ہے، اس مین نہ تو بیٹری استعمال ہوتی ہے، اور نہ برقی لہرین، غرض یہ گھڑی جب تک دنیا قائم ہے بغیر انسانی مدد کے متحرک رہے گی،

طاقت بخش حیاتین

جب سے موجودہ جنگ کے ہولناک شعلون نے دنیا کی اقتصادی، معاشرتی حالت اور مختلف کارخانون کو اپنی آتشین لپیٹ سے خاکستر کر دیا ہے، اس وقت سے سائنس دانون کو ایسی بہت سی نئی چیزون کی طرف توجہ کرنا پڑی ہے، جنھین جنگ نے ضروری بنا دیا ہے، جرمنی مین چونکہ خوراک کی کمی ہے، اس لئے وہان کے سائنس دان ایسی حیاتین تیار کرنے کی کوشش کر رہے ہین، جس کی ایک خوراک دن بھر کے کھانے کا کام دیگی،

ایک بڑا پھول

شمالی مغربی امریکہ کے جنگلون مین ایسے پودے پائے جاتے ہین، جن مین گلابی رنگ کے حسین پھول کھلتے ہین، ان پودون کا قد عموماً چھ فٹ ہوتا ہے، اور ان کے پھول اتنے بڑے ہوتے ہین، کہ اس کی ہر پتی ڈیڑھ دو فٹ لمبی ہوتی ہے، ان پھولون مین نزاکت بیحد ہوتی ہے اور چھونے کے ساتھ ہی سمٹ جاتے ہین، اس پھول کا نام لیکوڈلفیا (Rhodo-Ledum) ہے،

آثارِ علمیہ و ادبیہ

مولانا شبلی مرحوم کے دو غیر مطبوعہ خط

از

مولانا امتیاز علی خان صاحب عرشی ناظم کتب خانہ ریاست رامپور

مولانا شبلی مرحوم اور کتابخانہ ریاست رامپور مین بہت قدیم علمی رابطہ تھا، غالباً اس کا آغاز الفاروق کی تصنیف کے وقت ہوا ہے، کیونکہ سب سے پہلے اسی کتاب کی تالیف کے لئے مسالہ جمع کرنے مین مولانا نے ہندوستان کا کونا کونا چھانا، اور جب یہان مزید معلومات ملنے سے ناامید ہوئے تو ممالکِ اسلامیہ کا سفر اختیار فرمایا تھا،

کتابخانہ کی کتابِ معائنہ مین مولانا کی پہلی تحریر ۹ ستمبر ۱۸۹ء کی لکھی ہوئی ہے، یہ اس کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ آپ کا رامپور مین ورود ستمبر سنہ مذکورۂ بالا مین ہوا، تحریر کے الفاظ یہ ہین:-

"مین نے کتب خانہ کو کسی قدر تفصیل سے دیکھا، چونکہ مین کتب خانہ کی ایک مفصل رپورٹ لکھنا چاہتا ہون، اس لئے اس موقع پر اسی قدر لکھنا کافی ہوگا، کہ یہ ایک بےمثل کتب خانہ ہے، منتظمانِ کتب خانہ مستعد اور کارگذار ہین، خصوصاً مہدی علی خان صاحب کو اس قدر واقفیت اور تجربہ ہے، کہ ایسے عظیم الشان دار الکتب کی ایک ایک کتاب کا نمبر و نشان اور اس کی حالت گویا ان کی آنکھون کے سامنے ہے، فہرست کی اگر معقول ترتیب ہو جائے

تو نہایت آسانی ہو، مولوی عبید اللہ صاحب نے بہت کچھ کام کیا ہے جو قابل مدح ہی،

لیکن ابھی بہت کچھ کرنا ہے"   محمد شبلی   پروفیسر مدرستہ العلوم علی گڈھ

۹ ستمبر ۱۹۰۸ء"

اس مین جس مفصل رپورٹ کا ذکر ہے، وہ معارف بابت ماہ اکتوبر ۱۹۳۴ء مین مین نے شائع کرادی ہی، اس کے بعد ۱۹۱۴ء مین مولانا کتب خانہ تشریف لائے تھے، اس موقع پر آپنے کتاب معاینہ مین جو تحریر لکھی تھی، وہ بھی معارف کے سابق الذکر شمارے مین چھپ چکی ہی، مگر چونکہ چند سطرون سے زیادہ نہین ہے، یہان دوبارہ نقل کرتا ہون، فرماتے ہین:

"مین اس کتب خانہ سے بارہا متمتع ہوا ہون، ہندوستان کے کتب خانون مین اس سے بہتر کیا اس کے برابر بھی کوئی کتب خانہ نہین، مینے روم و مصر کے کتب خانے بھی دیکھے ہین لیکن کسی کتب خانہ کو مجموعی حیثیت سے مین نے اس سے افضل نہین دیکھا اہل کاران کتب خانہ کی محنت اور وسعت اطلاع کی داد دینی چاہئے، خصوصًا مہدی علی خان صاحب تو خود ایک زندہ کتب خانہ ہین۔

شبلی نعمانی۔   ۱۰ اپریل ۱۹۱۴ء"

مولانا نے اپنے پہلے سفر کے بعد حکیم اجمل خان مرحوم اور حافظ احمد علی خان مرحوم کے نام جو خط تحریر فرمائے تھے، ان مین سے صرف دو کتابخانے کے ایک پرانے فائل مین ملتے ہین، چونکہ ان سے شاعری کے متعلق مولانا کی رائے معلوم ہوتی ہے، نیز شعرالعجم کی تالیف کے آغاز پر مفید روشنی پڑتی ہی اسلئے معارف کے ذریعہ اہل ادب تک اس تحفہ کو پہنچا رہا ہون،

۱۔ مولانا کا پہلا خط غالبًا حافظ احمد علی خان شوق مرحوم سابق ناظم کتابخانہ کے نام ہے، حافظ صاحب مرحوم اوس زمانہ مین کتابخانہ کے منصرم تھے، اور نجی طور پر مطبع احمدی جاری کرکے اوس سے

ایک ماہانہ گلدستہ نکالتے تھے، اس خط مین القاب سرے سے محذوف ہے، صرف تسلیم سے شروع کر دیا گیا ہے، فرماتے ہین:

"۱۲ر جنوری ۱۸۹۶ء

تسلیم

والانامہ میری غیبت مین آیا، مین ایک ضروری کام سے وطن گیا ہوا تھا، آج واپس آیا ہون، آپ نے جس عنایت اور لطف سے ایک نیازمند کو یاد کیا ہے، اس کا شکریہ کس زبان سے ادا ہو سکتا ہے،

گلدستون کا مین بہت مخالف ہون، نہ اس لئے کہ مجھکو ایشیائی شاعری سے اجتناب ہے، بلکہ اس لئے یہ چیز اچیرن ہو گئی، گلدستہ مین اگر بالالتزام شاعری کی حقیقت، عرب، فارس اور ہندوستان کی شاعری کی تاریخ، ان کا باہم موازنہ اور اس قسم کے امور پر محققانہ آرٹیکل ہوا کرین، تو اشعار کا حصہ بھی پُرمزہ، ورنہ چٹنی کو مستقل غذا بنانا ایک بیفائدہ کوشش ہی، نئے مذاق کی شاعری زیادہ نہین چل سکتی، مولوی حالی صاحب کا میدان ہو چکا اور اُن کی چال پر جو لوگ چلتے ہین، بالکل تقالی معلوم ہوتی ہی تحقیقاتِ شاعری کا عنوان لے کر ہر پرچہ مین کچھ نہ کچھ لکھا جائے، تو البتہ ایک کام کی چیز ہو گی، لیکن اوس کے ساتھ چھپائی اور کاغذ کی عمدگی بھی جب تک اوّل درجہ کی نہ ہو، لوگ اس کی طرف توجہ نہ کرین گے،

مین بہت کم شعر کہتا ہون، دو تین سال مین ایک آدھ نظم ہو جاتی ہے، اور وہ اسی وقت کسی اخبار وغیرہ مین شائع ہو جاتی ہے، اس لئے غیر مطبوع کلام پیش نہین کر سکتا، الفاروق جواب چھپ رہی ہے، اس کے دیباچہ کے لئے کچھ اشعار موزون کئے تھے، اب اس کے درج کرنے کا ارادہ نہین ہے، وہ البتہ غیر مطبوع ہے، اس لئے نذرِ خدمت ہے، لیکن گلدستہ مین

اس کی کمیت کس تقریب سے ہو سکتی ہی، بہر حال تعمیلِ فرمایش کرتا ہون،

زر وہ ابھی ڈاکخانہ مین ہو کل ملے گا، اس وقت رسید لکھونگا،

من کہ یک چند زدم مہرِ خموشی بر لب | کس چہ داند کہ درین پردہ چہ سودا کردم[1]
محفل از بادۂ دوشینہ نیاسودہ ہنوز | بادۂ تند تراز دوش بہ مینا کردم
پیکرے تازہ کہ خواہم بہ حریفان بنود | نخے از ذوقِ خودش نیز تماشا کردم
می توانم کہ دمم در تنِ اندیشہ روان | منکہ دریوزۂ فیض از دمِ عیسیٰ کردم
شاہدِ راز کہ کس پردہ ز رویش نگرفت | گرہ از بندِ قبایش بہ فسون واکردم
سخن از پایۂ سقراط و فلاطون بگذشت | نامہ از نسخۂ روح القدس املا کردم
بسکہ ہر بار گہر پاش گذشتم زین راہ | دشتِ معنی ہمہ پُر لولوی لالا کردم
لب زخمیازہ دمی بست قدح نوشان را | پارۂ از جگر افشردہ بہ صہبا کردم

والتسلیم شبلی علی گڈہ

۱۲ جنوری ۱۸۹۸ء

۲- مولانا کا دوسرا خط حکیم اجمل خان مرحوم کے نام ہے، اس لئے کہ اس کی پشت پر موصوف نے اپنے قلم سے یہ عبارت حافظ احمد علی خان مرحوم کو لکھی ہی:

"حافظ صاحب، اس کا مناسب جواب مولوی صاحب کو لکھ بھیجئے، اگر آپ بندوبست کر سکتے ہین، تو کر دیجئے" اجمل ۲۶ مئی ۱۹۰۳ء

---

[1] معارف معلوم ہوتا ہو کہ الفاروق کے دیباچہ کے لئے مولانا نے جو نظم لکھی تھی، اس کے سب اشعار دیباچہ مین شائع نہین فرمائے، کیونکہ اس مین آخری شعر نہین ہو، دونون نظمون کے بعض مصرعون مین بھی کہین ایک دو لفظون کا اور کہین پورے مصرع کا تغیر ہے،

اصل خط اس طرح شروع ہوتا ہی :-

"مکرم ما

مین نے اب ایک عربی دان کاتب مقرر کر دیا ہے، جو غالباً صحیح لکھے گا، جداگانہ صحت کا انتظام نہین ہو سکتا تھا، فرمائیے تو اجزار طیار شدہ بھیجا جاؤن،

ہان یہ ارشاد ہو کہ کتب خانۂ رامپور سے متمتع ہونے کی کیا صورت ہی ؟

مین فارسی شاعری کی نہایت مبسوط تاریخ لکھنا چاہتا ہون، فردوسی، فرخی، عبد الواسع جبلی، انوری، سلمان ساوجی، حکیم سنائی، عرفی، نظیری، منوچہری، دامغانی کے حالات تذکرون سے نقل کرا کر ارسال فرمائین تو نہایت کرم ہوگا،

کاتب نقل کرے اور اجرتِ کتابت مین ادا کرون گا لیکن دولت شاہ سمرقندی، مجمع الفصحا، خزانۂ عامرہ، مرآۃ الخیال، سرخوش سے نقل کرنے کی ضرورت نہین، یہ کتابین یہان بھی موجود ہین،

والتسلیم شبلی

حیدرآباد، ۱۲ مئی ۱۹۰۳ء"

اس خط کے پہلے پیرے مین جن اجزاے کتاب کا ذکر ہے، وہ مفتاح السعادۃ کے اجزار تھے، یہ کتاب مولنا شبلی مرحوم کے توسط سے کتبخانہ آصفیہ حیدرآباد سے نقل کرائی گئی تھی،

باب التقریظ والانتقاد

آفتاب

مرتبہ جناب خورشید الاسلام صاحب صدر آفتاب مجلس مسلم یونیورسٹی علی گڈھ تقطیع اوسط ضخامت ۲۸۲ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت معلوم نہین، صدر مجلس سے ملے گی،

آفتاب ہال مسلم یونیورسٹی مین آفتاب مجلس کے نام سے طلبہ کی ایک علمی مجلس ہی جس کا مقصد ان مین تحریر و تقریر کا ملکہ اور علمی ذوق پیدا کرنا، اور ان کی مذہبی اور سیاسی تربیت ہی، صدر مجلس نے آخری مقصد کے تحت مین چند تجدیدی و اصلاحی مضامین اور بعض دینی و سیاسی مجددین کے حالات کا یہ مجموعہ شائع کیا ہے، اس مین سات مضامین ہین، "تجدید و احیاے دین" مولانا ابو الاعلیٰ مودودی "اسلامی تہذیب پر دوسری تہذیبون کے اثرات" جناب عبد اللطیف صاحب اعظمی "کیا موجودہ تصوف خالص اسلامی ہی" جناب ضیاء احمد صاحب بدایونی، "حضرت امام غزالی" جناب ملک حامد حسین صاحب "مختصر سیرت محمد بن عبد الوہاب نجدی" مولینا مسعود عالم صاحب ندوی" علامہ سید جمال الدین افغانی" مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی، "جمال الدین افغانی" جناب اسلوب احمد صاحب انصاری آخرین غالبًا ایک دو مضمون کے علاوہ باقی سب مضامین مختلف رسالون مین چھپ چکے ہین، اور مجلس کے مقصد کے لئے مفید ہین، تصوف کے متعلق ضیاء احمد صاحب کی تحقیق سنجیدہ ہے لیکن عبد اللطیف صاحب اعظمی

اور ملک حامد حسین صاحب کے مضامین مین بعض بڑی فاحش غلطیان ہین، مثلاً اعظمی صاحب لکھتے ہین:-

"مسلمانون کو غیر مسلم لڑکیون کے ساتھ بعض شرائط کے ساتھ شادی کرنا جائز ہے، اس لئے انھون نے ہندو لڑکیون کے ساتھ نہایت کثرت سے شادیان کین" کتابیہ عورتون کے ساتھ تو بیشک شادی جائز ہے لیکن ہندو عورتون کے ساتھ قبول اسلام کی شرط کے علاوہ معلوم نہین اور کون سی شرائط پر جائز ہے،

یا ابن عربی کا یہ خیال کہ خدا کے اصلی نام تین ہین، اللہ رحمن رب اور دوسرے تمام اس کے ماتحت ہین، عیسائیون کے عقیدۂ تثلیث سے ماخوذ ہے، ممکن ہے ابن عربی نے کہین یہ خیال ظاہر کیا ہو، لیکن اسکو تثلیث سے کیا نسبت، تثلیث مین تو تین علحدہ علحدہ مستقل مجسم وجود نکر اون کو خدا کی ذات مین شریک جانا جاتا ہی، اور ابن عربی تو اس کے قائل نہین، پھر ابن عربی نے تو عام اہل سنت کے مطابق یہ تسلیم کیا ہے کہ اصل صفات الٰہی سات ہین، (فتوحات مکیہ جلد اول ص۱۰۰ مصر) یا بلخ کا شہزادہ ابراہیم بن ادہم بدھ کے حالات سے اسقدر متاثر ہوا، کہ خلعت شاہی اُتار پھینکا، اور جنگلون کی راہ لی، اولاً حضرت ابراہیم ابن ادہم کی شاہزادگی کی روایت بالکل عامیانہ ہی، آپکا وصال خود مضمون نگار کے قول کے مطابق ۱۶۱ھ یا ۱۶۶ھ مین ہوا، جو مہدی عباسی کا زمانہ تھا، اور اس زمانہ مین اندلس کے علاوہ اسلامی ممالک کا کوئی حصہ بنی عباس کے قبضہ سے نہ نکلا تھا، اور نہ کہین امارت و حکومت قائم ہوئی تھی، پھر ابراہیم بن ادہم کس حکومت کے شاہزادے تھے، دوسرے یہ کونسی منطق ہی کہ جس شاہزادے نے دنیا چھوڑ دی تو محض بدھ کے حالات سے مشابہت کی بنا پر اسے بدھ کے اثر کا نتیجہ قرار دیا جائے، اس قسم کی اور بھی بعض غلطیان ہین، جن کی تفصیل کی اس مختصر ریویو مین گنجایش نہین، ملک حامد حسین صاحب کا مضمون تو اور بھی گیا گذرا اور اغلاط سے لبریز ہے، چند موٹی موٹی غلطیان یہ ہین، مثلاً "ابن سینا کا خیال تھا کہ شرع کے احکام و ریاست کے قوانین صرف عامۃ الناس کے لئے واجب العمل ہین، محمد (صلعم) کا مقصد یہ تھا کہ بدویون کو مہذب بنائین، اس مقصد کے لئے انھون نے علاوہ اور باتون کے حشر اجساد

کی تعلیم دی"، یا ابن رشد اپنے کو قطعاً اسلام سے آزاد خیال کرتا تھا، یہ فلسفی فلسفہ کو اسلام پر ترجیح دیتا تھا، اس کا خیال تھا، کہ جو کچھ قرآن میں ہے، اُسی کو بغیر چون و چرا کے مان لینا چاہئے، اسی کو وہ حق بتاتا ہے لیکن ایسا حق جو طفل طبقے کے لوگون کے لئے موزون ہے، اور اسکی وقعت قصہ کہانیون سے زیادہ نہین، فلسفہ ایک بلند چیز ہے، اور حقیقی وجود کا پتہ دیتا ہے" یا امام غزالی کے نزدیک حشر اجساد پر عقیدہ نہ رکھنے سے اسلامی عقیدہ پر کوئی اثر نہین پڑتا" ان مین سے ایک بات بھی صحیح نہین ہے، ابن سینا اسلام کو دین حق سمجھتا تھا، اور حشر اجساد کا قائل تھا، الٰہیات شفا مین لکھتا ہے، کہ "اس سچی شریعت نے جو ہمارے پیغمبر ہمارے آقا ہمارے سردار محمد صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے جسمانی عذاب و ثواب کا حال نہایت تصریح سے بیان کیا گیا ہے" کیا شریعت کو بدویون کا قانون سمجھنے والے اور معاد جسمانی کے منکر کے یہی الفاظ ہو سکتے ہین، البتہ عالم آخرت کی لذات کے متعلق اس کا خیال ہے کہ جسمانی لذتین عوام کے لئے ہین، خواص کے لئے اس سے بلند تر روحانی لذات ہین اس خیال کو بھی حشر اجساد کے انکار سے کوئی تعلق نہین، ابن رشد کے خیالات کو نہایت مسخ کر کے پیش کیا گیا ہے، فصل المقال اور کشف الادلہ مین قرآنی احکام پر فلسفیانہ غور و فکر کے بارہ مین اوس نے تفصیل کے ساتھ اپنے خیالات ظاہر کئے ہین، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ "دین حق ہے، اور وہ خود معرفت حق کے لئے فلسفیانہ غور و فکر کی دعوت دیتا ہے، فلسفیانہ طریق تفکر صحیح نتیجہ پر پہنچاتا ہے، اس لئے اس سے مذہب کی مخالفت نہین بلکہ اسکی تائید اور موافقت ہوتی ہے، اور کلام مجید مین خطابی اور اقناعی اور برہانی اور قیاسی دونون طرح کے دلائل ہین جن سے عوام اور اہل علم یعنی حکما، اور فلاسفہ دونون کی تشفی ہو جاتی ہے، اس لئے حکما کو برہانی اور قیاسی نقطۂ نظر سے اس پر غور و فکر کرنا چاہئے، اور آیات قرآنی کی دو قسمین ہین، ایک وہ جن کے معنی بالکل ظاہر ہین، اون کے ظاہری معنی کو بغیر کسی تاویل کے ماننا عوام اور اہل علم دونون کے لئے ضروری ہے، دوسری وہ جن مین ظاہری معنی کے علاوہ حکیمانہ تاویل بھی ہو سکتی ہے، اس مین حکما کو فلسفیانہ غور و فکر اور تاویل کی اجازت ہے، لیکن عوام کے سامنے اس کا اظہار کفر ہے، بلکہ ایسی کتابون مین بھی اس کا اظہار

نہ ہونا چاہئے جن پر عوام کی دسترس ہو" مضمون نگار کے نقل کردہ خیالات اور اس خیال مین کیا نسبت ہے؟
اسی طرح امام غزالی کی جانب جو قول منسوب کیا گیا، وہ بھی غلط ہے، وہ حشر اجساد پر یقین نہ رکھنے والے کو کافر سمجھتے تھے، جیساکہ تہافتہ الفلاسفہ مین ہے، اسی بنا پر انھون نے ابن سینا کی تکفیر کی ہے، احیاء العلوم ان کی آخری کتابون مین ہے، اس مین اس کا ذکر ہے، لطف یہ ہے کہ ان لوگون کے مقابلہ مین مصنفین اخوان الصفا، کو جن کی گمراہیان ظاہر ہین، مصلحین مین اور منصور حلاج کو عارف کامل تسلیم کیا گیا ہے، بعض واقعات تاریخی حیثیت سے بالکل غلط ہین، مثلاً امام غزالی کے تجدیدی کارنامون کے سلسلہ مین لکھتے ہین "کہ ترک (سلجوقی) جاہل تھے، اس لئے ان کے زمانہ مین وہ فنون جو درحقیقت قوم کی رہنمائی کرتے ہین، سرے سے غائب تھے، اور ان کی جگہ ان فنون کا زور تھا، جو دربار مین قدر و منزلت رکھتے تھے، اور جو سراسر مخرب اخلاق تھے، اور جن سے انسانون مین پست ہمتی، بزدلی اور بے غیرتی پیدا ہوتی ہے، ان حکومتون نے اگر کوئی خدمت کی تو بس اس قدر کہ ایک طرف یونان، روم اور عجم کے جاہلی فلسفہ کو جون کا تون اسلام مین پھیلا دیا، اور دوسری طرف اپنی دولت کے ذریعہ اسلامی معاشرت مین جاہلی علوم و فنون کو جاری کیا" یہ ان سلجوقی ترکون کے متعلق کہا جاتا ہے، جن مین الپ ارسلان اور ملک شاہ جیسے جلیل القدر فرمانروا پیدا ہوئے جنھون نے ایک طرف عباسیون کے زوال کے بعد اسلامی سیاست کے مردہ قالب مین جان ڈالی، دوسری طرف ان کی فیاضی اور ان کے وزیر نظام الملک کی علم نوازی نے بغداد کے مشہور دارالعلوم نظامیہ کی بنا ڈالی جو ساری اسلامی دنیا کا تعلیمی مرکز بن گیا، اگر ان کے یہ کارنامے تخریب اخلاق اور بزدلی، پست ہمتی اور بے غیرتی پیدا کرنے کے ضمن مین آتے ہین، تو بیشک مضمون نگار کا بیان صحیح ہے، یونانی اور رومی فلسفہ تو ان سے مدتون پہلے مامون کے زمانہ مین رائج ہو چکا تھا، اس کا الزام غریب ترکون کے سر ڈالنا کہان تک صحیح ہے، غالباً یہ مضمون کسی انگریزی مضمون یا کتاب سے اخذ و ترجمہ ہے، ورنہ اتنی غلطیان نہ ہو سکتی تھین، اگر مضمون نگار تنہا اردو کتابون

سے یہ مضمون لکھتے، تو اس سے کہین زیادہ صحیح معلومات ان کو مل جاتے، ضرورت ہے کہ ایسے مضامین کی اشاعت سے پہلے کسی صاحب نظر کو دکھا لیا جایا کرے، ورنہ اسلامی تاریخ کے متعلق طلبہ کے سامنے اسی قسم کے نادر معلومات آیا کرین گے، "م"

"شمیم عشرت"

کتابت وطباعت بہتر، ضخامت ۲۸۳ صفحے، پتہ:- حسینین منزل، گیا،

جناب سید احمد علی عشرت مرحوم گیا صوبۂ بہار کے رئیس اور کہنہ مشق شاعر تھے، انھون نے ۵ ار نومبر ۱۹۱۸ء کو انتقال کیا، اور ایک دیوان اور ایک بیاض اپنی یادگار چھوڑا، آج تقریباً ربع صدی کے گذر جانے پر اس دیوان کو ان کے لائق شاگرد رشید جناب سید حسن امام صاحب رئیس گیا نے مرتب شکل مین عمدہ کاغذ، عمدہ کتابت اور عمدہ طباعت کیساتھ شائع کیا ہی، لیکن دیوان کی اشاعت کا مقصد تاجرانہ نہین ہی، بلکہ خالص ادبی ذوق اور اپنے اوستاد کی ایک یادگار کو زندہ رکھنا ہی، اس لئے یہ قیمتہً فروخت نہین ہوتا، بلکہ ممتاز شعرا، ارباب ذوق اور علمی ادارون کو بلاقیمت ہدیتہً نذر کیا جاتا ہے، صاحب دیوان کو معلوم نہین کہ تلمذ کس سے حاصل ہی، لیکن وہ غالب کے شاگرد نادر شاہ خان صاحب شوخی رامپوری کے فیض صحبت سے جن کا قیام اکثر گیا مین رہتا تھا، بہت زیادہ مستفید ہوئے ہین، لیکن تعجب ہے کہ بااینہمہ وہ "دلی اسکول" کے رنگ سے بہت کم متاثر ہوئے، اور زیادہ تر غزلین لکھنؤ کے طرز مین لکھین، مثلاً شعرائے لکھنؤ کی طرح اکثر سیر حاصل غزلین، بلکہ جا بجا دو غزلہ لکھتے ہین اور بعض اشعار مین لکھنو کا رنگ صاف نمایان ہے، مثلاً

جب مرگ ترش رو نظر آئی دم آخر ٹوٹا خمار نشۂ غفلت ہوا ہوا

مرگ ترش رو کی ترکیب اسی لئے اختیار کی ہے، کہ ترشی سے نشہ اترجاتا ہے،

سُرخ جوڑا خونِ بسمل کا ہوا زیب بدن پھٹ پڑا جوبن عروسِ خنجرِ جلاد پر

کہیں کہیں ناسخ کی مضمون بندی اور تمثیلی رنگ بھی موجود ہے مثلاً

لاغر ایسا ہوا ہے جسم نحیف موے مژگانِ چشم عنقا ہے،

اہلِ دولت کو کہیں پایا نہیں حاجت روا وجہ رفعِ تشنگی آبِ گہر ہوتی نہیں

غیر ممکن ہے کہ پائے ظالمون سے کوئی فیض آبِ خنجر سے گیاہِ خشک تر ہوتی نہیں

لیکن بااین ہمہ ان کا کلام لکھنو کے ابتذال و رکاکت سے بالکل خالی ہے، مبتذل مضامین معشوق کے خارجی اور جسمانی اوصاف، انگیا، چوٹی، آئینہ وشانہ، پازیب اور چھاگل وغیرہ کی تعریف وتوصیف سے ان کے دیوان کے دامن پر کوئی دھبہ نہیں لگا ہے، اگرچہ عشق ومحبت کے لطیف ورقیق جذبات ان کے کلام مین زیادہ نہیں پائے جاتے تاہم مضامین جسقدر ہین، پاکیزہ ہین، اور اگر دیدہ ریزی سے انتخاب کیا جائے، تو بہت سے لطیف اور بلند اشعار بھی ان کے دیوان سے نکالے جا سکتے ہین، چند مثالین ملاحظہ ہون،

اے دامنِ دشتِ نجد تو ہی پردہ ہے مری برہنگی کا

یونہی لاکھ بار جیتے یونہی لاکھ بار مرتے تری رہگزر مین ظالم جو مرا مزار ہوتا

ساقی نے اوس کو بہرِ صبوحی کیا پسند چمکا نصیب اب قدحِ آفتاب کا

دونون جہان ملے مجھے تیری تلاش مین لیکن پتہ نہین ترے قصرِ جلال کا

قفس کی تیرے رونق ہوگی کیا ہم دل گرفتون سے چھڑایا تو نے اوصیاد ناحق آشیان ہم سے

مجھے راحت طلب کہدے نہ کوئی خوف ہے اسکا شبِ فرقت مین ورنہ جان دینا کون مشکل ہے،

اور بعض غزلین تو اول سے آخر تک سوز وگداز کے مضامین سے لبریز ہین مثلاً

سونے دے شورِ حشر کہ نا آرمیدہ ہون مین ساری زندگی کا صعوبت کشیدہ ہون

کیا پوچھتے ہو کس لئے خاطر کشیدہ ہون حرمان چشیدہ، غمزدہ آفت رسیدہ ہون
صیاد صدقہ کرکے مجھے چھوڑ دے کہ مین رنگِ بہارِ گلشنِ ہستی ندیدہ ہون
اک تم کہ جز نشاط و طرب کام ہی نہین اک مین کہ بہرِ رنج و الم آفریدہ ہون
کیا زہر مرگ مجھکو بھلا ناگوار ہو مین نامرادِ تلخیٔ ہجران چشیدہ ہون
یکسان زمانے مین ہے وجود و عدم مرا اک حرفِ آرزو بزبان نارسیدہ ہون
مجھ بال و پر شکستہ کا یارب ہے تو کفیل از دام جستہ تا بچمن نارسیدہ ہون
الجھائے خاک خارِ تعلق مجھے کہ مین اس خارزارِ دہر سے دامن کشیدہ ہون
بحرِ جہان مین خس کا سہارا نہین جسے وہ تختۂ شکستہ بطوفان رسیدہ ہون
سب دیکھتے ہین، حال کا پرسان کوئی نہین گویا کہ مین کسی کی شبیہِ کشیدہ ہون
صیاد ہمصفیرون کی حالت بتا تو کچھ مین مدتون سے حالِ چمن ناشنیدہ ہون

اس قسم کے اور بھی بہت سے پاکیزہ اشعار اس دیوان مین موجود ہین،

یہ دیوان صرف غزلیات کا مجموعہ ہے، قصائد بالکل نہین ہین، اخیر مین چند متفرق نظمین مثلاً مخمسہ، رباعیان اور قطعات ہین جو خاص لحاظ کے قابل نہین، "ن ع س"

گلِ رعنا

اردو زبان کی ابتدائی تاریخ اور اوس کی شاعری کا آغاز اور عہد بعہد کے اردو شعرا کے صحیح حالات اور ان کے منتخب اشعار، اردو مین شعرا کا یہ مکمل تذکرہ ہے جس مین آبِ حیات کی غلطیون کا ازالہ کیا گیا ہے، ولی سے لیکر حالی و اکبر تک کے حالات قیمت للعہ ۵۰۴ صفحے،

"منیجر"

مطبوعات جدیدہ

نبوت اور سلطنت مؤلفہ مولنا محمد حامد صاحب ناظم دینیات اسلامیہ کالج پشاور تقطیع اوسط،

ضخامت ۲۰۰ صفحے، کاغذ، کتابت، وطباعت بہتر قیمت معلوم نہیں، پتہ۔ مصنف سے ملے گی،

لائق مؤلف کے الفاظ مین اس تالیف کا مقصد یہ ہے "آج کل کے تعلیم یافتہ نوجوان یہ خیال کرتے ہین کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم محض تبلیغ رسالت کے لئے تشریف لائے تھے، اور آپ کو حکومت وسلطنت سے کوئی تعلق نہ تھا مین اس غلط فہمی کو دور کرنا چاہتا ہون" اس مقصد کے لئے انھون نے کلام مجید سے مسلمانون کے معاملات کے بارہ مین آنحضرت صلعم کے اختیارات حکومت کے اجزا، اور بعض گذشتہ انبیاء علیہم السلام کی حکومت کے واقعات اور حدیث وسیرت کی کتابون سے عہد نبوی کے مذہبی اور سیاسی نظام کو پیش کیا ہے، مؤلف کا مقصد نیک ہے لیکن اسکی تعبیر کا طریقہ صحیح نہین ہے، اس حد تک صحیح ہے کہ اسلامی قوانین کے قیام ونفاذ کے لئے عہد رسالت مین ایک سادہ مذہبی وسیاسی نظام قائم تھا، لیکن اس کو سلطنت سے تعبیر نہین کیا جا سکتا تھا، غلط طریقہ تعبیر سے واقعہ کی صورت بدل گئی ہے، مثلاً منجملہ انہی قانون ساز جماعتون (صاحب حکومت انبیاء) کے ہمارے رسول بھی ہین، (ص ۱) یا مکہ مین آپ مظلومیت کی زندگی بسر کرتے تھے، اور مدینہ مین آکر آپ کی شان حاکمانہ ہو گئی"۔ یا آپ نے محسوس فرمالیا کہ دینی تبلیغ بغیر نظام حکومت کے ناممکن ہے" یا آنحضرت صلعم یقیناً بادشاہ تھے، لیکن دنیاوی سلاطین سے آپ کی تاریخ ممتاز تھی" مؤلف کی نیت نیک ہے، لیکن ان الفاظ سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود واضع قوانین تھے یا مکہ مین جب آپ کے پاس مادی قوت نہ تھی، مظلومیت کی زندگی بسر کرتے رہے، مدینہ آنے کے بعد جب قوت حاصل ہوگئی،

تو حاکمانہ شان اختیار کرلی" بعض مقامون پر مفہوم کو صحیح الفاظ مین بھی تعبیر کیا گیا ہے، درحقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ پاک کے ساتھ دنیاوی بادشاہت وسلطنت اور اس قبیل کی کسی اصطلاح کی نسبت ہی صحیح نہین، ع "چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک" واقعہ یہ ہو کہ ابتداے بعثت سے اللہ تعالیٰ نے دو قسم کے انبیا مبعوث فرمائے، ایک وہ جن کے ذمہ صرف تبلیغ کا فرض تھا، اور قانون وشریعت سے انھین کوئی علاقہ تھا، جیسے حضرت عیسٰیؑ حضرت یحییٰ اور بعض دوسرے اسرائیلی انبیا علیہم السلام، دوسرے وہ جنھین منصبِ تبلیغ کے ساتھ شریعت اور اس کے نفاذ کے لئے حکومت بھی عطا ہوئی تھی، جیسے حضرت موسیٰ، حضرت سلیمان اور حضرت داؤد علیہم السلام، آنحضرت صلعم اسی دوسری قسم کے انبیا رمین تھے، اور چونکہ آپ دین ودنیا دونون کے لئے رحمت بنا کر بھیجے گئے تھے، اور اسلام دنیا مین خدا کا آخری دین تھا، اس لئے اپنے ساتھ دین ودنیا کی جامع شریعت بھی لایا تھا، اس کے قیام ونفاذ کے لئے جس حد تک مادی نظام کی ضرورت تھی، اسی حد تک آنحضرت صلعم نے ایک سادہ نظام قائم فرما دیا تھا، جسے اصطلاحی معنون مین سلطنت سے کسی طرح تعبیر نہین کیا جا سکتا، مصنف کی اس تالیف سے بہت پہلے سیرۃ النبی حصۂ دوم مین تاسیسِ حکومتِ الٰہی کے عنوان سے اس نظام کا پورا خاکہ موجود ہے، مصنف نے حسنِ نیت سے یہ کتاب لکھی ہے، اور ایک حیثیت سے مفید بھی ہے، لیکن ان کے خیال کے برعکس اب تعلیم یافتہ نوجوانون کا یہ خیال ہو رہا ہے، کہ انبیا علیہم السلام نے نعوذ باللہ اپنے جاہ واقتدار اور امارت وحکومت کے لئے مذہب کا ڈھونگ کھڑا کیا تھا، اس لئے اب ضرورت اسکی ہو کہ اس غلط خیال کی تردید کی جائے، اور بتایا جائے کہ انبیاء علیہم السلام کا اصل کام تو تبلیغ وتعلیم وتزکیہ ہے، لیکن جب کبھی ان فرائض کی بجاآوری مین دنیا کا کوئی سیاسی نظام راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا ہے، تو لامحالہ اس پتھر کو راستہ سے ہٹانا پڑتا ہو، اسلام انسانون مین دین ودنیا کے فوائد حسنات کو لیکر آیا ہو، اور اسکی شریعت مین جہان عقائد وعبادات کا باب ہو، حدود تعزیرات ومعاملات کے ابواب بھی ہین لیکن اول مقصود بالذات اور ثانی مقصود بالعرض ہو،

محمد رسول اللہ مترجمہ جناب مولوی عبید الرحمن صاحب تقطیع چھوٹی ضخامت ۹۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ۸ر پتہ کتبستان پوسٹ بکس نمبر ۲۱۲۶ بمبئی ۳۔

کارلائل نے اپنی مشہور کتاب ہیرو اینڈ ہیرو ورشپ مین آنحضرت صلعم پر بھی ایک باب لکھا ہی مذکورۂ بالا کتاب اسی کا اردو ترجمہ ہی، اسلام اور آنحضرت صلعم کے متعلق کارلائل کے معلومات اور خیالات اگرچہ اغلاط اور نقائص سے یکسر پاک نہین ہین، تاہم اس تاریک دور مین جبکہ یورپ مین تعصب اور غلط بیانیون کا طومار برپا تھا بڑی حد تک کارلائل نے صحیح واقعات لکھنے کی ہمت کی، درحقیقت اس دور کا کوئی یورپین اسلام اور آنحضرت صلعم کے متعلق مشکل ہی سے صحیح تصور قائم کرسکتا ہی، کچھ تو اس لئے کہ اس زمانہ مین یورپ نہایت اندھے تعصب مین مبتلا تھا، پھر اس کے پاس علم کے اتنے وسیع ذرائع نہ تھے، ان سب سے بڑھکر یہ کہ جدید یورپ کا کوئی فرد نہ صرف اسلام اور آنحضرت صلعم بلکہ کسی الہامی مذہب اور پیغمبر برحق کے تقدس وعظمت کا صحیح ادراک کرہی نہین سکتا اس لئے کارلائل نے اپنے خیال کے مطابق سچائی اور تحقیق کے باوجود بعض بڑی فاش غلطیان کی ہین، تاہم یہ کتاب اسلام اور آنحضرت صلعم کے متعلق اس دور کی دوسری کتابون کے مقابلہ مین غنیمت ہی، خیال آتا ہے، کہ اس کتاب کا ترجمہ پہلے بھی ہوچکا ہی،

تنقیدی اشارے از جناب آل احمد صاحب سرور، لکچرار اردو مسلم یونیورسٹی تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۰۰ صفحے، کاغذ، کتابت، طباعت، بہتر قیمت ۸ر پتہ نذیر اینڈ سنز مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڈھ،

یہ کتاب سرور صاحب کی ان سولہ تقریرون کا مجموعہ ہے، جو اونھون نے اردو ادب کے مختلف ادبی اور تنقیدی پہلوؤن پر دہلی ریڈیو پر کین اردو ناول کا ارتقار، اردو نثر مین مزاحیہ نگاری، اردو مین فسانہ نگاری، اردو شاعری مین خمریات ناولسٹ اور جرم، انگریزی شاعری، ہندوستانی ادب مین حالی کا درجہ اکبر کی شخصیت اور آرٹ چکبست لکھنوی، اقبال اور اس کا فلسفہ، شوکت علی

خان فانی، رتن ناتھ سرشار، ہندوستانی ادب مین آغا حشر کا درجہ، سمندر پار سے سرسید کے خطوط، مکاتیب مہدی، خندان، ریڈیو کے شرائط کی پابندی کے ساتھ کسی علمی و ادبی موضوع پر جامع تقریر بہت مشکل ہے لیکن ان تقریرون مین یہ خوبی ہے، کہ اس مین اختصار کے باوجود بڑی حد تک جامعیت موجود ہے، اور زیر تقریر موضوع پر اس حسن مذاق اور نکتہ سنجی سے تبصرہ کیا گیا ہے، کہ کوئی بنیادی بات چھوٹنے نہین پائی ہے، اور زبان کی سادگی کے باوجود ادب کا معیار پوری طرح قائم ہے یہ تقریرین لائق مقرر کے اعلیٰ ادبی ذوق اور تنقیدی نگاہ کی آئینہ دار ہین، اور ادبی حیثیت سے اصحاب ذوق کے مطالعہ اور طلبہ کے استفادہ کے لائق ہین،

الترجمۃ العربیۃ مولفہ مولنا مسعود عالم ندوی و مولانا ناظم ندوی ادیب ندوۃ العلماء تقطیع چھوٹی ضخامت ۶۶ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر ۱۲؍ پتہ :- معین الندوہ مندرو پٹنہ، اور محمد ناظم صاحب ندوی مکارم نگر لکھنؤ،

عربی زبان کی تعلیم کی سہولت کے لئے اسکی صرف و نحو پر اردو مین بہت سی کتابین موجود ہین بعض مین ضمناً عربی انشار و ترجمہ کی تعلیم کا بھی کسی حد تک لحاظ رکھا گیا ہے، لیکن خاص اس مقصد کے لئے غالباً کوئی کتاب نہین لکھی گئی جو عربی ترجمہ و انشا کی تعلیم مین معاون ہو، مولینا مسعود عالم صاحب ندوی سابق اڈیٹر الضیاء اور مولانا محمد ناظم صاحب ندوی ادیب ندوۃ العلماء جن کے ادبی دستگاہ سے اہل علم واقف ہین، اور جنھین اس کی تعلیم کا عملی تجربہ بھی ہے، اوس کے اصول و قواعد پر یہ کتاب لکھی ہے، ہر قاعدہ کے ساتھ عربی اور اردو دونون ترجمون کی مشقین بھی دیدی ہین، اسباق مین تدریج کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے، یہ کتاب نہ صرف عربی زبان کے طلبہ بلکہ بہتیرے مدرسین کیلئے بھی مفید ہے،

"م"

سیر الصحابہ رضی اللہ عنہم

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مسلمانوں کے لئے جن مقدس ہستیوں کے کارنامے اور سوانح حیات مشعلِ راہ ہو سکتے ہیں، وہ حضرات صحابہ کرام ہیں، دار المصنفین نے پندرہ برس کی جانفشانی و کوشش سے اس عظیم الشان کام کو انجام دیا، اور اردو میں صحابہ کرام کے حالات و سوانح اور اخلاق و حسنات کی دس ضخیم جلدیں احادیث و سیر کے ہزاروں صفحات سے چن کر مرتب کیں اور بحسن و خوبی شائع کیں، ضرورت ہے کہ حق طلب اور ہدایت و رہنمائی کے جویاں مسلمان ان صحیفوں کو پڑھیں، اور اس شمع ہدایت کی روشنی میں چلیں، جو آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے ان کے سامنے جلائی گئی تھی، ان جلدوں کی علحدہ علحدہ قیمتیں حسب ذیل ہیں، جن کا مجموعہ معہ ۲۷ ر ہوتا ہے، لیکن پورے سٹ کے خریدار کو صرف عـــہ ۲۰ ر میں یہ دس جلدیں کامل نذر کی جاتی ہیں، پیکنگ ذمہ دار المصنفین، محصول ذمہ خریدار،

جلد اول	خلفائے راشدینؓ	سے ر	جلد ششم	سیر الصحابہ ششم	عہ ر
جلد دوم	مہاجرین اولؒ	ہیے ر	جلد ہفتم	سیر الصحابہ ہفتم	عہ ر
جلد سوم	مہاجرین دوم	سے ر	جلد ہشتم	سیر الصحابیات	عہ ر
جلد چہارم	سیر الانصار	سے ر	جلد نہم	اسوۂ صحابہ اول	عہ ر
جلد پنجم	سیر الانصار دوم	عہ ر	جلد دہم	اسوۂ صحابہ دوم	ہیے ر

منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ

تابعینؒ

علم و عمل اور مذہب و اخلاق میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے سچے جانشین اور ان کے تربیت یافتہ تابعین کرام رضی اللہ عنہم تھے اور صحابۂ کرام کے بعد ان ہی کی زندگی مسلمانوں کے لئے نمونۂ عمل ہے، اس لئے سیر الصحابہ کی تکمیل کے بعد دار المصنفین نے اس مقدس گروہ کے حالات کا یہ تازہ مرقع مرتب کیا ہے، اس میں حضرت عمر بن عبد العزیزؒ، حضرت حسن بصریؒ، حضرت اویسؒ قرنی، حضرت امام زین العابدینؒ، حضرت امام باقرؒ، حضرت امام جعفر صادقؒ، حضرت محمد بن حنفیہؒ، حضرت سعید بن مسیبؒ، حضرت سعید بن جبیرؒ، حضرت محمد بن سیرینؒ، حضرت ابن شہاب زہریؒ، امام ربیعہ رائیؒ، امام مکحولؒ شامی، قاضی شریحؒ وغیرہ چھیانوے ۹۶ اکابر تابعینؒ کے سوانح، ان کے علمی، مذہبی، اخلاقی اور عملی مجاہدات اور کارناموں کی تفصیل ہے، مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی، ضخامت ۵۰۰ صفحے، قیمت: للعہ،

تاریخ اسلام

حصۂ اوّل

(از آغاز اسلام تا حضرت حسن رضی اللہ عنہ)

اس کتاب میں عرب قبل از اسلام کے حالات اور ظہور اسلام سے لیکر خلافت راشدہ کے اختتام تک کی اسلام کی مذہبی، سیاسی اور تمدنی تاریخ ہے، مرتبہ: شاہ معین الدین احمد ندوی، ضخامت ۲۸۰ صفحے، قیمت: ۔ سے ر

حصۂ دوم

اموی سلطنت کی صد سالہ سیاسی، تمدنی اور علمی تاریخ کی تفصیل، حجم ۴۷۲ قیمت سے ر

مسعود علی ندوی   منیجر دار المصنفین   اعظم گڈہ

مطبع معارف بن محمد اویس آرٹی نے چھاپکر شائع کیا

٨٩١٢ ۳۳ ه

معارف

آخری درج شدہ تاریخ پر یہ کتاب مستعار لی گئی تھی مقررہ مدت سے زیادہ رکھنے کی صورت میں ایک آنہ یومیہ دیرانہ لیا جائیگا۔

۲۶/۱۲/۵۴

۱۸۹ھ

معارف
جلد ۵
۱۹۲۰

7915 ۳۴۰۰،

کتب خانہ جامعہ عثمانیہ

۱۔ اراکین مجلس اعلیٰ، مجلس عاملہ، مجلس انتظامی ... کتابیں ... رکھ سکتے ہیں۔

۲۔ اساتذۂ جامعہ ... پانچ کتابیں ایک ماہ کے لیے ... رکھ سکتے ہیں۔

۳۔ طلبا ... تین کتابیں ... رکھ سکتے ہیں۔

۴۔ ...

۵۔ ...

۶۔ کتابوں پر کسی قسم کا نشان ... نہ لگایا جائے۔

۷۔ قلمی نسخے ... کی کتابیں جاری نہیں کی جائیں گی۔ فقط